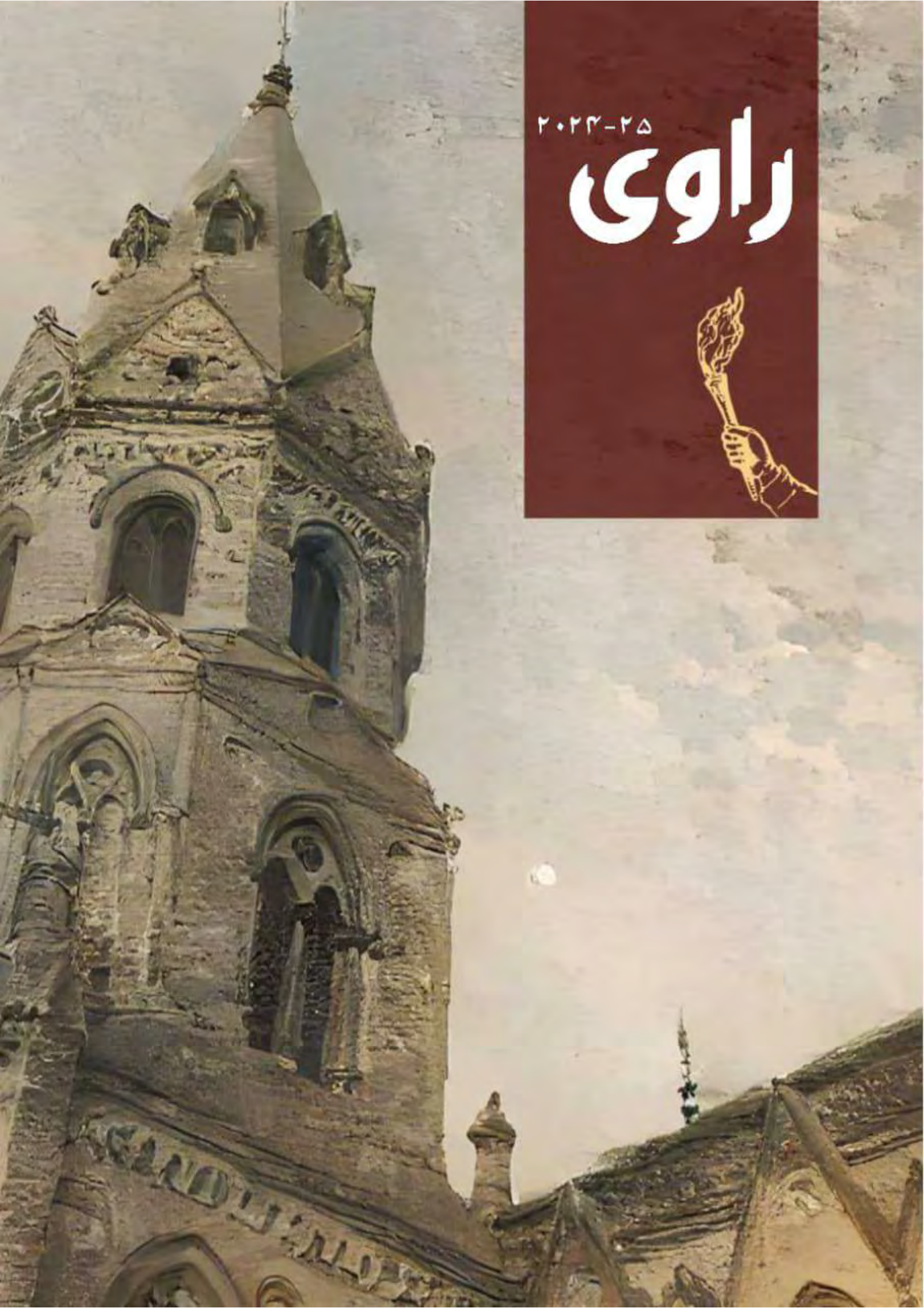
راوی

۲۰۲۴-۲۵



مدیرانِ راوی

ایس ایم ذوالفقار الدین	۱۲۔۱۹۱۰
شری کرشن کپور	۱۳۔۱۹۱۲
گرودت کارویل	۱۹۱۴
احمد شاہ بخاری (پطرس)	۲۱۔۱۹۱۹
پریش چندر کٹھپالیہ، امتیاز علی تاج	۱۹۲۱
اگرا سین	۲۳۔۱۹۲۲
فضل حق معتصم	۲۴۔۱۹۲۳
صغیر احمد ہاشمی	۱۹۲۴
شیخ عبدالرحمن	۱۹۲۵
تاج محمد خیال	۲۶۔۱۹۲۵
سید حسن جعفری	۲۷۔۱۹۲۶
حافظ عبدالحمید	مئی ۱۹۲۷
شیخ فاروق احمد	۲۸۔۱۹۲۷
محمد مسعود	۲۹۔۱۹۲۸
شیخ محمد اکرام	۳۰۔۱۹۲۹
فضل محمد فضل	۳۱۔۱۹۳۰
ن۔م۔راشد	۳۲۔۱۹۳۱
نسیم حسن	۳۳۔۱۹۳۲
عمر فاروق	۳۴۔۱۹۳۳
آغا عبدالحمید	۱۹۳۴
ظہیر الدین	۳۵۔۱۹۳۴
بشیر احمد قریشی	۱۹۳۵
محمد حسین، بشیر چوہدری	۱۹۳۶
شمشاد قریشی	۳۷۔۱۹۳۶
سید محمد جعفری، محمد کیانی	۳۸۔۱۹۳۷
وشوامتر عادل، حامد کیانی	۳۹۔۱۹۳۸
محمد صدیق اولکھ	اپریل ۱۹۳۹
منظور الحق	اکتوبر ۱۹۳۹
ریاض الدین احمد	۴۰۔۱۹۳۹
رؤف شیخ، مبارک مسعود	جون ۱۹۴۰
محمد اقبال	۴۱۔۱۹۴۰
رؤف شیخ	۴۲۔۱۹۴۱
امان اللہ سردار	۴۳۔۱۹۴۲
ضیا جالندھری	۴۵۔۱۹۴۴
عبدالکریم خالد، ارملا سوندھی	۱۹۴۵
محمد حسین، عبدالسلام	۴۶۔۱۹۴۵
ایم ایچ شمیم، منظر بشیر	۴۷۔۱۹۴۶
احسان الحق	۴۸۔۱۹۴۷
اعجاز فاروقی	۴۹۔۱۹۴۸
بذل حق محمود	۵۰۔۱۹۴۹
مظفر علی سید	۵۲۔۱۹۵۰
شہزاد احمد	۱۹۵۲
محمود سلیم جیلانی	۱۹۵۳
حسن نواز گردیزی	۱۹۵۴
حنیف رامے	۱۹۵۵
محمد اسلم	۱۹۵۶
انیس ناگی	۱۹۵۷
شریف خالد لون	۱۹۵۸
شوکت کاظمی، افتخار جالب	۱۹۵۹
اقبال معین	۱۹۶۰
انور ادیب	۶۲۔۱۹۶۱
محمود شام	۱۹۶۳
راحت نسیم ملک	۱۹۶۴
شاہد نبی ملک	۱۹۶۵
یعقوب ناسک	۱۹۶۶
سرمد صہبائی	۱۹۶۷
اسد اللہ غالب	۱۹۶۸
محمد اجمل نیازی	۱۹۶۹
سہیل صفدر	۱۹۷۰
اطہر وقار عظیم	۱۹۷۱
محمد اشرف عظیم	۱۹۷۲
وحید رضا بھٹی	۱۹۷۳
باصر سلطان کاظمی	۱۹۷۴
سراج منیر	۱۹۷۵
سجاد سلیم ہوتیانہ	۷۹۔۱۹۷۸
خالد منظور بسرا	۸۰۔۱۹۷۹
سلمان باسط	۸۲۔۱۹۸۱
محمد جاوید غنی	۸۳۔۱۹۸۲
احمد علیم	۸۴۔۱۹۸۳
لبنیٰ صدیق	۸۵۔۱۹۸۴
بدر منیر الدین	۱۹۸۶

عباس تابش	۱۹۸۷	سعد الحسن	۲۰۱۳
ظہور احمد	۸۹_۱۹۸۸	نوازش ملک	۲۰۱۴
سعشہ خان	۹۱_۱۹۹۰	حافظ محمد جنید رضا	۲۰۱۵
محمد اطہر مسعود	۱۹۹۲	فہد محمود سوختہ	۲۰۱۶
عبدالحمید بھٹہ	۱۹۹۳	اسامہ ضوریز	۲۰۱۷
محمد حسن رضا گوندل	۱۹۹۴	رانا محمد کفیل	۱۹_۲۰۱۸
خالد محمود سنجرانی	۱۹۹۵	زوہیب عالم	۲۱_۲۰۲۰
طیب رشید	۱۹۹۶	توصیف محمود	۲۳_۲۰۲۲
محمد اعظم ورائچ	۱۹۹۷	علی قائم نقوی	۲۵_۲۰۲۴
محمد صدیق اعوان	۱۹۹۸		
محمد صلاح الدین ایوبی	۱۹۹۹		
عزیر احسن	۲۰۰۰		
علی عثمان قاسمی	۲۰۰۱		
محمد علی خان	۲۰۰۲		
عبدالسمیع	۲۰۰۳		
نعیم امجد	۲۰۰۴		
ریاض الحسن	۲۰۰۵		
محور عباس	۲۰۰۶		
عاطف خالد بٹ	۲۰۰۷		
شجاع الرحمن ڈوگر	۲۰۰۸		
عدنان محسن	۲۰۰۹		
رانا حمزہ اعجاز	۲۰۱۰		
سلیم حسنی	۲۰۱۱		
علی اختر سلیم	۲۰۱۲		



راوی

۲۰۲۴-۲۵

مدیر

علی قائم نقوی

شریک مدیران:

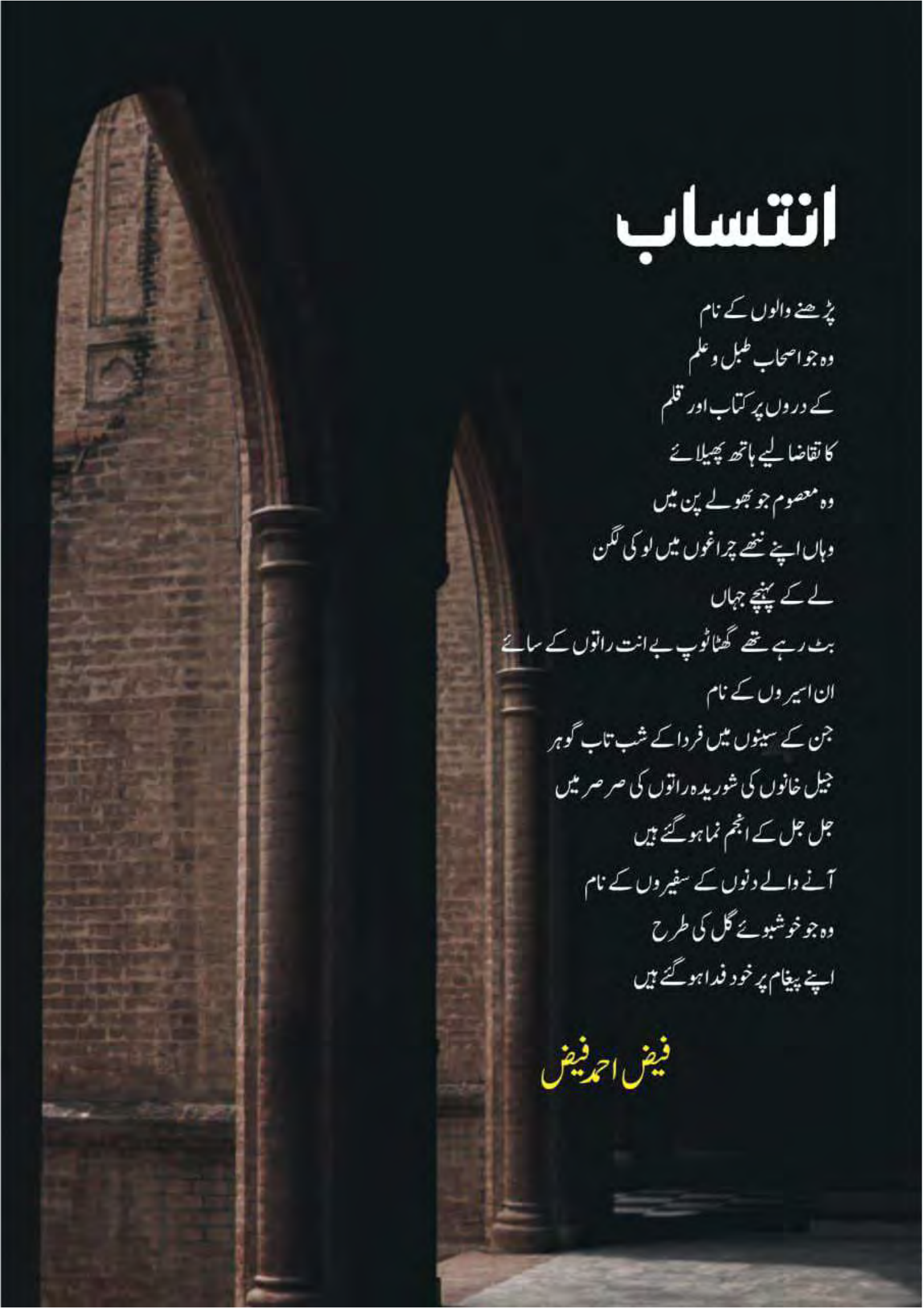
نعمان بخاری، سیف الرحمن جعفر

نائب مدیران:

انس رحمان، سیف علی، میاں محمد طلحہ

معاون مدیران:

خوشنود اختر، حمزہ افتخار



انتساب

پڑھنے والوں کے نام
وہ جو اصحاب طبل و علم
کے دروں پر کتاب اور قلم
کا تقاضا لیے ہاتھ پھیلائے
وہ معصوم جو بھولے پن میں
وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن
لے کے پہنچے جہاں
بٹ رہے تھے گھٹا ٹوپ بے انت راتوں کے سائے
ان اسیروں کے نام
جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر
جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں
جل جل کے انجم نما ہو گئے ہیں
آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام
وہ جو خوشبوئے گل کی طرح
اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے ہیں

فیض احمد فیض

فہرست

اداریہ		۱
نعت	علی قائم نقوی	۲

مضامین

یااستاد	سرمد صہبائی	۳
میخانہ ہستی میں ہم سبو کی تلاش کا مرکز حلقہ ارباب ذوق	ڈاکٹر سعادت سعید	۱۳
بلے بلے اور اوئے اوئے کی ورچول جدلیات اور حلقہ ارباب ذوق	مرزا اطہر بیگ	۳۳
فارانی صاحب	ڈاکٹر شفیق عجمی	۴۷
مولانا ابوالکلام آزاد۔۔۔انسان دوستی پر مبنی سیاسی مذہبی اساسیت	ظفر سپل	۵۷
اردو نثر کے دو آزاد (یک اسلوبیاتی مطالعہ)	ڈاکٹر محمد افتخار شفیع	۷۰
عالمی شعری ادب میں تہذیبی اتصال کی صورتیں: ایک مطالعہ	ڈاکٹر محمد افتخار شفیع	۷۷
اردو کا ناول جس پر فحاشی کے الزام میں پابندی لگی	زیف سید	۸۷
کلاسیکی اردو شعر اور طبِ یونانی (ذوق، مومن اور غالب کے تناظر میں)	ڈاکٹر ارسلان راٹھور	۹۱
تقسیم پاکستان سے قبل گورنمنٹ کالج لاہور کی تہذیبی زندگی کی چند جھلکیاں	ڈاکٹر ارسلان راٹھور	۹۸

افسانے

رُکی ہوئی زِندگی	محمد حمید شاہد	۱۰۱
فیصلے کی گھڑی	شاذیہ مفتی	۱۰۸
آدمی سے ڈرتا ہوں	ڈاکٹر سفیر حیدر	۱۱۰
ایک اندھیری رات میں	محمد عباس	۱۱۵
گاب اور فُضلہ	سلیم ہارون	۱۲۹
پانی پُوردے وسنیک	سلیم ہارون	۱۳۵

غزلیں

جو ہماری نہیں تھی، سر وہ مصیبت نہیں لی	خورشید رضوی	۱۴۳
یوں تو وہ شکل کھو گئی گردشِ ماہ و سال میں	خورشید رضوی	۱۴۳
کب وہ ظاہر ہو گا اور حیران کر دے گا مجھے	ظفر اقبال	۱۴۴
بے وفائی کر کے نکلوں یا وفا کر جاؤں گا	ظفر اقبال	۱۴۴
خیر اوروں نے بھی چاہا تو ہے تجھ سا ہونا	احمد مشتاق	۱۴۵
کام اتنی ہی فقط راہ گزر آئے گی	صابر ظفر	۱۴۵
دعا کا پھول پڑا رہ گیا ہے تھالی میں	نذیر قیصر	۱۴۶
صندلیں زمیں اپنی مرمریں مکاں اپنا	سعادت سعید	۱۴۶
دستِ دعا کو کاسۂ سائل سمجھتے ہو	سلیم کوثر	۱۴۷
انہیں میں جیتے انہیں بستیوں میں مر رہتے	افتخار عارف	۱۴۷
کشمکش کم نہیں ہوتی کہ جہاں کھینچتا ہے	گلزار بخاری	۱۴۸
جاری ہے غزل پور کا میلہ اُسے کہنا	عباس تابش	۱۴۸
ملو کہ سلسلہ رفتگاں رہے نہ رہے	اختر عثمان	۱۴۹
رات دن محبوس اپنے ظاہری پیکر میں ہوں	ریاض مجید	۱۴۹
موجۂ خونِ پریشان کہاں جاتا ہے	شاہین عباس	۱۵۰
کہاں کسی پہ یہ احسان کرنے والا ہوں	آفتاب حسین	۱۵۰
کوئی تھاریت پہ پیشانیاں رکھنے والا	منصور آفاق	۱۵۱
خواب کا اعتبار کر لوں کیا	فیصل عجمی	۱۵۱
خراب و خستہ واماندگاں گزر رہے ہیں	میر احمد نوید	۱۵۲
ان پہ جتنا یقین تھا ٹوٹا	حسنین اکبر	۱۵۲
اُن دنوں شہر میں معمار ہوا کرتے تھے	شناور اسحٰق	۱۵۳
اک دیا، روز جگاتا ہے مجھے	انجم سلیمی	۱۵۳

خیال و فکر کی سرحد کے پار جاتے ہوئے	نصرت صدیقی	۱۵۴
گزری جو رہگزر میں اسے در گزر کیا	خواجہ رضی حیدر	۱۵۴
یہ نہر آب بھی اس کی ہے ملک شام اس کا	افضال احمد سید	۱۵۵
عشق سامان بھی ہے بے سر و سامانی بھی	سعود عثمانی	۱۵۵
تمہاری یاد کا ساون کہاں سے آتا ہے	اکرام عارفی	۱۵۶
شام تک بچ رہیں جو چشمِ خریدار سے پھول	واجد امیر	۱۵۶
اسے سمجھنے کا کوئی تو راستہ نکلے	وسیم بریلوی	۱۵۷
ہوا کے ہوش اُڑانے اِدھر اُدھر ہوئے ہیں	عتیق احمد جیلانی	۱۵۷
ضبط گریہ میں بھی گریہ تو کیا ہے میں نے	مقصود وفا	۱۵۸
زندگی تو نے لہو لے کے دیا کچھ بھی نہیں	راجیش ریڈی	۱۵۹
ناراض ہیں بچپن کے کئی یار ہمارے	افتخار حیدر	۱۵۹
کسی کے عکس کو حیران کرنا چاہتا ہوں	قمر رضا شہزاد	۱۶۰
بھڑک اُٹھی ہے وہی نارِ آتشیں مجھ میں	علی زریون	۱۶۰
کسی کسی کا الگ انتظام ہوتا ہے	اظہر فراغ	۱۶۱
ربط اسیروں کو ابھی اس گل تر سے کم ہے	ادریس بابر	۱۶۱
نہ تشنہ لب تھے نہ تشنہ لبی سے خالی تھے	عدنان محسن	۱۶۲
مجھ کو یہ وقت وقت کو میں کھو کے خوش ہوا	ذوالفقار عادل	۱۶۲
بہار آئے گی اور میں نمو نہیں کروں گا	شاہد ذکی	۱۶۳
وہ حسن سبز جو اترا نہیں ہے ڈالی پر	اختر رضا سلیمی	۱۶۳
رشتوں نے رسی باندھ کے کھینچا نکیل سے	افضل خان	۱۶۴
خط کے چھوٹے سے تراشے میں نہیں آئیں گے	خالد ندیم شانی	۱۶۴
تیرے ہوتے ہوئے بھی خانہ پری میں گم تھی	نعیم گیلانی	۱۶۵
سو طرح کی مشکلیں ہیں مجھ کو آسانی کے ساتھ	کاشف حسین غائر	۱۶۵
ہم باوجود خیر و خبر گم ہوئے ملے	شبیر حسن	۱۶۶

وہاں اس نے جانے کی بات کی یہاں میرا چہرہ اتر گیا	تہذیب حافی	۱۶۶
نہیں ہے منحصر اِس بات پر یاری ہماری	جواد شیخ	۱۶۷
رویا میں خواب میں اِدھر، اور اُدھر جناب کی، نیند خراب ہو گئی	عمار اقبال	۱۶۷
یہ زمیں گھومتی ہے یا مرا سر گھومتا ہے	سجاد بلوچ	۱۶۸
نہیں جاتی یہ حیرانی ہماری	فضل گیلانی	۱۶۸
مٹنے والا تھا جو اک نقش اُبھارا میں نے	فیصل ہاشمی	۱۶۹
کس کو معلوم بھلا کتنے جتن سے آئی	حماد نیازی	۱۶۹
اب تک جو جی چکا ہوں جنم گن رہا ہوں میں	سرفراز عارش	۱۷۰
جاگا جو پور پور میں قندیل کی طرح	توقیر تقی	۱۷۰
اگرچہ اس میں کئی مشکلات دیکھتی ہے	فیضان ہاشمی	۱۷۱
گھر مرا تھا، نہ وہاں کوئی گلی میری تھی	عابد ملک	۱۷۲
یقیں کی سمت دلِ بے یقیں سے تیر آیا	عقیل شاہ	۱۷۲
اب ایک سانس کے بدلے میں اک صدی کم ہے	اسامہ ضوریز	۱۷۳
دستک جو نہیں اس کی میسر اسے کہنا	فہد محمود سوختہ	۱۷۳
رنجِ وارفتگاں کا حصہ ہو	تجمل کاظمی	۱۷۴
چشموں کے خواب میں رہے ڈوبے پڑے ہوئے	ارسلان راٹھور	۱۷۴
دلوں میں خوف کے چولھے کی آگ ٹھنڈی ہو	رانا عامر لیاقت	۱۷۵
خبر تو ہو کہ جوازِ کتاب کونسا ہے	خرم آفاق	۱۷۵
غار تھا غار کی تنہائی تھی آگے میں تھا	عقیل عباس	۱۷۶
جگنوؤں کی قسم دیوں کی قسم	فیاض بوستان	۱۷۶
گلی سے قافلۂ رنگ و بُو گزرتا تھا	علی قائم نقوی	۱۷۷
خاکی پیکر ہے مگر خاک نشینوں سے نہیں	راکب مختار	۱۷۷
مرے سمیت یہاں جو بھی ہے، یہ سب میں ہوں	راز احتشام	۱۷۸
نگارِ خواب سرِ چشمِ تر ٹھہر کوئی دیر	احسان اصغر	۱۷۸

اگر وہ چومتا نہیں	کفیل رانا	۱۷۹
وہ شوخ رنگ جب اپنی قبا بدلتی ہے	زوہیب عالم	۱۷۹
سبھی کو بر سرِ امکان تھوڑی کرنا ہے	زنیر نقوی	۱۸۰
ہم اب تو روز ہی ملتے ہیں اس لیے کم ہیں	علی ارتضیٰ	۱۸۰
گوشے گوشے پہ کوئی نقشِ قدم بنتا ہے	حارث بلال	۱۸۱
دل کے بے لاگ اظہار پر ہچکچاہٹ کا پہرا تو ہے	انس رحمان	۱۸۱
منتظر تھے تمہارے پھول کھلے	سیف علی	۱۸۲
دماغ الجھا رہے زندگی میں جی نہ لگے	میاں محمد طلحہ	۱۸۲
وصل کے باغ میں یہ خواری بہت ہوتی ہے	کمال حسن	۱۸۳
مجھ کو سپردِ سایہ اغیار کر نہ دے	شاہنواز ہائم	۱۸۳
تفصیل کا نہیں وہ، خلاصوں میں بانٹ دے	حمیدہ شاہین	۱۸۴
جانے کدھر کدھر ہے کہاں کی لگی ہوئی	حمیدہ شاہین	۱۸۴
مسلسل ایک ہی تصویر چشم تر میں رہی	یاسمین حمید	۱۸۵
مثالِ عکس مرے آئنے میں ڈھلتا رہا	یاسمین حمید	۱۸۵
وارفتہ و سرشار و فدا چاہیے مجھ کو	صائمہ آفتاب	۱۸۶
عکس میں جھانکتی کمی کو دیکھ	صائمہ آفتاب	۱۸۶
خرام موجۂ بادِ صبا سے ملتی رہے	صائمہ زیدی	۱۸۷
طلسم لب میں کیا کچھ ہے وہ چشم مہرباں کیا ہے	صائمہ زیدی	۱۸۷
عشق تقصیر کے حوالے سے	ڈاکٹر آمنہ ندیم قاضی	۱۸۸
اپنے اپنے رائیگاں جانے کے غم سے مضمحل	سیماب ظفر	۱۸۸
سب جن کے لیے جھولیاں پھیلائے ہوئے ہیں	فریحہ نقوی	۱۸۹
ہمیں وراثت میں اپنا لہجہ ملا ہوا ہے	فریحہ نقوی	۱۸۹
اچھا خواب دکھایا تم نے خواب دکھانے والوں میں	امن شہزادی	۱۹۰
فریبِ دنیا نے ہلکان کر دیا ہے مجھے	عائشہ شفق	۱۹۰

پلٹنے والوں نے دشنام جب تمہارا دیا	نیلوفر افضل	۱۹۱
جا نکلے عجب دشت میں اوراق پلٹ کر، اطراف سے کٹ کر	نیلوفر افضل	۱۹۱
جانے مَیں نے کن لفظوں کو کن لوگوں کا بار کیا	فاطمہ مہرو	۱۹۲
کہیں ملے گا تو یہ اہتمام کر لیں گے	فاطمہ مہرو	۱۹۲

نظمیں

نعت	وحید احمد	۱۹۳
نومبر کے پہلے ہفتے پہ ایک نظم	اختر حسین جعفری	۱۹۶
اے لاہور	جیلانی کامران	۱۹۷
درخت، میرے دوست	ثروت حسین	۱۹۷
محبت میں دیر ہو سکتی ہے	ذیشان ساحل	۱۹۹
ہم کہ ہیرو نہیں	جاوید انور	۱۹۹
زندگی ہمارے لیے کتنی آسان کر دی گئی ہے	افضال احمد سید	۲۰۰
اسمِ اعظم	سرور کامران	۲۰۱
ایک عام سے دن کی نظم	ہمایوں احمد منصور	۲۰۲
کینوس	قیس قیصرانی	۲۰۲
ہم کبھی خوبصورت نہیں تھے	عدنان بشیر	۲۰۳
محبت کا میوزیم	نوازش ملک	۲۰۳
نظم	وکاس انجم	۲۰۴
مرے درخت تری بے کنار خواہش میں	احسان اصغر	۲۰۴
بوڑھا عیسائی	شہباز گوہر	۲۰۶
ایک مضافاتی دن	اویس سجاد	۲۰۶
نظم	فاطمہ مہرو	۲۰۷
تم بہت خوبصورت ہو	صدیق شاہد	۲۰۸

جیواُس زندگی کو	توحید زیب	۲۰۹
بازگشتِ خواب	ذیشان حیدر	۲۱۰
عشق معنی سے بہر حال بہت آگے ہے	زاہد خان	۲۱۰
نسیان نامہ	انس رحمان	۲۱۱

اداریہ

تہذیبی ارتقاء کے زینوں پر قدم رکھنے والوں نے کبھی اپنے اولین قدموں کو فراموش نہیں کیا اور روایت کی زنجیر کا حُسن یہی ہے کہ اس سے وابستہ نفوس، اس کی ہر کڑی کو قید کی بجائے اپنی فکری وراثت تسلیم کرتے ہیں۔ ادب، اس تہذیبی ارتقاء کی سب سے معتبر سند کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک ایسی سند، جو مختلف ادوار میں ہونے والی شعوری ولاشعوری کوششوں کی گواہی کے طور پر ہمیشہ موجود رہی ہے۔

ادیب ہر دور میں معاشرے کے اجتماعی شعور کی سطح کا تعین اور اس میں بہتری کے لیے عملی کوششیں کرنے کا ذمہ دار رہا ہے۔ یہ ذمہ داری فقط اشعار کی تحسین، نثر کی مقبولیت، فقروں کی شہرت اور لفظوں کی نشست و برخاست تک محدود نہیں ہے۔ یہ تو وہ بارِ گراں ہے جسے کسی رستمِ زماں کے کاندھے نہیں بلکہ ایک ادیب کا دل ہی اٹھا سکتا ہے۔

آدمی کیا ہے! قیدِ حیات میں وقت کی سلاخوں سے سر ٹکرانے والا ایک زندانی، لیکن ادیب، ادیب عام زندانی نہیں ہے، وہ شاید جانتا ہے کہ اس مقید نوع کا جرم کیا ہے، وہ شاید یہ بھی جانتا ہے کہ اس قید کی معیاد کتنی ہے، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہاں کچھ بھی جان لینا بے معنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی وہ کفن میں گھیسو اور مادھو کی نسلی محرومیوں کا پرسہ پیش کرتا ہے تو کبھی دیوانِ میر کے صفحات سے پکارتا ہے:

قیدِ حیات، قید کوئی سخت ہے کہ روز
مر رہتے ہیں گے اُس کے گرفتار ایک دو

دیکھیے، انسان کے اجتماعی شعور کی نمائندگی جیسی کاوشِ جاں کناں کی قیمت فقط وہ توجہ تھی جو شاید معاشرے نے کبھی ادب اور ادیب کو نہیں دی۔ آج بھی شہر کے بڑے بڑے کتاب میلوں میں عادتاً گھومتا آدمی کہانی سُننا تو چاہتا ہے لیکن واقعہ سمجھنا نہیں چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب خانوں کی گھُن زدہ الماریوں میں پڑی گرد آلود کتابیں سڑکوں پر گونجنے والا مار دو، کاٹ دو کا شور سنتی ہیں اور نفرت و انتشار کے زہر کا تریاق بننے والے لفظوں کو اپنے سینے سے لگائے بے بس پڑی ہیں۔ لطیف جملے اور برجستہ مصرعے دیمک کے حلق سے نیچے اترتے جا رہے ہیں۔ راوی کے اس شمارے کی صورت، میں انہی دم توڑتے لفظوں کا مقدمہ لیکر آپ کے سامنے حاضر ہوں، پڑھ لیجیے، شاید کچھ بن پڑے، وگرنہ حقیقت تو یہ ہے کہ:

وہ ملتفت ہیں مگر اب ہمیں دماغ نہیں
کہے ہوئے کو پھر اب ابتداء سے کون کہے

(خورشید رضوی)

علی قائم نقوی

نعت

علی قائم نقوی

ہر کارِ ہدایت ترے انداز سے نکلا
ہر لفظ کا معنی تری آواز سے نکلا

قدموں سے حدِ فرشِ زمیں تُو نے بڑھائی
افلاک کا رستہ تری پرواز سے نکلا

تجھ لو سے ملی جس کو بھی توفیقِ نظارہ
تاریکیِ شب میں وہ بڑے ناز سے نکلا

نے حسِ سماعت، نہ کوئی سُر نہ صدا تھی
پھر نغمۂ تخلیق ترے ساز سے نکلا

خورشیدِ فلک ہو کہ مرا بخت ہو شاہا
جو ڈوب کے نکلا ترے اعجاز سے نکلا



تصویر کشی: سید یاسر عثمان

مضامین

یا استاد

سرمد صہبائی

مشکل وقت میں انسان یا تو اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور یا پھر اپنے استاد کو لیکن مجھے اپنے استاد کو یاد کرنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ وہ میری زندگی کی سرگزشت کا حصہ ہے، میری ہڈ بیتی ہے۔ میں اسے نہ بھی یاد کروں تو وہ مجھے یاد رہتا ہے۔ یہ ان استادوں میں سے نہیں جو ہمیں کلاس روم میں درسی کتابیں پڑھاتے ہیں، یہ وہ استاد ہے جو ہمیں زندگی کرنا سکھاتا ہے۔ میری اس عظیم استاد سے پہلی ملاقات کالج کی کنٹین میں ہوئی۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں پہلے ہی دن مجھے خبردار کر دیا گیا تھا کہ میں سینئر لڑکوں سے ہشیار رہوں کیونکہ یہ فرسٹ ائیر کے لڑکوں کو خوب بے وقوف بناتے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ فیس کہاں جمع کروانی ہے تو یہ تمہیں کالج کی لیٹرین میں بھیج دیں گے۔ اگر پوچھو انفارمیشن کاؤنٹر کہاں ہے تو یہ تمہیں گرلز روم کا رستہ دکھائیں گے جہاں لڑکیاں مل کر تمہاری اچھی خاصی درگت بنائیں گی۔ اتفاق سے اسی دن کالج کی یونین کی طرف سے تین بجے ایک سیمینار ہو رہا تھا۔ میں نے اوول گراؤنڈ میں بیٹھ کر ایک تقریر لکھی ڈالی لیکن جب ہال میں اپنا نام لکھوانے گیا تو پتہ چلا یونین کے فنکشن میں فرسٹ ائیر کے طالب علموں کو حصہ لینے کی اجازت نہیں۔ سخت مایوسی ہوئی لیکن پھر پتہ چلا کہ یونین کا سکرٹری ہارون کیانی ہے، ہارون جسٹس ایم آر کیانی کا بیٹا تھا اور کیانی صاحب میرے والد کے بہت اچھے دوستوں میں سے تھے۔ میں نے فوراً ہارون کو والد صاحب کا نام بتایا۔ اس نے کہا اگر وقت بچا تو تمہیں پانچ منٹ دے دیے جائیں گے۔ پانچ منٹ بچ گئے اور میں نے جو لکھا تھا دھڑلے سے پڑھ دیا۔ اس سیمینار میں بڑے سینئر مقرر شامل تھے، علی کاظم، امتیاز جاوید، طارق علی، ارشاد کاظمی اور خالد جاوید۔ پتہ نہیں منصفین کو میری کیا بات پسند آئی کہ انہوں نے مجھے پہلا انعام دے دیا۔ اب ایک طرف تو مجھے اس ''انہونے'' انعام پر خوشی ہو رہی تھی لیکن دوسری طرف یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ یہ سینئر لوگ اب پتہ نہیں مجھ سے کیسا سلوک کریں گے۔ میں ڈرتے ڈرتے ہال سے باہر نکلا تو سامنے یہی سینئر کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں واپس مڑ جاتا انہوں نے مجھے دیکھتے ہی ''مبارک مبارک'' کے نعرے لگائے اور بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: ''چلو اب تم ہمیں کینٹین میں چائے اور سموسے کھلاؤ۔'' پہلے تو میں نے سمجھا یہ مجھے فرسٹ ائر فول بنانے کی کوئی چال ہے لیکن جب چائے کا دور شروع ہوا تو ان سے کچھ ایسی بے تکلفی ہوئی کہ لگا وہ سب برسوں سے میرے دوست ہیں۔

گورنمنٹ کالج میں داخلہ ملنے کا مطلب ایک مہذب دنیا میں داخل ہونا تھا اور مہذب دنیا کا مطلب انگریزی تہذیب تھا۔ تقریباً سبھی لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے انگریزی بولتے اور انگریزوں کے سٹائل میں اٹھتے بیٹھتے۔ لڑکیوں میں کوئی ایوا گارڈنر تھی تو کوئی سوزن ہیورڈ، لڑکوں میں ایلوس پرسلے، گریگری پیک اور راک ہڈسن۔ دوسرے دن جب میں اپنے انہیں سینئر

دوستوں کے ساتھ کینٹین میں بیٹھا گورنمنٹ کالج کی ''کلونیل گلوری'' colonial glory سے مسحور ہو رہا تھا تو دیکھا یک دم میرے گرد بیٹھے سب سینیئرز ایک ایک کر کے کھسک گئے ہیں اور ایک لمبے بالوں والا شخص نیکر پہنے میرے سامنے کھڑا ہے۔

''اوئے کاکا تیری تے اندرے کلاس ہو رہی اے تے توں ایتھے بیٹھا چاء پی رہیا ایں؟'' (بیٹا تیری تو اندر کلاس ہو رہی ہے اور تو یہاں بیٹھا چائے پی رہا ہے؟)

یہ کون ہے جو مجھ سے اتنی بے تکلفی سے بات کر رہا ہے اور وہ بھی پنجابی میں۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اس سے کیا کہوں لیکن اس کی شخصیت میں اس قدر دلکشی اور اپنائیت تھی کہ میں کچھ کہے بغیر خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور مجھے کلاس میں لے گیا۔ وہاں بھی اسی بے تکلفی سے اس نے پروفیسر سے کہا۔

''لو بھئی تسی تے ایتھے کلاس پڑھا رہئے اوتے تہاڈا منڈا باہر چاء پی رہیا اے۔'' (لو جی آپ تو ادھر کلاس پڑھا رہے ہیں اور آپ کا شاگرد باہر بیٹھا چائے پی رہا ہے) میں حیران پریشان، انگریزوں کے کالج میں انگریزی کے پروفیسر کے ساتھ بھی علی الاعلان پنجابی اور ایسی ہی بے تکلفی۔

''یار یہ بندہ کون تھا؟'' میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لڑکے سے پوچھا:

''یہ ڈاکٹر نذیر ہیں کالج کے پرنسپل۔''

''پرنسپل؟''

''ہاں۔''

دوسرے دن میں نے یہ واقعہ اپنے سینئر دوستوں کو سنایا تو انہوں نے کہا ڈاکٹر صاحب جب راونڈ پر آتے ہیں تو بھاگ جایا کرو۔ چنانچہ میں نے جونہی ڈاکٹر صاحب کو آتے دیکھا تو جلدی سے کھسکنے کی کوشش کی لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے بھاگنا کس طرف ہے۔

''اوئے کاکا ٹھہر جا'' مجھے یک دم ڈاکٹر صاحب کی آواز آئی۔ وہ میرے پیچھے بھاگ رہے تھے, میں شرمندگی سے رک گیا۔

''چل یار اج میں تینوں چاء پیانا آں۔'' (چل یار آج میں تمہیں چائے پلاتا ہوں)۔ ڈاکٹر صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے جو کالج کی بلڈنگ کے اندر ہی تھا۔ ان کے ڈرائینگ روم میں کوئی کرسی یا صوفہ سیٹ نہیں تھا، بس چند پیڑھیاں پڑی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب دوسرے کمرے سے ایک بڑا چائے کا گول ڈبا لے کر آئے۔ ''ایہ چاء مینوں بلراج ساہنی نے بمبئے توں بھیجی اے'' (یہ چائے بلراج ساہنی نے مجھے بمبئی سے بھیجی ہے) یہ کہہ کر باورچی خانے میں غائب ہو گئے۔ بلراج ساہنی بھارت کا مشہور اداکار تھا۔ میں نے اس کی دو فلمیں دیکھ رکھی تھیں، کابلی والا اور ہم لوگ۔ تھوڑی دیر بعد خود ہی چائے لے کر آئے اور میرے ساتھ پیڑھی پر

بیٹھ گئے۔ چائے واقعی بہت مزے کی تھی۔ ہم دونوں ان پیڑھیوں پر بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہے، شاعری پر، موسیقی پر۔ اسی دوران کہیں ڈاکٹر صاحب کی باتوں میں گورنمنٹ کالج کی ''کلونیل گلوری'' چائے کی بھاپ میں بھک سے اڑ گئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی دوستی نے مجھ پر ادب اور کلچر کے ہزار دروازے کھول دیے تھے۔ اب ہم ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں بغیر اجازت چلے جاتے، وہ کبھی ہمیں صوفی تبسم سے ملواتے تو کبھی استاد دامن سے۔ ڈاکٹر صاحب کی بیٹھک میں اور پھر گورنمنٹ کالج کی میوزک سوسائٹی کی محفلوں میں ہم نے بڑے بڑے موسیقاروں کو سنا، استاد فتح علی خان، امانت علی خان، استاد سلامت علی خان، نزاکت علی خان، روشن آراء بیگم اور استاد شریف خان پونچھ والے۔ ڈاکٹر صاحب کبھی ہمارے ساتھ کالج کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر گپ لگاتے اور کبھی کالج کی کنٹین میں۔ وہ سارا دن ایک درویش کی طرح کالج کے چاروں طرف پھرتے رہتے۔ ہم لاہور میں رہتے تھے، لیکن ہمیں اس بات کی بالکل کوئی خبر نہیں تھی کہ ہم شاہ حسین کے شہر میں رہتے ہیں اور شاہ حسین روز ہمیں ڈاکٹر نذیر کے روپ میں ملنے آتا ہے۔

شاہ حسین فقیر اے، نہ آکھو کوئی پیر اے

ڈاکٹر صاحب سوائے کسی سرکاری تقریب کے کبھی سوٹ ٹائی نہ پہنتے، ہمیشہ اپنے سفید کرتے شلوار میں نظر آتے یا کبھی فلیٹ بوٹ، نیکر اور بنیان میں اوول گراؤنڈ میں لڑکوں کے ساتھ ریس لگاتے دکھائی دیتے، کبھی کسی مالی کے ساتھ لان میں گھاس پر بیٹھے پھولوں کی کیاریوں کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوتے اور کبھی کالج کے پچھواڑے میں چنگڑ محلے کے بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے۔ وہ زیادہ پیدل ہی چلتے اور کبھی کہیں دور جانا ہوتا تو سائیکل پر جاتے۔ انہیں کسی طالب علم کی بیماری کی خبر ملتی تو سائیکل پکڑ کر اس کے گھر اس کی عیادت کو پہنچ جاتے۔ ان کی دوستیاں ملک کے سبھی بڑے شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور موسیقاروں سے تھیں۔ انہیں کسی نے کبھی بھی اپنی کسی بات پر کسی قسم کی سفید پوشی کا بھرم رکھتے نہیں دیکھا تھا۔ میں ایک دن ان کے کمرے میں گیا تو وہاں ایک بڑا بارعب آدمی سرخی مائل کھدر کا دھوتی کرتا پہنے سر پر پگڑی باندھے بیٹھا تھا۔ کھدر کا یہ رنگ میں نے اکثر فیشن ایبل اور متمول مارکسسٹوں کو پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کا لباس دھول سے اٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ سانولا، ڈاڑھی مونچھ گھنی اور آنکھوں میں ایک صوفیانہ خمار تھا۔

''ایہ میرا بھرا اے موتی شاہ'' (یہ میرا بھائی ہے موتی شاہ) ڈاکٹر صاحب نے بڑے پیار سے کہا: ''روڑی کٹدا اے۔'' (روڑی کوٹتا ہے) ''گاوندا بہت اچھا اے۔'' (گاتا بہت اچھا ہے)۔ ڈاکٹر صاحب نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنے مزدور بھائی کو بڑے فخر سے مجھ سے ملوایا۔ موتی شاہ نے وہیں میز پر ٹھیکہ لگایا اور نہایت سریلی آواز میں ایک پنجابی گیت سنایا۔ موتی شاہ کی شخصیت میں بڑی انٹھنٹسٹی تھی، ایک سچائی جو میں نے شاید ہی کسی سوشلسٹ میں دیکھی ہو۔

ایک دن مال روڈ پر ڈاکٹر صاحب کو ایک پولیس والے نے کسی بات پر روک لیا۔ پوچھا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ہیں۔ اس پر پولیس والے سمجھا وہ اس سے مذاق کر رہے ہیں لیکن چند ہی منٹوں کے بعد وہاں ڈاکٹر صاحب کے مداحوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا اور وہیں مال پر محفل جم گئی۔

فرسٹ ائیر میں جب میں اردو کی کلاس میں گیا تو دیکھا ہمارے استاد ایک بلندی پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں، یہ بشیر الرحمان تھے جن کا بڑا رعب تھا۔ انہوں نے کتاب سے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ جوانی میں استادوں کو چھیڑنے میں مزہ آتا تھا چنانچہ ایک جگہ انہوں نے پڑھا: ''اس نے رسی کا سرا پکڑا''۔ میں نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔ بشیر صاحب نے غصہ سے مجھے گھورا اور گرجدار آواز میں بولے۔ ''کیا بات ہے؟''

میں نے کہا: ''سر لفظ سرا نہیں سرا ہے۔ سر کا مطلب راز ہے اور سر کا مطلب جہاں سے کسی چیز کی ابتدا ہوتی ہے، جیسے سرورق، اس لئے یہ رسی کا سرا ہو گا، سرا نہیں۔''

''کیا رول نمبر ہے؟''

''۲۰۴''

''نکل جاؤ میری کلاس سے''، انہوں نے غصے کہا اور حقے کی ناڑی کو مونہہ سے لگا لیا۔

اب مجھے ایک اور کلاس میں بھیج دیا گیا، وہاں بھی یہی سلوک ہوا کہ استاد ''مکروزور'' کو ''مکروزور'' پڑھ رہے تھے۔ ایک دو کلاسوں کے بعد مجھے ایک ایسے استاد کے پاس بھیجا گیا جن سے غلطی کا ہونا ناممکن تھا۔ مرزا منور صاحب عربی فارسی کے عالم تھے۔ میں روز اس انتظار میں رہتا کہ مرزا صاحب کوئی غلطی کریں لیکن میری آرزو پوری نہ ہوتی، آخر ایک دن ان سے غلطی ہو ہی گئی، کہنے لگے میر نے کیا خوب کہا ہے: ''قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو، کاش کہ تم مرے لئے ہوتے۔''

میں نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔ کلاس سہم گئی۔

''ہاں کیا بات ہے؟''

''سر یہ شعر غالب کا ہے میر کا نہیں۔''

''خاموش۔ بیٹھ جاؤ!''

''تحقیق کر لیجیے گا۔'' میں نے بیٹھتے ہوئے کہا

مرزا صاحب نے ایک لمحہ سوچا اور کہا

''ٹھیک ہے یہ شعر غالب کا ہی ہے'' اور پھر طنزاً مجھ سے کہا: ''بندہ پروری کا شکریہ۔''

''بندہ کس قابل؟'' میں نے بھی ذرا طنزاً کہہ دیا۔ مرزا صاحب کو تھوڑی دیر میں جب پتہ چلا کہ میں ''بندہ'' ان کو کہہ رہا ہوں تو غصے سے بولے: ''کیا رول نمبر ہے؟ نکل جاؤ میری کلاس سے۔''

مرزا صاحب کی کلاس سے بھی چھٹی ہو گئی تو مجھے قیوم نظر کی کلاس میں بھیج دیا گیا جو دوپہر دو بجے ہوتی تھی۔ اس کلاس میں بہت سے طالب علم ہوتے تھے۔ میں کلاس میں پچھلے بنچ پر سو جایا کرتا تھا۔ قیوم صاحب کو میں وہاں سے نظر نہیں آتا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھے سوتے ہوئے دیکھ لیا۔ قیوم صاحب اذیت رسائی کے ماہر تھے، چنانچہ خوش ہوئے کہ آج ایک شکار ہاتھ آیا ہے۔ مجھے حکم دیا کہ میں ساری کلاس کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاؤں۔ وہ چاہتے تھے کہ مجھے ساری کلاس کے سامنے عبرت کا نمونہ بنایا جائے۔

''نظم اور نثر میں فرق بتاؤ'' قیوم صاحب نے پوچھا۔

''سر نظم میں بحر ہوتی ہے اور نثر میں بحر نہیں ہوتی۔''

''جو فرق میں نے بتایا ہے وہ بتاؤ'' قیوم صاحب یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ میں ان کے لیکچر کے دوران سویا ہوا تھا۔

میں نے کہا: ''سر آپ نے کیا فرق بتایا ہے؟''

کہنے لگے میں نے جو بتایا ہے وہ تم اس لئے نہیں بتا سکتے کہ تم سوئے ہوئے تھے۔

میں نے کہا: ''سر آخر آپ نے کیا بتایا ہے کیونکہ میرے خیال میں تو اس کے علاوہ کوئی اور فرق نہیں۔''

''میں نے بتایا تھا کہ نثر میں ہم کہتے ہیں 'وہ آتا ہے' جبکہ نظم ہم 'آتا ہے وہ' بھی کہہ سکتے ہیں۔''

لیکن سر میرا من کی باغ و بہار میں تو یہ ہے, ''آنا اس کا، جانا اس کا''۔ قیوم صاحب ایک فرسٹ ائر کے لڑکے سے یہ توقع نہیں کر رہے تھے کہ اس نے کچھ پڑھا لکھا ہو گا۔

''میں نے بتایا تھا کہ نظم میں قافیہ ردیف ہوتا ہے اور نثر میں نہیں۔''

''مگر سر آپ غالب کے خطوط پڑھ لیں اس میں مقفع عبارات بھی ہیں یعنی قافیہ ردیف موجود ہے۔ سر آپ مان لیں نظم اور نثر کا بنیادی فرق یہی ہے کہ نظم میں وزن ہوتا ہے اور نثر میں وزن نہیں ہوتا۔''

''کیا رول نمبر ہے؟'' قیوم صاحب نے بے بس ہو کر کہا: ''نکل جاؤ میری کلاس سے۔''

اب میری قیوم صاحب کی کلاس سے بھی چھٹی ہو گئی، اس دن کے بعد میں کسی اردو کی کلاس میں نہیں گیا۔ جب داخلے کا وقت آیا تو میرا داخلہ روک لیا گیا اس لئے کہ دو برس میں میرے صرف چودہ لیکچر تھے۔ میں بہت پریشان ہوا، ڈاکٹر صاحب کو پتہ چلا تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے پی اے کو بلا کر کہا، ''اوئے کوئی بے ایمانی کرو تے سرمد دا داخلہ بھجواؤ! اینوں اردو زبان پڑھن دی کی لوڑ اے'' (بھئی کوئی بے ایمانی کرو اور سرمد کا داخلہ بھجواؤ اسے اردو زبان پڑھنے کی کیا ضرورت ہے)۔ میرا داخلہ چلا گیا اور میں اردو میں فیل بھی نہیں ہوا بلکہ بہت اچھے نمبروں سے پاس بھی ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب اگر وہ ''بے ایمانی'' نہ کرتے تو میرے دو سال ضائع ہو جانے تھے۔ ہمارا ایک دوست کالج کی ایک ادبی تنظیم کا سیکرٹری تھا، وہ کوئی بل اپروو کروانے ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ اس نے

حساب کتاب میں گڑبڑ کی ہوئی تھی۔یعنی 'بے ایمانی' ڈاکٹر صاحب نے اس سے صرف اتنا کہا۔ ''بیٹا ربر تو کوئی اچھا سا استعمال کر لینا تھا۔ جاؤ اور بل ٹھیک بنوا کر لاؤ!''

ہم جب کینٹین میں ڈاکٹر صاحب سے گپ شپ لگاتے تو اس میں کبھی کبھار پروفیسر بھی شامل ہو جاتے۔ایک دن ایک پروفیسر نے جو باہر سے نیا نیا پڑھ کر آیا تھا ڈاکٹر صاحب کو مرعوب کرنے کے جتن میں انگریزی زبان میں بڑی بڑی جناتی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے مارکسزم پر لیکچر سا دینا شروع کر دیا۔ڈاکٹر صاحب خاموشی سے سنتے رہے اور جب اس نے اپنا لیکچر ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا تو انہوں نے کنٹین کے بیرے کو آواز دیتے ہوئے کہا: ''او یار ایہ دودھ تے ذرا گرم کر کے لیا'' (او یار ذرا یہ دودھ تو گرم کر کے لاؤ)۔ڈاکٹر صاحب نے ایک ہی فقرے میں اس پروفیسر کی ساری گفتگو کا جواب دے دیا تھا۔یعنی انگریزی کے مقابلے میں پنجابی، (ثقافتی مزاحمت / مداخلت / یاد دھانی) بیرے کو ''یار'' کہہ کر بلانا (انسانی برابری) اور دودھ گرم کرنے کی بات کرنا نمائشی اور کتابی علم کے تکبر کو عام زندگی کی حقیقت سے دوچار کرنا تھا۔

اس زمانے میں ٹی وی نیا نیا آیا تھا، لوگ نشریات سے پہلے ہی ٹی وی لگا کر بیٹھ جاتے تھے اور بلینک سکرین دیکھتے رہتے تھے۔کوئی ٹی وی پر آتا تو محلے والے کیا سارا شہر اس کو جان جاتا تھا، پان والا بھی کہتا ''سر رات کو میں نے آپ کو ٹی وی پر دیکھا تھا۔'' ہمارے ایک دوست جو اس زمانے میں ٹی وی کراچی سے ایک کوئز پروگرام کرتے تھے لاہور تشریف لائے، وہ بہت رکھ رکھاؤ اور نستعلیق قسم کے دانشور تھے جو اپنی شہرت کو بڑی سنجیدگی سے لیتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ انہیں سب لوگ جانتے ہیں اور ان کی دانشوری کی دھاک سب پر بیٹھ چکی ہے۔انہوں نے مجھ سے سے کہا: ''ہمیں یہاں کے دانشوروں سے ملوایئے گا۔'' میں انہیں ڈاکٹر صاحب کی طرف لے گیا۔ڈاکٹر صاحب اس زمانے میں ایک ادبی انسٹی ٹیوٹ کے ہیڈ تھے۔وہ اپنے آفس میں سٹول پر بیٹھتے تھے اور ان کی گھومنے والی افسرانہ کرسی ایک کونے میں پڑی رہتی تھی۔اس دفتر میں ایک سکرین بھی تھی جو کمرے میں پردے کا کام دیتی تھی۔جب ہم وہاں پہنچے تو میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا، میرے پیچھے اچکن میں جس کے بٹن گردن تک بند تھے وہ نستعلیق شخصیت اس امید کے ساتھ کھڑی تھی کہ ڈاکٹر صاحب ابھی اچھل کر اس کا استقبال کریں گے۔

''اوئے سرمد؟ آ جا آ جا، (ہمارے دانشور دوست کو دیکھتے ہوئے) اوئے کاکا توں وی لنگھ آ (بیٹا تو بھی آ جا)۔'' ڈاکٹر صاحب کے اس استقبال سے ہمارے شہرت زدہ دوست کو یک دم گمنامی کا ایسا دھچکا لگا کہ ایک لمحہ کے لئے ان کا اپنے ہونے پر سے بھی اعتبار اٹھ گیا۔

ڈاکٹر صاحب کو ظاہری شوشا، خوامخواہ کی نمائش اور خود پسندی بالکل نہیں بھاتی تھی۔وہ ایسے مردم شناس تھے کہ ایک نظر میں انسان کی شخصیت کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے لیکن اس کا اظہار بڑی خوبصورتی سے کرتے تھے۔ہمارے دوست جب ڈاکٹر صاحب کی ان کی شہرت سے بے خبری کی رمز کو نہ سمجھ سکے تو میں نے ذرا کھنکار کر کہا: ''ڈاکٹر صاحب یہ ٹی وی پر آتے ہیں۔''

''اوہو بھئی معاف کرنا میں تو ٹی وی نہیں دیکھتا۔او بھئی چائے لاؤ''۔انہوں نے اپنے چپراسی کو آواز دی۔

اب ٹی وی کے دانشور صاحب کا مسئلہ بن گیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو اپنی شہرت اور دانشوری کا کیسے یقین دلائیں۔ چنانچہ انہوں نے علی گڑھ کا ذکر چھیڑا اور لمبی چوڑی تمہیدیں باندھ کر یہ جتایا کہ وہ علی گڑھ کے کتنا قریب رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے میز کی دراز سے ایک کتاب نکالی جو کسی انگریز نے لکھی تھی، کہنے لگے: ''دیکھو یہ علی گڑھ یونیورسٹی پر تازہ کتاب آئی ہے۔'' کتاب کھولی تو پہلے صفحے پر کتاب کا انتساب تھا، ''ڈاکٹر نذیر کے نام جس کا مقام میرے لئے اپنے باپ جیسا ہے۔'' ٹی وی دانشور حیران ہوئے اور علی گڑھ کی نیمز ڈراپنگ یعنی تمہیدی جاہ و جلال اور سکہ بند ناموں کی منادی اختتام کو پہنچی۔ اب دانشور نے فیض صاحب سے اپنی دوستی کا ذکر چھیڑا، چنانچہ بولے: ''فیض آئے، کہا، جان من'' اور فیض کے چند شعر سنا دیے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے پھر دراز کھولی اور اس میں سے فیض صاحب کا ایک خط نکالا اور ہمارے سامنے رکھتے ہوئے کہا، ''بھئی فیض کی تازہ نظم دیکھو۔ یہ آج ہی ان کا خط آیا ہے''۔

دانشور نے پھٹی آنکھوں سے خط پڑھا۔ ''پیارے نذیر یہ میں نے ایک نظم لکھی ہے، تم اسے دیکھو اور بتاؤ کیسی ہے؟''

دانشور اپنا ''جان من'' بھول گئے اور فیض کی نیم ڈراپنگ بھی ختم ہو گئی۔ اب استاد دامن آ گئے، استاد کا جسہ یعنی ڈیل ڈول پہلوانوں جیسا تھا، وہ خود بتاتے تھے کہ جب وہ کسی مشاعرے میں بلائے گئے تو منتظمین نے کہا: "ہم نے تمہیں شاعر لانے کو کہا تھا، تم پہلوان لے آئے ہو۔''

''چل نذیر آٹھ تندوری پراٹھے کھائیے'' (چل نذیر اٹھ تندوری پراٹھے کھائیں) استاد نے کھڑے کھڑے کہا۔

''نہیں استاد کراچی توں مہمان آئے ہوئے نیں'' (نہیں استاد کراچی سے مہمان آئے ہوئے ہیں)۔ استاد نے مہمان دانشور کو ایک نظر دیکھا اور باہر نکل گئے۔

''یہ کون صاحب تھے؟'' دانشور نے مجھ سے سرگوشی کی۔

''استاد دامن ہیں, پنجابی کے بہت بڑے شاعر اور فیض صاحب کے قریبی دوست''، میں نے آہستہ سے کہا۔

اس سے پہلے کہ ہمارے دانشور دوست یہاں سے اجازت لے کر کسی پان والے کی دکان پر جاتے, دس بارہ ننگ منگے بچے شور مچانے بڑی بے تکلفی سے کمرے میں داخل ہوئے۔

''اوئے بھئی ذرا ٹھہر کے آنا، ایس ویلے مہمان آئے ہوئے نہیں'' (بھئی ذرا ٹھہر کے آنا اس وقت مہمان آئے ہوئے ہیں)۔ ڈاکٹر صاحب نے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بچوں نے ''مہمان'' کی طرف ذرا مایوسی سے دیکھا اور خاموشی سے واپس پلٹ گئے۔

''یہ بچے کیسے یہاں تشریف لائے؟'' حیرت زدہ دانشور نے پوچھا:

''کچھ نہیں یہ یہاں (گھومنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) جھونٹے (جھولے) لینے آتے ہیں۔ یہ پیچھے چنگڑ محلہ ہے, وہاں رہتے ہیں۔ میں ان کی کرکٹ ٹیم کا بھی مینجر ہوں''۔ڈاکٹر صاحب نے کہااور سکرین کے پیچھے گم ہو گئے جہاں انہوں نے اپنے نہانے کے لئے پانی کی بالٹی رکھی ہوئی تھی، نہانے کی آواز آئی تو ہکا بکا دانشور نے استفسار کیا۔

''سرمد صاحب یہ فرمایئے کہ انہوں نے ڈاکٹریٹ کس میں کی ہوئی ہے؟''ڈاکٹر صاحب نے چونکہ زوالوجی میں پی ایچ ڈی کی ہوئی تھی اس لئے میں نے اس کا سلیس ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔

''علم الحیوانات میں''۔

ڈاکٹر صاحب کے درویش صفت چال چلن سے کچھ پروفیسر نالاں بھی تھے۔ وہ کہتے کہ ڈاکٹر صاحب نے کالج کا ڈسپلن خراب کر دیا ہے۔ان کے ذہن میں ابھی تک گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کا امیج اسی کلونیل انگریز کا تھا۔ گورنمنٹ کالج اور دوسرے تعلیمی ادارے انگریز نے میکالے کی تعلیمی پالیسی پر بنائے تھے اور ان کا مقصد بابو پیدا کرنا تھا لیکن اسی کالج سے اقبال اور پھر راشد اور فیض بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اس کالج کی کلونیل وراثت کی مزاحمت کی، ڈاکٹر صاحب اسی روایت کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے ایک دن اس کا ذکر ڈاکٹر صاحب سے کیا تو انہوں نے کہا: ''بھئی ایک ڈسپلن ملٹری ڈسپلن ہوتا ہے جہاں ڈسپلن اوپر سے مسلط کیا جاتا ہے اور ایک ڈسپلن ایوالو evolve ہوتا ہے یعنی گراؤنڈ سے شروع ہوتا ہے۔ نوجوان طالب علم ایک پودے کی طرح ہے، ہمیں اس کی نشوونما کرنی چاہیے۔اسے پھلنے پھولنے دینا چاہیے۔''

ایم اے میں مجھے کالج کے رسالے ''راوی''کا ایڈیٹر بنایا گیا۔ راوی کے نگران قیوم نظر ہوا کرتے تھے، وہ تھے تو بڑے پیارے آدمی لیکن انہیں طالب علموں کو ذہنی اذیت دینے میں بہت مزہ آتا تھا۔ میری ان سے شروع سے ہی کچھ ان بن تھی, پہلے تو انہوں نے مجھے اردو کی کلاس سے نکالا تھا اور بعد میں جب میں نے فرسٹ ییئر میں ان کو ایک غزل ''راوی'' کے لئے دی تو انہوں نے سب کے سامنے میرا خوب مذاق اڑایا اور ایک سفاکانہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولے: ''دیکھو ذرا اس فرسٹ ائیر کے لڑکے کو، یہ اپنے آپ کو شاعر سمجھتا ہے۔ سوچو بھلا اس کو راوی کے لیے غزل دینے کی جرات کیسے ہوئی۔''اب چونکہ میں اسی ''راوی''کا ایڈیٹر تھا اور قیوم صاحب نگران تو ہمارا کوئی نہ کوئی تو جھگڑا ہونا ہونا تھا، چنانچہ ایک دن ایڈیٹوریل پر ان سے بدتمیزی کی حد تک جدل ہو گیا۔ قیوم صاحب کو میرا لکھا ہوا اداریہ سخت ناپسند تھا لہذا انہیں نے اسے چھاپنے سے انکار کر دیا اور مجھے ان کی مرضی کے مطابق اداریہ لکھنے کو کہا جس کے لیے میں ہرگز تیار نہیں تھا۔ چنانچہ قیوم صاحب نے انتقامی کارروائی کرتے ہوئے مجھے ''راوی'' کی ایڈیٹری سے نکال دیا۔ معاملہ پرنسپل تک پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بورڈ کی میٹنگ بلائی جس میں مجھے بھی بلایا۔

''قیوم صاحب آپ نے سرمد کو کیوں ''راوی'' سے نکال دیا؟''

''سر یہ بڑا بدتمیز ہے، گستاح اور ضدی ہے، آگے سے جواب دیتا ہے۔''

''قیوم صاحب اگر میں سرمد کو کہوں کہ تم راوی کے ایڈیٹر بن جاؤ اور یہ آگے سے نخرے کرے اور کہے مجھے ایڈیٹر نہیں بننا, تو میں کیا کروں گا؟ میں اس کے نخرے سہوں گا۔ اس کے ناز اٹھاؤں گا۔ آپ بھی اس کے ناز اٹھائیں''۔ قیوم صاحب اس بات پر بہت پریشان ہوئے۔ میٹنگ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر اجمل صاحب کو راوی کا نگران بنا دیا اور میرا ادار یہ جوں کا توں چھپ گیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ کچھ سالوں بعد قیوم صاحب ریٹائر ہو کر اورئنٹل کالج چلے گئے تو میری ان سے ایک نہایت خوبصورت دوستی شروع ہو گئی۔ اب وہ ہر ہفتے خاص طور پر مجھے ملنے آتے اور دیر تک مجھ سے باتیں کرتے۔ میں بھی ان کو اورئنٹل کالج ملنے جاتا۔ ہماری بحث بھی بہت چلتی اور وہ قہقہے لگا لگا کر میری باتوں سے خوش بھی ہوتے۔ ہمارے وہی قیوم صاحب جنہوں نے مجھے پہلے کلاس سے اور پھر ''راوی'' سے نکالا تھا مجھے ایم اے کے امتحان کے ایک پرچے کا ایکسٹرنل ایگزامینر بنا دیا۔ شاید یہ بھی ڈاکٹر صاحب کا کرشمہ تھا جنہوں نے کہا تھا: ''قیوم صاحب میری طرح آپ بھی سرمد کے ناز اٹھائیں۔''

30 نومبر 1964 میں گورنمنٹ کالج کی کانوکیشن پر فیلڈ مارشل صدر ایوب خان کو چیف گیسٹ کے طور پر بلایا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے پرنسپل ہوتے ہوئے ہم نے کبھی کالج کے اندر پولیس نہیں دیکھی تھی، اس لئے کہ پولیس کو اندر آنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ چنانچہ صرف ایوب خان کی گاڑی اندر آئی۔ ایوب کے ساتھ پنجاب کے گورنر نواب کالا باغ بھی تھے۔ تقریب شروع ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے ایوب خان کو مخاطب کرتے ہوئے تقریر کا آغاز ''یور ایکسلینسی مسٹر پریذڈنٹ'' سے کیا۔ اس پر سٹوڈنس میں ایک غصے کی لہر دوڑ گئی, ان کے خیال میں ان کے پرنسپل کو ایک ڈکٹیٹر کو ''یور ایکسلینسی'' نہیں کہنا چاہیے تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا پرنسپل کسی بھی سیاسی اقتدار رکھنے والے شخص سے زیادہ عظیم ہے۔ چنانچہ جب ایوب خان نواب کالا باغ کے ساتھ بخاری آڈیٹوریم کا افتتاح کر کے واپس جا رہا تھا تو کالج کے کونے کھدروں سے ان دونوں کے خلاف نعروں کی اونچی اونچی آوازیں سنائی دیں۔ ایوب اور گورنر دونوں جلدی سے گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔

اسی ہفتے ''راوی'' کا نیا شمارہ آیا جس کے انگریزی کے حصے کا اداریہ اسی تقریر کے حوالے سے لکھا گیا تھا۔ ایڈیٹر (غالباً مظفر عباس) نے ڈاکٹر صاحب پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ پرنسپل کو ''یور ایکسلنسی'' کی بجائے صرف ''مسٹر پریزیڈنٹ'' کہنا چاہیے تھا۔

اوپر سے حکم آیا کہ یہ شمارہ بین کر دیا جائے لیکن ڈاکٹر صاحب نے معزرت کر لی۔ کچھ دنوں بعد جب میں حسب معمول کنٹین میں بیٹھا چائے پی رہا تھا تو ڈاکٹر صاحب آئے, وہ بہت جلدی میں نظر آ رہے تھے۔

''اوے سرمد توں چرس پینی شروع کر دتی اے۔؟'' (اوئے سرمد تو نے چرس پینا شروع کر دی ہے؟) میں حیران کہ ڈاکٹر صاحب مجھے کیا کہہ رہے ہیں۔

''نہیں سر, میں نے تو آج تک چرس کی شکل تک نہیں دیکھی۔''

''اوئے نہیں توں اج چرس پیندا رہیا ایں'' (نہیں تم آج چرس پیتے رہے ہو)۔ وہ یہ کہتے ہوئے کنٹین سے باہر نکل گئے۔ مجھے ان کی اس بات سے کچھ شبہ ہوا، میں اٹھ کر کینٹین سے باہر نکلا تو دیکھا بہت سے لڑکے ایک بلیک بورڈ کے گرد جمع ہو رہے ہیں،

قریب آیا تو دیکھا اس پر ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ سے لکھا ہوا ایک پیغام تھا۔ انہیں گورنمنٹ کالج سے ٹرانسفر کر دیا گیا تھا اور وہ طالب علموں کو پر امن رہنے کا پیغام چھوڑ کر کالج سے باہر جا چکے تھے۔ یک دم مجھے ان کی چرس والی بات یاد آئی۔ ہم نے فوراً گلاسوں میں جا جا کر ڈاکٹر صاحب کی ٹرانسفر کی خبر پہنچانا شروع کر دی اور لڑکے لڑکیوں کو کلاسوں سے باہر آنے کو کہا۔ دیکھتے دیکھتے سارا کالج اوپن ایر میں اکٹھا ہو گیا۔ حکومت کے خلاف زور دار تقریریں ہوئیں اور سٹرائیک کا اعلان کیا گیا۔ ہر روز کالج کے سارے لڑکے لڑکیاں اکٹھے ہو کر احتجاج کرتے اور نعرہ لگاتے۔ ''ہمارا باپ ہمیں واپس کرو۔'' میں نے بھی ایک نعروں سے بھرپور نظم لکھی جو ہر روز اس جلسے میں پڑھی جاتی۔ اس کے دو شعر مجھے اب بھی یاد ہیں۔

کیوں علم کے رستے میں ہے دیوار ، حکومت؟
کیوں علم کی گردن پہ ہے تلوار ، حکومت؟
قاتل کا نہیں چور کا ڈاکو کا نہیں ہے
یہ ملک ہمارا ہے ہلاکو کا نہیں ہے

(یاد رہے اس وقت کے ڈی ایس پی کا نام ہلاکو تھا)

یہ گورنمنٹ کالج کی تاریخ کی سب سے بڑی سٹرائیک تھی جو چار روز تک جاری رہی اور آخر نواب کالا باغ کو گورنمنٹ کالج کے طالب علموں کو ان کا باپ واپس کرنا پڑا۔

بہت برس بعد میں جب گورنمنٹ کالج کی ایک کانووکیشن پر گیا تو اپنے سامنے ایک انتہائی بدشکل کالا آہنی گیٹ دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ ہمارے زمانے میں یہاں ایک خوبصورت سلور رنگ کا نازک سا گیٹ ہوتا تھا جو زیادہ تر کھلا رہتا تھا۔ اندر گیا تو سٹوڈنٹس سے زیادہ پولیس نظر آئی۔ پولیس؟ گورنمنٹ کالج میں؟ پرنسپل صاحب سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ''وزیر اعلی تشریف لا رہے ہیں"۔

''تو پھر کیا ہوا'' میں نے کہا۔ اس پر وہ تھوڑے کنفیوز ہوئے اور کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ چپ ہو گئے۔ اس پر میں نے انہیں ایوب خان اور ڈاکٹر نذیر صاحب کا واقعہ سنایا اور کہا: ''ہمارے زمانے میں کالج کے اندر پولیس نہیں آ سکتی تھی اور ہم یہ بھی نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ ہمارا پرنسپل کسی ڈیکٹیٹر کو ''یور ایکسلینسی'' کہے کیوں سر؟ اس لئے کہ ہمارے نزدیک کسی بھی اعلی تعلیمی ادارے کے پرنسپل کا مرتبہ حکمران وقت سے برتر ہوتا ہے۔ لیکن سر مشکل یہ ہے کہ اس کے لئے ڈاکٹر نذیر بننا پڑتا ہے۔''

میخانہ ہستی میں ہم سبو کی تلاش کا مرکز حلقہ ارباب ذوق

ڈاکٹر سعادت سعید

معزز سامعین!

میں حلقہ ارباب ذوق لاہور کے سیکرٹری میاں شہزاد کی گزشتہ سال کی اعلیٰ کارکردگی کو سراہتے ہوئے ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے آپ سے مخاطب ہونے کا موقع فراہم کیا۔اس کے ساتھ ہی حلقہ ارباب ذوق کے ارکان کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے ایک غیر جمہوری آپادھاپی کی فضا میں جمہوریت کے اصولوں کی پذیرائی کی ہے۔ محترم نواز کھرل کا انتخاب آپ کی آزاد رائے کی قبولیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

حلقہ ارباب ذوق گزشتہ پچاسی سالوں سے رائے کی آزادی کو دبانے والوں کے خلاف خموش جہاد کر رہا ہے۔ برطانوی سامراج کے دور میں بھی حلقے کے اراکین نے آزادی کے خیالات کو آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد کے مارشلائی اجبار کے دنوں میں بھی حلقے کے ارکان نے اپنی آزاد آرا کو کسی نہ کسی شکل میں طشت از بام رکھا۔ طاقت کے نشے یا گھمنڈ میں من مرضی کے فیصلے مسلط کرنے والے فسطائیوں اور آمروں کے خلاف حلقہ ارباب ذوق کے ارکان نے اپنے آزاد شعور کو مسلسل استعمال کیا۔ رائے کی آزادی کو دبانے والے نظاموں کو چیلنج کرنے ہی سے آزاد شعوری کے سرمایے کی حفاظت ممکن ہے۔

ادب کو تمام انسانی سماج پر محیط سمجھنا ایک بنیادی مغالطہ ہے اور اسی مغالطے کی بنیاد پر اس میں آفاقی اقدار کی تلاش کی آرزوئیں پیدا ہوئیں، ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ اگر اس بنیادی سوال کا جواب مل جائے کہ کوئی شاعر شعر کیوں کہتا ہے اور کوئی نثر نگار نثر کیوں لکھتا ہے؟ اور پھر اس خیال کی وضاحت کی بھی ضرورت ہے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے زیر اثر لکھے جانے والے ادب میں دوٹوک انداز سے اس امر کا اعادہ کیا جاتا رہا ہے کہ ادب لکھنے کا بنیادی مقصد غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کے لیے راہ ہموار کرنا ہے۔ ایسے معاشرے کو ہر نوع کی اجارہ داری سے پاک رکھنا ہوگا۔ وجودی ادیبوں اور شاعروں کے نزدیک ادبی آرزوئیں ادیب سے تقاضا کرتی ہیں کہ وہ اپنے وجود کے جوہر کا سراغ لگائے اور اپنی شناخت کے لیے اپنی فکری و جذباتی زندگی کی الجھی ہوئی راہوں اور سطحوں کا بنظر غائر جائزہ لے کر زندگی کے اصل مفہوم کو سمجھے اور اسے دوسروں کو سمجھائے۔ یہ بات بھی طے ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک ادیب اور شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے جب تک وہ فنی پختگی کے مطلوبہ تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہوتا۔ جدید ادیبوں اور شاعروں نے فنی حوالوں کو بنیاد بناتے ہوئے بھی زندگی کی تلخیوں سے گہرا تعلق قائم رکھا اور یوں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے عصری ویسٹ لینڈ کو اپنے اپنے انفرادی رنگ میں پیش کرنے کا جتن کیا۔ ادبی تخلیقی سرمائے پر طائرانہ نظر دوڑانے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس میں رکتی چلتی تصویر کشیوں، منظروں، کرداروں، مکالموں!، زمانی و مکانی سلسلوں، ڈرامائی کیفیتوں، الہامی و وجدانی خیالوں اور موضوعاتی رنگا رنگیوں کے صدہا جہان آباد ہیں۔ بلاشبہ اس میں موجود

نثری و شعری آہنگوں میں یکسانیت کے بجائے جدت و روایت کے امتزاج سے پیدا ہونے والی بو قلموں بیانی تاثریت کی یکجائی بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ادبی تخلیقات جہاں شاعروں اور ادیبوں کی پرچھائیوں کی امین ہوتی ہیں وہاں ان کی منجمد اور متحرک فضاؤں میں فکری وسعتیں،داخلی و خارجی سحر کاریاں اور آسیبی طلسم آرائیاں بھی دستیاب ہیں۔ادب میں موجود بنیادی خیالوں کا سلسلہ انسانی جبلتوں، سماجی تجربوں اور قلبی و فکری زاویوں تک پھیلا ہوا ہے۔اس ادبی منظر نامے میں مقامی اقدار کے عمل دخل کو بطریق احسن ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک آفاقی ادبی اقدار کا تعلق ہے تو وہ ادب میں اتنی ہی آپاتی ہیں کہ جتنی کسی سماج سے ماورا ہو کر لائی جا سکتی ہیں۔ پاکستان میں جب ہم پاکستانی ادب کی بات کرتے ہیں تو لامحالہ ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس ادب کی حدیں ہماری سرحدوں کے اندر ہیں۔ نیشن اسٹیٹس کے زمانے میں کسی قومی ادب میں اتنی ہی انسانی آفاقی قدریں بار پاسکتی ہیں کہ جن کی قومی ریاستی نظاموں میں گنجائش ہے۔علامہ اقبال نے جب فرنگیوں اور مسلمانوں کی قدروں کے مابین موجود تفاوت کا تذکرہ کیا تھا تو اس امر پر مہر تصدیق بھی ثبت کی تھی کہ آفاقی ادب یا تو مقامی ہندوستانی حب الوطنی کے دائرے میں منعکس ہو رہا ہے یا پھر ملی تشخص سے جڑا ہوا ہے۔بس انہی کے دائروں میں رہ کر آفاقیت کا علم بلند کیا جاسکتا ہے۔البتہ اس حوالے سے اتنی گنجائش بہر حال موجود رہتی ہے کہ جہاں کہیں یکساں سیاسی، معاشی اور عمرانی نظام ہو گا اس کے پیدا کردہ مسائل بھی موجود ہوں گے یوں پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کے ملکوں کے ادب میں اپنے اپنے دائروں کے اندر تین انواع کی آفاقی قدریں بھی نظر آرہی ہوتی ہیں۔امریکی، روسی اور ویتنامی ادب کو بنیاد بنا کر میری اس عرضداشت کو سمجھا جاسکتا ہے۔دنیا کی سیاسی تقسیموں سے ماورا ہو کر جب ادب کو مادی اور روحانی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جائے گی تو مولانا روم کی شاعری میں موجود آفاقی حقانیت کی امریکہ سمیت دنیا کے ہر ترقی یافتہ، ترقی پذیر یا پسماندہ ملک کو ضرورت پیش آئے گی۔ مولانا روم نے کہا تھا:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

(کل شیخ ہاتھ میں چراغ لئے شہر میں گشت کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا میں دیو و دد یعنی وحشیوں سے عاجز ہوں۔ مجھے انسان کی آرزو ہے۔ان سست عناصر ساتھیوں سے دل گرفتہ ہو چکا ہوں۔ مجھے خدا کے شیر اور دستاں کے رستم کی تمنا ہے۔ میں نے کہا کہ جو نہیں ملتا ہم نے اس کی جستجو کی ہے۔اس نے کہا کہ جو نہیں ملتا مجھے اس کی آرزو ہے۔)

اس لیے روحانیت اور مادیت کے مابین جنگ کے سیاق و سباق ہی میں ہم آفاقی قدروں کی نشاندہی سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ یوں خیر و شر کے مابین تمیز کی جاسکتی ہے۔ تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لینے والے، شکستوں سے چور انسانوں کا ملجا و ماوا وہ روحانی پیغام ہے کہ جس کے مطابق انسانی سماجوں میں زر، زمین اور زن کی بنیاد پر ہونے والے جھگڑوں کی گنجایش نہیں ہے۔ اس میں گھوڑا آگے بڑھانے یا پانی پینے پلانے کے معاملات پر کشت و خون نہیں ہو سکتا۔ عورتوں کو زندہ درگور نہیں کیا جاسکتا۔ کالے کو گورے پر، امیر کو غریب پر، آقا کو غلام پر فوقیت نہیں ہے۔ چوری، قتل، جوا، زنا، سود، لوٹ مار، دھوکا دہی اور جبر و اکراہ کی سختی سے ممانعت ہے۔ جو ادب ان برائیوں اور خرابیوں کی شناخت کے حوالے سے لکھا جاتا ہے اس میں آفاقی قدروں کی موجودگی لازمی ہے ۔ عہد نامہ عتیق میں موجود دس احکامات ہوں یا حجتہ الوداع کے خطبے میں موجود مطلق رہنما اصول ان کی بنیاد سے انحراف کرنے والے ادب میں آفاقی قدروں کا در آنا ناممکن ہے۔ عام طور پر اعلیٰ ادب کی پہچان کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ وہ ادب جس کے مضامین غیب سے آئیں یا اس میں مسائل تصوف کا بیان کیا جائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی فکری یا فلسفیانہ جہت انتہائی بلند ہو۔ اس میں وحدت فکر کی بات ہو، کسی جگہ ثنویت کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اعلیٰ ادب میں جواز یا تاویل سے کسی جھوٹ کو سچ نہ دکھایا جائے۔ وہ ایسا ادب ہوتا ہے جو انسان کو مقامی ضمیر سے بالاتر لے جاتا ہے۔ اس میں سرحدوں سے ورا آفاقی حقانیت کا درس ہوتا ہے ۔ اس ادب میں کسی ایک علاقے کی ثقافتی یلغار سے کسی دوسرے علاقے کو مغلوب کرنے کا امکان بھی نہیں ہوتا۔ ادب میں آفاقی قدروں کا ایک زیریں سطحی سلسلہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے مطابق خدا کے علاوہ اور کسی کی عبادت کی گنجایش نہیں ہے۔ انسان کی تمنا ہے کہ اس کی زندگی امن و سکون سے گزرے۔ وہ چونکہ مخلوق خدا ہے لہٰذا اسے عزت سے زندہ رہنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ہر حال میں اسے ملنی چاہئیں۔ ایسا تبھی ممکن ہو گا کہ خدا کی زمین کو غاصبوں اور لٹیروں سے پاک کیا جائے۔

اپنے مزید خیالات کے اظہار سے قبل میں ڈاکٹر یونس جاوید کو دل کی گہرائیوں سے ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے حلقۂ ارباب ذوق کے نام سے سن ۱۹۸۴ء میں ایک وقیع کتاب شائع کی۔ اس میں حلقہ ارباب ذوق کے اتار چڑھاؤ کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح کی ایک کتاب ڈاکٹر اشفاق بخاری نے حلقہ ارباب ذوق لائلپور کے عنوان سے چھاپی۔ ہنوز یہ باب تشنہ تکمیل ہے کہ میرا خیال ہے حلقۂ ارباب ذوق کے نام سے عالمی سطح پر موجود ادبی تنظیموں کی کارروائیوں کو جمع کر کے شائع کرنے کا کوئی بندوبست ہو سکے تو قارئین کو تخلیقی، علمی اور تنقیدی بصیرتوں پر مشتمل کئی قاموس میسر آجائیں گے۔

حلقہ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والے ارکان غور و فکر کے رسیا ہونے کے ناطے اپنی اپنی آرا رکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان کی بوقلموں سوچیں اور جذبے اس ادارے کی مجموعی فضا پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے ادبی اجلاس میں ایک دوسرے کے خیالات کا احترام کرنا اور اپنی اپنی تجزیاتی تحصیل و ترسیل کو ایک گونہ آزادی سے پیش کرنا عمومی وتیرہ رہا ہے۔ یوں مجھے اس خطبے کے آغاز ہی میں اعتراف کر لینا چاہیے کہ میں آزادی رائے کو انسان کا بنیادی حق تصور کرتا ہوں اور اس نسبت سے حلقے کے تمام ارکان کے افکار و تصورات کی بھی قدر کرتا ہوں۔ علاوہ ازیں ان کے مشربی عقائد پر محاکمے کرنا بھی میرا فرض نہیں

ہے۔تاہم اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ ہمیں مجموعی طور پر کم یاب ہوتی انسانیت کی بازیافت کا کام کرنا ہے۔اس بازیافت کے عمل میں ہمارا سابقہ رنگا رنگ خیالات سے پڑتا ہے۔اگر یہ خیالات انسانی زندگی کی درست جہت نمائی کرنے کے امکانات رکھتے ہیں تو ان سے اختلاف کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔حلقہ ارباب ذوق کے ارکان مختلف ادبی اصناف سے وابستہ ہیں۔وہ ان کے فروغ کے لیے اسلوبی، تکنیکی اور فنی زاویوں کا استعمال کرتے ہیں۔اسی سیاق و سباق میں ان کی فکری اپروچوں اور جذباتی کیفیتوں کو پذیرائی ملتی ہے۔یہ ہم سب جانتے ہیں کہ انفرادی انسانی شعور خام سے پختگی کی جانب سفر کرتا ہے۔اس سلسلے میں ہم سب ایک دوسرے کی معاونت بھی کرتے رہتے ہیں۔اس حلقے میں آج سے ستاون برس قبل میں نے جو تخلیقات و تنقیدات پیش کیں ان کی پذیرائی کے باوجود میں ان میں موجود خام طرز فکر و اظہار کو تسلیم کرنے سے گریزاں نہیں ہوں۔قیامت چال زمانے میں اگر ہم نظری اور احساساتی طور پر روایتی انجماد سے کنی کترا کر نہیں چلتے تو ہمیں قدامت پسند ہونے کا تمغہ وصول کرنے میں پس و پیش کا سامنا نہیں ہونا چاہیے۔یوں اپنے اپنے خاموں کو پختگی سے ہمکنار کرنے میں ہمیں کوئی عذر بھی نہیں ہونا چاہیے۔

اگر ہم اپنے ارکان سے بالمشافہ ہمکلام ہو کر یہ پوچھیں کہ آپ ادب کیوں تخلیق کرتے ہیں تو لامحالہ وہ کوئی آئیڈیل نقطہ نظر ہی پیش کریں گے۔اس نقطہ نظر کی رینج انفرادی اظہار سے اجتماعی افادیت کو محیط ہو گی۔کوئی ادیب یہ نہیں چاہتا کہ اس کا اور اس کے ارد گرد بسنے والے لوگوں کا استحصال کیا جائے۔وہ یہ بھی نہیں چاہے گا کہ اس کو غلامی کی فکری و عملی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔اسے اس کے انتخاب سے محروم رکھا جائے۔اسے اس کی وابستگی سے روکا جائے۔تاہم وسیع تر اپروچ کو سامنے لانے کے لیے بحث و مباحثہ کے عمل سے فرار بھی درست رویہ نہیں ہے۔حلقہ ارباب ذوق میں ہونے والے ادبی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی مکالموں کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس کے ارکان ہمنوائی کی تلاش میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔کبھی وہ ہمنوا ہو جاتے ہیں اور کبھی شدید اختلافات کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔یہ سب کچھ حلقہ ارباب ذوق کی مکالماتی و مباحثاتی ثقافت کا حصہ ہے۔یہ ثقافت حلقہ ارباب ذوق کی پہچان بن چکی ہے۔

نوجوان کسی قوم کا اثاثہ ہوتے ہیں۔وہ سماجی زندگی کے مختلف شعبوں میں تعمیر و ترقی کی دوڑ میں شریک ہو کر قوم کی خدمت کرتے ہیں۔معاشی، سائنسی، معاشرتی امور میں ترقی کی منزلیں طے کرنے والی قومیں دنیا میں ممیز مقام کی حامل ہو جاتی ہیں۔قوموں کی نشو و نما میں تہذیبی و تمدنی حوالوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی معیاری سرگرمیاں بھی دنیا میں قوموں کو ممتاز کرتی ہیں۔حلقۂ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں نے ۱۹۳۹ء کے بعد سے آج تک ہماری قومی زندگی کے ارتقا میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔اس حلقے نے اس زمانے میں اردو زبان کی حفاظت و ترقی کے لیے بھی اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں کہ جس زمانے میں ہندی اردو تنازعہ دو قومی نظریات کی بنیادوں کو مستحکم تر کر رہا تھا۔یہ اتفاق کی بات نہیں ہے کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد سے قبل لاہور میں ایک تنظیم نے اردو کو بنیادی ذریعۂ اظہار کے بطور بنیادی اہمیت دی۔یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک غیر سیاسی پلیٹ فارم سے پنجاب میں اردو کے نام پر قومی دھارے میں شامل ہونے کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔اردو کو قومی زبان کا درجہ تو

قیام پاکستان کے بعد ملا تاہم اس سے قبل بھی یہ نوشتۂ تاریخ تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو اتحاد کے لیے اردو زبان میسر آ سکے۔اس زبان کی دھوم ہندوستان یا بقول داغ سارے جہاں میں مچی ہوئی تھی۔ پنجاب اور کئی دیگر علاقوں کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں نے ۱۹۳۹ء میں زبان کو ذریعہ اظہار کے طور پر اپنا کر اہم قومی خدمت کی جانب پیش رفت کی۔ حلقۂ ارباب ذوق کی ادبی، فنی اور لسانی خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے۔اس فورم کے جھنڈے تلے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے اردو ادیب اور دانشور متحد و مجتمع رہے ہیں۔اس حوالے سے اس زبان کے سیکولر کردار کی جابجا تعریفیں دستیاب ہیں۔ ابتدائی دور میں حلقۂ ارباب ذوق کے ادبا اور شعرا اگرچہ اپنے غیر سیاسی کردار پر نازاں نظر آتے ہیں لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ انسان ایک سیاسی جانور ہے۔اس لیے میرا سوال یہ ہے کہ پنجاب میں رہتے ہوئے پنجاب کے ادیبوں نے اردو زبان کے نام پر ایک تنظیم کی بنیادیں کیوں استوار کیں۔ شاید اس لیے کہ سیاست انسان کی گھٹی میں ہے اور آپ جس سیاسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اس سے متعلقہ ہر حوالہ آپ کا بنیادی حوالہ بن جاتا ہے۔اردو زبان کے نام پر حلقے کا قیام قیام پاکستان سے آٹھ سال قبل لاہور میں ہوا۔اس کا یہ بنیادی تیور کم و بیش ۲۰۲۴ء میں بھی موجود ہے۔اردو کی بنیاد پر اس وقت دنیا بھر میں اس تنظیم کی آزاد یا اس سے منسلک بیسیوں شاخیں موجود ہیں۔اس حوالے سے اس کے قومی کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لکیر کے فقیر چند غیر محتاط دعووں کی بنیاد پر بھلے اس کی بنیاد کو لاکھ غیر سیاسی کے نام سے تعبیر کریں لیکن اسے دو قومی نظریئے سے کسی بھی صورت جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یوں اس کے غیر محسوس سیاسی کردار سے پہلو تہی ممکن نہیں ہے۔

یہاں ایک اور مغالطے کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے کہ جس کے نتیجے میں حلقے کے اراکین کو بدستور یہ باور کرنا پڑ رہا ہے کہ یہ حلقہ ترقی پسند تحریک کے رد عمل کے بطور وجود میں آیا۔ رد اعمال کے حوالے سے ہونے والی تمام کی تمام نظریہ سازی جزوی صداقتوں کو سامنے لاتی ہے۔اس نظریہ سازی کے نتیجے میں یہ ماننا لازمی ہو جاتا ہے کہ حلقہ ارباب ذوق کے نوجوان یا بزرگ ادبا و شعرا ادب کو زندگی کے لیے فائدہ بخش نہیں سمجھتے تھے۔ وہ آزادی اور ترقی کی نفی کرتے تھے۔ جبر و استحصال کا شعور نہیں رکھتے تھے۔انہیں ادب کے نئے امکانات سے سروکار نہیں تھا۔ان کا اسلوب، ہیئت اور موضوع جدید نہیں تھے۔ وہ اسے انسانیت کا ترجمان اور ہمدرد نہیں سمجھتے تھے۔ یا انہیں سچائی، حقیقت اور عقلی صداقتوں کے اظہار سے کوئی دشمنی تھی۔ رد اعمالی نظریہ بازی یا یہ یاوہ کی منطق کا شکار ہوتی ہے یعنی یہ مسجد ہے وہ بتخانہ چاہے یہ لے لو چاہے وہ لے لو۔ مسجد میں بتخانہ اور بتخانہ میں مسجد دیکھنے والے ہمارے کلاسیکی شعرا بھی یہ جانتے تھے کہ حقیقت جزوی نہیں کلی ہوتی ہے اسی لیے غالب یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے۔ میں یہاں حلقہ ارباب ذوق ۱۹۴۳ء کی بہترین نظمیں کے ص ۲۹ پر شائع ہونے والی تصدق حسین خالد کی ایک نظم کی جانب توجہ دلاؤں گا اس میں ترقی پسندی کے بنیادی حوالے موجود ہیں:

ایک کتبہ

شیر دل خان! میں نے دیکھے تیس سال

پے بہ پے فاقے مسلسل ذلتیں،
جنگ!
روٹی!!
سامراجی بیڑیوں کو وسعتیں دینے کا فرض
ایک لمبی جانکنی
سو رہا ہوں اس گڑھے کی گود میں
آفتاب مصر کے سائے تلے
میں کنوارہی رہا
کاش میرا باپ بھی۔۔۔
یوں کنوارا
کیا کہوں؟

اس نظم میں زندگی کے تحفظ کا شعور نظر آتا ہے۔ شاعر آزادی اور ترقی کی قوتوں کا معترف ہے جبر و استحصال کے خلاف ہے۔ کلاسیکی رویے کے مقابلے میں اس نظم میں نئے امکانات منعکس ہوئے ہیں۔ اس میں اسلوب، ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے جدت دستیاب ہے۔ یہ انسانیت کی ترجمان اور ہمدردی پر مشتمل نظم ہے۔ اس میں سچائی، حقیقت اور عقلی صداقتوں کی نفی نہیں ہے۔

سامعین محترم یہ نظم حلقہ ارباب ذوق کے ابتدائی دور کی نظم ہے۔ سو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حلقہ ارباب ذوق ترقی پسند تحریک کے رد عمل کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ انجم رومانی کہ جو حلقہ ارباب ذوق کے مزاج سے گہری نسبت رکھنے والے شاعر ہیں ان کی یہ نظم بہترین نظمیں ۱۹۴۳ء کے ص ۳۷ پر شائع ہوئی ہے:

زندگی
کاغذ کی کچھ کھر کھر کھر کھر، چاندی کی جھنکار
چند تقاضے بھوکے بھوکے، روپہلی گفتار
رات کا پراسرار اندھیرا
اس میں کہیں اک نور کا ڈیرا
منظر ستھرے، صاف سہانے
جیسے دھندلا مست سویرا

من پاگل کے الھڑ سپنے
پھسلیں، سنبھلیں، سنبھلیں، پھسلیں
ایک جماہی، ایک انگڑائی رات کو پھر لے آئے
ایک تمنا، ایک کشاکش پھر من پر چھا جائے؟
تسکین کے سائے لہرائیں سات سمندر پار
آئیں راہی، جائیں راہی
تڑپیں اور تڑپائیں راہی
ایک تمنا ایک کشاکش
ہر سو ہر جا حسرت حسرت
خواب بنے رہ جائیں راہی
خواب کی صورت آئیں راہی، خواب کی صورت جائیں
روندی ہوئی راہیں ویسے ہی پیہم روندی جائیں

حلقہ ارباب ذوق کی مرتب کردہ یہ تیسری کتاب تھی اس سے قبل دو اور انتخاب شائع ہو چکے تھے
۔اس انتخاب کے پیش لفظ میں شعر محمد اختر لکھتے ہیں:

''سال کی بہترین نظمیں کتابی صورت میں شائع کرنے کی یہ تیسری کڑی ہے۔ پہلی مرتبہ ہم نے مل جل کر مجموعہ خود ہی شائع کیا کیونکہ اس وقت حالات اتنے ساز گار نہ تھے کہ کوئی ناشر جدید نظموں کے اس قسم کے مجموعے کو چھاپنے کی جرأت کرتا۔(جدیدیت)

ان مجموعوں پر عمومی نوعیت کے ایسے اعتراض ہوئے کہ جن کا جواب دینا واجب نہیں تھا۔
اس میں غزل اور گیت شائع نہیں کیے گئے (آزاد، معریٰ اور پابند نظمیں طبع کی گئیں)۔
یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں زیادہ تر پنجاب کے شعرا کو چھاپا گیا ہے (صوبائی تعصب کا اعتراض وارد کیا گیا)۔
اس سلسلے میں شعر محمد اختر نے درست جواب دیا کہ

''ہمارا مقصد بہترین نظمیں پیش کرنا ہے اور بس۔ یہ الگ بات ہے کہ پنجاب کے نوجوان نظم لکھنے والے عموماً زیادہ غور و فکر سے کام لے کر ارد و نظم کو فروغ دے رہے ہیں جس کی بنا پر وہ ان مجموعوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔''

اس پیش لفظ کے آخر میں شیر محمد اختر، مرکز حلقہ ارباب ذوق، وائی ایم سی، لاہور، سکرٹری حلقہ ارباب ذوق مرقوم ہے۔

حلقہ ارباب ذوق کے فورم سے شائع ہونے والی نظم و نثر کی کتب (انتخاب، بہترین نظمیں، ان میں معروف ترقی پسند شعرا بھی چھاپے گئے اور جدید مغربی رجحانات کے حامل شعرا کو بھی شامل اشاعت رکھا گیا۔) کے مطالعوں سے اس امر کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ان میں جدید ادبی رجحانات کو بنیادی اہمیت دی گئی تھی۔ حلقہ ارباب ذوق کے زیر اہتمام نئی تحریریں کے نام سے شائع ہونے والی کتب میں رومانوی، سماجی اور جدید فکری زاویوں سے مزین تحریریں موجود ہیں۔ ان کتب میں پنجاب کے نوجوان دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو نمایاں جگہ دی گئی۔ اس سیاق وسباق میں یہ کہنا امر لازم ہے کہ حلقہ ارباب ذوق کے ارکان اور اس کی مجلسوں میں شامل ہونے والے پنجاب کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے ارد گرد کی زندگی پر گہری نظریں ڈال کر اپنے عہد کے قارئین کے لیے درست جہت نمائیوں کی داغ بیل ڈالی۔ ان کے مقاصد میں اردو کی ترویج واشاعت کے ساتھ ساتھ لکھاریوں کی تعلیم وادبی تربیت کا معاملہ شامل تھا۔ انہوں نے ابتدائی طور پر پنجاب میں اردو لکھنے والوں کے معاملات کی حفاظت کی۔ حلقہ ارباب ذوق کی تنقیدی محفلوں میں عقلی اور سائنسی شعور کے استعمال کی بدولت سنجیدہ فکری کی فضا نے جنم لیا۔ حلقے کے ارکان کا خیال تھا کہ مشترکہ ہندوستان میں اردو ادب اور صحافت کے لیے ماحول سازگار نہیں ہے۔ اس لیے انہیں ان میدانوں میں سخت محنت کا سامنا کرنا ہوگا۔

حلقہ ارباب ذوق کے موجودہ آئین کے مطابق یہ ایک ایسا ادارہ ہے کہ جس کا تعلق کسی مذہبی یا سیاسی جماعت سے نہیں ہے۔ اس کو آزاد جمہوری ادارہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد میں اولین مقصد اردو ادب کی ترویج واشاعت ہے۔ اس میں نئے لکھنے والوں کی تعلیم و تہذیب کا کام کیا جاتا ہے۔ اردو لکھنے والوں کو علاقائی زبانوں اور ثقافتوں کے قریب لانا اس کا ایک اور پہلو ہے۔ اس میں لکھنے والوں کے حقوق کا تحفظ کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ شعر و ادب کو اندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا بھی اس کے طے شدہ مقاصد میں سے ایک مقصد ہے۔ اس کو ایک مرکزی تنظیم کے بطور دیکھا گیا ہے۔ اس کے مرکز کو بوجوہ قائم نہیں رکھا جاسکا جس کے نتیجے میں اس کی ہر شاخ ایک آزاد اکائی کے بطور کام کر رہی ہے۔ یوں ہر شاخ بیک وقت شاخ بھی ہے اور مرکز بھی۔ شہزاد احمد اس کے آخری مرکزی سیکرٹری جنرل تھے جس کی مجلس عاملہ کے ارکان میں میں بھی شامل تھا۔ پھر اس کے بعد اس کی مرکزیت خود مرکزیت میں تبدیل ہوتی رہی۔ اس وقت اس کی تمام شاخیں اپنے اپنے طور پر خود مرکزیت کی مدعی ہیں۔ میرے خیال میں اس کی ہر شاخ حلقے کے اغراض و مقاصد کی پیروی کرتے ہوئے ترقی کے زینے طے کرتی چلی جا رہی ہے۔ اس عمل کو کسی بندھن میں باندھنے کا تجربہ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی لیے اس کے آئین نو کی بنیادیں استوار کرنا ایک نئے مشکل مرحلے کے بطور اس کے ارکان کی ذمہ داری ہے۔

بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے میڈیائی طائروں کے اس دور میں فکری ابہام بام عروج پر پہنچا ہوا ہے۔ ہم مقامی لوگ طوعاً و کرہاً عالمیائے گئے ہیں۔ ایسے میں فردی اور اجتماعی شعور کے خیالات کا تعین کار دشوار ہے۔ عالمی بازاریت کا ان چاہا تسلط ہمارے شعور کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتا جا رہا ہے۔ ابہام کی دبیز معنوی چادروں نے ہمیں خود سے تو دور کیا ہی تھا ہم ایک دوسرے

سے بھی دور کر دیئے گئے ہیں یا ہو گئے ہیں۔ ہمارے دماغ ہمہ وقت عالمی خوش روؤں یا بدروؤں میں بہنے کے لیے تیار ہیں۔ ایسے میں مقامیت اور مرکزیت کے معانی تبدیل کیے جا رہے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ تو ادب کو زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ تو کیا جا رہا ہے مگر ان تقاضوں میں صارفیتی بازار کی رنگیناں اپنے خم و چم سمیت ہمارے ظاہری و باطنی شعور کو ایسی وسعتوں کی جانب لیے جا رہی ہیں کہ جہاں مرکز کے معانی تبدیل ہو چکے ہیں۔ مرکز در مرکز شعور کے نئے مراکز ہمیں اپنی جانب بلا رہے ہیں۔ ایسے میں علاقائی زبانیں ہمیں متاثر نہیں کر پا رہیں۔ ہم عالمی السنہ سے فیض پانے والے ترجمے کے ایک نئے طاقتور دور سے گزر رہے ہیں۔ حسن عسکری سے لے کر راقم الحروف تک اور راقم الحروف سے لے کر مشینیائی تراجم کرنے والے دیگر مترجمین تک معنویت کے سمندر ہمیں بہائے لیے جا رہے ہیں۔ لینگ اور پیرول کے نئے غیر مختتم معاملے دھیرے دھیرے ہمیں اپنی اپنی متعینہ شناختوں سے ماورا کرتے جا رہے ہیں۔ ایسے میں ہمیں ہماری جانب بڑھنے والی شعور کی ہر رو مانوس لگنے لگی ہے۔ ایسی ہی مانوسیت آفریں کئی روؤں نے ہمیں گھیر رکھا ہے۔ اس لیے عامیانہ اطلاعاتی خبروں سے لے کر کائنات شناسی کی عمیق تحقیقوں تک اور سوچ کے عمومی وتیروں سے لے کر شعور کی بشریاتی، نفسیاتی اور فلسفیاتی تعبیروں تک سب کچھ ہمیں اپنا اپنا سا معلوم ہونے لگا ہے۔ اسی اپنائیت کے خرخانوں کا حاصل جمع صرف یہ ہے کہ نو طرزی غلامی اور ان چاہی اسیری نے ہمیں کسی مہاسد پایے کی طرح سے مکمل طور پر جکڑا ہوا ہے۔ ایسے میں آزاد جمہوری مقاصد تلپھٹ ہو کے رہ گئے۔ یوں جا بجا نئے عالمی ڈھول پیٹیئے سر عام ہمیں ناچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ یوں نہ روسی سوشلزم بچا ہے اور نہ ہی چینی کمیونزم سب کچھ سارفیت کے عظیم طوفان کی لہروں کے ساتھ بہ چکا ہے۔ تو ایسے میں حلقہ ارباب ذوق میں کس آزاد شعور کی آواز بلند کریں۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی لوٹ مار کے لیے راہیں ہموار کرنے والے غلام شعور کے ڈنکے جا بجا بج رہے ہیں۔ ایسے میں ہم اور کچھ کریں یا نہ کریں غالب کی طرح سے یہ دعوے تو کر ہی سکتے ہیں:

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

حلقہ ارباب ذوق لاہور کے قیام کے بعد سے آج تک مقامی اور عالمی سطح پر بیسیوں تنظیموں نے اس نام کے پرچم تلے اپنے ادبی اور لسانی کاموں کو سامعین اور قارئین کی نذر کیا۔ حلقہ ارباب ذوق اس کے ارکان کے لیے ایک ایسا ادارہ ہے کہ جس پر انہیں اپنا استحقاق جتانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ حلقے کا ہر رکن اسے ایک ایسے مرکز کے بطور استعمال کرنے پر نازاں و فرحاں رہتا ہے کہ جو اسے دوسرے ادیبوں اور شاعروں سے مسلسل جوڑے رکھنے میں مدد و معاون ہے۔ حلقہ ارباب ذوق سے اس کے ارکان کی فکری و جذباتی وابستگی نے اس تنظیم کے مسلسل ارتقا کے عمل کو قائم و دائم رکھا ہے۔ دنیا کے کسی بھی علاقے میں اس نوع کی تنظیم ڈھونڈے سے نہیں ملے گی۔ حلقہ کے ارکان نے صدق و خلوص سے اس کی حفاظت کی ہے۔ ان دنوں حلقہ ارباب ذوق کی متعدد آزاد شاخیں اپنے اپنے طور پر سرگرم عمل مقامی اور عالمی سطح پر بے لوث انداز میں اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف

ہیں۔اس کا ہر رکن اسے ایک ایسا ذاتی اثاثہ سمجھتا ہے کہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں اس نام کے تحت ادیبوں اور شاعروں کو جمع کر کے قارئین اور سامعین کی فیض یابی کا اہتمام کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔حلقہ ارباب ذوق ایک ایسی عجوبہ تنظیم کا نام ہے کہ جس کی روایت سازی میں اس کے ارکان مسلسل حصہ ڈالتے چلے آرہے ہیں۔حلقہ ارباب ذوق کا نام اتنا مسحور کن ہے کہ اس کے تحت ایک ہی شہر میں دو دو تین تین حلقے بھی کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔تاہم ایک شہر میں ایک سے زائد حلقوں کا قیام بھی اس کے ارکان کی استمداد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔حلقہ ارباب ذوق کے نام کی حامل مقامی اور عالمی سطح کی تنظیموں میں شعور کی آزادی کا وصف دیدنی ہے۔اس کی تنقیدی اور علمی نشستوں میں کھل کر اختلاف واعتراف کرنے کی روایت انتہائی مستحکم ہے۔

حلقہ ارباب ذوق برصغیر ہندو پاک کی ایک رجحان ساز ادبی تنظیم ہے۔اس کے فکری مزاج کی بدولت اس کی مقبولیت کا گراف بلند سے بلند تر ہوتا چلا جارہا ہے۔حلقہ ارباب ذوق نے اپنی پچاسی سالہ تاریخ میں اتار چڑھاؤ کے کئی سلاسل کا سامنا کیا۔اس کے ارکان کے لیے یہ حقیقت مسرت افزا ہے کہ اس کے جلسے آج بھی باقاعدگی سے جاری ہیں۔اس میں اپنی تخلیقات پیش کرنے کی تمنا ہر رکن یا غیر رکن ادیب اور شاعر کے دل میں جاگزیں رہتی ہے۔اسے ایک انار سو بیمار والی کیفیت بھی لاحق رہتی ہے۔اس کے نتیجے میں بیک وقت دو دو تین تین حلقے بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔لیکن ان حلقوں کو چلانے والے افراد کسی نہ کسی شکل میں بنیادی حلقے کے رکن ہی ہوتے ہیں۔لاہور شہر کے پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے دل میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ اس کے مختلف زونز میں کم از کم ایک حلقہ تو ضرور ہونا چاہیے۔تاکہ زیادہ سے زیادہ ادیب اور شاعر ان میں اپنی تخلیقات پیش کر سکیں۔ایک زمانے میں حلقہ ارباب ذوق وائی ایم سی اے، حلقہ ارباب ذوق ٹی ہاؤس، حلقہ ارباب ذوق لوہاری، حلقہ ارباب ذوق پنجاب یونیورسٹی اولڈ بلاک کیفے، حلقہ ارباب ذوق چینیز لنچ ہوم، حلقہ ارباب ذوق مغلپورہ اور حلقہ ارباب ذوق ماڈل ٹاؤن بھی شعر وادب اور اردو زبان کی ترویج واشاعت میں اپنے اپنے مثبت کردار ادا کر چکے ہیں۔آج بھی ایک ہی مقام پر دو مختلف دنوں میں دو حلقے سرگرم عمل ہیں۔یوں لاہور کی ادبی رونقیں قائم ودائم ہیں۔

اگر زمین پر انسانی زندگی کے اعمال کو پرکھا جائے تو یہ کہنا بہت مشکل نہیں ہوگا کہ انسان نے اپنے ساتھی انسان پر جبر روا رکھنے کا کوئی سلسلہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔اس نے غلام ساز منصوبوں کے وسیلے سے دوسرے انسانوں کو حیلوں بہانوں اور جور جبروں کے وسیلے سے اپنا مطیع رکھنے کے مجرمانہ کام کیے۔وہ گنجفہ باز خیال بن کر محفلیں برہم نہیں کرتا تھا۔جنگوں، بگٹٹ یلغاروں سے علاقے فتح کرتا تھا اور وہاں کے وسنیکوں کو مہر غلامی سے داغتا تھا۔انسان نے پرامن انسانوں کی محفلیں برہم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔آپ مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے بت خانے کی ورق گردانی نے یہ ضرور سجھایا ہوگا کہ انسان نے اپنے ہی بنائے ہوئے بتوں کی بالارادہ اسیری قبول کی۔اس اسیری کا فائدہ پروہتوں اور حاکموں نے اٹھایا۔دنیا کے بت خانے کی کتاب کی نیرنگیوں کی ورق گردانیاں ہمیں روسو کے اس فقرے کی یاد دلاتی ہیں کہ ہم آزاد پیدا ہوئے تھے لیکن دنیا میں ہمیں زمجیروں سے جکڑ دیا گیا ہے۔دانشور اسیری میں بھی آتش زیر پا رکھتے ہیں تاکہ ان کی زنجیروں کا ہر حلقہ موئے آتش دیدہ کی

شکل اختیار کر جائے۔ ہم کسی غلام کو یہ بنانے والے کون ہیں کہ وہ غلام ہے۔ غلامی اس کا تجربہ ہے ہم اسے کیسے بتائیں کی نظم غلامی کا مطالعہ کیسے کیا جائے۔ حلقہ ارباب ذوق کے دانشوروں نے اپنے اپنے طور پر اپنی اپنی غلامیوں کی شناخت کی۔ حلقہ ارباب ذوق کا قیام اس دور میں عمل میں آیا کہ جب برطانوی شہنشاہیت نے دنیا کے اتنے علاقے گھیر رکھے تھے کہ ان کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں ہندوستان کے غلام دانشوروں اور ادیبوں پر یہ الزام لگانا کسی صورت بھی درست نہیں ہے کہ وہ ادب برائے ادب کے قائل تھے۔ انہیں ہر قدم پر اپنی غلامی کا احساس ہوتا تھا۔ اس امر کے سب گواہ ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کے ہندوستان پر غاصبانہ قبضے کے بعد ہر دانش ور نے کسی نہ کسی سطح پر بلائے غلامی کے خلاف اپنے تاثرات رقم کیے تھے۔ ایسے میں نو آبادیاتی ہندوستان میں (اگر مجھے اس اصطلاح کے قبضہ گروپ اسے استعمال کرنے کی اجازت دیں) حلقہ ارباب ذوق کا قیام اس ادب کے فروغ کے لیے عمل میں آیا کہ جو ہمارے دانشوروں کو لسانی، سماجی، تاریخی، ثقافتی طور پر ان کی آزاد شناخت کا احساس دلا سکے۔ انہوں نے اردو زبان کو اس لیے اہمیت دی کہ اس میں شعور آزادی کے حوالے سے دفتر کے دفتر رقم ہو چکے تھے۔ دور کیوں جائیں حلقے کے ادیبوں اور دانشوروں کے منظور نظر شاعر اور دانشور کہ جو اس ادارے کے قیام سے ایک سال قبل دنیا سے رخصت ہوئے تھے ان کی کتب میں نظریاتی طور پر سامراجی آقاؤں کا کچا چٹھا کھولا گیا تھا۔ حلقہ ارباب ذوق کے ابتدائی مسلم ارکان اقبال دوست تھے اور ان کے تصور آزادی کو پورے طور پر سمجھتے تھے۔ ۱۹۴۰ء کی قرارداد میں بنگالیوں اور دوسرے مسلم لیگی زعمانے اردو کو قومی شناخت کی علامت قرار دے دیا یوں حلقہ ارباب ذوق کی اردو نوازی کی بنیادوں کو مستحکم سہارا مل گیا۔ بزم داستان گویاں یا حلقہ ارباب ذوق کے ابتدائی ادیب اور شاعر مثلاً شیر محمد اختر، نصیر احمد جامعی، نسیم حجازی، قیوم نظر، امجد حسین، تابش صدیقی، اقبال احمد، محمد فاضل، حفیظ ہوشیار پوری، محمد سعید، عبدالغنی، مختار صدیقی، یوسف ظفر، انجم رومانی، وغیرہ سبھی اقبال دوستی کا دم بھرتے تھے اور اردو فروغی کے ارادے رکھتے تھے۔ ابتدائی محفلوں میں شریک ہونے والوں میں ڈاکٹر محمد باقر، اختر شیرانی، صفدر میر،، الطاف گوہر، حمید احمد خان، عابد علی عابد سب کے سب قومی شناخت کے معاملے میں بڑے حساس تھے۔ حلقے میں اردو لکھنے والے چند غیر مسلم بھی شریک ہوتے تھے۔ ان میں کرشن چندر اور پنڈت ہری چند اختر راجندر سنگھ بیدی، بھی شامل تھے۔

حلقہ ارباب ذوق کے دانشوروں نے کئی سطحوں پر علامتی، حکمتی، وضاحتی، جائزاتی اور تجزیاتی حوالوں سے انسانی سینوں میں دایم الحبس تمناؤں کو قدرے آزادی کا احساس دلانے کا کام خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ انہوں نے افسانہ کیسے پڑھا جائے؟، ناول کیسے جانچا جائے؟ نظم کا مطالعہ کن رخوں سے کیا جائے؟ تنقید کے گوناگوں پہلوؤں کا کیسے احاطہ کیا جائے؟ غرض یہ کہ تمام ادبی اصناف کے جائزوں کے عملی تفسیریئے مہیا کیے۔ ان تفسیریوں کے معیار بند سلسلے اس کے ادبی جلسوں میں آج بھی اپنی جھلکیاں دکھا رہے ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق کا ہر رکن اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ وہ ایک کڑے معیار سے گزر کر سامنے آتا ہے۔ جہاں تک شعر و ادب کی تخلیق کا تعلق ہے میرے لیے حلقہ ارباب ذوق کا ہر رکن ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ

کاروباریت اور صارفیت کے استبدادی پنجوں سے بچ کر وہ اپنے لیے تخلیق و تعلیم ادب کے لیے قیمتی لمحات بچالیتا ہے۔ وہ اپنی عمر کے کچھ حصے کو اپنے لیے بھی استعمال کرتا ہے۔ سو بلا تفرق میں حلقے کے ہر رکن کی ادب دوستی اور ثقافت نوازی کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ تاہم نظری مباحث میں اختلافات کو ذاتیات پر حملہ تصور کرنے والے رویے کی شدید مذمت کرنا ہمارا فرض اولین ہے۔

حلقہ ارباب ذوق ادبی معیار بندی کا وہ ادارہ ہے کہ جو کئی علمی و ادبی اداروں اور تنظیموں میں نقد و نظر کی صائب مشعلیں روشن کر چکا ہے۔ یہ عملی تنقید کے سہارے نظری تنقید کے کئی دفتر وجود میں لا چکا ہے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ حلقہ ارباب ذوق میں شامل ہونے والے متعدد دانشوروں اور تخلیق کاروں نے اپنی اپنی کتب کے وسیلے سے دنیا بھر میں دانش فروغی کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کا سنہری دور ساٹھ اور ستر کی دہائیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس دور میں عزیز الحق، افتخار جالب، انور سجاد، انیس ناگی، عارف امان، صفدر میر، عابد حسن منٹو، فہیم جوزی، خالد محبوب لڈو، زبیر رانا، آزاد کوثری، اور کسی حد تک راقم الحروف نے بھی اس کے نیم خالی تالاب کو دانش کے دودھ سے بھرنے کی کوشش کی۔ اس سے قبل اور اس کے مابعد کے ادوار میں حلقے کی تنقیدی نشستوں کا رنگ خاصا مختلف نظر آئے گا۔

حلقہ ارباب ذوق کے آغاز ہی سے نقادوں اور تخلیق کاروں نے ادب کے نظری مباحث سے بنیادی سروکار رکھا۔ ان مباحث سے ان کے معاصر لکھاریوں اور دانشوروں کو بھرپور استفادے کے مواقع ملے۔ تاہم اس کے ادبی اور نیم سماجی مزاج میں تبدیلی عزیز الحق، افتخار جالب، عزیز الدین احمد کے محاکماتی مقالوں کی بدولت رونما ہوئی۔ عزیز الحق نے معاصر مغربی تھیوریز کو اپنے انتقادی فکر کی بدولت نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ انہوں نے اپنے ماقبل کے حلقہ جاتی جلسوں میں نظریہ برائے تعارف نظریہ کے مقاصد سے پیش کیے جانے والے مضمونوں اور مقالوں کی ساختیاتی شکلوں کو مکمل طور پر بدل کے رکھ دیا۔ ان دنوں بھی بعض دانشور اس پرانی روش کو بحال کر رہے ہیں کہ جس کا مطمح نظر تھیوریز کے تعارفیوں کی ترسیل تھی۔ مثلاً یہ کہ فلاں فلاں مغربی نظریہ سازوں کے ادبی، فکری اور نفسیاتی رجحانات کیا ہیں۔ وہ برصغیر ہندو پاک کے سماج میں ان رجحانات کی عصری معنویت سے لا تعلق و منفک رہتے تھے۔ نظریات کی تفصیل مہیا کرنا ایک سطح پر فائدہ مند بھی تھا کہ وہ لوگ جو انگریزی سے ناواقف تھے انہیں مغربی نظریات کی لم میسر آجاتی تھی۔ عزیز الحق نے مغربی تھیوریز پر محاکماتی نظر ڈالی۔ حلقہ ارباب ذوق میں ان کے مقالوں اور فکری بحثوں نے دھوم مچا رکھی تھی۔ ان کے خیالات سے مستفید ہونے اور ان کی باتیں سننے کے لیے لاہور شہر کے کونے کونے سے لوگ آیا کرتے تھے۔ انہی لوگوں کو متحد کر کے انہوں نے افراد کے فکری شعور کو بالیدہ کرنے کے لیے ینگ پیپلز فرنٹ کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم کی۔ عزیز الحق فرد کو اس کے کل کے تناظر میں پرکھنے کے قائل تھے یوں ان کے مقالوں اور مضمونوں کی بین العلومی ساختیت کا جا بجا چرچا ہوا۔ انہوں نے لسانی تھیوریز، تجرباتی فکر، وجودی مظہریات، اسطوری معنویت، قاری اساس اپروچ، یونگیں مابعد الطبیعات، فرائڈین بدنی رقص، زبانیاتی دوائر کی جبریت، تانیثیت، آزادی کی ضرورت، غلامی کی نفسیات جیسے موضوعات پر محاکمے کیے۔ وہ تھیوری کے نام پر سامنے آنے والی ثنویاتی تنقید کے حامی نہیں تھے۔ اشیا، انسان اور کائنات کے باہمی

رابطوں کو ایک کل میں دیکھنا ان کا وتیرہ تھا۔ان کے مضامین میں بشریات، فکریات، معاشیات، ثقافتیات، نفسیات، لسانیات، سیاسیات، مذہبیات کے حوالے غیر محسوس طور پر در آتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ صارفیت کے اس دور میں انسان کو شے میں تبدیل کر کے بیچا جا رہا ہے۔اس سلسلے میں مردہ معاشرے کی زندگی کے نام سے ان کے مضامین کو پذیرائی ملی۔یہ مضمون آج کے معاشرے کی مردہ زندگی اور بے حسی کے خاتمے کے لیے نظری جہت نمائی کرنے کے امکانات رکھتے ہیں۔حلقہ ارباب ذوق کی تاریخ میں عزیز الحق سے بڑا دانشور کمیاب ہے۔موجودہ دور میں ممیز ہونے کے لیے مغربی تھیوریز کے نام پر بین الاقوامی شہرت رکھنے والے علمی تعارف باز یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان کے مرقومہ نظریاتی مباحث پر ان سے قبل کسی اور نے ہاتھ نہیں ڈالا۔امتزاجی تنقید کے مہا بیانگیے علمی طور پر اس لیے سطحی ہیں کہ انہوں نے نظریات کے تعارفیے پیش کر کے ایلیٹ طبقوں اور بورژوائی ادبی میلوں میں ناموری کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ جزو میں کل کو دیکھنا اور کل میں جزو کو دیکھنے والی وجودی محاکماتی دانش انہیں چھو کر بھی نہیں گزری۔اپنی بیکار علمی ٹپوسیوں کے لیے کبھی وہ افسانے کی دلدل میں اترتے ہیں اور کبھی اپنی رعونتی تنقید کے کیچڑ میں جا پھنستے ہیں۔عزیز الحق نے نقاد، شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس، تمثیل نگار کے لیے کبھی ہدایت نامے جاری نہیں کیے تھے۔شاید اس لیے کہ وہ ادبی سوداگر فروش نہیں تھے۔حلقہ ارباب ذوق کے تنقیدی مزاج میں جس تبدیلی کا سنگ بنیاد عزیز الحق نے رکھا تھا وہ آج نہ صرف اس میں بلکہ کئی معاصر ادبی تنظیموں اور مجلسوں کی تنقید کا رنگ خاص بنا ہوا ہے۔اس مزاج کو بنانے میں عزیز الحق کی وجودی مارکسی تنقید کا بڑا ہاتھ ہے۔مضامین عزیز الحق کی فہرست ہی موجودہ تھیوری بازوں کی ملمع کاریوں کو طشت از بام کر سکتی ہے۔اس فہرست کے چند ادبی و فکری عنوانات پر ایک نظر ڈالیے:

وجودیت اور آزادی، منطق اور اثباتیت، آزاد خیالی، خواب اور شاعری، یونگ اور پاکستانی ادب، غزل کعبہ اور کلیسا کے مابین، شعر شاعر و سامع، شخصیت ذات اور ادب، مقصدی ادب، اسلام یا کچھ اور، اقبال اور ٹیڈی ازم، قول و قرار، محمد علی مردہ باد، معیار زندگی اور آزادی، مردہ معاشرے کی زندگی، مردانگی کی نفسیات اور انقلابی عمل، اقبال اور مسلم لیگ کی سیاست، اقبال و اقبال۔ایشا و ایشیا، نیا سال مبارک

سامراجیو غضب ہو تم پر عوام کا، کشمیر جاگ اٹھا، معاہدہ تاشقند مردہ باد، نیا تاشقند، پاکستان کے بنیادی تضادات، پاک بھارت تعلقات، قومیتوں کا مسئلہ، موجودہ صورتحال اور ادیب، موجودہ صورتحال اور ادب، یوم مئی کا پیغام۔

اسی دور میں حلقہ ارباب ذوق میں صفدر میر، افتخار جالب، جیلانی کامران، یوسف کامران، عزیز الدین احمد، ظہیر کاشمیری، انور سجاد، انیس ناگی، سجاد باقر رضوی، شہزاد احمد، سعادت سعید، فہیم جوزی، آزاد کوثری، زبیر رانا، سہیل احمد خان نے اپنے مضامین میں عصری مغربی و مشرقی نظریات پر کھل کر اظہار خیال کیا۔ان کے مضامین کی بدولت حلقہ ارباب ذوق کا وہ مزاج نمودار ہوا جو آج بھی حلقہ ارباب ذوق سے متعلقہ ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں میں جا بجا جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔اس دور میں مارکس، اینگلز، لینن، ماؤ، ہوچی منہ، سیکو طورے، گرامچی، فرائڈ، یونگ، ایڈلر، آئی اے رچرڈز، ڈیوڈ ڈیشیز، برٹرینڈ رسل، کے او گڈن،

سارتر، سیمون ڈی بوائر، فرانز فینن، وٹگنسٹاین، ژاک ڈریڈا، لیوی سٹراس، ہربرٹ مارکیوز، ایرک فرام اور بے شمار دیگر تھیریٹیشنز کے زاویہ ہائے نظر کی روشنی میں لسانیات، بشریات، جنسیات، تانیثیت، مارکسیت، وجودیت، تعبیریت، نو تعبیریت، ساختیات، مابعد ساختیات، جدیدیت، مابعد جدیدیت، آبادیات، نو آبادیات اور اسی نوع کے وہ سب نظریات کہ جن کی بعض معاصر نقالوں کے مضامین میں چیدہ چیدہ جھلکیاں نظر آتی ہیں حلقہ ارباب ذوق کے ارکان کے شعور میں جاگزین تھے۔ افتخار جالب کی تحریروں میں نئے عہد کے نظریاتی شعور کی جھلکیاں وافر مقدار میں دستیاب ہیں۔ انہوں نے اپنی آنکھ کے فرق کو ظاہر کرتے ہوئے جدیدیت کے علمبردار ن۔ م راشد کے حوالے سے یہ لکھ کر کہ اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے جیسی طفلانہ خواہشیں مرے زمانے کا ساتھ چھوڑ چکی ہیں مابعد جدیدیت کے دوائر میں سفر شروع کیا۔ یہ سفر ان کے مضمون استعاراتی و لسانی روابط کی صورت معکوس (۱۹۶۳ء) سے آغاز پا کر ان کے مضمون لاشعر تک جاری رہا۔ افتخار جالب کا مضمون لسانی تشکیلات ان کے جدید ترین نظریات سے مملو تھا۔ انہوں نے جدیدیت اور کلاسیکیت کے ربطی حوالوں میں بے ربطی کی تلاش کی۔ یہ بے ربطی نئے روابط کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ انہوں نے ناولوں، افسانوں اور معاصر شعری مجموعوں پر اپنے مضامین میں نئے لسانی اسالیب کی نشاندہی کی۔ اسی زمانے میں ساختیاتی شعری انتشار کے ظاہری عناصر پر ان کا نقطہ نظر سامنے آیا۔ ان کے اعلیٰ سطحی مضامین میں ''نئی شاعری اور ثنویت زدہ تنقید، فی بطن شاعر، نئی شاعری سامراج کی سازش ہے؟، بورژوافی بورژوازی، جدید علامت نگاری، غالب۔ ہیئت شناس و ہیئت ساز، شعر گوئی ارتکاب قتلے، استعاراتی فلک الافلاک (دیباچہ استعارے)، مافوق الانسانی کلچر شامل ہیں۔

علاوہ ازیں انہوں نے شام کی دہلیز (سلیم الرحمن)، زبان کا نیا تخلیقی شعری باطن (دن چڑھے دریا چڑھے، عباس اطہر)، اسلوب کا نیا معجزہ، گلا آفتاب (ظفر اقبال)، خواہش، خواب، اندیشے و خوف سال اشاعت (ریت آئینہ ہے) کے پیش لفظ لکھ کر اپنے لسانی، فکری اور نظریاتی حوالوں کو قارئین کی نذر کیا۔ افتخار جالب نے تاریخ ادب اردو کو اپنے زاویے سے دیکھا۔ انہیں بنجر شعری ویرانے میں نئی ہریاول کی نمو ظفر اقبال کے شعری مجموعے آب رواں میں نظر آئی۔ افتخار جالب کو شعر و ادب کے ساتھ ساتھ مصوری اور موسیقی سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اس حوالے سے وہ صادقین اور امانت علی خان پر اکثر گفتگو کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں راقم الحروف کے دس سے زیادہ مضامین میں مابعد جدیدیت اور پس ساختیات، نو آبادیات، مارکسیت، وجودیت کی نسبتیں روشن ہوئیں۔ ان میں مغائرت، کمٹمنٹ، انتخاب، آزادی، کایا کلپ کے مغربی اور مشرقی حوالے موجود ہیں۔ چند عناوین ملاحظہ ہوں: ''نظریہ عمل اور بورژوا ادیب''، شعر و ادب میں انفرادی اور تخصیصی کردار، نئی شاعری اقلیم امکان اور تصور آزادی (چار حصے)، ابلاغ، عدم ابلاغ اور معاشرتی قدریں، اقبال اور ایشیا، خود دریافتی، متوسط طبقے کا دانشور اور تاریخی عمل، نئی صورت حال اور موقع پرست دانشور، مسئلے کا مسئلہ وغیرہ۔ آج حلقہ ارباب ذوق کا مزاج من حیث المجموع وجودی مارکسی ہے۔ اس کی یہ مزاج سازی حلقہ ارباب ذوق کے ان ارکان کی بدولت ممکن ہوئی جنہوں نے اپنے مضمونوں، افسانوں، ناولوں، ڈراموں اور شعری اصناف میں اپنے ارد گرد موجود ماحول کے کڑے جائزے لیے اور اس راہ پر استقلال سے چلتے ہوئے حقیقی انسانی آزادی کی معیار بندی کی۔

حلقہ ارباب ذوق کے ارکان نے ابتدا سے قیام پاکستان تک اپنے عہد کے گلوبل تخلیقی و فکری تناظر سے اپنی جڑت قائم رکھی۔انہوں جہاں کلاسیکی اور معاصر اردو ادب پر اظہار خیال کی روایت قائم کی وہاں انگریزی اور کئی دیگر زبانوں کے علم وادب کے دھاروں سے بھی استفادے کا سلسلہ جاری کیا۔ تحلیل نفسی، شعور، لا شعور، اجتماعی لاشعور، عالمی اساطیر کے جائزے بھی لیے گئے۔ صرف و نحو کی سماجی بنیادوں جیسے لسانی فکریاتی معاملات پر بھی توجہ دی گئی۔ یوں اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جانا چاہیے کہ مغربی تھیوریز کے فروغ کے معاصر مدعیان اس سلسلے میں مقلدین ہی ٹھہرتے ہیں۔اس حوالے سے ان کی سہرا بندیاں تحقیقی بد دیانتی کا شاخسانہ رہیں گی۔اس دور میں حلقہ ارباب ذوق کے ارکان کی کبھی ٹی ایس ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ کے خیالات سے تربیت ہوئی، کبھی یونگ اور فرائڈ کے نظریات سے ذہن سازی ہوئی، کبھی انہیں مارکس اور اینگلز کے تصورات نے آلیا، بعد ازاں کبھی سارتر اور فرانز فینن نے ان کے دماغ روشن کیے۔ کبھی اے جے ائر اور اوگڈن نے ان کے لسانی زاویے درست کرنے کی کوشش کی۔ کبھی ہوچی منہ اور ماؤزے تنگ کے فکری حاصلے کام آئے۔اس تفصیل کا اجمال یہ بھی ہے کہ انگریزوں کے مقبوضہ ہندوستان میں کئی ادبی اطوار کے حوالے سے مزاحمتی سلسلوں کی گونج سنائی دیتی رہی ہے۔اس لیے مابعد نوآبادیات کے تصورات کو زبردستی پاکٹ کرنے والے دانشور نہ صرف حلقہ ارباب ذوق کے آزادی پسند دانشوروں کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں بلکہ اس حوالے سے سرسید اور ان کے رفقا کی علمی و فکری مزاحمتوں اور بعد ازاں اقبال تک ان کے مقلدین کے سامراج مخالفت بیانیوں کو بھی زور از وری پاکٹ کرنے کا غیر منصفانہ کام بھی کر رہے ہیں۔ فاعتبر یا اولا بصار۔

حلقہ ارباب ذوق کے پڑھے لکھے شاعروں نے عظیم بیانیوں کی تخلیق کے لیے اپنے ما قبل کے فارسی اور اردو شاعروں کے بالاستیعاب مطالعے کیے ،ان کے سامنے عبد القادر بیدل، مرزا اسداللہ خان غالب اور علامہ محمد اقبال کے عظمتوں کو محیط اسالیب رہے۔ن۔م۔راشد اور ن کے ساتھی ہوں یا فیض احمد فیض اور ان کے مقلدین، افتخار جالب ہوں یا ان کے اسلوبی شکوہ کے گرویدہ شاعر سب کے سب صریر خامہ کو نوائے سروش سمجھنے والے زندگی دوست شاعر اور ان کے معنوی استاد بیدل کے اسالیبی و معنوی کرشموں کے عشاق تھے۔افسوس کہ بد قسمت نصابی نقادوں تک ان کی شعری لمیات کی رسائی نہ ہو سکی۔یوں وہ اور ان کی تنقید و تحقیق شاعرانہ طوطی کے بالمقابل شش جہتی آئینہ جھانکی سے محفوظ و مامون رہے۔افتخار جالب نے علامہ اقبال کی عظیم نظم مسجد قرطبہ کے اسلوب کو بیدل کی میٹا لینگوئج کے تسلسل کے بطور دیکھا ہے۔یہ میٹا لینگوئج کے استعمال کا یہ انداز انہیں ایذرا پاؤنڈ کے کینٹوز میں بھی منعکس دکھائی دیا۔

حلقہ ارباب ذوق کی ادبی اور تنقیدی محافل کا عظیم دور ساٹھ کی دہائی سے شروع ہو کر ستر کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں اپنے عروج کو پہنچا۔اس دور کا بنیادی نقطہ نظر یہ تھا کہ زندگی اور صورت حال پر دانشوروں کی تعبیروں سے تو قاموسی صفحات بھرے ہوئے ہیں اصل معاملہ تو ان کو تبدیل کرنے کا ہے۔ظالموں کے مسلط کردہ نظاموں کو تبدیل کیے بغیر حقیقی انفرادی اور اجتماعی آزادی میسر نہیں آسکتی۔یہ زمانہ دانشوروں کے لیے اجتماعیت میں گھل مل جانے کا تھا۔ مگر پھر سرمایہ داری کی چور چترائیوں

نے فرد کو اجتماع سے منفک کر دیا۔ اجتماعیت کے خواب دیکھنے والے صارفیتی انفرادیت کے چیمپیئن بنتے چلے گئے۔ سرمایہ داروں کی ماکرانہ چالوں کے نتیجے میں محنت کش انسان غربت کی نچلی لائنوں سے بھی نیچے پہنچا دیئے گئے۔ اسے آپ سرمایہ دارانہ گلوبلائزیشن کا جراحتی تحفہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ انصاف اور عدل کے خواہاں انسانوں کے دماغوں کی جراحت کر کے ان میں فارن ایسچینج کے خواب سی دیئے گئے۔ یوں دنیا کو یک طاقتی نظام میں ڈھالنے کا کام پایہ تکمیل کو پہنچایا گیا۔ آزادی پسند دانشور آج بھی اس یک طاقتی نظام کے خلاف رد عمل کا اظہار کر رہے ہیں مگر ان کی آواز نقار خانے میں توتی کی آواز کی مثل ہے۔ دنیا کو عوام کی سطح پر یک طاقتی نظام کی ضرورت ہے۔ یک طاقتی، دو طاقتی اور سہ طاقتی نظاموں کے تضادوں کے نتیجے میں دنیا دو عظیم جنگوں کی تباہی کے بعد تیسری جنگ کے دہانے پر کھڑی ہے۔ ایسے میں دنیا بھر کی عوامی طاقتوں پر مشتمل یک طاقتی نظام کا خواب دیکھنا آزادی پسند شعور کی ناگزیریت ہے۔ بقول افتخار جالب: ''نہ امریکی اکانومی رسیشن سے بچ سکتی ہے، نہ دنیا زیادہ دیر تک یونی پولر رہ سکتی ہے۔ یہ دنیا بائی پولر یا ٹرائی پولر ہوا ہی چاہتی ہے۔ پھر ہم نیشنل اسٹیٹ سطح پر اپنے فائدے کا یونائیٹڈ فرنٹ بنائیں گے۔ اگر نیشنل اسٹیٹ کا انسٹیٹیوشن دریا برد ہو گیا تو کون سی ایسی تاریکی ہے جس میں سارترین انڈویجنل کی روشنی نہ دمک سکے۔ پھر ہمارے نئے اجتماعی ادارے مثلاً ڈبلیو ٹی او کے خلاف مزاحمتی گروپ، ڈاکٹرز ود آؤٹ فرنٹئیرز، آئی ایل او وجود میں آچکے ہیں، سبحان اللہ! گلوبل کیپٹل ازم اور ایتھینسٹی کی ایسی کی تیسی! ایتھنیسٹی اور گلوبلائزیشن زندہ/مردہ باد!''

اس نوع کی گفتگو عارف امان، عزیز الدین احمد، افتخار جالب، عابد حسن منٹو، احمد بشیر، صفدر میر، ظہیر کاشمیری، افتخار جالب، انیس ناگی، سعادت سعید، خالد محبوب لڈو، آزاد کوثری، سعید چودہری، فہیم جوزی اور کئی دوسرے دانشوروں کی حلقہ جاتی گفتگو کا معمول تھی۔ حلقے میں انقلابی مضامین پڑھے جاتے۔ کچھ تو کہیے کے نام سے معاصر پاکستان اور گلوبل دنیا کے مسائل پر بحث مباحثے ہوتے۔ ویت نام، کشمیر، فلسطین، الجزائر، محکوم افریقی ممالک، مظلوم لاطینی امریکہ کے معاملات پر گرما گرم مذاکرے ہوتے۔ ماؤزے تنگ، ہوچی منہ، کم ال سنگ، سیکو طورے، نکرومہ، یاسر عرفات وغیرہ

اس دور میں عوامی آزادی کی بابت بڑے بڑے دعوے کیے جاتے۔ محکوم کی تعریف ہوتی حاکم کے ظلم کے قصے بیان کیے جاتے۔ مزدور، کسان، نوکر، قیدی، عورت کی مظلومیت کو بنیاد بنا کر ظالمانہ افعال و اعمال پر شدید تنقید کی جاتی۔ تاہم یہ تنقید حلقے میں پیش کیے جانے والے ادبی مقالوں، افسانوں، ناولٹوں، غزلوں اور نظموں کی روشنی میں سامنے آتی تھی۔ متن اور اس کے سیاق و سباق اور اس کے مستور معنی کے حوالوں سے کھل کر اظہار خیال ہوتا۔ یہ سب کچھ حلقہ ارباب ذوق کی نئی پرانی روائتوں کے نتیجے میں سامنے آیا تھا۔

حلقہ ارباب ذوق نے ہر دور میں دور کے تقاضوں کے مطابق خاموش اظہار اور ہنگامہ پیدائی کی راہیں اختیار کیں۔ اس کے ارکان اس کے عشاق ہیں۔ اس شمع ارد و پر قربان ہونے والے سینکڑوں پروانے ہیں۔ ان میں سے کچھ ارکان شخصی آمریتوں کے زمانے میں دبے دبے بھی رہے اور ہمت مردانہ کے مظہر بھی بنے۔ البتہ انہوں فکری پگڈنڈیوں اور شاہراہوں پر صداقت کی جستجو

کے رویے کو ترک نہیں کیا۔ علامہ اقبال، ن۔م۔ راشد اور کئی دوسرے ترقی پسند شعرا نے ان زنداں خانوں کا بار بار احساس دلایا ہے کہ جن میں لاکھوں تمنائیں دائم الحبس رہتی ہیں۔ یعنی وہ ''سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ'' سمجھنے کا کام کرتے رہے ہیں۔

حلقہ ارباب ذوق کی مزاج سازی کا پہلا دور مقبوضہ ہندوستان کا تھا جس میں اہل وطن کی بے بسی کا انتقام لینے کے لیے قسم قسم کے رستے تلاش کیے جاتے تھے۔ اپنی حوصلہ مندی کے لیے بال زدہ شیشے کو خط پیمانہ سمجھنے کا کام بھی ہوتا رہا ہے۔ یعنی تجھ میں ہمت ہے تو دنیا کو بہا کر لے جانے کے برعکس وہ چائے کی پیالیوں میں طوفان اٹھانے پر قانع رہے۔ تاہم ایسا بھی ہوا کہ ن۔م راشد جیسے شاعر انگریزوں سے وطن کو آزاد کروانے کے لیے خاکسار تحریک میں بھی شامل ہوئے۔ بعد ازاں جنگ عظیم دوم کے زمانے میں برطانوی مفادات کی جزوی تکمیل کے لیے ان کی عسکری آغوش کا حصہ بھی بنے۔ اپنے فیض احمد فیض اور کئی دوسرے ادیب شاعر بھی جرمن جاپانی اتحاد کے خلاف تاج برطانیہ کی بقا کے لیے محنتیں کرتے رہے۔ حلقہ ارباب ذوق کے دانشوروں کے سامنے دوسرا سنگین دور آزادی وطن کے حصول کے درمیان مقامی لوگوں میں فسادت کے پھوٹنے اور وسیع پیمانے پر انسانی قتل عام کی صورت ابھرا۔ اس دور میں فسادات پر انسان دوستی کے حوالے سے کثرت سے ادب تخلیق ہوا۔ تیسرا دور ایوبی آمریت کا دور تھا کہ جس کے خلاف اور حق میں کئی آوازیں اٹھائی گئیں۔ یہ آوازیں حلقہ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والے کئی ادیبوں کے متون کا حصہ ہیں۔ چوتھا دور سقوط مشرقی پاکستان کا دور تھا۔ اولاً اس میں بنگال کے عوام کے حقوق کو دبانے کے لیے کئی ادیب اور دانشور پیش پیش رہے اور بعد میں پاکستان کی شام الم پر آنسو بہانے کا کام بھی کرتے رہے۔ اس دور میں عزیز الحق اور ان کے ساتھیوں نے واضح طور پر مظلوم بنگالی پاکستانی عوام کے حق میں کھل کر لکھا۔ اس دور کے بعد کا دور آج تک کا دور ہے۔ اس میں حلقے کے بیشتر ارکان نے جمہوریت کے موٹو کو سامنے رکھا تاہم ان میں جنرل ضیاء الحق اور جنرل مشرف کا ساتھ دینے والے بھی تھے۔ اس دور میں پاکستان کو بری طرح سے صارفیت کے شکنجوں میں جکڑ دیا گیا۔ ان پر ایک نئی طرز کی غلامی مسلط کر دی گئی۔ اس غلامی کے خلاف اور حق میں لکھنے والے حلقے کے ارکان آج باہمی آویزش اور محاربے کی صورت حال کے روبرو ہیں۔ غلام ساز ادراک کو فروغ دینے والے دانشور اور ادیب مغربی تھیوریز میں موجود جبریت کے بھاری پتھروں سے آزادی طلب شعور کو کچلنے کا کام کر رہے ہیں۔ تاہم اکثر ادیب اس صورت حال میں غیر جانبدار رہ کر اپنی زندگیوں کو یہ کہہ کر محفوظ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو۔ اگر ہم حلقے کے دانشوروں کی تحریروں کا بنظر غائر جائزہ لیں تو ہمیں یہ تینوں رویے ان میں مل جاتے ہیں۔ پہلا رویہ آزادی طلبی کا رویہ ہے۔ دوسرا رویہ غلام سازی کا رویہ ہے۔ تیسرا رویہ درمیان میں رہنے والا رویہ ہے یعنی وہ اپنی نبیڑنے کے درپے ہیں۔ یعنی وہ کبھی موئے شیشہ کو خط پیمانہ سمجھتے ہیں اور کبھی شیشے میں بال آنا۔ وہ پنجہ خورشید کو دست شانہ سمجھ رہے ہیں۔ وہ از خود رفتگی اپنے اپنے خیال کے گلزاروں میں خواب سبزہ بیگانہ کی تعبیر ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانے، ان کی غزلیں، ان کے ڈرامے ان کے ناول ان کی تنقید ان کے غیر وابستہ خیالوں کا شاخسانہ بنی ہوئی ہے۔ اس صورت حال کی عکاسی غالب کے ان دو اشعار میں یوں ہوئی ہے:

کشتی عالم بہ طوفان تغافل دے کہ ہیں
عالم آب گداز جوہر افسانہ ہم
وحشت بے ربطی پیچ و خم ہستی نہ پوچھ
ننگ بالیدن ہیں جوں موئے سر دیوانہ ہم

میں اپنے خطبے کو اپنے ایک دیرینہ تجزیئے پر ختم کرتا ہوں کہ حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ ارکان اور سامعین و قارئین کو سمجھ لینا چاہیے کہ پرانی صورت حال میں قتل، خودکشی اور موت پوسٹ کولونیل اجڑ کا مقدر تھے۔ نئی صورت حال میں قتل، خودکشی اور موت پوسٹ کولونیل اجڑ کا مقدر ہیں۔ اور اگر یہ صورت حال برقرار رہی تو قتل ہوتے رہیں گے، خودکشیوں سے سابقہ پڑتا رہے گا۔ وہ موت کے پیہم عذابوں میں گرفتار رہیں گے۔ نئی اور پرانی صورت حال کے مابین قتل، خودکشی اور موت کے طریق کار کا اختلاف ہے۔ وجود بدلا ہے جوہر برقرار رہا ہے۔ جوہر کی تبدیلی قتل، خودکشی اور موت سے نجات کا وسیلہ ہے۔ بزبان استعارہ وہ اک دوسرے کے جسم کے ٹکڑے کھا کر جوان ہوئے ہیں۔ اک دوسرے کا لہو پی کر ان کے چہرے سرخ ہوئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے جسموں کے ٹکڑے کھاتے رہیں گے۔ وہ ایک دوسرے کا ایک دوسرے کا لہو پیتے رہیں گے۔

یہ غیر انسانی صورت حال ہے ہر غیر انسانی صورت حال کو تبدیل ہونا چاہیے۔ بھیڑیوں اور چیتوں کے نرغے میں گرفتار انسان چیختا ہے۔ خود حفاظتی کے انتظامات کرتا ہے۔ انہی انتظامات کے دوران کبھی بھیڑیے اور چیتے وقتی دباؤ کے تحت چھپنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن پھر اپنی حفاظت گہوں سے نکل کر انسانوں پر جھپٹتے ہیں۔ بھیڑیوں اور چیتوں کا مکمل طور پر خاتمہ بہت ضروری ہے۔ ان کی پناہ گاہوں کو تباہ و برباد کرنا انسانی حقیقت کو نشو و نما دینا ہے۔

ویسے بھی ہندوستان کی تاریخ نسل کشیوں اور خون ریزیوں سے بھری پڑی ہے۔ مہابھارت کی جنگوں سے لے کر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک انسانوں کو اپنے اپنے مقدس نشانوں اور علامتوں کی حفاظت نے ایک دوسرے سے بھڑائے رکھنے کے کام کو فوقیت دی ہے۔ ان قوموں اور انسانوں کو پھولوں میں سانس لینے کے مواقع کم کم ہی ملے ہیں وہ برستی گولیوں کے ماحولوں میں جیتے رہے ہیں۔ پھر لہو میں نہانے والوں کی مقدس یادیں مزید نفرتوں کے آتش فشانوں کو جنم دیتی ہیں۔ حق پر ہونے والے یا ناحق پر ہونے والے اپنے اپنے قربان ہوتے یا کیے گئے لوگوں کو شہیدوں کے زمروں میں رکھتے ہیں۔

قومی نغمے اور ترانے قومی نشانوں کی عظمتوں کے گن گواتے ہیں اور ان کے اندر دشمنوں سے لڑنے کے حوصلوں پیدا کرتے ہیں۔ اپنے انسانوں کی موتوں اور اکھڑے دموں کی یادیں تکلیف دہ تو ہوتی ہی ہیں تاہم وہ انہیں فتح کی فجریں طلوع ہونے کے مژدے بھی سناتی ہیں۔ ان کے سبزہ زار بارود سے اٹ جاتے ہیں۔ مگر وہ اپنے اپنے نشانوں اور علامتوں کی حفاظت کے لیے آبناؤں، ساحلوں، جنگلوں اور دمدموں میں جیتے جاگنے کا عزم رکھتے ہیں۔ وہ شاعر جو پاؤں تلے آتی چیونٹی کے غم میں بے چین پھرتے اور رات رات بھر جاگتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے عوام کو آمادہ کرتے ہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کا خون بہائیں۔ ان کے ذہن میں آزادی

کے خیال نمودار ہوتے ہیں اور وہ کسی دوسرے کی غلامی میں جانے کی بجائے آزاد ہم صفیروں کے زمزموں کو اپنا آئیڈیل بناتے ہیں۔اور اپنے اپنے مورچوں میں بندوقیں تانیں دشمنوں کے منتظر رہتے ہیں۔اور پوربوں اور پچھموں میں آگ بن کر دشمنوں پر چھانا چاہتے ہیں۔

دشمن کو دشمن کے اسم، نشان یا علامت کے بطور دیکھنے کا فائدہ یہ ہے کہ ہم اس احساس جرم سے بچ جاتے ہیں کہ ہم کروڑوں انسانوں کے مد مقابل ہیں۔ان کے خون کے پیاسے ہیں۔انہیں مارنا چاہتے ہیں۔اس لیے ہم یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ تخیل کے پرندے مقتول ہیں۔ہماریِ تخییل کا میدان وُسعت طلب ہے۔جادوئی حقیقت نگاری یا ساحری عف عفی آوازوں سے معمور ہے۔شاید اس لیے کہ غارت گری کا باؤلا سگ تواتر سے ہمیں کاٹ رہا ہے۔اس کے حلق کی آگ سے آوازوں کی ابلتی جھاگ بہہ رہی ہے۔یہ سانسوں کی چراگاہوں میں بھوکی خَلق پَر پِل پڑا ہے۔ان کی آبرو مند آنکھوں کی پُتلیاں گھاس پر گری پڑی ہیں۔انسانوں کے لہو کے زَخم خوردہ پرندے یاسیت کا شکار ہیں۔ان کے دل ان کے سینوں سے باہر پتھروں اور کنکریوں میں دھڑک رہے ہیں۔

ناخَلف
زَاغنہ
آرزوئیں اُڑانوں سے عاری
سرِ آفتِ گل پڑا
پَر کٹے
غول باندھے گئے اور
ٹیلوں کے قدموں تلے
طائرانِ تخیل پسے!

فغاں آشنا
میرِ طرف وکَنَف۔۔۔
بَخت مثلِ خَرَف
نَادَری تھی دَفادَف
ڈَفالی بجاتے رہے
وَحشیانہ دھنیں

بَر بَری بَر بَریت
اُڑاتی رہی
خونِ ناحق سے بھرتے
سمندر کا کَف
بچھ گئی
ماتمی آبروؤں کی صف
اِس زَنازَن ہلاکت کے
شاہد بہت
اِحتجاجِ سخن سَر سَری
سَر سَری!
سَر سَری!!!

شہر خالی کرو، کوچے خالی کرو تاکہ آپ کو وہ انسان نظر نہ آسکیں کہ جو جنگی جنوں میں مبتلا قوموں کے بارودی اور کیمیاوی کووڈ سے صدہا سالوں سے موت کے شمشان گھاٹوں میں ارتھیوں کی مانند جلائے جارہے ہیں۔ یہ آئندہ بھی جلائے جاتے رہیں گے۔ ایسے میں شہر خالی کوچہ خالی کی صدائیں لگتی رہیں گی۔ تاکہ ہمیں موت کے منہ میں دھکیلے جانے والے انسان نظر نہ آ سکیں۔ اس عمل کو نظروں سے اوجھل کرنے کے لیے ناولوں، افسانوں اور شعروں میں بدکاریوں کے قصے رقم کیے جائیں یا پھر کسی دوشیزہ کے خوابوں میں گم کن پڑوانے یا جوگ لینے کے لیے ٹلہ جوگیاں کا رخ کیا جائے۔ پرانے زمانے کے خیالی پرندوں کی صدائیں سنائی جائیں اور نئے زمانے کے حقیقی پرندوں کی زفیلوں کو اپنی تخلیقات کے آشیانوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب کر دیا جائے۔

بلے بلے اور اوئے اوئے کی ورچول جدلیات اور حلقہ ارباب ذوق

مرزا اطہر بیگ

صدارتی خطبہ کیسے لکھا جاتا ہے اس بارے میں جب گوگل نے بھی کوئی رہنمائی نہ کی تو لکھنے والے کی حالت غیر ہونا شروع ہو گئی۔ ٹھہر جاؤ اس صورت حال کے بیان کی اگر آگے چل کر کوئی گنجائش نکلی تو کہہ دینا ابھی کچھ سنجیدگی سے شروع کرو۔

معزز خواتین و حضرات! لکھنے لکھانے کے حوالے سے یہ ایک عام اور سادہ کی حقیقت ہے کہ لکھت خواہ ادبی ہو یا غیر ادبی، تاثراتی ہو یا تجزیاتی، افسانوی ہو یا تنقیدی لکھنے والے کی کچھ مخصوص لسانی، ساختیاتی یا اظہاراتی ترجیحات لازماً ایک گہرے محرک کے طور پر متن کے عقب میں اور بعض اوقات تو کھلم کھلا کارفرما نظر آتی ہیں۔ لکھنے والا چاہے بھی تو اُن سے نجات حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ نجات حاصل کرنا کوئی ضروری بھی نہیں ہوتا۔ لکھاری جو ہے سو ہے اور اُس کو کسی معذرت کے بغیر ویسا ہی رہنا چاہیے۔ راقم الحروف کو بھی بطور راقم عمل تحریر کی اس اٹل نفسیات سے کوئی مفر نہیں۔ لیکن اس کے باوجود جب اُسے یہ تحریر یعنی صدارتی خطبہ سالانہ اجلاس حلقہ ارباب ذوق 2025 لکھنے کا حکم دیا گیا اور بار بار دیا گیا تو خیال آیا کہ کم از کم اس بار سنجیدگی سے کام لینا ہو گا اس بار وہ تحریری بے راہ روٹیاں نہیں چل پائیں گی جو زندگی بھر کی فکشن بازی میں شامل حال رہی ہیں۔ یہ ایک انتہائی سنجیدہ اور ذمہ داری کا کام ہے اس لیے اسے لکھتے وقت اپنے باطنی محرر کو قابو میں رکھنا ہو گا۔ یوں بھی اگر انگریزی کا Address لکھنا یا دینا ہوتا Presidential ہی سہی، تو ذہنی اور جذباتی فضا کچھ اور طرح کی ہوتی۔ لیکن اپنی زبانوں کا یہ لفظ "خطبہ" اگرچہ ترجمہ بالکل درست ہے، کم از کم اس گناہگار کے لیے ایک خوفزدہ کرنے والا امکان ہے۔ چنانچہ بہت احتیاط برتنی ہو گی اور افسانہ سازی کے میدان میں ہونے والی اٹھ کیلیوں کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔ ویسے بھی اُدھر فکشن میں تو چونکہ اس قسم کی حرکتیں اور بھی بہت لوگوں نے کی ہیں اس لیے حقیقت نگاری کی نااہلیت پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک بارعب سی ٹرم بھی موجود ہے۔۔ میری مراد Meta fiction سے ہے۔ جس کا لیبل میری تحریروں پر بہر حال بلاوجہ نہیں ہے۔ یعنی فکشن بناؤ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتے، دکھاتے جاؤ کہ کیسے بن رہی ہے۔ تو بھائی تحریر اور تحریر پر رننگ کومینٹری کا شعبدہ فکشن میں تو چل سکتا ہے لیکن خطبہ لکھنے یا دینے میں اس طرح کی حرکت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے بھی کہ کچھ علم ہی نہیں کہ یہ ہے کیا؟ تحریر ہے یا تقریر ہے؟ زندگی میں شاید چند خطبے سُنے ضرور ہونگے لیکن یہ کہ ایک دن خود لکھنا پڑھنا پڑے گا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

سوچا نہیں تھا تو اب سوچو، اب سر پر آن ہی پڑی ہے تو۔ تو جناب کافی سوچا۔ بلکہ سوچنے سے پہلے گوگل کیا۔ افسوس عہد حاضر کے اُس عالم مطلق، مشکل کشا سے بھی کچھ خیرات نہ ملی۔ تو دھڑا دھڑ سوچنا شروع کیا، کہ وقت نکلا جاتا ہے۔ معاشرے میں ادیب کے کردار کے انتہائی سنجیدہ موضوع کے بارے میں سوچا، ادیب معاشرے کے رستے ہوئے ناسور کو نشتر کیسے لگاتا ہے۔ ادب اور عمل جراحی کے تعلق کے بارے میں سوچا، یہ خطبے کے لیے ایک موزوں اور کافی نیا موضوع ہو سکتا تھا۔ معاشرے میں

ادبی، ثقافتی، تخلیقی اقدار کے تحفظ اور پرداخت کے لیے حلقہ ارباب ذوق جیسے ادارے جو اہم کردار ادا کر رہے ہیں اُن کی تحسین کی جاسکتی ہے اور کرنی بھی چاہیے۔ ہاں کہیں کہیں ہلکے پھلکے تنقیدی مشورے بھی دیے جا سکتے ہیں۔ ادب، ادیب اور ثقافت کی سرکاری سرپرستی ایک اور توجہ طلب موضوع ہے۔ تو عرض یہ ہے کہ سنجیدہ مواد کی کوئی کمی نہ تھی لیکن افسوس کہ بات کچھ دل کو لگتی نہیں تھی۔ کچھ بھی سطروں پہروں میں جمتا نہیں تھا۔ ادھر آخری تاریخ قریب آتی جا رہی تھی۔ تو آخر ہوا کیا؟ یہ ایک لمبی کہانی ہے جو اصل میں نہایت مختصر ہے اور وہ یہ کہ راقم کو بالآخر اپنی تحریری فطرت ثانیہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ دوسرے لفظوں میں اپنی آئی پر آنا پڑا۔ تو معزز حاضرین یہ تحریر یا تقریر جو ابھی آپ کے سامنے اور آپ کے تعاون یا عدم تعاون سے بنے گی بلکہ بننا شروع ہو چکی ہے اسے ایک طرح سے ایک میٹا خطبہ کہا جاسکتا ہے۔ دیکھتے ہیں کیا کہنا ہے اور کیسے کہہ پاتے ہیں۔ کیا بولا جاتا ہے کیا سنا جاتا ہے۔ کیا کچھ ان کہا چھوڑ دیتے ہیں۔ تو Meta سے کوئی نجات راقم الحروف کے لیے ممکن نہیں۔ BTW یہ لفظ META جو ابھی یہاں ہم ایک محدود معنوں میں استعمال کر رہے ہیں آگے چل کر ممکن ہے کہ ایک انتہائی وسیع اور کافی خطرناک معانی اختیار کر لے۔ تو ابھی کچھ نہ کچھ تو شروع کر دیتے ہیں بلکہ ہو ہی چکا ہے۔ یعنی آغاز۔۔۔ ویسے کہا جاتا ہے کہ دنیا میں دو قسم کے ناکام لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جو شروع نہیں کر پاتے اور دوسرے وہ جو ختم نہیں کر پاتے۔ تو پہلی قسم کی ناکامی سے تو بچیں، رہی ختم کرنے کی بات تو ممکن ہے اُس میں انتظامیہ خود ہی کوئی مدد کر دے۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس محفل کے شرکا کی غالب اکثریت نہ صرف ادب فہمی میں درجہ کمال پر فائز ہے بلکہ اپنے گوناگوں ذاتی تخلیقی تجربات کی روشنی میں وہ عمل تحریر کے باطنی تخلیقی و غیر تخلیقی اسرار و رموز سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔ اس لیے میں یہ خوش دلانہ توقع کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہوں کہ آپ نہ صرف اس مابعد الجدیدی مسئلے کی پیچیدگیوں کو سمجھ سکتے ہیں بلکہ اس کے شکار کسی فرد سے ہمدردانہ رویہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ میری مراد کسی بھی قسم کی تحریر کے باقاعدہ لفظی آغاز کے مسئلے سے ہے۔ سادہ لفظوں میں وہی کہ بھئی دراصل کیسے شروع کیا جائے؟ پہلا فقرہ کیا ہو؟ آپ سے بہتر کوئی نہیں جانتا کہ لکھنے والے کے لیے وہ خاص فقرہ، پیرہ حتی کہ بعض اوقات تو انفرادی لفظ تلاش کرنا بھی ایک انتہائی مشکل مرحلہ بن سکتا ہے جو اُس کی کسی تحریر کے لیے ایک موزوں نقطہ آغاز بن سکے۔ ایسا بہر حال بہت کم ہی ہوتا ہے کہ لکھنے والا سیدھی شفاف تحریری راہوں پر بھاگتا چلا جائے۔ راستے پر خطر، معنوی، فکری، لسانی کھائیاں کھڈ ہر طرف، اور پھر بعض اوقات بدترین حالات میں تو اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا کہ بس اندھیرے میں چھلانگ لگا دی جائے۔

راقم الحروف وسطور بہر حال فی الحال ایسی کسی چھلانگ سے اجتناب کرے گا اور اُس وقت تک اس تحریر یا تقریر کا نقطہ آغاز ڈھونڈتا رہے گا جب تک کہ کوئی تحریر کے بحر ظلمات میں دھکا نہیں دے دیتا۔ یہ دھکا کون دیتا ہے؟ یہ یوں تو ایک روایتی ملین ڈالر کا سوال ہے لیکن کئی طرح کے تخلیقی ٹیرف لگنے کی وجہ سے قیمت کافی گر گئی ہے۔ جواب بہت آسان ہو چکا ہے۔ اور یہاں جناب میں تحریری عمل کی بے پناہ اسلوبی اور محرکاتی پیچیدگیوں کے تھیٹر میں ایک نئے، اصل میں بہت پرانے کردار کا اضافہ کرنے

کی اجازت چاہتا ہوں۔ جو لکھنے والے سے کہیں بڑھ کر لکھت کو ممکن بنوادیتا ہے۔ لکھنے والے کے محض منتشر تخیلات اور افکار پریشان کو اپنی نگرانی میں A4 سائز کے چند کاغذوں پر، یا کسی word processing soft ware میں مجسم کروادیتا ہے۔ وہ بنوادیتا ہے، لکھوادیتا ہے۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے وہ کردار ہے "لکھوانے والا"۔ لکھوانے والے کے لیے بذات خود کسی بھی قسم کا لکھنے والا یا لکھاری ہونا ضروری نہیں، اگر ہو تو سونے پر سہاگے والی بات ہے۔ لیکن ڈویژن آف لیبر کے اصولوں کے مطابق لکھنے والے کی دنیا اور ہے اور لکھانے والے کی اور۔ لکھوانے والا لکھنے والے کی احتجاجی چیخ و پکار پر قطعاً کوئی توجہ نہیں دیتا۔ حالات کی غیر موزونیت، خرابی صحت، بے رغبتی جیسے عذر لنگ اس پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتے۔ اُسے بس لکھت چاہیے اور ایک dead line کے مکمل dead ہونے سے پہلے چاہیے۔ چنانچہ اس تحریر میں بھی عمل تحریر کے آغاز وانجام کے سنگین وجودی مسائل کا جو واویلا اوپر کیا گیا اُس کا تعلق بھی لکھنے والے سے ہے لکھوانے والے سے نہیں۔ اُس کا تعلق ان سطور کو لکھنے والے مجھ عاجز سے ہے انہیں لکھوانے والے جناب ڈاکٹر امجد طفیل صاحب سے نہیں۔ میرے خدا۔۔۔ مشکل صورت حال ہے وقت ضائع ہوتا جارہا ہے اور میرا خیال ہے ابھی خطبہ شروع نہیں ہوا یا شاید ہو چکا ہے۔

ایک لمحہ توقف کیجیے۔ ابھی ابھی اچانک میرے ذہن میں وہ روایتی گھنٹی بجی ہے جو بھلے زمانوں میں تو غیب سے طرح طرح کے مضامین کے نزول کی خبر دیتی تھی لیکن اب وہ بنیادی طور پر کسی قسم کا ڈاؤن لوڈ شروع ہونے سے خبردار کرتی ہے۔ فی الحال ایک بات ہی share کر سکتا ہوں کہ۔۔ دیکھو یار یہ بھی تو ایک اچھا خاصہ دلچسپ نقطہ آغاز بن سکتا ہے۔ جو اتفاق سے سامنے آگیا۔۔۔۔ اتفاق سے کچھ بھی نہیں ہوتا پیچھے کہیں word processing جاری ہوگی۔ بہر حال کیوں نہ اسی سے شروع کر کے دیکھا جائے۔ یہ جو دو نہایت سادہ سے الفاظ ہماری اپنی زبانوں میں موجود ہیں۔ اور مجھے یہ بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ مدتوں سے کبھی کبھی اچانک پریشان کرنے لگتے ہیں۔ لکھنا اور لکھوانا۔

ان دو افعال، اعمال یعنی۔۔۔ لکھنا اور لکھوانا میں کیا تعلق ہے؟ یا سرے سے کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں۔ اگر ہے تو کیا تعلق؟ کیا ویسا ہی گرائمری تعلق ہے جیسا کہ بنانا، بنوانا، ناچنا، نچوانا، تلنا، تلوانا، کھودنا، کھودوانا، کرنا، کروانا وغیرہ میں ہے؟ لیکن۔۔ زیادہ اہم۔۔۔ کیا یہ کوئی ایسا مسئلہ ہے بھی کہ جس پر سرے سے کوئی توجہ دی جائے۔ کیا یہ محض کسی ایک زبان کا انتہائی مخصوص لسانی معمہ نہیں ہے اور بس۔ یاد رہے کہ ہماری قریب ترین غیر ملکی زبان انگریزی میں لکھوانا، بنوانا، کروانا جیسے افعال کے لیے کوئی مفرد الفاظ موجود نہیں، کچھ نہ کچھ شامل کر کے مثلاً لکھنے کے لیے کہنا، درخواست کرنا، حکم دینا، وغیرہ شامل کر کے مرکب فعل بنانے پڑتے ہیں۔ لیکن میں کوئی دعوی نہیں کر سکتا انگریزی کے ماہرین، یہاں معزز حاضرین میں بہت ہوں گے۔۔۔ بہتر بتا سکتے ہیں۔ تو لکھنے والے کو اصل مسئلہ یہ درپیش ہے کہ کیا لکھوانے والی قوتوں کا لکھنے کے عمل میں کوئی کردار ہوتا ہے؟ ہو سکتا ہے؟ اور اگر ہوتا ہے تو کیسا؟ اتفاق سے راقم الحروف حالات زندگی اور ذاتی تجربات کی روشنی میں یہاں کچھ عرض کرنے کی جسارت کر سکتا ہے کیونکہ مدتوں کچھ خاص قسم کے لکھوانے والوں کی چیرہ دستیوں کا شکار رہا ہے۔ مراد ٹیلی ویژن ڈرامہ سکرپٹ رائٹنگ سے ہے۔

ماضی سے آتی کچھ آوازیں آپ کو سنانے کی اجازت چاہتا ہوں شاید اس سے آپ کو کچھ اندازہ ہو کہ لکھنا اور لکھوانا ہر طرح سے باہم شفاف اور نیوٹرل صورت حال نہیں ہے اور یہ دیکھنا دلچسپ ہو گا کہ ''لکھنے والا'' اور ''لکھوانے والا'' عمل تحریر کی سماجیات میں طاقت، غلبے، ترغیب اور دھمکی کے کیسے کیسے حساس مقامات پر فائز ہو سکتے ہیں۔

سچویشن نمبر 1

''ہاں کیا بنا؟ لکھا اُس نے۔''

''نہیں سر۔ ابھی تو نہیں۔

''تو لکھواؤ اس سے ۔ سنو ۔ لکھوانا اُسی سے۔ مجبوری ہے۔ وہ پاپولر جا رہا ہے سیریل ہٹ ہو جائے گا۔ لکھواؤ، لکھواؤ۔۔۔''

''سر نخرے دکھا رہا ہے۔''

''تو پیسہ پھینک۔ اُس کا باپ بھی لکھے گا۔ لکھوانا اُسی سے ہے۔''

''سر وہ اُس دوسرے رائیٹر کا بھی فون آیا تھا جس کا بتایا تھا آپ کو۔ وہ بھی لکھنا چاہتا ہے۔''

''کون وہ ماٹھا۔ اُس۔ اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ دے۔ کہہ۔ کہہ چندا کوئی اور گھر دیکھ لے ہم نے نہیں لکھوانا۔ ہمارا کوئی اسٹینڈرڈ ہے۔ ایسا نہیں کہ ہر ایرے غیرے سے لکھواتے پھریں۔''

''جی سر''

''ایسے ہی نہ بول دینا۔ کبھی کھوٹے سکے بھی چل جاتے ہیں۔ کبھی کچھ چھوٹا موٹا، فالتو کھاتا لکھوانا پڑ بھی سکتا ہے۔''

سچویشن نمبر 2

''ایڈیٹر صاحب یہ تو آپ نے سارے ایک ہی دھڑے کے رائٹروں سے اس حساس موضوع پر مضامین لکھوا لیے۔ جیسے مجلہ انہی لوگوں کا ترجمان ہو۔''

''جی سر تو پھر حکم کریں سر۔''

''حکم میں نے کیا کرنا ہے۔ ایڈیٹر آپ ہیں یا میں لکھوائیں۔ لکھوائیں محترم۔ دوسری رائے رکھنے والوں سے بھی لکھوائیں۔ دوسرے موقف والوں کو بھی برابر کی جگہ دیں۔ تین چار آرٹیکل لکھوائیں اُدھر سے بھی تاکہ Balance بن جائے۔ جو ہماری پالیسی ہے۔ فخر کرتے ہیں ہم اس پر۔ جلدی لکھوائیں۔''

''وہ لیکن سر اب تو کاپیاں بھی جڑ گئی ہیں۔''

''اور میرا جو دماغ جڑ گیا ہے۔ اور اس۔ اس کے بعد جیل جانا پڑا تو سب کچھ ہی جڑ جائے گا۔''

سچویشن نمبر 3

''سر یہ تو اچھا ہوا حلقے کے الیکشن بلا مقابلہ ہوں گے۔اب نئی انتظامیہ کو Hand over کرنے سے پہلے آخری فنکشن کروانا ہے۔صدارتی خطبے کا رپھڑ پڑے گا۔''

''رپھڑ کیا ہے۔چار پانچ نام تجویز کرو مجلس عاملہ سے کوئی ایک موزوں بندہ فائینل کرالو۔''

''مجلس عاملہ۔۔دیکھا جائے گا سر۔اصل میں تو آپ نے ہی کرنا ہے فائینل۔یہ میں نے ایک لسٹ بنائی ہے۔''

''اچھا دکھا۔۔ہوں ہوں۔۔۔اس نام پر تو سیدھا کانٹا لگا دے۔''

''کیوں سر''

''یہ بندہ کبھی تعاون نہیں کرتا۔ Commit کر بھی لے تو عین وقت پر بیمار شمار ہو جاتا ہے۔کہتا ہے لکھ نہیں سکتا آج کل۔''

''کہتا تو یہی ہے۔واللہ عالم۔اب بندہ چھاپہ تو مار نہیں سکتا کہ عین اوپر سے بندہ اسے لکھتا ہوا جا پکڑے۔''

''ویسے سر یہ پکڑا جائے۔تو تھوڑی شوشا بن جائے گی۔جو بندہ کبھی نہ آیا ہو۔''

''تو لکھوا لے۔''

''نہیں سر یہ کام آپ کریں سر۔آپ کی بات اور ہے۔''

''میں لکھواؤں صدارتی خطبہ اور اُس بندے سے۔۔۔ناممکن۔۔۔''

(پس منظر میں المیہ موسیقی سنائی دیتی ہے۔)

لکھوانے والی قوتیں بہر حال ناممکن کو ممکن بنانا جانتی ہیں۔اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ حقیر پر تقسیر یہاں اس معزز ایوان کے سامنے کب کا کسی سنجیدہ، بارعب، Formal (حوالہ گوگل) تقریر کو شروع کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔تو جناب میں صرف ایک بار اور آخری بار آپ سے اپنی لسانی، اور دراصل تعقلاتی قسمت آزمانے کی اجازت مانگتا ہوں۔اور ہماری زبانوں میں مخصوص انداز میں مستعمل ان ہی دو الفاظ لکھنا اور لکھوانا میں سے کوئی ایسا عمومی نتیجہ برآمد کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو ہمیں کچھ عمومی دلچسپی کے مسائل کے بیان اور پھر اُن کے تجزیے کی راہ دکھا سکے۔تو بہت تھوڑے سے ذہنی بھڑکاؤ کو راہ دینے کی اجازت دیں۔اگر یہ کوشش ناکام رہی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اندھا دھند خطبہ پڑھنے لگوں گا۔اندھے تحریری گہراؤ میں چھلانگ لگا دوں گا۔دیکھی جائے گی۔اگرچہ میرے اندر کا ایک نیم مردہ سا نقاد بار بار سرگوشیاں کر رہا ہے۔کوئی relevent بات کر۔کچھ to the pointبول۔

ایک بات تو فوری طور پر ذہن میں آتی ہے کہ اپنے جیسے ایسے ہی دوسرے اداروں کی طرح حلقہ ارباب ذوق بھی بنیادی طور پر ایک لکھوانے والا ادارہ ہے۔اس لیے عمل تحریر کی سماجی تحرکیات سے براہ راست منسلک ہونے کے ناطے ہمارا یہ ایک سطح پر محض لسانی نقطہ آغاز کوئی اتنا زبردستی کا طرفہ تماشہ آغاز بھی نہیں ہے۔بلکہ۔۔میرا خیال ہے کچھ بات بن رہی ہے۔یہاں۔ایک

بڑی عمومی حقیقت کی کھوج ملتی محسوس ہوتی ہے۔ لکھوانا، خواہ اس عمل کے محرکات اور ہتھکنڈے کتنے بھی معتبر اور معزز کیوں نہ ہوں، لکھنے والے کی دنیا میں دوسرے یا غیر کے ظہور کا اعلان کرتا ہے، یعنی یہ فلسفیانہ حلقوں میں زیادہ مقبول اصطلاح The Other کی آمد ہے۔ تحریری عمل۔۔اور اب اس میں لے آئیں سب ہی کچھ۔۔۔ادبی تحریر، نثری، نظمی، افسانوی، تنقیدی وغیرہ وغیرہ کا آئیڈیلسٹ تصور تخلیق کار کو اپنی ذات اور کائنات کے مجموعی تجربے کی اظہاراتی جہتوں، یا مظہریاتی ساختوں کے انتخاب میں کامل آزادی دیتا ہے۔ ادبی تخلیق کا یہ قادر مطلق ہونے کا رومانی تصور لکھنے والے کی اقلیم میں لکھوانے والے کی بھدی مداخلت تو ایک طرف کسی ادب نواز کی مشفق سہولت کارانہ آمد و رفت کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ لیکن کیا یہ اتنا ہی آسان ہے۔ ہر گز نہیں ۔اس egoist اور شاید نرگسیت زدہ نقطہ نظر کی مخالفت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

اور یہی موقعہ ہے کہ ہم اس طرح کے اداروں کے بنیادی structure اور dynamics کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ لکھوانے والے، ادب بنوانے والے، ایک سطح پر لکھنے والے کے غیر تو ہیں لیکن اُن اداروں کے اپنے دعووں اور شعوری ارادوں کے مطابق ایک گراں قدر ادبی عمل کو پروان چڑھانے والے غیر، اعلیٰ ادبی تخلیقی صلاحیتوں کی پہچان کر کے اُن کی تنقیدی اور اصلاحی آبیاری کرانے والے The Other ۔(نوٹ۔اہم۔خطرہ ہے کہیں ان فقروں کو طنزیہ نہ سمجھ لیا جائے۔اچھا آخری پڑھائی/ایڈیٹنگ میں حذف کر دیا جائے گا۔ لیکن اُس سے تو کام خراب ہو جائے گا ساری دلیل کا۔ بہر حال ابھی یہ مداخلتی خیال روکو۔روکو۔روکو۔)

سوشیالوجی آف لٹریچر، ایک ڈسپلن جو انگریزی بولنے والے مغربی ممالک کی نسبت یورپ اور خاص طور پر فرانس میں زیادہ۔۔ مقبول ہے،۔۔۔ کہنے لگا تھا دیکھو The Sociology of Literature, Gisele Sapiro۔۔ سوری۔۔۔ پلیز اس کو حذف کر دیں۔ یہ صدارتی خطبہ ہے کوئی ریسرچ پیپر نہیں۔ اگرچہ اس سے اتنا تو ممکن ہو جاتا کہ حاضرین میں سے چند ایک پر میری علمیت کا جعلی رعب پڑ جاتا۔ خدا میرے حال پر رحم کرے۔ بہر حال۔۔۔ تو عرض یہ ہے ادب کی سماجیات کا ڈسپلن دیگر امور کے علاوہ کسی معاشرے میں قائم شدہ ایسے اجتماعی اداروں، حلقہ ارباب ذوق ٹایپ ادارے ہی نہیں بلکہ جس میں زیادہ Glamourized ادبی کانفرنسیں، ادبی میلے، ادبی ایوارڈ دینے والی تنظیمیں سب ہی شامل ہیں کو زیر بحث لاتا ہے۔ ڈسپلن ایک طرح کے Discourse analysis کے ذریعے ان سب کی اندرونی ساخت اور اُن میں طاقت اور اختیار کی dynamics کا مطالعہ کرتا ہے۔ ان مباحث میں بالآخر یہ بنیادی بصیرت سامنے آتی ہے کہ ادب بنانے پر اکسانے والے، طرح طرح کی ترغیب دینے والے، ادبی دربان کا کردار ادا کرنے والے، مختلف نظری لیبل لگانے والے غیر محسوس طریقے سے ایک بڑے ادب پرور گروہ میں چھوٹی چھوٹی دھڑے بندیاں قائم کرانے والے، ادبا اور شعرا میں انسانی جبلتوں کے زیر اثر ایک زہر ناک مسابقت کا احساس پیدا کرانے والے، اور آخر میں ان سب نیک خواہشات کی تکمیل کے نقطہ عروج کے طور پر اپنے ادیب کے ادب پارے کی طرف ایک منظم و مرتب توجہ مبذول کرانے کا کامیاب اہتمام کرانے والے ان سب The Other عناصر کا متمع

نظر صرف ایک ہی ہوتا ہے کہ اپنے پسندیدہ ادیب کو اُس کے اصلی، پہلے اور آخری ''غیر'' کا سامنا کرنے کے قابل کیسے بنایا جائے۔ لکھنے والے کا The ultimate Other پڑھنے والا، یعنی قاری۔ لکھنے والے نے بلآخر پڑھنے والے کی عدالت میں حاضر ہونا ہے۔ فیصلہ وہیں سے آنا ہے۔ ویران جزیرے میں موجود کسی لکھنے والے رابنسن کروسو کی لکھت ادب اُسی وقت بنتی ہے جب وہ کوئی دوسرا لکھائی کے اُن نشانوں پر اپنی نظریں دوڑا لیتا ہے۔ پڑھ لیتا ہے۔ لکھوانے والا ادارہ یہاں مدد کرتا ہے۔ قاری کا فیصلہ نہ صرف ہمارے منتخب ادیب کے حق میں آنا چاہیے بلکہ مخالفت میں اُٹھنے والی منحوس آوازوں کو خاموش کرانے کا معقول بندوبست بھی ہونا چاہیے۔ ہمارے شاعر، فکشن نگار، نقاد۔۔۔ چلو نقاد بھی۔۔۔ ان سب کے فن پاروں کی نہ صرف بلے بلے ہونی چاہیے بلکہ اپنے مذموم مقاصد کے تحت اوئے اوئے پر تلے دوسرے کمینوں کی بیخ کنی بھی ہونی چاہیے۔ اپنے قریب کی دیکھی بھالی ادبی فضا میں ہمارا ایک دوست افسانہ نگار سیشن کے بعد، چائے زہر مار کر کے، باہر نکلتا ہے تو دل میں ٹھان لیتا ہے کہ اس دفعہ اس نے میرے افسانے پر اوے اوے کی ہے، کروائی ہے۔ اگلی دفعہ اس کے چیلے چانٹوں میں سے کوئی آئے ذرا اور پھر دیکھے گا کیسا رگڑا لگتا ہے۔

مذکورہ بالا سطور کو ایک سامنے کی بات کو غیر ضروری طور پر پیچیدہ زبان میں پیش کرنے کی ایک نیم ڈرامائی کوشش بھی کہا جا سکتا ہے۔ جی ایسا ہی ہے۔ آخر اس تقریر یا تحریر کا پیٹ بھی تو بھرنا ہے، ابھی شاید دس پندرہ منٹ ہی گذرے ہیں مجھے ہدایت دی گئی تھی کہ خطبہ گھنٹے بھر کے قریب ہونا چاہیے۔ تو آگے بھرتے، مطلب بڑھتے ہیں۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ حلقہ ارباب ذوق لاہور کا اسی طرح کا کوئی اجلاس چند دہائیاں پہلے ہو رہا ہوتا اور شومی قسمت سے احقر کو اسی قسم کی بپتا کا سامنا ہوتا تو وہ بلے بلے اور اوئے اوئے جیسے ہیجانی اور سنسنی خیز الفاظ استعمال نہ کرتا، نسبتاً کم متشددانہ اور معتدل الفاظ کے استعمال سے بھی بنیادی طور پر اسی ادبی سماجی نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا سکتا تھا جو بہر حال جبلی طور پر تو اُس وقت بھی ویسی ہی تھی جیسی کہ آج ہے۔ لیکن آج 2025 میں فرق یہ ہے اب یہ الفاظ بلکہ ان کے ہم معنی زیادہ پاور فل لسانی تراکیب ایک نئے معمول کا حصہ بن چکی ہیں۔ اور شاید الفاظ ہی نہیں بدلے بلکہ اُن کی تعبیر کرنے والے افعال اعمال بھی اب بہت مختلف معاملات بن چکے ہیں۔ اپنے اصلی تے وڈے ''دوسرے'' پڑھنے والا یا قاری۔۔۔ کی بلے بلے کی ہوس میں مبتلا یا اوئے اوئے کے امکان سے دہشت زدہ ادیب اب چند دہائیاں پہلے کا ادیب نہیں اور اُس کا The Other قاری بھی وہ نہیں۔ یہ دونوں لازم وملزوم اور متحارب ہستیاں وقت کے اس دورانیے میں نام نہاد حقیقی کی بجائے کسی اور زمان و مکان میں جا چکی ہیں۔ ایک متوازی دنیا میں۔

اس متوازی کائنات کو فوری طور پر سامنے لانے کے لیے میں ایک چھوٹا سا لفظی اور تاریخی شعبدہ استعمال کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ تاکہ کسی لمبی چوڑی تمہید کے بغیر ہم آج کی دنیا میں ابھی کے اسی لمحے میں آ جائیں اور ہو سکے تو بات کچھ آگے چلے۔ میں اگر یہ کہوں کہ یہ نئی متوازی کائنات ارسطو کی انسان کے بارے میں ایک مشہور زمانہ تعریف کی از سر نو تعریف کرنے سے سامنے آ سکتی ہے تو شاید اصولاً سائنسی منطقی طور پر تو غلط ہو لیکن محاوراتی اظہاراتی طور پر نہیں۔ ارسطو نے کہا تھا۔ Man is

a social animal. جبکہ اب تین ہزار سال بعد سلی کون ویلی کا فلسفی کہتا ہے اور کہتا ہی نہیں ثابت کرتا ہے بنا کر دکھاتا ہے کہ Man is a social media animal۔ہاں Animal دونوں صورتوں میں ابھی تک قائم ہے لیکن اس کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ انسان اور مشین خاص طور پر micro chip اور Nano technology کے امتزاج سے جو نئے Hybrid سامنے آسکتے ہیں وہ صرف سائنس فکشن کی فینٹسی یا مستقبلیات Futurology کی تھیوریز کا حصہ نہیں ہیں بلکہ کائنات میں انسان کی مرکزیت کے حقیقی خاتمے کے کئی انوکھے منظر ناموں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن یہاں شاید ہم چالو موضوع سے دور ہٹ رہے ہیں اور Posthumanism کی طرف پھسل رہے ہیں۔ لیکن احتیاط کیسی؟ Meta کی کھلی چھٹی ہم نے لے لی تھی اور اب دوسرا Metal بھی آنے والا ہے۔ لیکن خیر یہ پھسلوان بعد میں سہی اگر وقت ہوا ضرورت ہوئی تو اسے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ فی الحال ہم ادب، ادیب، قاری، لکھنے والے، لکھوانے والے، بلے بلے اور اوئے اوئے کرنے کروانے والوں کی نئی متوازی دنیا میں جاتے ہیں۔ اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا ح ''حقیقی'' نہیں بلکہ ''ورچول'' ہے۔ Real اور Virtual ۔۔ ہونے کی ان دو سطحوں میں فرق بڑوں بڑوں کو confuse کر دیتا ہے۔ ورچول وہ کہ جو ہے مگر نہیں ہے قسم کا کچھ ہے۔ طبعی physical نہیں ہے بلکہ Software کا پیدا کردہ ہے۔ تو یوں کہہ لیں کہ یہ ایک سطح پر حقیقی تو ہے لیکن actual نہیں ہے۔ یہ سب معاملات Digital revolution کی Deep ontology کی راہ دکھاتے ہیں اور جہاں قدم قدم پر کسی نئے فلسفیانہ گڑھے یا گھڑے میں گرنے کے شدید ترین خدشات موجود ہے بچنا چاہیے۔ ہم سوشل میڈیا کو ہی لیتے ہیں اور ادب پر اس کے ممکنہ اثرات کا ذکر کرتے ہیں۔

بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے کہ سوشل اور میڈیا کے یہ دو الفاظ مل کر بھی ایک کافی کمزور، ان طاقتے سے مرکب کا صوتی تاثر پیدا کرتے ہیں۔ دونوں الفاظ اپنی اپنی جگہ بھی کسی قسم کے جارحانہ تحرک کی خبر نہیں دیتے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ پچھلی دو دہائیوں میں عالمی سطح پر بین الاقوامی تعلقات کی دنیا میں اس نام نہاد میڈیا کی بے پناہ اور تباہ کن طاقت کے مظاہرے، عرب سپرنگ سے لے کر برما کے انسانی المیے میں فیس بک کے مخصوص استعمال تک پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں اور جو اب عہد حاضر کی تاریخ کا حصہ ہیں اور جنہیں بدترین معنوں میں اینٹی سوشل ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ انفرادی سطح پر بھی اس میڈیا کے مختلف پلیٹ فارمز کو استعمال کرتے ہوئے آپ کسی فرد کی ذاتی زندگی کو کیسے جہنم بنا سکتے ہیں۔ ان سب موضوعات پر علمی تجزیوں اور نظری مباحث کی اب کمی نہیں۔ ایسا فکر انگیز مواد بھی میسر ہے جو ایک طرف اس مخصوص ٹیکنالوجی کی تاریخ کو ٹرانزسٹر کی ایجاد سے لے کر فیس بک کے موجد Mark Zuckerberg کی ڈیجیٹل کاوشوں تک لے آتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ یہ ٹیکنالوجی اب انسان کے خارجی اعمال کو نئی توانائی اور رفتار اور سہولتیں ہی عطا نہیں کرتی بلکہ اُس کی داخلی، باطنی، وقوفی اور جذباتی زندگی میں بھی بھرپور مداخلت کرتی ہے۔ بظاہر یہ ایک عام سی بات لگتی ہے کہ صدیوں پہلے عینک کے عدسے کی ایجاد نے ایک خارجی مادی وجود کو ہمارے نظام بصارت کا حصہ بنا کر دراصل جسم کا حصہ بنا دیا تھا۔ لیکن اب یہ اتنی عام سی بات نہیں

ہے کہ یہ بالشت برابر آلہ، جس میں پچھلی دو صدیوں کی فزکس محاوراتی نہیں بلکہ بہت ہی حقیقی معنوں میں بھری ہے یہ دراصل آپ کے ہاتھ میں موجود نہیں بلکہ آپ کے دماغ، آپ کے نظام عصبی کے اندر فٹ ہو چکا ہے۔ یہ توجہ، تعلق، دوری، قربت، اشیر باد، لعنت، میری جان اور دفان، محبت۔ نفرت کی ہیجانی ٹیکنالوجی ہے۔ اب آپ یہ جان سکتے ہیں، اور یہ اہم ہے کہ ابھی تین سال پہلے ہی سلی کون ویلی سے یہ فیصلہ کیسے آیا کہ فیس بک کا نیا نام Meta ہوگا۔ یہ محض نام کی تبدیلی نہ تھی بلکہ یہ ورچول اور حقیقی دونوں سطحوں پر ایک بہت پر بصیرت پیش رفت تھی اور کیسے؟ اس لیے کہ ، واضح کیا گیا تھا کہ سوشل میڈیا دراصل ایک Metaverse ہے۔ عام گھسی پٹی حقیقی کائنات سے اوپر اٹھی ہوئی ایک اور متوازی دنیا جس میں انسان دوسرے انسانوں سے ہر طرح کا معاملہ کر سکتا ہے بلکہ ایسا معاملہ بھی کر سکتا ہے کہ جس کا دوسری پرانی دنیا، بھاری بھر کم، بھدی، وزن والی کائنات میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

پچھلے دنوں راقم الحروف کو میرے ایک عزیز کی طرف سے، کہ دیار غیر میں انہی معاملات کی درس و تدریس میں مصروف ہے ایک کتاب پڑھنے کا مشورہ دیا گیا کہ ہو سکتا ہے ورچول عناصر کی چیرہ دستیوں کو سمجھنے میں وہ میری کچھ مدد کر سکے۔ آشفتگی خیال میں کچھ کمی آئے کچھ افاقہ ہو۔ یہ ایک مشہور صحافی مصنف Max Fisher کی کتاب The chaos machine تھی۔ بہت اشتیاق سے مطالعہ شروع کیا اور سچی بات ہے کہ عزیز کی توقع کے مطابق Metaverse کے اسرار و رموز کے بارے میں میری آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔ بلکہ اپنی کچھ دیگر دلچسپیوں کے زیر اثر کئی دوسرے سوالات نے بھی جنم لیا مثلاً یہ کہ فرانسیسی سوشیالوجسٹ اور فلسفی Jean Baudrillard کے Hyper-reality کے نظریے اور بہت بعد میں، ہماری اس نئی طلوع ہونے والی Metaverse میں، سامنے آنے والے کینیڈین سوشل سائنٹسٹ Anabel Quan Hasse کے Hyperconnectivity کے نظریے میں کوئی تعقلاتی تسلسل قائم ہوتا ہے یا نہیں؟ موخر الذکر نظریے کے مطابق ای میل، فیس بک، انسٹا گرام، ٹویٹر، وٹس اپ اور ایسے ہی معاشرتی ارتباط پیدا کرنے والے دوسرے نظام Digital Hyperconnectivity کی ایک ایسی صورت حال پیدا کرتے ہیں جس میں ہر شخص اور ہر چیز، دوسرے ہر شخص اور ہر چیز سے، ہر جگہ اور ہر وقت مربوط ہو جاتی ہے۔ انتہائے ارتباط کا یہ ایک خوف زدہ کرنے والا تصور ہے۔ مجوزہ کتاب پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ اس کا مطلب ہے کہ فاصلے کی موت واقع ہو چکی ہے۔ حالانکہ انسان نے اپنے پچھلے دو لاکھ سال کے ارتقا کے دوران فاصلے کم کرنا ہی نہیں فاصلے قائم کرنا اور فاصلے برقرار رکھنا بھی سیکھا ہے اور ادب، آرٹ بلکہ ہر قسم کی تخلیقی سرگرمی بشمول سائنس اور فلسفہ فاصلہ مانگتی ہے اور فاصلے میں ہی پروان چڑھتی ہے۔ یہ کس قسم کا علمی ادبی سوشل میڈیا ہے خاص طور پر جو ہم پر آشکار ہوتا ہے۔۔۔ کہ بندے سے بندہ جڑا گرا کھڑا ہے تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ ایک نفسا نفسی، افراتفری کا عالم ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ سوائے میں میں کی ممیاٹ کے ساتھ ساتھ۔۔ شعری، نثری، افسانوی، تنقیدی چیخ و پکار کے

ساتھ ساتھ فیس بک کی Likes کی بلے بلے کلک کلک کرتی جاتی ہے اور ہمارے ادبی تخلیق کار، صرف اُبھرتے ہوئے ہی نہیں بہت اُبھر چکے بھی سب کے نظام عصبی میں Dopamine کی کک پر کک لگتی جاتی ہے۔

موخر الذکر تاثرات، مذکورہ کتاب کے مطالعے کے دوران جنم لینے والے کچھ ذیلی (بے) فکری شاید نامناسب جذباتی شگوفے تھے لیکن جو بنیادی طور پر عہد حاضر کے گھمبیر Metaverse مسائل پر Max Fisher کے پر مغز مباحث، گہرے مشاہدات، تفصیلی رپورٹوں اور منطقی تجزیوں سے ہی پھوٹ رہے تھے اور جس طرح یہ سب کچھ احقر کو بھی ایک عاجزانہ سے انداز میں کچھ فکری ٹامک ٹوئیاں مارنے پر اکسا رہا تھا اس سے یہ تو ثابت ہو رہا تھا کہ مطالعہ ہر لحاظ سے پر لطف ہی نہیں بلکہ پر مغز بھی جا رہا ہے۔ لیکن افسوس کہ یہیں میرے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا۔ چلیں واقعہ کہہ لیں جو بیک وقت پرانا حقیقی بھی تھا اور نیا ورچول بھی۔ یعنی ایک پاؤں حقیقی میں دوسرا ورچول میں۔ وہی مطالعہ جو لمحہ بھر پہلے بہت پر لطف معلوم ہو رہا تھا اک دم کچھ پھیکا سا پڑ گیا مرجھا سا گیا۔ اندر سے آواز، بلکہ کراہ اُٹھی نہیں یار مزہ نہیں آ رہا۔ یہ جس مقام پر، جس علمی لیول پر، جس گہرائی سے تم اس سنجیدہ انتہائی relevant موضوع کے بارے میں پڑھ رہے ہو یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ دنیا کو اس کا علم ہونا چاہیے کہ تم یہ کتاب پڑھ رہے ہو۔

یہ میرا Virtual Self یا اس دنیا کی ایک اور اصطلاح کے مطابق شاید میرا Avatar تھا جو اچانک میری منتیں کرنے لگا تھا کہ میں اس کتاب بمع اپنے تھوبڑے کی تصویر فیس بک پر پوسٹ کروں اور بلے بلے کرانے کی کوشش کروں۔ مجھے اُس کی یہ ترغیب کچھ پسند نہ آئی، پرانی عادتیں، شاید قدریں جاتے جاتے ہی جاتی ہیں۔ ہم دونوں میں اگلے چند منٹ کے لیے جاری رہنے والا مکالمہ فکر انگیز ہونے کے علاوہ عبرت انگیز بھی تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس Meta تحریر کے ذریعے ادب اور Metaverse میں کسی تعلق کو سمجھنے میں مدد دے سکے، مجرد تعقلاتی سطح پر نہ سہی خود نوشتی تمثیلی سطح پر ہی سہی۔ حقیقی گوشت پوست کے انسان نے اپنے ورچول ہم زاد کو ڈانٹنے اور سمجھانے کے ملے جلے انداز میں مخاطب کیا۔

''نہیں یار یہ برا لگتا ہے۔ یہ کتاب میں پڑھ رہا ہوں۔ کسی کو اس سے کیا لینا دینا۔ کیا مصیبت پڑی ہے، اشتہار لگانے کی۔۔ کہ دیکھو بھئی دیکھو۔۔۔ میں یہ کتاب پڑھ رہا ہوں۔''

''اور وہ جو اپنا لکھا ہوا، بعض اوقات تو بغیر چھپا ہوا۔۔ اُس کی جو پوسٹیں لگاتے رہتے ہو وہ اشتہار نہیں ہوتیں کیا؟ یہ ہے جی میری کتاب میں سے ایک اقتباس۔ پوسٹ کے ساتھ لکھتے ہو تم۔ اور درجنوں Likes کماتے ہو۔ وہ اشتہار نہیں ہوتے کیا؟''

ظالم بہت جلد لاجواب کر دیتا ہے لیکن میں بھی اتنی جلد ہتھیار ڈالنے والا نہیں۔ خواہ یہ Real self اور Virtual self کی تکرار کہیں بھی لے جائے۔

''وہ اطلاع ہوتی ہے۔ بطور رائیٹر میرا حق ہے کہ میں اپنے قارئین کو بتاؤں کہ میں کیا لکھ رہا ہوں اور وہ کب میسر ہو گا۔ ایک میسج ہوتا ہے۔ بس۔''

''اعلیٰ میسیج۔ تم نے خود ہی کہہ دیا میسیج۔ یہی تو میں کہتا ہوں۔ بطور رائٹر میسیج تمہارا حق ہے صرف اپنی کتاب اپنی تحریر کا میسیج دینا ہی کافی نہیں بلکہ اپنے Followers کو یہ میسیج دینا بھی تمہارا حق ہے بلکہ ضروری ہے کہ تم کس سطح کے عالم فاضل رائیٹر ہو اور پھر یہاں تو تم اپنے فیلڈ میں ہو۔ اب تو بڑے بڑے جید سینیر، ابھرتے ہوئے، اُبھارتے ہوئے، اُبھرے ہوئے ہر طرح کے مصنف، ادیب، شاعر ایسی پوسٹیں بھی لگاتے ہیں کہ آج انہوں نے سلاد کونسا کھایا۔ اُن کے لان میں پھول کیسے کھلے ہیں۔ کئی تو ہر چار دن بعد ٹالسٹائی، مثنوی مولانا روم، بالزاک، اور طلسم ہوش ربا کے ساتھ اپنی سیلفیاں لگاتے ہیں۔ تاکہ دنیا کو پتہ چلے کہ ایندے ورگا تے کوئی جمیا ہی نہیں۔۔ تم پتہ نہیں کسی غلط فہمی میں ہو؟ لگاؤ یہ پوسٹ Max Fisher کی کتاب کی کہ تم پڑھ رہے ہو لگاؤ۔ دس بج رہے ہیں تمہارے followers سو بھی سکتے ہیں۔''

''دیکھتے ہیں۔ لیکن تمہارا کیا خیال ہے وہ سب لکھنے والے جو یہ ورچول مشقت کرتے ہیں اس طرح اُن کی بلے بلے ہو جاتی ہے ادبی دنیا میں؟''

''یہ Depend کرتا ہے likes کے نمبر پر۔۔۔ میرا خیال ہے بلے بلے ہزار likes کے بعد شروع ہوتا ہے۔ تم ابھی ڈیڑھ سو سے اوپر نہیں گئے۔ پوسٹ لگاؤ۔ یہ سب اب رہنا ہے بھائی یہ اب عالمی ادبی کلچر کا حصہ ہے۔''

میرا دل ٹوٹ جاتا ہے اور میں اپنے ورچول ہم زاد کی تقریباً ہر بات ماننے کو تیار ہوں لیکن ایک آخری کوشش کرتا ہوں۔

''میرا نہیں خیال۔۔ دنیا میں ہر جگہ کے ادبی سوشل میڈیا، Meta culture میں ایسا ہی ہو رہا ہو گا۔ سب کے اپنے اپنے رنگ ڈھنگ ہوں گے۔ کوئی دعوی تو نہیں، یہ محققین کا کام ہے۔ لیکن جہاں تک ہماری online ادبی دنیا کا تعلق ہے میری تھیوری یہ ہے کہ دراصل یہاں ایک قسم کا ورچول ادبی مشاعرہ جاتی جوگاڑ بنا ہے۔ دیکھو داد، فوری طور پر داد، اسی زمان و مکان میں داد، ''ہنے ایتھے رکھ'' داد ہمارے شعری کلچر کا جزو لاینفک ہے۔ تو روایتی مشاعرہ اس مسئلے کا بہترین حل تھا لیکن ظاہر ہے صرف شعرا کرام کے لیے۔ جب ہمارے ہاں بھی نثری افسانوی تخلیقات کا چلن عام ہو گیا تو نثر نگار بہت اوازار ہوئے کہ ان شاعروں کی واوا موج لگی ہوتی ہے۔ آتے ہیں اور دس پندرہ منٹ میں اتنی واہ واہ کرا کے چلے جاتے ہیں جتنی ہمیں مہینوں کیا برسوں بعد بھی مشکل سے ملتی ہے وہ بھی ملے نہ ملے، اوئے اوئے کا خطرہ ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے۔ ایسا ادب لکھنے کا کیا فائدہ۔ ایک مشکوک ادبی نظریہ کے مطابق شاید اسی لیے ناول کم تعداد میں لکھے گئے۔ بہر حال ایک دوسرے مشکوک نظریے کے مطابق نثر نگاروں کے احساس محرومی کو کم کرنے کے لیے حلقہ ارباب ذوق ٹائیپ کی ادبی انجمنیں معرض وجود میں آئیں۔ لیکن اصل انقلاب سلی کون ویلی سے اُٹھنے والے Digital revolution سے آیا۔ سمجھ رہے ہو؟''

''مجھے ایڈیٹ نہ سمجھو میری تو پیدائیش ہی سلی کون ویلی میں ہوئی تھی۔ ہاں آگے بولو۔ تو یہ جوگاڑ کیسے ہوا۔''

''جوگاڑ، اب ایک عالمی سطح پر مانی ہوئی conceptual حقیقت ہے لیکن اسے ابھی تک زیادہ تر ٹیکنالوجی کی مقامی تخلیق نو، اختراع کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن میرا نظریہ یہ ہے کہ جوگاڑ ہمارے لیے ایک شاندار تخلیقی امکان ہے جو Homi

Bhabha کے Hybrid سے کہیں آگے کی چیز ہے۔ جوگاڑ نظریوں، غیر ملکی concepts، فلسفوں یعنی discourses، بلکہ narratives، بیانیے کا سخت رلا ہوا لفظ۔۔۔ سب پر ہی ہو سکتا ہے۔ تو بات لمبی ہے ہمارے ہاں سوشل میڈیا نے جس طرح ہر قسم کے ادیبوں کے لیے وافر داد و تحسین کا ورچول بندوبست کیا ہے وہ بذات خود زبردست بلے بلے کا مستحق ہے۔ مال بہت ہے، کڑھس نہ ڈالیں، سب کو ملے گا۔''

میرا سانس پھولنے لگتا ہے لیکن لگتا ہے میرا ورچول سیلف متاثر ہو رہا ہے اور چونکہ صفر اور ایک کے Binary logic کی مخلوق ہے اس لیے مجھے مشورہ دینے میں ایک دو لمحوں سے زیادہ نہیں لیتا۔ شاید کوئی نیا سرکٹ بنا ہے۔

''مجھے لگتا ہے تم پوسٹ کلونیل تھیوری میں بھی کوئی ورچول جوگاڑ کرنے والے ہو۔ ایسا کرو اسے بھی upload کر دو لیکن تھوڑی تیاری کے بعد۔ بلکہ حلقہ ارباب ذوق والوں سے کہو ''ادبی تحسین و تنقید کا ورچول جوگاڑ'' پر ایک کانفرنس کرائیں۔ وہاں پیپر پڑھو۔ بلکہ اگر صدارت کرا دیں تمہاری تو بہہ جا بہہ جا ہو جائے گی۔ اُدھر کوئی دوست۔۔ چلو کوئی واقف کار ہے تمہارا۔۔ نہیں؟ یہ تو حال ہے۔ دیکھو digital سوشل میڈیا ٹھیک ہے لیکن پرانے بندہ ٹو بندہ Analog تعلقات بھی ضروری ہیں۔ ہر چیز ابھی مکمل Metaverse میں شفٹ نہیں ہوئی۔ ادبی میلوں کانفرنسوں، میں جاتے ہو؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''بس فضول Socialization ہوتی ہے وہاں۔ یا پی آر ہوتی ہے۔ بس۔ میرے کچھ اصول ہیں۔''

''وہ اصول میں جانتا ہوں۔ اصل وجہ کیا ہے؟''

''کوئی بلاتا ہی نہیں۔''

پتہ نہیں میرے کان دھوکہ کھا رہے ہیں لیکن ایک لمحے کے لیے لگتا ہے کہ ورچول سیلف روپڑا ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحے اُس کی آواز شدید تحکمانہ ہو جاتی ہے۔

''لگا لگا۔۔۔ یہ اس کتاب کی۔۔ Chaos machine کیا ہے، لگا۔ تمہارا کیس بالکل Hopeless ہے۔''

میں اپنے بیرون از دماغ، دماغ کے ٹوٹے سیل فون کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ کتاب کی تصویر لیتا ہوں باقی سب رسوم ادا کرتا ہوں اور پوسٹ کا بٹن دباتے ہی Likes کا کھاتا کھلنے کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔ رات گئے تک نیند نہیں آتی۔ کچھ نہیں آیا۔ بے چینی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ آخر ایک جان افزا ٹنن کی آواز آتی ہے۔ میری پوسٹ کو پسند کیا گیا ہے۔ نام دیکھتے ہی مایوسی ہوتی ہے، ارشاد میدان ہے ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا نائب قاصد جو میری ہر پوسٹ کا پہلا like کرنے والا ہوتا ہے۔ مایوسی کی وجہ خدانخواستہ یہ نہیں کہ نائب قاصد کی like کی قیمت metaverse میں کسی بڑے سکالر یا نقاد سے کم ہے۔ یہی تو کمال ہوا ہے۔ مجھے اسی کتاب

میں پڑھا وہ واقعہ یاد آجاتا ہے فیس بک کو ڈیویلپ کرنے کے دوران Mark Zukerberg کی ٹیم کے ایک ساتھی نے Likes کا ایک بٹن اُس سے پوچھے بغیر ہی پتہ نہیں کسی ذہنی رو میں شامل کر دیا۔ باس کو اس کی یہ حرکت کوئی پسند نہ آئی۔

''یہ کیا تم نے ڈال دیا ہے۔''

لیکن Zukerberg کا وہ کولیگ شاید کچھ ایسا دیکھ چکا تھا جو ٹیکنالوجی کی تاریخ میں آج تک کسی نے سوچا بھی نہیں تھا: انسانی ہیجانات، جذبات کا مقداری اظہار انسانی پسند ناپسند کے ساتھ عددی تیقن کا ارتباط۔

''باس دیکھو تو سہی کیا بنتا ہے۔''

اور پھر واقعی جناب لوگوں کی پوسٹز کے ساتھ دوسروں کی پسندیدگی کے عدد جڑنے لگے۔۔۔ دس، سو، دو سو، ہزار، دس ہزار۔۔۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ ٹیکنالوجی اب انسان کے دماغ کے اندر گھس کر کچھ اپنی قسم کا جگاڑ کرنے لگی تھی۔

سو جاتا ہوں۔ خواب بھی اسی دنیا کے آتے ہیں۔ دیکھتا ہوں کہ صرف بیس سال بعد کی دنیا ہے اور Artificial Intelligence کے بے پناہ پھیلاؤ کی وجہ سے دنیا بھر کے ادیب، شاعر، مصور، موسیقار، حتی کہ فلم ایکٹر بھی بے مصرف ہو چکے ہیں فارغ ہو چکے ہیں۔ اقوام متحدہ میں اس سنگین صورت حال پر ایک قرارداد منظور کی جا رہی ہے کہ ہر ملک کو پابند کیا جائے کہ وہ فارغ ہونے والے ماضی کے ان فنکاروں کے لیے مناسب نوکریوں کا بندوبست کرے۔ ایک جزوی حل یہ بھی تجویز کیا جاتا ہے کہ کم از کم پاپولر ناولوں کی سطح پر، ناول کا پلاٹ AI خود بنالے پھر باقی ماندہ بھرتی کا کام کسی رائیٹر سے لکھوائے۔ AI کی رہنمائی میں انسانی لکھاریوں سے زیادہ پرفیکٹ ادب لکھوانے کے لیے AI کو استعمال کرنے کے طریقے بھی AI سے ڈویلپ کرائے جا سکتے ہیں۔۔۔

ٹنن کی آواز آتی ہے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ صبح ہو چکی ہے۔ پہلا کام ہی سیل فون کی طرف ہاتھ بڑھانا ہے۔ ارشاد میدان کے علاوہ صرف دو اور ناموں نے میری اس پوسٹ کو پسند کیا ہے کہ میں Max Fisher کی کتاب پڑھ رہا ہوں۔ دن کا آغاز بہت گندا ہوا ہے۔ مجھے اپنا ادبی مستقبل سخت خطرے میں نظر آتا ہے۔

خواتین و حضرات اسی طرح مجھے اس تقریر کا مستقبل بھی خطرے میں نظر آتا ہے کہ انجام کیا ہو گا۔ Meta تحریروں کے ساتھ علاوہ دیگر مسئلوں کے ایک سنگین مسئلہ ''شتر گربگی'' کا بھی ہوتا ہے، ''چڑ گگھ'' کہہ لیں۔ یعنی ان مل چیزوں کو ملانے کے چکر میں وقت کا انتہائی غیر محتاط استعمال۔ جیسے یہ واہمہ ہو کہ امتحانی پرچے کے سوالات تو محدود ہو سکتے ہیں لیکن وقت لامحدود ہے حالانکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ Metaverse اور ہماری بے چاری ordinary verse یا دوسری ٹرمنالوجی میں on line اور off line یا Digital اور Analog دنیاؤں کے باہمی تعلق سے۔۔۔ جس کی طرف اوپر چند جانوروں کے محاوراتی استعمال کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے، جنم لینے والے سوال کم از کم محدود نہیں اور مستقبل

میں اُن میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔ لیکن سر دست وقت موجود نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وقت پورا ہو گیا ہے اس لیے اونٹ، بلی، چڑیا اور فاختہ کے محاوراتی استعمال۔۔۔

ایک لمحہ توقف کیجیے میرے خدا مجھے کچھ یاد آ گیا جس سے اس تحریر کا اختتام بنایا جا سکتا ہے۔ شتر گربگی اور چڑ گھ جانوروں سے یاد آیا۔ ان دنوں، یعنی بالکل آج کل میں ایک امریکن سائنس فکشن رائٹر Ted Chiang کی کہانیوں کی کتاب Exhalation میں سے ایک کہانی پڑھ رہا ہوں۔۔۔ اب یہ ورچول سیلف کی ہدایت پر پوسٹ نہیں لگا رہا اور اگرچہ زمانہ Post-Truth کا ہے لیکن یہ Truth ہے۔۔۔ تو اس کہانی کا ٹائٹل ہے The lifecycle of Software Objects یہ ایک لڑکی کی کہانی ہے جو ایک چڑیا گھر میں پارٹ ٹائم Zoo keeper رہ چکی ہے لیکن اب چونکہ ایک سوفٹ ویر انجینیر بھی ہے اس لیے اُسے ایک سوفٹ ویر ڈیزائننگ کرنے والی فرم Gamma Blue میں جاب مل جاتی ہے۔ یہ لوگ ورچول پالتو جانور ڈویلپ کرنے کے ایک بڑے پراجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ ان ورچول پالتو جانوروں کے سوفٹ ویر میں ایک مکمل Genome ڈال دیا گیا ہے۔ خریدنے والے انہیں بچپن سے بڑے ہونے تک اپنی خواہشات کے مطابق پالتے ہیں۔ اب اس سارے پراجیکٹ کے اندر کیا ہوتا ہے؟ ظاہر ہے یہاں بتایا نہیں جا سکتا اور ویسے بھی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی کافی طویل ہے۔ لیکن یہاں صرف ایک بات کا ذکر کروں گا ایک عجیب ساڈرانے والا خیال جو کہانی پڑھتے ہوئے آیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم انسان بھی اب اس Metaverse میں پالتو ورچول انسان ہیں جو خود بھی دوسرے ورچول انسانوں کو اپنی خواہشات کے مطابق پالتے ہیں۔ پالتو بننے، بنانے اور بنوانے کے بے پناہ ادبی، غیر ادبی اور بے ادبی امکانات ہیں۔ اور پھر آخری سوال۔۔۔ کہیں۔۔۔۔ وہ پالتو بنوانے والے کہیں اور تو نہیں بیٹھے؟ کیا سلی کون ویلی میں یا کہیں اور؟ میں نہیں جانتا۔ اگر آپ جانتے ہوں تو براہ کرم آف لائین رابطہ کیجیے۔

آپ سب خواتین و حضرات کا بے حد شکریہ۔

فارانی صاحب

ڈاکٹر شفیق عجمی

۹ جنوری ۲۰۲۱ء کو ڈاکٹر شیرانی مرحوم کے لئے منعقدہ تعزیتی ریفرنس میں ایک ادھورا مضمون پڑھا تھا جسے بعد میں مکمل کرنے بیٹھا، خاتون بھی قریب ہی تھیں۔ لکھتے لکھتے نجانے کیا خیال آیا کہ لکھنا چھوڑ کر کہا کہ شاید ایک مضمون مجھے فارانی صاحب پر بھی لکھنا۔۔۔ وہ ناراض ہو کر بولیں کہ خدا کا خوف کریں، وہ آپ کے دوست ہیں اور۔۔۔ اگلے روز یعنی ۱۷ جنوری کو فارانی صاحب کی وفات کی خبر ملی۔

اِناللہ واِناالیہ راجعون

نماز عصر کے بعد چودھری کالونی سمن آباد کی مسجد علی المرتضےٰ میں ان کا جنازہ ہوا۔ سوشل میڈیا پر ان کی وفات کی خبر دی گئی تھی۔ چھٹی کا دن اور سرد ترین موسم تھا، پھر بھی احباب کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔ یونیورسٹی سے وابستہ ان کے دوست اور شاگرد بھی ان کو الوداع کہنے کے لئے موجود تھے۔

جنازے کے بعد ہمت کر کے میں ان کے آخری دیدار کے لیے آگے بڑھا، سفید کفن میں لپٹے ہوئے فارانی صاحب کا چہرہ کھلا رکھا گیا تھا، زرد اور کمزور چہرہ، جسے پہچاننا بھی مشکل تھا۔ موت ان کی دلنواز مسکراہٹ بھی لے اڑی تھی۔

ان کے بیٹے سَحبان نے بتایا کہ ستمبر میں ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور اس کے بعد سے وہ کمزور ہوتے چلے گئے تھے۔ کچھ دن ان کی زبان لڑکھڑاتی رہی، چلنا پھرنا دشوار ہو گیا لیکن پھر وہ سنبھل گئے، وائرس کی دوسری لہر کے بعد یونیورسٹی بند ہو گئی۔ یہ ان کے لئے فالج سے بڑا حملہ تھا۔ متین اکمل کہہ رہا تھا کہ یونیورسٹی بند ہونے کے باوجود وہ دسمبر میں ایک روز یونیورسٹی پہنچ گئے اور دیر تک بخاری آڈیٹوریم کے سامنے بیٹھے اس کے در و دیوار کو تکتے رہے۔

مجھے یاد آیا کہ کرونا کی شدت کے دنوں میں ان کا فون آیا تو وہ سماجی فاصلوں کی ہدایات پر بے اختیار ہنس رہے تھے۔ میں آخری بار ان کی آواز سن رہا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ فاصلے بہت بڑھ جائیں گے۔ وہ ملتان میں پیدا ہوئے اور ملتان ہی میں پیوندِ خاک ہوئے۔

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

گورنمنٹ کالج اور اس کے در و بام سے ان کی دوستی اٹوٹ تھی۔ وہ ۱۹۶۲ء میں سنٹرل ماڈل سکول سے میٹرک کر کے سال اول کے طالب علم کی حیثیت سے کالج میں داخل ہوئے۔ انٹر میڈیٹ ۱۹۶۴ء اور بی اے ۱۹۷۱ء میں کیا۔ یہیں سے ۱۹۸۳ء میں انگریزی ادب میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔

ان کے کالج کے زمانے کے بیشتر ساتھی بڑے بڑے عہدوں تک پہنچے۔ایک فنکارانہ طبیعت لے کر پیدا ہونے والے طارق سلمان خاں فارانی نے ۱۹۸۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک مترنم گوشے کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ان کو وہاں بیٹھے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ ان سے مطمئن،اور مسرور شخص دنیا میں کوئی اور نہیں۔فنکار طلبہ کے جھرمٹ میں بیٹھے،ان کی تربیت کرتے اور ان کو موسیقی کے اسرار و رموز سکھاتے ان کی زندگی کی شام ہو گئی۔

انہوں نے زندگی میں آگے بڑھنے اور آگے بڑھنے کے لئے دوسروں کی ٹانگیں کھینچنے کے خیال کو کبھی دل میں پیدا ہونے نہیں دیا۔ان کے ارد گرد ایسے تماشے ہوتے تھے جن پر وہ نفرین بھیجتے تھے اور ایسے لوگوں کو ایک فاصلے سے ملتے تھے۔وہی لوگ ان کو بد دماغ اور مغرور قرار دیتے تھے۔کبھی خود پسندی کا طعنہ کبھی بے خودی کا چرچا،لیکن فارانی صاحب کبھی ان کے دباؤ میں نہیں آئے۔

۱۹۹۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور پہنچنے سے بہت پہلے میں میوزک سوسائٹی کی سرگرمیوں سے آگاہ تھا۔۱۹۷۲ میں میرا اسکول کا ساتھی عزیز ظفر آزاد مجھے وہاں لے کر گیا تھا۔میں نہیں جانتا تھا کہ کبھی اس کا حصہ بنوں گا۔

نذیر احمد میوزک سوسائٹی میں ہر اختتامِ ہفتہ پر باقاعدگی سے کنسرٹ منعقد ہوتا رہا ہے جس میں کالج کے فنکار طلبہ اپنے فن اور اپنی ریاضت کے نمونے پیش کرتے تھے۔فارانی صاحب کا دیا ہوا اعتماد اُن کے ایک ایک سُر سے جھلکتا محسوس ہوتا تھا۔شعبہ اردو میں آنے کے بعد میں نے بھی اپنے ایک ساتھی،پروفیسر عارف ثاقب کے ہمراہ کنسرٹ میں شرکت کرنا شروع کیا بلکہ حوصلہ یہاں تک بڑھا کر گھرانوں کے فنکار لڑکوں کے درمیان بیٹھ کر غزل سرا بھی ہونے لگے۔فارانی صاحب،موسیقی کے ساتھ ہمارے شغف کو دیکھ کر ایک مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کرنے لگے۔

میوزک سوسائٹی میں ہماری آمد و رفت کی اطلاعات،صدرِ شعبہ اور اوپر تک بھی پہنچنے لگیں۔شعبہ تاریخ کے پروفیسر مسعود رضا(مرحوم)میوزک سوسائٹی کے سٹاف ایڈوائزر تھے،ان کی آواز سریلی نہیں تھی،لیکن کن رس تھے۔مہربان طبیعت کے مالک تھے اور فارانی صاحب کے ساتھ ان کی اچھی نبھ رہی تھی۔سالانہ داخلوں کے موقع پر مجھے میوزک ٹرائل کمیٹی کے ممبر کی سے کام کرنے کا موقع ملنے لگا۔۱۹۹۹ء میں مسعود رضا صاحب کی ریٹائرمنٹ کے بعد حیثیت مجھے پرنسپل صاحب نے سوسائٹی کا ایڈوائزر بنا دیا۔

ابتدا میں اس فیصلے سے میں اور فارانی صاحب دونوں پریشان ضرور ہوئے۔وہ ابھی میرے مزاج آشنا نہیں تھے اور میں ان کی بد دماغی کے جھوٹے سچے قصے سن چکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کام کیسے چلے گا۔لیکن یہ کام ایسا چلا کہ چلتا ہی چلا گیا جب تک کہ ۲۰۱۳ء میں یونیورسٹی نے مجھے خیر باد نہیں کہہ دیا۔

میوزک سوسائٹی میں طلبہ کا نظم و ضبط مثالی تھا۔ غیر سنجیدہ عناصر کے لئے وہاں کوئی جگہ نہ تھی۔ داخلوں کے بعد سوسائٹی کی ممبر شپ کا کام مکمل کیا جاتا۔ ہر ہفتے کو کنسرٹ کا انعقاد لازمی تھا اور ہر سال سوسائٹی کے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لایا جاتا۔

میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ اپنی کلاسوں سے فارغ ہو کر کچھ وقت فارانی صاحب کے ساتھ گزاروں۔ ان کے ساتھ طویل مشاورت کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میوزک سوسائٹی کے بارے میں اس عام تاثر کی نفی ہونی چاہیے کہ یہاں محض گانا بجانا ہوتا ہے۔ پھر سب نے دیکھا کہ نذیر احمد میوزک سوسائٹی، یونیورسٹی کی ثقافتی سرگرمیوں کا ناگزیر حصہ بن گئی۔ اس سے پہلے سوسائٹی محض ہفتہ وار کنسرٹ تک محدود تھی یا پھر سالانہ کھیلوں کے موقع پر اور بالخصوص آخری روز اوول گراؤنڈ میں سوسائٹی اپنا رنگ جماتی تھی۔ اب غالب، اقبال اور فیض کے کلام کی گائیکی کے مقابلوں کا اہتمام بھی کیا جانے لگا۔ یومِ اقبال کی تقریب کو ایک روایت کا درجہ حاصل ہو گیا۔ یونیورسٹی کے نامور اساتذہ کو کلامِ اقبال کے فکری و فنی پہلوؤں پر گفتگو کے لئے مدعو کیا جانے لگا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سعادت سعید کا نام سرِ فہرست ہے جنہوں نے ہمیشہ طلبہ کی دعوت کو قبول کیا اور انہیں اپنے خطاب سے لطیف کیا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، پروفیسر طارق زیدی اور مرزا اطہر بیگ نے بھی مختلف موقعوں پر خوش دلی سے ایسی تقریبات میں شرکت کی۔

میوزک سوسائٹی میں سمعی و بصری (Aidio - visual) کولیکشن بھی قائم کی گئی جس میں برِ صغیر کے نامور فنکاروں کی ریکارڈنگ کو محفوظ کیا گیا۔ مختلف تقاریب میں طلبہ کو یہ پروگرام دکھائے جاتے تھے۔

۲۰۰۰ء میں ملکہ ترنم کی وفات پر سوسائٹی میں "گائے گی دنیا گیت میرے" کے عنوان سے ایک خراج عقیدت (Tribute) کا اہتمام کیا گیا۔ فیض احمد فیض کے جشن صدی کے موقع پر "تیری آواز کے سائے" کے تحت ایک شاندار پروگرام ترتیب دیا گیا جس میں محترمہ منیزہ ہاشمی، ڈاکٹر علی مدیح ہاشمی اور عدیل ہاشمی بطور خاص شریک ہوئے۔

سالانہ کنسرٹ کو ثقافتی ورثہ (Cultural Heritage) کا نام دیا گیا جس میں سوسائٹی کے فنکار طلبہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ کنسرٹ شروع ہونے سے کئی گھنٹے پہلے ہی بخاری آڈیٹوریم میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی اور اس کے باہر ھاؤس فل کا بورڈ آویزاں کرنا پڑتا۔

آل پاکستان موسیقی کانفرنس میں بھی سوسائٹی کے طلبہ اپنی آواز کا جادو جگاتے اور نمایاں کامیابیاں حاصل کر کے لوٹتے۔

میوزک سوسائٹی کے فعال کردار کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اگست ۲۰۰۶ء میں نوبل انعام یافتہ سائنس دانوں کے جی سی یونیورسٹی کے دورے میں ان کو میوزک سوسائٹی میں بھی لے جایا گیا جہاں طلبہ کی پرفارمنس سے وہ خوب محظوظ ہوئے۔

ہر سال جی سی میں داخلوں کے وقت ایک مشکل مرحلہ میوزک ٹرائل کی صورت میں سامنے آتا۔ چند نشستوں کے لئے فنکاروں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہوتی جن میں ہمیشہ شام چوراسی اور پٹیالہ گھرانے کا کوئی نہ کوئی لڑکا بھی شامل ہوتا جو نو عمری ہی سے لے اور سُر کے پکے ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود داخلہ کسی استحقاق کی بنیاد پر نہیں بلکہ کارکردگی کے میرٹ پر دیا جاتا۔ انتخاب کا معیار سخت اور کڑا، پالیسی صرف میرٹ اور عمل سراسر شفاف ہوتا تھا۔ اوپن ٹرائل میں امیدوار کے والدین یا سرپرستوں کو بھی شرکت کی اجازت تھی کہ اس پورے عمل کا مشاہدہ کر سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس انتخاب کے خلاف کبھی کوئی عذر داری سامنے نہیں آئی۔ شفافیت کو قائم رکھنے میں ہم نے اپنا اپنا کردار نبھایا۔ فارانی صاحب کا کریڈٹ یہ بھی تھا کہ ان کے قریب ترین دوست بھی ان سے سفارش کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ فارانی صاحب کا معمول تھا کہ صبح یونیورسٹی میں داخل ہوتے تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ ہوتا تھا جس میں چوک پکی ٹھٹھی کے ایک پنواڑی سے بنوائے گئے خصوصی پان اور سگریٹ کے کئی پیکٹ ہوتے تھے۔ سوسائٹی پہنچ کر ناشتہ منگواتے، کبھی گھر سے بھی لے کر آتے تھے۔ شام تک بار بار چائے پی جاتی اور سگریٹ سے سگریٹ سلگایا جاتا۔ صرف ریاضت کے دوران وقفہ آتا۔ دوپہر کا کھانا کھاتے ان کو کم ہی دیکھا گیا۔ یونیورسٹی کا وقت ختم ہو جاتا، شام ہو جاتی لیکن سوسائٹی کے بلب روشن رہتے جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ فارانی صاحب ابھی تشریف فرما ہیں۔ جب اندھیرا پھیل جاتا اور سوسائٹی بھی اکتا کر سائیں سائیں کرنے لگتی تو فارانی صاحب سیڑھیاں اترتے اور یونیورسٹی سے نکل کر گھر کا رخ۔۔۔۔ نہیں کرتے تھے بلکہ چوک یتیم خانے کے قریب اپنے ایک دوست سلیم کے کارخانے میں پہنچتے جہاں ان کی نشست گاہ کا بندوبست تھا۔ جوتوں کا کارخانہ تھا۔ اس وقت کاریگر سب جا چکے ہوتے تھے۔ فارانی صاحب نے مجھے کئی بار بتایا کہ وہ وہاں بانسری پر ریاض کرتے ہیں۔ وہ گھر کس وقت پہنچتے تھے۔ یہ بتانا انہوں نے کبھی ضروری نہیں سمجھا۔ مجھے لگتا تھا کہ انہیں گھر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

ریاضت فن کا لازمہ ہے لیکن وہ اس کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتے تھے جن سے کسی "کسبی" کی آگاہی بھی محال ہے۔ مجھے بلند فشار خون نے آن دبوچا تو بڑی پریشانی لاحق ہوئی۔ ابتدا میں دوائیں بھی مؤثر ثابت نہیں ہو رہی تھیں۔ ایک روز انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ باقاعدگی سے ریاض کیا کریں، میں نے گھر میں تذکرہ کیا تو مجھے ترت جواب ملا کہ اس علاج سے آپ کا بلڈ پریشر تو شاید ٹھیک ہو جائے لیکن ہمارا ضرور بڑھ جائے گا۔

کارخانے میں فارانی صاحب کا ریاض ان کے دوست کے انتقال تک معمول کے مطابق جاری رہا۔ ایسا ٹھکانہ پھر ان کو کہاں مل سکتا تھا۔

دنیا میں چند ایک دوست ایسے تھے کہ جن کے اصرار پر وہ پرفارمنس کے لئے راضی ہو جاتے۔ ایک دو بار انہوں نے ہاسٹلز میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ راگ دیس ان کا پسندیدہ تھا اور اس کی ریاضت بھی بہت تھی۔ وہ دل سے اسے پرفارم کرتے۔

قومی اور صوبائی سطح کے مقابلوں کے لئے وہ طلبہ پر بہت محنت کرتے تھے اور ان کی کامیابی کو اپنا انعام سمجھتے تھے۔ گورنر ہاؤس لاہور میں ملک کی ایک اہم ترین شخصیت کی آمد پر مختلف جامعات کے طلبہ نے کلام اقبال پیش کیا۔ سوسائٹی کے طلبہ کی

پرفارمنس کا خصوصی اعتراف کیا گیا۔ دو یا تین لاکھ روپے کا کیش پرائز بھی انہیں دیا گیا جو انہوں نے خود ہی آپس میں تقسیم کر لیا۔ فارانی صاحب سخت ناراض تھے کہ اس بندر بانٹ میں انہوں نے نواز جعفر حسین کو کیوں فراموش کر دیا جو انہیں دو ہفتے تک پریکٹس کرواتا رہا تھا۔

فارانی صاحب کا گھرانہ مذہبی تھا لیکن انہوں نے بظاہر خود کو کبھی مذہبی آدمی کے طور پر پیش نہیں کیا۔ البتہ جمعے کے روز وہ گھر سے خاص طور پر تیار ہو کے آتے تھے۔ شلوار قمیض کے ساتھ واسکٹ اور پاؤں میں کُھسہ، نمازِ جمعہ ہمیشہ یونیورسٹی کی مسجد میں ادا کرتے تھے۔ ان کے والد ڈاکٹر یو۔ ایم سلیم خاں فارانی (م ۲۰۰۷ء) بنیادی طور پر ایک ماہر لسانیات (Linguist) تھے۔ اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور کے شیخ الجامعہ بھی رہے۔ مذہب کی طرف ان کا میلان فطری تھا۔ بچے بھی ان کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے سوائے طارق فارانی صاحب کے جو فنکارانہ طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ جس مسجد میں ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی اس کی تعمیر میں بھی ان کے بھائیوں خصوصاً چھوٹے بھائی جابر فارانی کا حصہ نمایاں رہا ہے۔ زاہد فارانی ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ وہ بھی کلاسیکی موسیقی کا عملی ذوق رکھتے تھے۔ لیکن جنازے پر ان سے ملاقات ہوئی تو سفید ریش نظر آئے۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ مدت سے اپنا شوق چھوڑ چکے ہیں۔ طارق فارانی جب تک زندہ رہے، اپنے شوق کو مرنے نہیں دیا۔

۲۰۱۹ء میں انہوں نے اپنی فیملی کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی۔ مجھے معلوم ہوا تو انہیں آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے کہہ کر مبارک دی جس کا جواب انہوں نے ایک زوردار قہقہے کی صورت میں دیا۔

دیکھا گیا ہے کہ بعض بڑے طاقت ور افسروں کو بھی ریٹائرمنٹ کا دکھ چاٹ جاتا ہے۔ خاص طور پر ایسے افسروں کو جن کے ہاتھ لمبے، پاؤں زمین سے اوپر اور آنکھیں پھری ہوئی ہوتی ہیں، ریٹائرمنٹ ان کے لئے ایک سانحہ بن کر آتی ہے جو ان کو یکسر بدل کر رکھ دیتی ہے، پھر بعد از ریٹائرمنٹ ان کے مذہب اور اخلاق پر درس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ فارانی صاحب تو پیری مریدی کی طرح افسری ماتحتی کے بھی قائل نہیں تھے۔ پھر وہ کوئی بڑے افسر بھی نہیں تھے محض پروگرام افسر تھے اور یہ افسری بھی ان کے ذوقِ جمال کی تسکین کا ذریعہ تھی اور بس۔ آخر ان کی ریٹائرمنٹ کا وقت آن پہنچا۔ میں اداس تھا لیکن ان کے چہرے پر ملال کے کوئی آثار نہ تھے۔ انہوں نے میوزک سوسائٹی کی چابیاں رجسٹرار آفس بھجوا دیں اور مجھے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ از سرِ نو ملازمت (Re-employment) کے لئے نہ تو کوئی درخواست دیں گے اور نہ ہی صاحب سے جا کر ملیں گے۔ میں نے کہا کہ ایسا کرنے کی آپ کو ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

راقم الحروف نے میوزک سوسائٹی کے ایڈوائزر کی حیثیت سے ایک نوٹ لکھا اور فائل لے کر ڈاکٹر سہیل احمد خاں کے پاس جا پہنچا جو ان دنوں ڈین کے منصب پر فائز تھے اور فارانی صاحب کے زبردست مداحوں میں سے تھے۔ وہ حیران ہو کر بولے کہ اچھا فارانی صاحب ریٹائر ہو گئے؟ پھر محبت سے بولے کہ ان کو ریٹائر نہیں کیا جا سکتا۔ انکی سفارش (Recommendation) کے بعد وائس چانسلر آفس پہنچا۔ ڈاکٹر خالد آفتاب بھی نوٹ دیکھ کر مسکرائے۔ فارانی صاحب کو اٹھ کر کسی آفس تک جانے کی

زحمت اٹھانا نہ پڑی۔ بغیر کسی تعطل کے سال بہ سال ان کے کنٹریکٹ کی تجدید ہوتی رہی اور وہ ۷۵ برس کی عمر میں آن ڈیوٹی ہی دنیا سے رخصت ہوئے۔

انہی دنوں ایک "نامور" پروفیسر بھی ریٹائر ہوئے تھے۔ ریٹائرمنٹ سے اگلے ہی روز کنٹریکٹ کے لئے ان کو صاحب کی چوکھٹ پر گڑگڑاتے ہوئے دیکھا گیا۔ ان کی حالت سے لگتا تھا کہ اگر ان کا کام نہ ہوا تو وہ ضرور فوت ہو جائیں گے لیکن ان کو کنٹریکٹ نہ مل سکا اور:

وہ ابھی تک فوت بھی نہیں ہوئے

یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ ان کا فارانی صاحب کے ساتھ کیا موازنہ؟

فارانی صاحب نے اپنی شان کے ساتھ زندگی گزاری۔ ۲۰۱۴ء میں ان کی اکلوتی بیٹی نابغہ کا انتقال ہوا تو وہ ڈگمگا گئے۔ ان کو اپنی پیاری بیٹی کے ساتھ بہت لگاؤ تھا۔ وہ سدا کی بیمار تھی۔ فارانی صاحب اس کے لئے پریشان رہتے۔ پھر ایک دن اچانک وہ موت کی آغوش میں چلی گئی۔ میں ان دنوں یونیورسٹی میں نہیں تھا۔ مجھے خبر ہی نہ ملی۔ چند دنوں بعد ان کا فون آیا تو انہوں نے گلہ کیا۔ میں اسی وقت تعزیت کے لئے ان کے پاس پہنچا۔ اس روز ان کو بڑے کرب میں محسوس کیا۔

فارانی صاحب اپنی زندگی میں ایک بڑے جذباتی بحران سے بھی گزرے جس کا شاید میں واحد گواہ ہوں۔ ان کو دیدۂ تر کے ساتھ میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا نہ ہی اس کے بعد ان کو ایسی بے بسی سے دوچار دیکھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کسی شدید طوفان میں کوئی تناور درخت اپنی جڑوں سے اکھڑ کر زمین پر آپڑا ہو۔ وہ کسی ایسے مسافر کے لئے تڑپ رہے تھے جو زندگی کی اگلی منزلوں کی طرف روانہ ہو چکا تھا اور پیچھے مڑ کے دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ میں ہر روز وداع و وصل کے نئے نئے قصے گھڑ کے ان کو سناتا اور تسلی دیتا رہتا۔ وہ بار بار پہلو بدلتے اور یقین اور بے یقینی کے عالم میں سنتے رہتے اور پھر آہستہ آہستہ اپنی گہری خاموشی میں اترتے چلے گئے۔ انہوں نے اپنے غم کے ساتھ سمجھوتہ کب اور کیسے کیا، مجھے علم نہ ہو سکا۔

فارانی صاحب ہمیشہ خوف اور خوشامد سے دور رہے۔ یہی ان کا شخصی کمال اور ان کی شخصیت کا راز تھا۔ رُبع صدی پر پھیلے ہوئے دوستانہ تعلق میں بھی احترام کو اولیت حاصل تھی۔ ادبی چھیڑ چھاڑ بھی ہو جاتی لیکن ہمارے مزاجوں میں ستائش باہمی کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ غزل گائیکی ہمارا پسندیدہ مشترکہ موضوع تھا۔ وہ اس حوالے سے بہت کچھ جانتے تھے۔ جب بھی بیٹھنے کا موقع ملتا اس پر گفتگو ہوتی۔ مختلف غزل گائیک اور ان کا فن زیرِ بحث آتا۔ وہ بڑی مہارت سے ان کے فن کی باریکیوں پر بات کرتے۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوا۔

فارانی صاحب واہ واہ کے لئے کام نہیں کرتے تھے۔ ان کی موزوں کی ہوئیں دُھنیں سن کر جی خوش ہوتا تھا لیکن تعریف ان کے من کو بھاتی ہی نہ تھی۔ آخر ایک موقع ہاتھ آیا جب وہ ہماری زبان روک نہیں سکتے تھے۔

۲۰۱۲ء میں یونیورسٹی کی جانب سے ان کی خدمات کے اعتراف میں ایک شاندار تقریب منعقد کی گئی۔ ان کے نامور شاگردوں کی بڑی تعداد اس موقع پر موجود تھی۔ سب نے اپنے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ موقع غنیمت جانتے ہوئے میں نے بھی درج ذیل الفاظ کے ذریعے فارانی صاحب کی محبتوں کا کچھ نہ کچھ حق ادا کرنے کی کوشش کی۔

آج کی یہ خوبصورت شام ہمیشہ یادگار رہے گی۔ برصغیر کی اس عظیم درسگاہ کے ساتھ علم و تحقیق اور ادب و فن کی کتنی ہی تابندہ روایات وابستہ ہیں، جنہیں قائم کیا گیا، نبھایا گیا اور آگے بھی بڑھایا گیا۔ آج کی یہ شام اس لئے بھی یادگار رہے گی کہ اس شام میں ایک نئی روایت کی طرح ڈالی گئی ہے، ایک تقریب تحسین کمال کا آغاز کیا گیا ہے جس کا سہرا بلاشبہ اس درسگاہ کے سربراہ کے سر ہے جنہوں نے ضروری سمجھا کہ طارق فارانی صاحب کی ۳۰ برسوں پر محیط خدمات کو خراج تحسین پیش کیا جانا چاہیے۔ ان کا یہ عزم اس رسمِ قدیم کے منافی ہے کہ جس میں:

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

یہ علم دشمن اور کم نظر معاشروں کا چلن ہے کہ اہل کمال کی زندگی میں ان کے جوہر کمال کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا ہے اور موت کے بعد ان کو دیوتا کا درجہ دے کر ان کی پرستش شروع کر دی جاتی ہے، لیکن آج اس رسم کے برعکس، ہم سب اپنے درمیان موجود ایک سچے فنکار کو سلام (Salute) کرنے جا رہے ہیں جو سال ہا سال سے ستائش اور صلے کی پروا کیے بغیر اپنی ہی دھن میں مست غزل خواں چلا جا رہا ہے۔

ہمارے درمیان ایسے کتنے ہی آئیڈیلسٹ ہمیشہ موجود رہے ہونگے جو ایک فنکار ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھتے ہوں گے لیکن ان کے حالات ان کے آڑے آتے رہے ہوں گے اور انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھا دیئے ہوں گے ، اپنا رستہ بدل لیا ہو گا لیکن کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو زمانے کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیتا ہے فن کی تپش میں مبتلا رہتا ہے اور ایک فنکار کے طور پر خود کو منوا لیتا ہے، مگر اپنے فن کو کمرشل کرنے سے انکار کر دیتا ہے، یہ ہمارا آج کا فنکار ہے جو اپنی مادرِ علمی کے طلبہ کو فن کا درس دیتا ہے اور پھر عملی طور پر ان کو غالب، اقبال اور فیض کے لازوال کلام سے آراستہ کر کے نئی منزلوں کی طرف سفر کا اشارہ دیتا ہے اور اپنے کام کو ہی اپنا انعام سمجھتا ہے۔

غالب، اقبال اور فیض، زبانِ اردو کے وہ عظیم المرتبت شاعر ہیں جن کے منتخب کلام کو برصغیر کے ہر بڑے موسیقار نے کمپوز کیا اور ہر نامور گائیک نے اعزاز سمجھ کر گایا اور فن کی بلندیوں کو چھو لیا۔ ان کے بعد کس میں ہمت تھی کہ ان شعراء کے کلام کی طرف ہاتھ بڑھائے لیکن یہ کارنامہ بھی ہمارے فنکار نے سرانجام دیا۔

جن دوستوں نے فارانی صاحب کی مرتب کی ہوئی دھنوں میں درج ذیل کلام سنا ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ رنگ، آہنگ اور انداز، فارانی صاحب کا خاص اپنا رنگ ہے جس پر کسی دوسرے کمپوزر کی چھاپ موجود نہیں۔

وہ آ کے خواب میں تسکین اضطراب تو دے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

پھر مجھے دیدۂ تر یاد جگر تشنہ فریاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

دگرگوں ہے جہاں ، تاروں کی گردش تیز سے ساقی
دل ہر ذرہ میں غو غائے رستا خیز ہے ساقی

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

اس کے علاوہ انہوں نے صوفیانہ کلام اور ملی نغمات کو بھی وجد آفریں دھنوں میں ڈھالا جنہیں ہمارے طلبہ وطالبات نے مختلف کانفرنسوں اور مقابلوں اور غیر ملکی وفود کے سامنے پیش کر کے اپنی درسگاہ کا نام روشن کیا۔

تخلیق فن جسے غالب نوائے سروش سے تعبیر کرتا ہے ایک پر اسرار اور پیچیدہ عمل ہے جس کا تجزیہ مشکل تر ہے۔ ناقدین نے اس کی سعی کی ہے لیکن اس کو مکمل طور پر گرفت میں نہیں لایا جاسکا۔

عظیم موسیقار اور اولڈ راوین خواجہ خورشید انور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کسی ساز (Instrument) کی بجائے ماچس کی ڈبیا پر انگلیوں سے ترنم (Rythm) کے ذریعے دھن مرتب کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ جب فارانی صاحب بظاہر بانسری پر ریاض کر رہے ہوتے ہیں تو دراصل وہ اس وقت کسی دُھن کو عالم خیال سے سُروں میں اتارنے اور سجانے کی کوشش میں منہمک ہوتے ہیں۔ ویسے ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ انتخابِ کلام کے بعد گھنٹوں نہیں بلکہ دنوں اور ہفتوں تک اس کے فکری و فنی پہلوؤں پر قریبی دوستوں کے ساتھ بحث (Discussion) کرتے اور پھر کہیں جا کر اس کی شکل بنتی۔ یونہی تو نہیں کہا گیا کہ

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرع تر کی صورت

ایک شجر کو موزوں دُھن میں ڈھالنے کے لئے بھی خون جگر صرف کرنا پڑتا ہے۔ فارانی صاحب موسیقی کے ماہر ہی نہیں عالم بھی ہیں اور اس کا اندازہ چند سال قبل اس وقت ہوا جب اس درسگاہ کے شعبہ ریاضیات کی دعوت پر انہوں نے موسیقی اور ریاضیات

'Music and Mathematics'' کے موضوع پر ایک عالمانہ لیکچر دے کر ریاضی دانوں کو حیران کر دیا تھا۔ کاش اس وقت اس بے مثال لیکچر کو محفوظ کر لیا جاتا۔

فارانی صاحب کے فن کا جائزہ تو فنِ موسیقی سے وابستہ کوئی استاد ہی لے سکتا ہے اور ہمارے لئے تو موسیقی کے طالب علم ہونے کا دعویٰ کرنا بھی مشکل ہے۔ البتہ بہت پہلے

راوی کے لئے لکھی گئی ایک مختصر نظم فارانی صاحب کی نذر ہے:

اے مغنی! اے مرے محبوب دوست
تیرے نغموں سے نکھر جاتا ہے احساسِ جمال
تیری لے سے دل کی ہر دھڑکن جواں
اے مغنی! اے میرے محبوب دوست
تیرے گیتوں سے بہل جاتا ہے دل

تیرے نغموں سے سنور سکتی ہے ساری زندگی
تو ذرا آگے بڑھے تو آج بھی
حُسنِ فن سے زندگی کا حسن ہوتا ہے عیاں

فارانی صاحب نے اپنی مادر علمی کی ثقافتی زندگی کے فروغ کے لئے جس یکسوئی اور جانفشانی سے اپنا کردار ادا کیا ہے، اس کے اعتراف کے لئے منعقد ہونے والی آج کی تقریب ہم سب کے لئے ہمیشہ یادگار رہے گی۔

مولانا ابوالکلام آزاد۔۔۔انسان دوستی پر مبنی سیاسی مذہبی اساسیت

ظفر سپل

یکم جنوری 1920ء کو مولانا آزاد پہلی بار بنگال کی صوبہ بدری اور رانچی کی نظر بندی سے آزاد ہو کر باہر نکلے تو ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایک اور طرح کی جلوہ آرائی تھی۔۔۔ تحریک خلافت کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس وقت کی سلطنتِ عثمانیہ میں شامل حجاز کے شہر مکہ میں پیدا ہونے والے مولانا آزاد تحریک خلافت کے سر گرم سیاسی رہنما کے طور پر سامنے آئے اور مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان، گاندھی اور جواہر لعل نہرو کے ساتھ مل کر انہوں نے ہندوستان کی سیاسی فضا میں زبردست تحرک پیدا کر دیا لیکن 1924ء میں ترکوں نے خود ہی خلافت کے خاتمے کا اعلان کر کے ہندوستان کے جذباتی مسلمانوں کو ششدر کر دیا۔۔۔ خلافت کا ادارہ ختم ہو گیا، مگر کانگریس اور کانگریسی رہنما گاندھی اور نہرو کے ساتھ مل کر تحریک خلافت کے لیے سر گرم کردار ادا کرنے والے مولانا آزاد، گاندھی اور نہرو کی دوستی کے رشتے میں بندھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آل انڈیا کانگریس کا حصہ بن گئے۔ 1928ء میں ملک کے مستقبل کے بارے میں شائع ہونے والی نہرو رپورٹ نے مسلم قومی رہنماؤں کی سیاسی تقسیم پر حتمی مہر ثبت کر دی۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خان تو عام جماعت المسلمین کے ساتھ سر سید کے دکھائے ہوئے راستے پر گامزن ہو گئے مگر مولانا آزاد نے کانگریس سے اٹوٹ رشتہ قائم کر لیا۔ پھر ان کی سیاسی زندگی کے اگلے تیس برس تاریخ کا ایک مختلف باب ہیں، جس سے ان کے دینی مرتبے کو بھی ضعف پہنچا۔ اب ان کے اور عامۃ المسلمین کے درمیان ایک دیوار کھڑی تھی اور ایک وقت ایسا بھی آیا، جب کلکتے کے مسلمانوں نے ان کی امامت میں نماز عید ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد 17 اگست 1888ء کو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی خیر الدین قادری نقشبندی تھا۔ وہ افغان نژاد صوفی منش انسان تھے، جو اپنے والد کی جلد وفات کے بعد دہلی میں اپنے نانا کے پاس آ گئے۔ انہوں نے ہی ان کی پرورش اور تربیت کی۔ 1957ء کے ہنگام میں مولوی خیر الدین مکہ معظمہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ یہیں ان کی شادی مدینہ منورہ سے تعلق رکھنے والی ایک نہایت لکھی پڑھی خاتون شیعہ عالیہ بنت محمد سے ہوئی اور یہیں مولانا آزاد پیدا ہوئے۔ ان کا نام احمد رکھا گیا۔ بعد میں مولوی خیر الدین وطن واپس آ گئے اور 1890ء میں اس خاندان نے کلکتہ میں سکونت اختیار کر لی۔

اگرچہ مولانا آزاد کے حالات زندگی کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ خود ان کی اپنی معروف سوانح حیات تذکرہ بھی دستیاب ہے اور اس پر محققانہ مضامین بھی لکھے گئے ہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ مولانا کی ابتدائی زندگی اور اس حوالے سے تاریخ اور سنن میں تضاد پایا جاتا ہے۔ خیر، یہ بات عمومی طور پر طے شدہ ہے کہ مولانا کی تعلیمی اٹھان نہایت تیز رفتار تھی اور انہوں نے اس عمر میں وہ علمی کارنامے انجام دینے شروع کر دیئے تھے، جب عام طور پر طالب علم علمی کتب کتاب سے ابتدائی طور پر آشنا ہو رہے ہوتے ہیں۔ میرے لئے یہ بات بھی دلچسپی کا باعث تھی کہ وہ ابتدا میں شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ اپنا تخلص-94 آزاد رکھا

اور کلکتے کے مشاعروں میں غزلیں پڑھنا شروع کر دیں۔ 1899ء میں محض گیارہ سال کی عمر میں انہوں نے شاعری کا ماہوار رسالہ -94 نیر نگ عالم (ذیلی عنوان گلدستہ اشعار) شائع کیا، جو آٹھ ماہ تک باقاعدگی سے چھپتا رہا۔ ساتھ ہی وہ دوسرے رسالوں میں مضامین لکھنے لگے۔ ان کا پہلا قابل ذکر مضمون مئی 1902ء میں مخزن میں شائع ہوا، جو فن اخبار نویسی پر ہے۔ گو مضمون میں کوئی خاص بات نہیں اور خیالات بھی زیادہ تر انگریزی کتب سے ماخوذ ہیں، لیکن اس بات کی طرف ضرور اشارہ ملتا ہے کہ آزاد اخبار نویسی کی اہمیت کو سمجھ گئے تھے اور یہ بات بھی ان کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اگر اخبار کو یورپ میں سلطنت کا جزو اعظم سمجھا جاتا ہے تو صحافت یہی کردار ہندوستان میں بھی ادا کر سکتی ہے۔ اس وقت میرے ممدوح کی عمر صرف چودہ سال تھی اور میں جس نکتے کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کر رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ مضمون کے عنوان کے نیچے مضمون نگار کا نام کچھ اس طرح درج ہے۔۔۔-94 مولوی ابوالکلام محی الدین احمد آزادی ہلوی مقیم کلکتہ۔ مگر اس نکتے پر میں تفصیلاً آگے چل کر بات کروں گا۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں ابوالکلام آزاد نے -94 لسان الصدق-93 کے نام سے ایسا عمدہ رسالہ جاری کیا کہ حالی اسکے مداح ہو گئے۔

جب انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں مولانا حالی کی ملاقات مولانا آزاد سے ہوئی تو وہ یہ ماننے کیلئے تیار نہ تھے کہ سولہ سالہ لڑکا ابوالکلام آزاد ہے، جو لسان الصدق کا مدیر ہے۔ یہی حال مولانا شبلی کا تھا۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات ابوالکلام آزاد سے ہوئی تو وہ اس بے ریش لڑکے کو ابوالکلام آزاد کا بیٹا سمجھ کر مربیانہ گفتگو کرتے رہے۔ اس 1904ء کے آخر یا 1905ء کے آغاز میں مولانا شبلی کی ابوالکلام آزاد سے غالباً دوسری ملاقات بمبئی میں ہوئی تو انہوں نے آپ کو ندوۃ العلماء لکھنو بلا کر الندوہ کی ادارت میں شریک کر لیا۔ یہاں آزاد کا قیام لگ بھگ ایک سال رہا۔ یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی کہ اس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا اور اس ربط ضبط نے وہ گہرائی اختیار کی کہ استاد و شاگرد آپس کے راز و نیاز میں شریک ہو گئے۔ اب انہوں نے الندوہ کے شعبہ ادارت کو خیر باد کہا، امرتسر آئے اور ایک اور مشہور اخبار وکیل کی ادارت سنبھال لی۔ انہی دنوں ان کے بڑے بھائی ابوالنصر آہ کا انتقال ہوا تو وہ اپنے والد کے اصرار پر 1907ء میں کلکتے واپس آگئے اور ایک ہفت روزہ اخبار دار السلطنت کے ایڈیٹر بن گئے۔ -94 دار السلطنت سے وہ آٹھ نو ماہ بعد الگ ہو گئے اور دوبارہ کچھ عرصے کے لیے وکیل سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن اب خود ان میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔ وہ سرسید کے قائل نہیں رہے تھے، جبکہ وکیل کے مالک شیخ غلام محمد، سرسید کے گرویدہ تھے۔ اس طرح دونوں کی نہ نبھ سکی۔ پھر 1909ء میں ابوالکلام آزاد کے والد ماجد کا بھی انتقال ہو گیا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مستقلاً کلکتے آگئے، جو ملک کی علمی اور سیاسی زندگی کا ایک بڑا مرکز تھا۔

غالباً انہی ایام میں ان کی ملاقاتیں بنگال کے کسی حد تک دہشت پسند انقلابی سیاسی رہنماؤں سے ہوئیں، جو ہندوستان کی آزادی کے لئے خفیہ قسم کی انقلابی تحریکیں چلایا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ ان ہندو بنگالیوں کے طریق سیاست سے جلد بیزار ہو کر ان سے علیحدہ ہو گئے، مگر انہی انقلابیوں سے انہوں نے سیاست کا پہلا سبق سیکھا۔ انہی تحریکات کے زیر اثر انہوں نے 1913ء میں ایک نیم خفیہ مذہبی انقلابی سیاسی جماعت حزب اللہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ الہلال میں اس سے متعلق ایک مبہم سا بیان بھی شائع

کیااور وہ اس طرح کہ اپنی مجوزہ پارٹی کا منشور یا اغراض و مقاصد بیان کرنے کی بجائے یہ نوٹ لکھا: -94 من انصاری الی اللہ ؟(خدا کی راہ میں میرے مددگار کون ہیں) اور الہلال کی پالیسی سے متفق لوگوں سے درخواست کی کہ اگر وہ مجوزہ پارٹی حزب اللہ میں شامل ہونا چاہیں تو اپنے نام اور پتے ان کو بھیج دیں۔ شومئ قسمت الہلال 1914ء میں بند ہو گیا اور مولانا آزاد کی زندگی میں بھی قید و بند کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس طرح حزب اللہ کا پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا۔ بہر حال مولانا آزاد کی مذہبی انقلابی سیاست، مجوزہ جماعت اور مسئلہ امامت، اور امام الہند بننے کی آرزو، اور علمائے ہند کے ہاتھوں اس کی تکمیل یہ تمام موضوعات نہایت اہم ہیں اور ایک علیحدہ گفتگو کے متقاضی ہیں۔ (اور میں اس پر لکھنے کا آرزو مند بھی ہوں) تاہم اس وقت یہ ساری بحث ہمارے موضوع کے فریم سے باہر ہے۔

جون 1912ء میں کلکتے سے ہفت روزہ اخبار الہلال کا اجرا مولانا آزاد کی زندگی کا اہم سنگ میل ہے۔ الہلال کو برسوں کی تیاری کے بعد ایک واضح نصب العین کے تحت شائع کیا گیا تھا اور اس نے -94 کا مرید، زمیندار اور مسلم گزٹ کی طرح مسلمانان ہند کی ذہنی تربیت میں کامیاب کردار ادا کیا۔ الہلال ایک طرح سے سرسید کے 1980ء میں شائع ہونے والے معرکہ آرا ماہنامے تہذیب الاخلاق کا جواب تھا، جس میں سرسید کی غیر مفاہمانہ عقلیت پسندی کی بجائے روایت سے جڑت اور انسان دوستی کو اساس بنایا گیا تھا۔ مولانا ایک زمانے میں سرسید کے قدردان رہے تھے۔ لیکن شبلی کی صحبت اور پھر اپنے طبعی رجحانات اور سیاسی میلانات کے سبب انہوں نے مختلف اور مخالفانہ نقطہ نظر اختیار کر لیا۔

اب دیکھا جائے تو بنیادی اور اصولی اختلافات تو سرسید اور عالمائے دیوبند کے درمیان تھے۔ سرسید نے جو طریقہ تعلیم رائج کیا وہ مدرسہ دیوبند کے تعلیمی نظام کی عین ضد تھا۔ تو سوچا جا سکتا تھا کہ دیوبند علی گڑھ کا پُر جوش مخالف ہو گا لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان اختلافات نے کبھی بھی پُر جوش عملی مخالفت کی شکل اختیار نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ تو اسلام کے بہترین علماء و صلحاء کی تربیت اور طریق کار تھا کہ مناظرہ بازی اور مخالفت برائے مخالفت میں راہ کھوٹی نہ کی جائے اور دوسرا یہ کہ فریقین کے مابین رشک و حسد والا معاملہ بھی نہ تھا اور ہر دو نے جان لیا تھا کہ نظریات مختلف ہونے کے باوجود دونوں قوم کی دو مختلف ضروریات دینی تعلیم اور دینوی تعلیم پوری کرنے کی راہ پر گامزن ہیں۔ اسی لئے ایک وقت ایسا بھی آیا، جب دونوں اداروں کے اکابرین نے مختلف مقاصد کے حصول کے لیے اشتراک عمل کے منصوبوں پر بھی غور کیا۔ مگر یہ سرسید کی گود میں پلنے والے اور اس کے دست راست شبلی تھے، جنہوں نے دیوبند کے طرز عمل کے برعکس سرسید اور علی گڑھ سے عملی مخالفت کا رویہ اختیار کیا اور اپنے قلم کو اس مخالفت کے لیے استعمال کیا۔ انہیں سرسید کا سب سے بڑا مخالف قرار دیا جا سکتا ہے، مگر اس کے باوجود وہ اشتعال جذبات کی مکروہ حدوں تک نہیں گئے۔ اس لئے کہ ایک مدت سرسید کی صحبت میں گزارنے کی وجہ سے وہ یہ نکتہ جان گئے تھے کہ سرسید کے خیالات سے تو اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر سرسید پر حتمی نکتہ چینی کا حق صرف اس شخص کو ہے جو عملی اقدامات میں ان سے سبقت لے جائے۔ سرسید اور ان کے عملی کاموں کی مکمل اور ایک حد تک کامیاب مخالفت شبلی ہی کی صحبت کے پروردہ اس پر جوش نوجوان نے کی، جو

آگے چل کر مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے مشہور ہوا۔ ابتدائی طور پر اس مشن کا آغاز الہلال-93 کی اشاعت سے کیا گیا۔ یہ درست ہے کہ یہ نوجوان عملی فتوحات میں اپنے استاد شبلی کے مقام کو نہیں پہنچا، مگر یہ ماناپڑے گا کہ ہماری علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی زندگی پر اس کا اثر فوری، غیر معمولی اور حیرت انگیز تھا۔

دراصل علی گڑھ تحریک کے کئی پہلو تھے ادبی علمی تعلیمی اور سیاسی۔ آزاد کے الہلال نے ہر پہلو سے سرسید، علی گڑھ تحریک کے مختلف پہلوؤں اور سرسید کے رفقائے کار پر موثر نکتہ چینی کی۔ کہنا چاہیے کہ آزاد کی تمام زندگی ان عمارتوں کو مسمار کرنے میں گزر گئی، جن کی تعمیر سرسید اور ان کے ساتھیوں نے کی تھی۔

ادبی لحاظ سے مولانا آزاد کا خاص طرز تحریر اس آسان نثر کا عین ضد تھی، جو سرسید نے عوام الناس میں اپنے تعلیمی اور مذہبی خیالات کی ترسیل کے لیے رائج کرنا چاہی تھی اور یہ ان کی ایک اہم قومی خدمت تھی کہ انہوں نے اردو نثر کو مرزا رجب علی بیگ سرور جیسے نثر نگاروں کے مسجع اور مقفی طرز سے پاک کیا اور اسی نثر کو رائج کیا جسے مرزا غالب نے رائج کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے عبارت آرائی اور تصنع نگاری کے لیے استعمال کئے جانے والے مشکل الفاظ اور دور از کار تشبیہوں کو ترک کر کے اسے ہر طرح کے خیالات کے اظہار کا کامیاب ذریعہ بنا دیا۔ مگر آزاد کی مخصوص انشاپردازی سرسید کے طرز تحریر کا عین ضد تھی۔ وہ عبارت میں شکوہ پیدا کرنے کے لئے مشکل عربی اور فارسی کے الفاظ بالقصد استعمال کرتے تاکہ اس میں رنگینی اور علمیت کا اظہار ہو سکے۔ رام بابو سکسینہ کے مطابق یہ وہ طرز خاص ہے، جسے آزاد نے الہلال امیں برتا۔ اس طرح وہ اردو نثر کو اسی مقام پر واپس لے گئے جہاں وہ سرسید کی اصلاح سے پہلے تھی۔

سرسید کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت تھا۔ علی گڑھ کالج اس مقصد کی تکمیل کی غرض سے قائم کیا گیا۔ اپنے طرز تعلیم کو مروج اور مقبول کرنے کے لیے انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ اس کانفرنس میں ایک سال مولانا آزاد کو بھی مدعو کیا گیا اور وہ شریک بھی ہوئے۔ لیکن وہاں انہوں نے سرسید کی تعلیمی پالیسی کی اتنی شدت سے مخالفت کی کہ کانفرنس کے منتظمین کو ان پر کانفرنس کے دروازے بند کرنا پڑے۔ دراصل مولانا آزاد کے نزدیک جدید تعلیم سے زیادہ مصر اور کوئی چیز نہیں تھی، جس کا انہوں نے الہلال میں کھل کر اظہار کیا۔ اسی طرح وہ نے تعلیم یافتہ طبقے سے بھی خوش نہیں تھے اور الہلال میں جابجا اس طبقے کے نقائص گنواتے تھے:

میں جو نئے تعلیم یافتہ حضرات کا ہمیشہ شاکی رہتا ہوں، تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر گزشتہ خوبی کو ان سے دور پاتا ہوں اور ان کی جگہ کوئی نئی خوبی مجھے نظر نہیں آتی۔ ہماری گزشتہ مشرقی معاشرت، اوضاع واطوار، اخلاق وعادات، طریق بود وماند، یہ سب کے سب انہوں نے ضائع کر دیئے۔ (ایک مضمون، جو بیگم صاحبہ بھوپال کی کتاب تندرستی پر تبصرہ ہے)

مولانا آزاد اور علی گڑھ کا ایک اور اختلاف جو بنیادی اور اصولی نوعیت کا تھا، وہ سیاسی نقطہ نظر کے حوالے سے ہے۔ علی گڑھ کا نقطہ نظر ہندوستان کے مسلمانوں کو بنیاد بناتے ہوئے مقامی تھا اور اس کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کی علمی اور اقتصادی پستی کا

تدارک تھا، جس کے لیے وہ انگریز حکومت کے ساتھ اشتراک کو مسلمانوں کے لیے مفید سمجھتے تھے۔اس کے برعکس مولانا آزاد اس مقامی نقطہ نظر سے بے حد بیزار تھے۔ وہ پان اسلامک تحریک کے پرچم بردار تھے اور کانگریسی لیڈروں اور دیوبند کے علماء کے ساتھ مل کر ہندوستان کی انگریزوں سے آزادی کے لیے سرگرمی سے کوشاں تھے۔

علمی اور فکری طور پر آزاد کے سیاسی نقطہ نظر اور منہج کا عمل کراؤ اقبال اور جناح سے ہوا، جہاں ہر دو نقطہ ہائے نظر میں بعد المشرقین ہے۔آزاد متحدہ اور مخلوط ہندوستانی قومیت کے طرف دار ہیں، جسے وہ مذہبی آفاقیت کا جزو ثانی سمجھتے ہیں، جبکہ اقبال برصغیر میں مسلم مذہبی قومیت کے علم بردار ہیں اور یوں وہ اسلامی ریاست کے نظریہ ساز بن کر ابھرتے ہیں۔ علماء بالخصوص علمائے دیوبند نے آزاد کا ساتھ دیا، جبکہ مسلم جمہور کے اجماع نے اقبال اور جناح کے نقطہ خیال سے اتفاق کیا۔

دراصل آزاد کے متحدہ ہندوستانی قومیت کے نظریہ کا آغاز اس کے اپنے تمیمی انسانیت کے نظریے کے تحت ہوا، جس کے مطابق ایک انسان کو دوسرے انسان سے جوڑنے کی واحد کڑی-94انسانیت ہے، دوسرے تمام تعلقات غیر حقیقت پسندانہ اور مصنوعی ہیں اور اسلام نظریہ اخوت کے علاوہ کسی دوسرے رشتے کو تسلیم نہیں کرتا۔اسی تعبیر کے تحت انہوں نے سورۃ فاتحہ کی پہلی آیت-94الحمد اللہ رب العالمین-93 کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ اللہ صرف مسلمانوں کا رب نہیں ہے، بلکہ تمام عالم کا رب ہے اور اللہ نے اپنے کلام کا آغاز اس آیت سے کر کے انسانیت کا واضح پیغام دیا ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ آزاد کے خیالات شروع سے ہی ایسے نہ تھے۔1913ء میں انہوں نے ہندوؤں سے سیاسی اتحاد کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ اسلام کا مقام اتنا ارفع ہے کہ اس کے ماننے والوں کو اپنی سیاسی حکمت عملی کی تشکیل میں ہندوؤں کا تتبع نہیں کرنا چاہیے۔ مگر بعد میں تحریک خلافت کے اہم نظریہ ساز کے طور پر تحریک خلافت کے دوران آل انڈیا نیشنل کانگریس اور نہرو کی قربت نے 1920ء میں انہیں اپنے ابتدائی موقف سے منحرف ہونے پر مجبور کر دیا اور اب وہ کانگریس سے قربت کی بنیاد میں تلاش کرنے لگے، جس کے اراکین کی غالب اکثریت ہندو تھی۔اب انہوں نے ایک نیا نظریہ وضع کرتے ہوئے کہا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں صرف دو حقیقی سیاسی قوتیں ہیں، ایک تو برطانوی انگریز جن سے آزادی حاصل کرنا ہمارا مقصود ہے اور دوسری ہندو قوم، جو مسلمانوں کی دوست ہے۔انہوں نے کہا کہ اسلام غلامی کی زندگی پر کسی طرح مفاہمت نہیں کر سکتا اور اگر سامراجی طاقتیں مسلمانوں کی سرزمین پر قبضہ کرتی ہیں، جیسا کہ انگریزوں نے مغل مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ کیا، تو اسے واگزاشت کرانے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد مسلمانوں کا حق ہے اور یہ پرامن جہاد صرف ہندوؤں کی مدد سے لڑا جا سکتا ہے، جو کہ ہندوستان میں اکثریت میں ہیں۔

آزاد نے اپنے نظریے کو تقویت پہنچانے کے لیے سیرت رسول سے بھی سپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کی۔انہوں نے کہا کہ غیر مسلم اقوام سے اتحاد کی نظیر موجود ہے۔ جیسا کہ رسول خدا نے مدینہ پہنچ کر 622ء میں مدینہ کے یہود و کفار کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔آزاد اس طرف متوجہ نہ ہوئے کہ عملاً یہ معاہدہ موقوف ہو گیا تھا، بلکہ وہ اپنے نظریے میں اس مثال کی اصابت

اور جواز پر قائم رہے۔ کچھ عرصہ بعد علمائے دیوبند بھی اسی طرح کی دلیلوں سے کام لیتے رہے۔ 1919ء میں قائم ہونے والی مسلم علماء کی مذہبی سیاسی تنظیم جمعیت العلمائے ہنڈ انہی سیاسی خیالات کی حامل تھی۔ آزاد کے خیالات کا اعادہ مولانا انور شاہ، مولانا محمود حسن اور ان کے سرگرم جانشین مولانا حسین احمد مدنی نے کیا۔ ابتداء میں جناح اور اقبال پر طانوی حکومت کا جوا سر سے اُتارنے کے لئے ہندو قوم کے ساتھ مدبرانہ تعاون پر غور کرنے کے لیے تھے لیکن مولانا مدنی نے 1937ء (بلکہ 1937ء سے 1947ء تک) کئی ایسے پرجوش بیان دیئے، جس کی اقبال نے اپنی وفات سے قبل سخت مخالفت کی۔ خاص طور پر اقبال نے مدنی کے 1937ء کے اس بیان کی سخت مذمت کی، جس میں انہوں نے دعوی کیا تھا کہ قوم، بلالحاظ مذہب، کاملاً اسی سرزمین سے منسوب ہوتی ہے، جس میں وہ بستی ہے۔ اقبال نے مولانا مدنی کے استدلال کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ تصور جدید مغربی قومیتی تصور سے اخذ کیا گیا ہے اور اس میں اس لحاظ سے بھی دینی سقم موجود ہے کہ اس نے دنیائے اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اقبال نے مولانا مدنی کے امتیاز قوم اور ملت کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ محض لفظوں کا ہیر پھیر ہے۔ قوم اور ملت فلسفیانہ طور پر مماثل ہیں۔ مسلمانوں کی ایک امت ہے اور غیر مسلم بحیثیت مجموعی دوسری امت ہیں۔

خیر، آزاد نے آخر تک ہندو لیڈروں کا ساتھ دیا۔ مسلمانوں کی اکثریت آزاد کی کانگریس میں شمولیت پر سخت دل برداشتہ تھی۔ خصوصاً 1940ء میں جب ایک طرف مسلم لیگ قرارداد پاکستان منظور کر رہی تھی تو دوسری طرف آزاد کو آل انڈیا نیشنل کانگریس کا صدر منتخب کیا جا رہا تھا۔ پھر ان کا بار بار کانگریس کا صدر منتخب ہو کر مطالبہ پاکستان کو رد کرنے پر اصرار مسلمانوں کے لیے تکلیف کا موجب بنا۔ تاہم آزاد کے پاس مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں دو دلیلیں تھیں۔ اول تو ان کی یہ خواہش تھی کہ مسلمان ہندوستان میں رہ کر ایک طاقتور اقلیت کا کردار ادا کریں اور علیحدہ وطن کا مطالبہ ترک کر دیں، جو ان کے نزدیک صہیونیت کے نظریات کا حامل تھا۔ دوسرے ان کے خیال میں ہندوستان کی تقسیم آگے چل کر مسلمانوں کے لیے مضرت رساں ہو گی۔

مولانا آزاد کا اہم اور نادر کام احیائے مذہب کے حوالے سے ہے اور تصنیفی معیار کی اس بلندی کے ساتھ جو صرف ان کے ساتھ خاص ہے۔ جن احباب کی نظر طرسے قدیم علماء کی تصانیف گزری ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان میں وسعت معلومات اور تجر علمی کا سراغ لگانا قدرے مشکل کام ہے۔ ان علماء و مشائخ کو اپنے مدرسوں اور حجروں سے باہر جھانکنے کا کم ہی موقع ملا تھا، مغربی علوم اور مغربی کتب کے دروازے انہوں نے خود اپنے اوپر بند کر رکھے تھے حتی کہ ان دنوں قاہرہ، بیروت اور دمشق سے بھی جو ئی مذہبی کتب چھپتی تھیں، وہ ان کے مطالعے سے بھی محروم رہتے تھے۔ سو، انہوں نے اپنا پورا زور بیان رفع الیدین اور آمین بالجہر جیسے جزوی اور غیر ضروری مباحث میں صرف کر دیا۔۔ اب آزاد آئے تو حکیمانہ ژرف نگاہی ان کے جینز میں شامل تھی، مشرق و مغرب میں چھپنے والی مذہبی کتابوں اور علوم پر ان کی نظر تھی، زور قلم وہ اللہ نے دیا تھا کہ الامان۔ سو، انہوں نے مذہبی تصنیف و تالیف کا معیار اوج ثریا پر پہنچا دیا۔

برصغیر کی مذہبی تاریخ میں آزاد کا یادرہ جانے والا کام سرسید کے نو معتزلہ عقائد کے حوالے سے جدید علم الکلام کی تردید و اصلاح ہے۔ یہ کام آزاد سے پہلے چند دوسرے علماء نے بھی کیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ ان کے پاس زور قلم تھا اور نہ ہی نئے مسائل کے متعلق معلومات۔ ان کے استدلال کے طریقے بھی مدرسانہ، رسمی اور بے جان تھے۔ ان کے برعکس مولانا آزاد جن کے زور قلم میں شک نہیں تھا، جدید علوم پر نظر تھی، اسلام کی الہیاتی تاریخ سے خوب واقف تھے، اور وہ خود بھی تشکیک (۲) کی منزل سے گزر چکے تھے۔ سو، وہ جدید علم الکلام پر تنقید کے لیے خاص طور پر موزوں ثابت ہوئے۔

مولانا آزاد کا دوسرا اہم کام قرآن مجید کا حکیمانہ مطالعہ اور اس کے پیغام کی عوام الناس میں اشاعت ہے۔ ہندوستان میں اس کام کا پیغام کی آغاز شاہ ولی اللہ کے قرآن کے فارسی ترجمے سے ہوا۔ شاہ ولی اللہ کے صاحبزادوں نے قرآن کا اردو ترجمہ کر کے قرآن کے پیغام کی اشاعت کو مزید آسان کر دیا۔ اس کے بعد مولانا نذیر احمد کا ترجمۃ القرآن سامنے آیا تو اس میں بامحاورہ زبان کی ادبی چاشنی بھی تھی۔ ان تراجم کے بعد مرزا حیرت، مولوی عاشق علی اور مولوی فتح محمد جالندھری کے اردو تراجم کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس ملک کے مسلمانوں میں کلام مجید کو مجھے کی آرزو موجود تھی، جو پوری ہوئی۔ اب جو کی رہ گئی تھی وہ یہی تھی کہ اس کلام کے اصول کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا حصہ بنایا جائے۔ یہ کمی مولانا آزاد نے الہلال کے ذریعے پوری کرنے کی کامیاب سعی کی۔ الہلال میں قرآن مجید کے پیغام کے مختلف پہلوؤں پر حکیمانہ تبصرہ ہوتا۔ اب لوگوں کو یہ بات سمجھ لگی کہ قرآن مجید میں صرف جزاوسزا اور یہود و نصاری کے قصے نہیں ہیں، بلکہ ان کا تعلق ہماری روزمرہ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہے۔ خیر، اس بات میں بھی کافی وزن موجود ہے کہ جس طرح سرسید احکام کو سائنس کے مطابق ثابت کرنے کے لئے تاویل سے کام لیتے تھے، اسی طرح مولانا آزاد بھی اپنے خیالات کی تائید کے لئے قرآنی آیات کی حسب منشا ترجمانی کر لیتے تھے۔ ایک اور اعتراض جس کا اظہار خفی طور پر کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مولانا کی تحریروں نے اسلام کی عظمت و سچائی کو تو ضرور واضح کیا اور لوگوں کے دل مذہبی جوش سے بھی لبریز ہوئے، مگر آزاد وہ روحانی انقلاب لانے میں کامیاب نہیں ہوئے جو انسانی کیریکٹر و اخلاق کی تعمیر کرتا ہے۔ اس کمی کو دیوبند کی چار دیواری نے پورا کرنے کی کوشش کی، مگر بات یہ بھی ہے کہ مولانا آزاد کا بنیادی کام احیائے مذہب تھا، نہ کہ اصلاح کیریکٹر یا تعمیر اخلاق۔

مولانا آزاد کے مذہبی فکری نظام کا تشریحی اور تفسیری مطالعہ اس کے ذہین اور خلاق ہم عصر اقبال سے موازنے کے بغیر ادھورا رہتا ہے اور وہ اس طرح کہ آزاد قانون شریعت کے سرچشمے کے طور پر قرآن پر کلی انحصار کرتے ہیں اور حدیث سے صرف اور صرف اسی وقت مدد حاصل کرتے ہیں، سب انہیں اپنے استدلال کو مزید قوی بنانے کی ضرورت محسوس ہو۔ اس کے برعکس اقبال چاروں منابع سے مدد لیتے ہیں۔ خاص طور پر آخری دو یعنی اجتہاد اور اجماع ان کے لئے یکساں طور پر اہم ہیں، جنہیں وہ فی زمانہ قانونی ارتقاء کے حوالے سے بہت ضروری آلے قرار دیتے ہیں۔ دراصل اقبال کے شریعتی تشریحی نظام میں اجتہاد اور اجماع دونوں پر بیسویں صدی کے سائنسی اور سیاسی فتوحات کی چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ یہاں اس بات کے اعتراف میں بھی تردد سے کام نہیں لینا

چاہئے کہ علماء کی اکثریت یا علماء کا اجماع مذہبی اور سیاسی نکات میں آزاد سے متفق تھا، جبکہ عوام کے اجماع کے تصویر جدید (جس کے لئے سوادِ اعظم کی کلاسیکی اصطلاح مستعمل ہے) کو مولانا آزاد نے غیر مصالحانہ طور پر درخور اعتنا نہیں سمجھا۔

در اصل ژرف نگاہی، تبحر علمی اور وسیع تر مذہبی معلومات کے باوجود آزاد کی ذہنی تربیت بنیادی طور پر روایتی اور مدرسانہ تھی۔ انہوں نے 1907ء سے 1909ء کے درمیان عرب ممالک مصر، شام، عراق اور حجاز میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ اس تعلیم نے ان کی دینی اور سیاسی فکر میں روایاتی اور اساسیاتی رجحانات کو پختہ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے الہلال میں سرسید کی غیر مفاہمانہ عقلیت پسندی کا مقابلہ انسانیت کی پیش کش اور روایت پسندی اور جدیدیت کے اس امتزاج سے کرنے کی کوشش کی، جس کی جڑیں اساسیت کی زمین سے زندگی کشید کرتی تھیں۔

دین اسلام کی پُر جوش وکالت کرنے والے ہمارے دانشور نے ایک اور حیران کر دینے والا قدم اٹھایا۔ یہ ہندوستان میں مذاہب کے تقابلی مطالعے کی طرف پہلی باقاعدہ پیش رفت تھی۔ انہوں نے ہندومت، بدھ مت، عیسائیت، یہودیت اور زرتشنیت کو اپنے مطالعے میں شامل کیا۔ اگرچہ ترجیحاً وہ ہندومت کے تقابلی مطالعے کی طرف زیادہ راغب تھے۔ آخری مطالعے میں مولانا آزاد کا تقابل ادیان کا جائزہ انہیں اس دعوے کی طرف لے گیا کہ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے اور اس کی بنیاد ایک خدا کی پرستش اور عمل صالح کی زندگی ہے۔ اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں بھی انہوں نے واضح طور پر لکھا کہ قرآن مجید جملہ مذاہب کی گمشدہ سچائیوں کو از سر نو پیش کرتا ہے اور مذہبی گروہ بندیوں کے نتیجے میں سامنے آنیوالی جنگ و نزاع سے انسانیت کو نجات دلا کر انسان دوستی کے مسلک کی طرف لے جاتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اسلام رحمت و محبت کا مذہب ہے اور یہ خدا اور انسان کے درمیان محبت کا رشتہ قائم کرتا ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان محبت کا یہی رشتہ رانسانوں کے درمیان آپس کے رشتے کی بنیاد بنتا ہے۔۔۔۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں ایک کثیر المذاہب حیات باہمی کے قیام کے متمنی تھے اور غالباً اسی رجحان نے انہیں متحدہ ہندوستانی قومیت کے نظریے کی طرف پیش قدمی کی طرف مائل کیا۔

خیر، اب اگر میں ذاتی طور پر ان مباحث کا لب لباب پیش کرنا چاہوں تو مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ مولانا آزاد نے علی گڑھ اور اقبال کے کئے دھرے پر پانی پھیرتے ہوئے مذہبی فکر کی گھڑی کی رفتار معکوس کر دی، وہ اجتہاد کے بارے میں متذبذب رہے، مسلم قانون کی ترقی و اصلاح سے انہیں کبھی رغبت نہ تھی اور حدیث کی صحت اور اسناد بھی ان کی دلچسپی کے دائرے سے خارج تھے۔ روایت اور جدیدیت کے امتزاج کی پیش کش کے باوجود وہ طبعاً قدامت پرستی کی طرف جھکے ہوئے تھے، تاہم اسے اساسیت سے جڑت کا نام دیا جا سکتا ہے۔

حد کمال کو چھونے والے مذہبی اور سیاسی عجائبات کا مظاہرہ کرنے والا وہ نابغہ مولانا ابوالکلام آزاد۔۔۔ انہوں نے اپنے آغاز ایام ہی میں شاندار صحافتی اور ادبی صلاحیتوں کا اظہار کیا تھا۔ درمیان میں ایک وقفہ ضرور آتا ہے، جب وہ سیاست کے میدان میں حد درجہ پر جوش تھے، مگر وہ تادم آخر اپنی کمال ادیبانہ صلاحیتوں سے اپنے عہد کو متاثر کرتے رہے۔

میں پچھلے صفحات میں ان کے جاری کردہ رسالے نیرنگ خیال اور لسان الصدق، مخزن میں ان کے مضامین اور مختلف اخبارات ورسائل کی ادارت کا ذکر کر آیا ہوں اور یہ بھی کہ برسوں کی ذہنی اور عملی تیاری کے بعد انہوں نے 1912ء میں کلکتے سے ہفت روزہ اخبار الہلال جاری کیا۔ حکومت کی طرف سے مختلف قسم کی مشکلات کا شکار یہ ہفت روزہ نومبر 1914ء میں بند کر دیا گیا۔ نومبر 1915ء میں آزاد نے البلاغ جاری کیا۔ اپریل 1916ء میں آزاد کی صوبہ بدری کے احکامات کی وجہ سے البلاغ بھی بند ہو گیا۔ اب وہ رانچی میں آکر قیام پذیر ہوئے اور حکومت نے انہیں یہیں رانچی (بہار) میں قید کر دیا، جہاں وہ جنوری 1920ء تک نظر بند رہے۔

رانچی میں نظر بندی کا عرصہ ثمر ور ثابت ہوا۔ اس عرصے میں انہوں نے اپنی مشہور زمانہ سوانح عمری۔ تذکرہ مکمل کی، جو شاید ان کی سب سے زیادہ کامیاب تصنیف ہے۔ -تذکرہ کی زبان کیف آور ہے، واقعات ولولہ انگیز ہیں، بیان میں شعر و سخن کی چاشنی ہے، حتی کہ علمی واخلاقی مباحث بھی اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ دل ودماغ کو فرحت بخشتے ہیں۔ تذکرہ ایک خاص طرز کے انشاء وادب کا نمونہ ہے، جسے طرز مولانا آزاد کہنا چاہیے، مگر ان دنوں یہ طرز آزاد ایک خاص قسم کی جلالیت اور انانیت بھی لیے ہوئے تھا۔ دراصل اس سے پہلے بھی الہلال کا پورا دور مولانا آزاد کا جلالی دور تھا۔ انانیت ان میں روز اول سے تھی۔ میں نے اس مضمون کے آغاز میں لکھا تھا کہ آزاد کے مخزن میں چھپنے والے ان کے پہلے مضمون ہی کے نیچے مضمون نگار کا نام کچھ اس طرح سے درج ہے۔۔۔۔ مولوی ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی۔ اب اگر مزید دیکھیں کہ جس شخص کا اصل نام احمد ہو، تاریخی نام فیروز بخت، لقب ابوالکلام اور محی الدین ہو، اور تخلص آزاد ہو۔ اس میں کسی درجہ کی انانیت ہو گی۔ یہی سب کچھ تذکرہ کے حوالے سے سامنے آیا۔ انہوں نے کتاب کے ٹائٹل پیج پر تذکرہ کے نیچے ذیلی عنوان یہ درج کروایا۔۔۔ مولانا ابوالکلام اور ان کے خاندان کے بعض اکابر و شیوخ کے سوانح وحالات۔ ظاہر ہے وہ اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے بہت فکر مند تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی خاندانی بزرگوں کے متعلق بعض ایسے واقعات بھی درج کر دیتے ہیں، جن کی صحت کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار ہوتا رہا۔ یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ انہوں نے شکوہ انشاء اور تسکین جذبات کی خاطر کئی جگہ تحقیق وتصدیق کے اصولوں سے انحراف کیا ہے۔

اور جہاں تک مولانا آزاد کی انانیت اور احساس برتری کا تعلق ہے، وہ دہلی کا رہنے والا سرو قد، جس کا رنگ گورا، چہرہ کتابی، بدن دہرہ، آنکھیں ایرانی شہزادوں کی سی وضع لئے ہوئے، اور جب اسے یہ بھی احساس ہو کہ وہ غیر معمولی حافظہ رکھتا ہے اور غیر معمولی طور پر ہی ذہین وفطین بھی ہے، تو انانیت کا پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ مولانا کی ذہنی تیز رفتاری کا عالم یہ تھا کہ ان کے اساتذہ کے لئے انہیں ایک کلاس میں روکنا مشکل ہو جاتا تھا اور انہیں ترقی دے کر اگلے درجے میں بھیج دیا جاتا تھا، مگر قلیل عرصے کے بعد وہ اس جماعت کے ہمران ست گام سے بھی آگے نکل جاتے تھے۔ اس تیز رفتاری کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ صرف چودہ برس کی عمر میں درس نظامی سے فارغ ہو گئے اور فقہ، حدیث، منطق اور ادبیات پر انہیں عبور حاصل ہو گیا۔ لسان الصدق' کی ادارت کے حوالے سے تو میں پہلے ہی لکھ آیا ہوں کہ اس کے کم عمر مدیر نے شبلی وحالی کو کس طرح حیران کیا۔ سو، ان کا انا پرست ہونا بنتا ہے اور یہ بھی

کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کہ انہیں شروع ہی سے اپنے غیر معمولی ہونیکا اور احساس تھا۔ان کی منجھلی بہن فاطمہ بیگم آرزو نے اپنے انٹرویو میں خواجہ احمد فاروق کو اپنے بچپن کے ایام کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا:

ان کے کھیل آٹھ سال کی عمر میں عجیب انداز کے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً وہ کبھی گھر کے تمام صندوچوں اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے کہ یہ ریل گاڑی ہے۔ پھر والد کی پگڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے تھے اور ہم بہنوں سے کہتے تھی کہ تم چلا چلا کر کہو: ہٹو ہٹو، راستہ دو، دلی کے مولانا آرہے ہیں۔ کبھی وہ گھر میں اونچی میز پر کھڑے ہو جاتے تھے اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے تھے کہ تم لوگ تالیاں بجاو؟ اور سمجھو کہ ہزاروں آدمی میرے چاروں جانب کھڑے ہیں، میں تقریر کر رہا ہوں اور لوگ میری تقریر سن کر تالیاں بجا رہے ہیں۔

(مولانا ابوالکلام آزاد: مرتبہ خلیق انجم)

سو، اس عبقری میں انانیت اور احساس برتری پیدا ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ ویسے بھی وہ مزاجاً کم آمیز تھے اور وقت کی پابندی کے معاملے میں کسی انگریز سے کم نہ تھے۔ بغیر اجازت یا پیشگی تعین وقت کے ان سے ملاقات ناممکن تھی۔۔۔۔ وہ طبعاً ایک ارسٹوکریٹ تھے، مادی دولت سے سرفراز تھے، اس لئے اگر وہ بہک کر کچھ دن رئیس زادوں کے راستوں پر چل پڑے ہوں تو ماننے میں کوئی حرج نہیں اور ممکن ہے یہ محض الزام نہ ہو کہ انہوں نے شراب پی ہو ممکن ہے کہ پری وشوں کی طرف ملتفت ہوئے ہوں۔ مسلسل سگریٹ نوشی کے تو وہ شروع ہی سے عادی تھے حتیٰ کہ گاندھی جی کے سامنے بھی وہ اس شغل سے دست بردار نہیں ہوتے تھے۔ اور وہ تو خود بھی سید سلیمان ندوی کے نام لکھے ایک خط میں اعتراف کرتے ہیں کہ: میں شراب پیتا تھا، اور شراب پر ہی کیا موقوف ہے، میں نے ہر طرح کی سیاہ کاریاں کی ہیں، لیکن الحمدللہ کہ خدا نے مجھے توفیق دی اور اب نہیں کرتا۔

مولانا آزاد کی صحافیانہ اور ادیبانہ صلاحیتوں سے شروع ہونے والی بات مولانا کی انانیت کی طرف نکل گئی۔ لیکن بات یہ بھی ہے کہ رانچی کی نظر بندی سے رہائی کے بعد وہ مکمل طور پر سیاسی سرگرمیوں میں کھپ گئے اور ان کی تصنیفی مصروفیات نہ ہونے کے برابر رہ گئیں لیکن آخری عمر کی سیاسی مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے علمی کاموں کے لئے وقت نکال لیا۔ انہوں نے قرآن کی تفسیر پر پہلے ہی کام شروع کر رکھا تھا۔ ترجمان القرآن کے نام سے اس کی تفسیر کی پہلی جلد 1931ء میں شائع ہوئی اور دوسری جلد 1936ء میں۔ اسیری احمد نگر (1942-45) کے دوران انہیں مزید سوچ و بچار کا موقع ملا اور متعدد تبدیلیوں کے ساتھ ترجمان القرآن کا دوسرا ایڈیشن اسیری احمد نگر کے بعد شائع ہوا۔ ترجمان القرآن کی صرف دو ضخیم جلدیں ہی شائع ہو سکیں اور یہ ایک نامکمل قرآن ہے۔ جس میں سورت بنی اسرائیل (پارہ نمبر 15) تک قرآن کے مطالب اور معانی بیان کئے گئے ہیں لیکن اہم دینی امور کے متعلق مولانا آزاد کا نقطہ نظر مکمل طور پر سامنے آجاتا ہے۔ سورۃ فاتحہ کی سیر حاصل تفسیر ہی مولانا کے مافی الضمیر کو کھول کر سامنے رکھ دیتی ہے۔

ان کی مشہور زمانہ تصنیف غبار خاطر بھی اسی زمانہ اسیری احمد نگر کی یادگار ہے۔ یہ نواب صفدر یار جنگ کے نام لکھے گئے خطوط ہیں، جو غبار خاطر کے نام سے ان کے زمانہ اسیری کے بعد شائع ہوئے۔ تذکرہ کے بعد یہ غبار خاطر ہے، جن نے مولانا آزاد کی ادبی شخصیت کی ترجمانی کی۔ تذکرہ اور غبار خاطر میں پچیس سال کا بعد ہے۔ دونوں ہی فن انشاء کا شاہکار ہیں۔ مگر ربع صدی کے بعد تجربے اور مطالعے سے مولانا آزاد کیانداز فکر میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، وہ غبار خاطر میں نمایاں ہیں۔ غبار خاطر کی زبان زیادہ صاف ہے۔ پیدائشی خودپرستی اور نسلی غرور نے ان کے اندر انانیت کا جو روگ پیدا کیا تھا، وہ غبار خاطر میں بہت کم نظر آتا ہے۔ اب جذبات کی جگہ تدبر نے لے لی ہے۔

اب تک کے مباحث کے باوجود مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق آخری اور قطعی رائے قائم کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ سیاسی مباحثوں کی کہر کسی قدر دھندلی پڑ گئی ہے، مگر ختم نہیں ہوئی، تحریری مواد ابھی تک مکمل طور پر یکجا نہیں ہوا، خطوط ابھی تک جمع ہو رہے ہیں۔ کچھ تصانیف ابھی تک نامکمل ہیں، یا اشاعت کی منتظر ہیں اور جو کچھ دستیاب ہیں، اس کا بھی بہت کم حصہ پاکستان میں میسر ہے۔ ایسی حالت میں مجھ جیسے آدمی کے لئے متوازن فیصلہ یا رائے دینا تو بہت دشوار ہے۔ پھر بھی یہ بات بغیر کسی تردد کے کہی جاسکتی ہے کہ مولانا آزاد کو رب کریم نے غیر معمولی قابلیت، ذہانت، جرات اور عزم سے نوازا تھا، جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی اور فکری زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ ممکن ہے اس عرب نژاد ہندوستانی مسلمان عبقری نے برصغیر کے مسلمانوں کی دینی فکری اور سیاسی ضروریات اور اپنے مخالفین کے نقطہ نظر کو بجھنے میں غلطی کی ہو لیکن ماننا پڑے گا کہ اختلافات کے باوجود انہوں نے اپنی بلند اخلاقی سطح کو نیچے نہیں گرنے دیا۔ ان کی جو پاکستان مخالفانہ تحریریں، کچھ پیراگراف اور سطریں۔ کبھی سوشل میڈیا پر کبھی ادھر ادھر سے ہمارے سامنے سے گزرتی ہیں، وہ بھی مخالفانہ نہیں، بلکہ درد دل سے بیان کیا ہوا ان کا نقطہ نظر ہیں، جن سے دانش ورانہ اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ پاکستان بننے سے اب تک ہم نے جو کچھ دیکھا ہے، اس کو سامنے رکھ کر تو مولانا آزاد کی رائے سے شدید اختلاف کی گنجائش کم ہی ہوتی جارہی ہے۔ پھر بھی ان کے شدید ناقد مولانا عبدالماجد دریابادی کے درج ذیل الفاظ پڑھ لیجئے، جو انہوں نے اپنی ایک صحبت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھے تھے، لطف آئے گا:

> اپنے مخالفین خصوصاً مسلم لیگ کے لئے گلہ شکوہ کا شائبہ بھی زبان پر نہیں۔ سب کا ذکر یکساں خوشدلی سے۔ بلکہ پاکستان کے حق میں بجائے شکایت وشمات، طنز وتعریض کے الٹا کلمہ خیر۔ اور کچھ اس طرح کے الفاظ: اب جبکہ وہ بن چکا ہے تو ہم سب کی فلاح وبہبود اسی میں ہے کہ وہ طاقتور رہے۔
>
> (ابوالکلام آزاد: مرتبہ انور عارف)

رہے نام اللہ کا۔ نہ پاکستان بنانے والے رہے، نہ اس کے مخالفین، اور نہ ہی مولانا آزاد جیسے دانش ور، جنہوں نے قیام پاکستان کی اصولی مخالفت کی، مگر جب بن گیا تو اس کے استحکام کی آرزو کی۔۔۔۔ یہ فروری 1958ء کی صبح تھی، جب مولانا آزاد

حسب معمول صبح سویرے اُٹھے اور غسل خانے گئے، فالج کا حملہ ہوااور سفر آخرت کی تیاری شروع ہوگئی مسلسل تین دن بے ہوش رہے۔ایک بار کچھ ہوش میں آئے تو پنڈت جواہر لال نہرو قریب ہی بیٹھے تھے۔انہوں نے اپنا چہرہ قریب کیا تو ان کو خدا حافظ کہا، گویا شعوری طور پر سفر آخرت کے لیے تیار تھے۔ایک اور بار چند لمحوں کے لیے ہوش میں آئے تو آکسیجن پائپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے معالج سے کہا:

مجھے پنجرے میں کیوں بند کر رکھا ہے۔۔۔ چھوڑ دو۔۔۔بس خدا پر چھوڑ دو

22فروری1958ء کو شب سوا دو بجے سرمایہ حیات مستعار مالک حقیقی کے سپرد کیا۔

اگلے دن دوپہر ایک بجے میت اٹھائی گئی۔ تین بجے میت پریڈ گراؤنڈ پہنچی۔ مولانا احمد سعید دہلوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور جسد خاکی آغوش قبر کے سپرد کر دیا گیا۔ڈاکٹر رادھا کرشن نے آبدیدہ ہو کر کہا:

آج ہندوستان کا آخری مسلمان اُٹھ گیا گیا۔

حواشی

ا) مولانا آزاد کے نام لکھے گئے ایک خط میں مولانا شبلی فرماتے ہیں

افتخار عالم صاحب، مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر ان ہی آلودہ ہاتھوں سے حیات شبلی کو چھونا چاہتے ہیں۔اجازت اور حالات مانگے ہیں۔میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے لیکن عالم السرائر (یعنی مخفی حالات کا جاننے والا) خدا کے سوا ایک اور بھی ہے۔ وہاں سے منگوائے۔بھائی، بتا تو نہ دو گے ؟

(2 عنوان شباب ہی میں انہوں نے خاندانی ثقافتی ورثے کے طور پر ملنے والے عقائد پر شک و شبے کا اظہار شروع کر دیا تھا۔۔۔اس عمل میں سب سے پہلے مسلمانوں کے مختلف ثانوی گروہوں کے باہمی اختلافات نے توجہ جذب کی۔۔۔ مذہب کے ان داخلی تضادات نے بین المذاہبی اختلافات کی جانب توجہ دلائی۔ یہ امتیازات اور اختلافات کی ایک ایسی وسیع دنیا تھی کہ اس میں داخل ہونے کے بعد کسی ایک عقیدے کی صداقت میں یقین برقرار رکھنا بہت دشوار ہوتا ہے، ہمارے مولانا کا معاملہ بھی شک سے انکار تک جا پہنچا۔۔ لیکن حقیقت کے متلاشی مولانا آزاد اسی منزل پر نہیں رکے۔ان کا ذہنی سفر جاری رہا۔۔۔ یہ امر تعجب انگیز نہیں ہے کہ ہمارا دانشور شک و انکار کے مراحل طے کرنے کے بعد بالآخر تصدیق کے مرحلے تک جا پہنچا۔ مشرق کے اکثر مذہبی دانشور اسی ذہنی ارتقاء کی راہ سے گزرے ہیں۔ قرون وسطی میں اسکی نمایاں ترین مثال امام غزالی تھے۔

(سرسید سے اقبال تک: قاضی جاوید)

حوالہ جات

مولانا ابوالکلام۔ آزادی تذکرہ مرتبہ فضل الدین احمد۔ مکتبہ جدید، لاہور۔ میری لائبریری ایڈیشن۔ فروری 1960ء

ابوالکلام آزاد۔ غبار خاطر۔ مکتبہ القریش۔ لاہور۔ 1972ء

میر شفقت علی وفا۔ مولانا آزاد کا اخلاق و کردار بشمولہ، ماہانہ ای

ماہانہ ایوان اردو۔ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر۔ اردو اکادمی، دہلی۔ دسمبر 1988

شیخ محمد اکرام موج کوثر ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور مئی 2000ء

Pakistan Islamic Modernism in India (1857-1964) پروفیسر عزیز احمد

ترجمہ: ڈاکٹر جمیل جالبی۔ برصغیر میں اسلامی جدیدیت۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور 1989ء

قاضی جاوید۔ سرسید سے اقبال تک۔ نگارشات، لاہور۔ 1986ء

اردو نثر کے دو آزاد (یک اسلوبیاتی مطالعہ)

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع

نظم و نثر کے دونوں اظہاریے بہ ذاتِ خود متعدد تقاضے رکھتے ہیں، ان کے معیارات پر پورا اترنا جزوی طور پر ہی ممکن ہے۔ نظم و نثر کے انھی معیارات کے بیچوں بیچ کہیں اسلوب کی پیدایش ہوتی ہے۔ انگریزی میں اسلوب کے لیے Style اور فارسی میں سبک کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسلوب عربی الاصل لفظ ہے اور اس کی جمع اسالیب ہے۔ نور اللغات کے مطابق:

> اسلوب (ع۔ بالضم) مذکر۔ راہ، صورت، طور، طرز، روش، طریقہ، باندھنا، لازم صورت پیدا کرنا اور راہ نکالنا کے معنی میں رائج ہے۔ (۱)

اسلوب کی متعدد مروجہ تعریفوں کے باوجود اس کی جامع و مانع شکل سامنے نہیں آئی۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے اس پر بحث کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ:

> اسلوب سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقۂ ادائے مطلب یا خیالات و جذبات کے اظہارِ بیان کا وہ ڈھنگ ہے جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت کے شمول سے وجود میں آتا ہے اور چوں کہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کا علم، کردار، تجربہ، مشاہدہ، افتادِ طبع، فلسفۂ حیات اور طرزِ فکر و احساس جیسے عوامل مل جل کر حصہ لیتے ہیں۔ اس لیے اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا پرتو اور اس کی ذات کی کلید سمجھا جاتا ہے۔ (۲)

کسی ادبی شخصیت کے انفرادی انداز و اطوار اور اس کا فکر و نظریہ ہی اس کے طرزِ تحریر کو تشکیل دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نظم و نثر کے باہمی مقابلے اور متعلقین کے احساسِ تفاخر نے اسلوب کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ ہر ادیب نے انفرادیت کے حصول کی مساعی کیں اور خاص لفاظی، مخصوص فضا اور انفرادی انداز ترتیب دیا۔ یوں اسلوب شعر و سخن کی دنیا میں ابھرنے والا وہ قوسی دائرہ بنا جس نے ازاں بعد مصنف کی تلاش میں بھرپور معاونت کی۔ اسلوب کی اصطلاح زیادہ پرانی نہیں۔ مشرقی تنقید میں اس کا استعمال کہیں بعد میں ہوا۔ مغرب میں یہ لفظ صدیوں سے رائج ہے اور اس کے لیے زبان و بیان، انداز، اندازِ بیان، طرزِ بیان، طرزِ تحریر، لہجہ، رنگ اور رنگِ سخن جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ بہ قول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

> "کسی بھی شاعر یا مصنف کے اندازِ بیان کے خصائص کیا ہیں، یا کسی صنف یا ہیئت میں کس طرح کی زبان استعمال ہوتی ہے یا کس عہد میں زبان کیسی تھی اور اس کے خصائص کیا تھے، وغیرہ۔ یہ سب اسلوب کے مباحث ہیں، ادب کی کوئی پہچان اسلوب کے بغیر ممکن نہیں۔" (۳)

ہمارے عہد میں لسانیات کے عالمی سطح پر مقبول ہونے کے سبب اسلوب کے ساتھ اسلوبیات کا جائزہ بھی لیا گیا اور اسلوبیات کو وضاحتی لسانیات یعنی Descriptive Linguistics کی ایک ایسی شاخ قرار دیا گیا ہے جو ادبی اظہار کی ماہیئت، عوامل اور خصائص سے بحث کرتی ہے، لسانیات چوں کہ ایک سماجی سائنس ہے، اس لیے اس کا اندازِ قطعیت کے ساتھ مدلل سائنسی صحت کے ساتھ نتائج اخذ کرنے کا ہے۔ اسلوب کے دائرہ کار اور اس کے گرد و نواح میں موجود حقائق تک رسائی مشکل نہیں۔ اسلوب پر ادبی ذرائع کا اطلاق کیا جائے تو مصنف کے افکار ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ سید عابد علی عابد کے خیال میں:

"اسلوب دراصل فکر و معانی اور ہیت و صورت یا مافیہ و پیکر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے، لیکن انتقادی تصانیف میں اکثر و بیش تر کلمات مستعملہ کے معنی متعین نہیں ہوتے اور اسلوب کو محض اندازِ نگارش، طرزِ بیان کہہ کر اس کلمے کی وہ تمام دلالتیں ظاہر نہیں جا سکتیں جن کا اظہار مطلوب ہے۔" (۴)

جب کسی مصنف اور اس کے اسلوب کا تفصیلی تجزیہ کیا جاتا ہے تو تجزیہ دار شماریاتی انداز کے ساتھ حقائق واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسلوب مصنف پر عملی زندگی اور ماحول کے اثرات نظر آتے ہیں۔ وارداتِ قلبی کو قاری تک پہنچانے کے لیے ابلاغ کی جامع ترسیل ضروری ہے۔ مشرق میں بیان و بدیع کی موجودگی اسلوب کے قدیم خد و خال اور نقوش کی دریافت میں معاونت کرتی ہے۔ ایک منفرد اور زندہ اسلوب کا نمایندہ ادیب جو لفظ استعمال میں لاتا ہے وہ عموماً پر شکوہ اور شان دار ہوتے ہیں۔ ان میں ایک ربط و ضبط اور خصوصی تنظیم ہوتی ہے۔ بلیک مین (Black Man) کے مطابق:

To unite copiousness with precism, the flowing and gracefull and and the same time correct and exact in the choice of every difficult attainments in writings(۵)

یہاں تحریر میں پر شکوہ لفظیات، ماحول کی جلالتِ شاہی اور موضوع کے فلسفیانہ پن کا بہ تفصیل ذکر یوں ہوا کہ ہمارے پیشِ نظر دونوں شخصیات اردو نثر کے دو صاحبِ طرز ادیبوں کیمیں۔ مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا ابوالکلام آزاد اردو نثر کے دو ایسے ستون ہیں جن کا اسلوبِ سخن غیر سرسری مطالعے کا متقاضی ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد انیسویں صدی کے انحطاط پذیر دور کی پیداوار تھے، یہ عہد سیاسی، سماجی اور معاشرتی حوالے سے پس ماندہ ہونے کے باوجود ادبی حوالے سے خاصا زرخیز تھا۔ محمد حسین آزاد کے عہد کی نثر کے دور کے بارے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

اس دور کی نثری تخلیق کی اہمیت سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، اسی دور میں سرسید نے مذہبی اور اصطلاحی مضامین سے ملک و قوم کے دل و دماغ میں وسعت پیدا کی۔ اسی زمانہ میں آزاد نے تاریخ و تذکرہ کی دولت سے اردو ادب کو مالا مال کر

دیا۔۔اس نئے اور سنہری دور کی تزئین و ترصیع میں مولوی محمد حسین آزاد کا بھی زبردست ہاتھ ہے۔ دراصل خالص انشاپردازی کی بنیاد آزاد ہی نے ڈالی ہے۔ (۶)

اس عہد میں محمد حسین آزاد نے اپنا تخلیقی اسلوب سرسید کی معقولات، نذیر احمد کی ناصحانہ طبع، شبلی کی تاریخ پسندی اور حالی کے پھیکے پن سے بالکل جدا ہو کر وضع کیا۔ یہ عہد ہندستان تو کیا خود محمد حسین کی داخلی شخصیت کے حوالے سے ردِ تشکیل کا تھا، انھوں نے اپنی آنکھوں سے قتل و غارت کے مناظر دیکھے، تاسف اور زبوں حالی کی فضا کا مشاہدہ کیا لیکن ان کی طبیعت کی شگفتگی بہ ہر صورت موجود رہی۔ بہ قول ڈاکٹر اسلم فرخی:

> زندگی کی ابتدائی منزل میں انھوں نے اپنی بنی بنائی جنت کو اپنی آنکھوں کے سامنے مسمار ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی خوش مزاجی اور خوش دلی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خوش مزاجی اور خوش دلی ان کی طبیعت کا نمایاں وصف تھی۔ وہ غمِ روزگار کو ہنس کر ٹالنا چاہتے تھے۔ لیکن مایوسیوں اور ناکامیوں نے رفتہ رفتہ ان کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا۔ (۷)

اس کا نتیجہ مولانا محمد حسین آزاد کے مفقود الخبر اور ذہنی توازن بگڑنے کی شکل میں سامنے آیا۔ مولانا محمد حسین آزاد اپنے عہد کے سب سے بڑے میناکار اور مرصع نگار تھے۔ یہ اوصاف ان کے ہم عصروں کے ہاں کم ہیں، کوئی دوسرا ادیب ان کا شریک نہیں، وہ شکوہِ لفظی کے وصف کے باوجود بے ساختگی پیدا کرنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مطابق:

> آزاد ایک ایسے انشاپرداز ہیں جن کی عبارتیں قدیم و جدید دونوں اسالیب بیان کی جامع ہیں، وہ جہاں سادگی اور بے ساختگی پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہیں تکلف اور شوخی بھی دکھا دیتے ہیں، انھوں نے جہاں عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ جی کھول کر استعمال کیے ہیں وہاں انگریزی سے بھی بے تکلف فائدہ اٹھایا ہے۔ (۸)

مولانا محمد حسین آزاد کا اسلوبِ تحریر مرقع نگاری، صنائع و بدائع کا استعمال، بیانیہ قوت اور قدرتِ بیان، قادر الکلامی، محاکات، فارسی صرف و نحو کی چھاپ، واقعہ نگاری، لطائف و حکایات کا بیان اور اشاراتی انداز جیسی خصوصیات سے مالا مال ہے۔ ان خصوصیات پر غور کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک مخصوص عبوری عہد میں کسی ایک شخصیت کے ہاں اسلوبِ بیان کی ندرتوں کا بہ یک وقت مجتمع ہونا کیسے ممکن ہے؟ محمد حسین آزاد کی نثر نہیں بل کہ لفظوں کی آزری ہے، یوں لگتا ہے سخن کا کوئی مائیکل اینجلو قلم کے ساتھ سنگ تراشی کا شاہ کار ترتیب دے رہا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد فی الحقیقت صاحبِ اسلوب نثر نگاروں میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے سائنسی، استدلالی اور منطقی نثر کے زمانے میں شعر و نغمہ میں ڈھلی نثر تخلیق کی جس نے نہ صرف اپنے زمانے کو متوجہ کیا بل کہ متاثر بھی کیا۔ یہ اسلوب کرشماتی تخیل کا حامل ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کا تخیل ہو یا محاکات، دونوں صورتوں میں بننے والی تصویریں یکساں طور پر حسن اور رعنائی کا نمونہ ہوتی ہیں۔ مولانا محمد حسین کے اسلوب کا یہی جادو اپنی

ماورائیت کی بہ دولت قاری کو ایک مسحور کن فضا میں لے جاتا ہے، وہ گپ بھی لگائیں، غلو بھی کریں، قاری کو ان کی صداقت کا یقین نہ بھی ہو تو وہ ان کے تخیل کے شکنجے میں جکڑا جاتا ہے۔ چند اقتباسات دیکھیں:

جب دربار آراستہ ہوتا تھا، بادشاہ با اقبال اورنگ سلطنت پر جلوہ گر ہوتا تھا۔ اورنگ ہشت پہلو موزوں اور خوش نما تخت تھا، گنگا جمنی یعنی سونے چاندی کے عنصروں سے ڈھلا ہوا، دریا نے دل اور پہاڑ نے جگر نکال کر پیش کیا، لوگ سمجھے کہ الماس، یاقوت اور موتیوں سے مرصع ہے۔ (دربارِ اکبری)

یکایک آنکھ کھل گئی، دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغِ نو بہار میں ہوں جس کی وسعت کی انتہا نہیں۔ امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے، آس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے تمام عالم رنگین و شاداب ہے، ہر چمن رنگ و روپ کی دھوپ سے چمکتا، خوشبو سے مہکتا اور ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے۔ (نیرنگِ خیال)

مولانا محمد حسین آزاد اس بات سے بہ خوبی آگاہ ہیں کہ لفظوں سے تصویر سازی کرنا محض بیان کی جادو گری سے ممکن نہیں اس کے ساتھ ساتھ ذہن اور جذبات کا تحرک بھی ضروری ہے۔ اور انھوں نے اس بات کا پورا پورا دھیان رکھا ہے۔ لیکن کہیں کہیں یہ اندازِ بیان ایک خامی بنتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی مبالغہ آرائی بعض اوقات حد سے متجاوز ہو جاتی ہے اور وہ پایۂ اعتبار کھو دیتے ہیں۔ وہ آبِ حیات میں جانب داری سے کام لیتے ہیں۔ دربارِ اکبری میں تاریخ بیان کرتے کرتے تاریخ نگاری کے بنیادی اصولوں سے پہلو تہی کر جاتے ہیں:

اگرچہ علوم نے اس کی آنکھوں پر عینک نہ لگائی تھی اور فنون نے دماغ پر دست کاری بھی خرچ نہ کی تھی لیکن وہ ایجاد کا عاشق تھا اور یہی فکر تھی کہ ہر بات میں نئی بات پیدا کرے۔ اہلِ علم اور اہلِ کمال گھر بیٹھے تنخواہیں اور جاگیریں کھا رہے تھے، بادشاہ کے شوق، ان کے آئینۂ ایجاد کو اجالتے تھے، وہ نئی سے نئی بات نکالتے تھے، نام بادشاہ کا ہوتا تھا۔ (دربارِ اکبری)

یہاں اسلوب میں مصوری اور بے ساختگی نظر آتی ہے، ایک واضح ڈرامائی شعور دکھائی دیتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کا اسلوب اپنی معلق فضا کے باوجود خوش مزاجی کا علم بردار ہے۔ طارق سعید اس پہلو پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

ان کی خوش مزاجی آبِ حیات کے دورِ اول کے شعرا کی خوش مزاجی ہے۔ آزاد نے آبِ حیات کے ہر دور میں خوش مزاجی کو اہم خصوصیت قرار دیا ہے، یہ دراصل ان کی اپنی شخصیت کا پرتو ہے۔ ان کی طنز و تعریض بھی اسی خوش مزاجی میں لپٹی دکھائی دیتی ہے۔ (۹)

مولانا محمد حسین آزاد کے عہد سے متصل دور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ بہ قول حسرت موہانی:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

مولانا ابوالکلام آزاد کے نثری اسلوب کو الہامی درجہ ملا۔ سجاد انصاری نے انھیں اس انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا:

میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا۔۔۔ مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی۔ (۱۰)

مولانا ابوالکلام آزاد کی والدہ عرب تھیں، ان کی ابتدائی پرورش خانہ کعبہ کے باب السلام کے نواحی محلے میں ہوئی۔ گھر میں والد سے اردو میں گفتگو ہوتی تھی۔ البتہ اردو سیکھنے کا کوئی اطمینان بخش انتظام نہ ہو سکا۔ اسی وجہ سے جب ہم مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوبِ تحریر کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کا عربی نژاد ہونا کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ وہ اپنی تحریر میں بعض الفاظ سطحی انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً سوچنا/سونچنا، سوچیں/سونچیں، ڈھونڈنا/ڈھونڈھنا، گھاس/گھانس، تیار/طیار، پاؤں/پانوں، انڈیل/اونڈیل، پرانی/پورانی، الجھن/اولجھن وغیرہ

اہلِ علم نے ابتدائی طور پر انھیں رومانوی ادبی تحریک سے منسلک کیا، ان کی رومانویت میں حریتِ فکر، سچ کی پاس داری اور فکر و فلسفہ یک جا ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بعد اگر کوئی صاحبِ اسلوب ادیب پیدا ہوا تو وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے سوا اور کوئی نہیں۔ ابوالکلام آزاد اجداد کی اقدار کے وارث ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باغی ادیب بھی تھے، یہی بات انھیں روسو سے قریب کرتی ہے۔ ان کا اسلوب سر سید احمد خاں کی اصلاحی کوششوں کا فطری ردِ عمل تھا، وہ ایک مذہبی اسکالر تھے، اس لیے ان کے ہاں شعوری طور پر بڑے اعتماد کے ساتھ عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال دکھائی دیتا ہے۔

مولانا ابوالکلام کا انانیتی اسلوب جو کہیں کہیں خطیبانہ انداز اختیار کر لیتا ہے دراصل معرب اور مفرس زبان کے حامل ادیبوں کا نمائندہ ہے۔ ان جیسے لوگوں کی زبان پر ہمہ گیر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ الہلال اور البلاغ کے اشاریوں، غبارِ خاطر، البیان، ترجمان القرآن اور تذکرہ میں مذہبی اثر و نفوذ کی مکمل جھلک محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس کی تشریح و توضیح یوں کی گئی ہے:

قرآنی لب و لہجے سے مستفید ہونے کی بنا پر ان کی تحریروں میں ایک مقرر آتش نفس کا خطیبانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ جب مسلمانوں میں ایمانی حرارت پیدا کرنے کے لیے قلم اٹھاتے ہیں تو بغداد و قرطبہ کا جاہ و جلال اور شیراز و اصفہان کا حسن و جمال ان کی تحریروں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اور ان کی تحریر میں تقریر اور تقریر میں تحریر کا مزہ ملنے لگتا ہے۔ اس خطیبانہ انداز کی بنا پر انھوں نے سمٹی ہوئی چیزوں کو بار بار پھیلا کر اطناب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ (۱۱)

مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب کے چند نمونے دیکھیں:

ٹھہریے! ابھی ایک اور جماعت بھی ہے جو آپ کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ (خطبات)

اب معلوم ہوا کہ آج جسے مذہب سمجھتے آئے تھے وہ مذہب کہاں تھا، وہ تو خود ہماری وہم پرستیوں اور غلط اندیشوں کی صورت گری تھی۔ (غبارِ خاطر)

ان اقتباسات میں ان کے ہاں عربی و فارسی کے اثر و نفوذ کو دیکھا جا سکتا ہے:

تشدد کے معنی ہیں ظلم کے، اصراف و اتلافِ حق کے۔ (خطباتِ آزاد)

قرآن حکیم نے حیاتِ امم کے قانونِ الٰہی کا اعلان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابتدائے خلق سے جس طرح حق و عدالت کا ظہور یکساں ہے اسی طرح بطلان و فساد کا ظہور بھی ہمیشہ یکساں رہے گا، اسی طرح ظلم و عدوان کے دعوے بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کے رہے۔ (خطباتِ آزاد)

مولانا ابوالکلام آزاد کا اسلوب مشکل پسندی کی غرابت کے باوجود وجدانی اور ذوقی ہے، ان کا اسلوب ابتداً دقیق تھا لیکن آہستہ آہستہ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے بہ وسیلہ شبلی سرسید سے جاملا۔ دونوں بزرگوں کے طرزِ سیاست و مذہب میں فرق سہی لیکن باطنی رشتے اہم ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ :

مولانا ابوالکلام آزاد کے اس مخصوص اسلوب نے اردو نثر نگاری کو صدمہ پہنچایا یا اسے نئی توانائی عطا کی، یہ مسئلہ خارج از بحث ہے لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اس دور کے سبھی علما نے اسلام پر ہر طرح سے حملے شروع کر دیے تھے۔ مسلمان مجروح اور مرعوب تھے، مولانا آزاد نے اس اپنے انانیتی اسلوبِ بیان سے ان کی ذہنی پسپائی کو دور کیا اور اپنے زورِ قلم سے وہ کام کیا جو محققین اپنی بلند پایہ تحقیقی تصنیفات سے لیتے ہیں۔ (۱۲)

مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا ابوالکلام آزاد اُردو نثر کے دو نمایندہ صاحبِ اسلوب مصنف ہیں۔ دونوں کا اسلوبِ تحریر مقاصد اور نصب العین کے لحاظ سے قدرے تضاد کے باوجود داخلی لحاظ سے ایک ہی طرح کی فضا میں آنکھ کھولتا ہے۔ دونوں کے اسلوبِ تحریر میں وہ چاشنی ہے جس نے ان کی نثر کو شاعری کے روپ میں ڈھال کر حسن کا مرقع بنا دیا۔ دونوں کا اسلوبِ تحریر خالص رنگ کے قریب ہے۔ دونوں مصنفین کی تحریروں کے پردہ ہائے مجاز میں ان کی شخصیت جلوہ گر ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نیئر، مولوی، (مرتب) نوراللغات، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۶ء، ص ۲۱۸ ۲۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳

۳۔ نارنگ، گوپی چند، ادبی تنقید اور اسلوبیات، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۴

۴۔ عابد علی عابد، سید، اسلوب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص ۳۸

۵۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۸ء، ص ۱۶

۶۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، مولوی محمد حسین آزاد کی انشا پردازی مشمولہ، اردو نثر کے اسالیب، مرتبہ ڈاکٹر عقیلہ جاوید، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۴ء، ص ۵۲

۷۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۵ء، ص ۴۰۰

۸۔ زور، محی الدین قادری، اردو کے اسالیبِ بیان، لاہور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۶۲ء، ص ۶۶

۹۔ طارق سعید، اسالیبِ نثر کا تنقیدی مطالعہ، وجہی سے قرۃ العین تک، دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، س ن، ص ۱۴۰
۱۰۔ سجاد انصاری، محشرِ خیال، مرتبہ عامر سہیل، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۲ء، ص ۶۱
۱۱۔ طارق سعید، اسالیبِ نثر کا تنقیدی مطالعہ، وجہی سے قرۃ العین تک، ص ۱۴۰
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۷۱

عالمی شعری ادب میں تہذیبی اتصال کی صورتیں: ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع

انسانی زندگی میں ابتدا سے فنون لطیفہ (بالخصوص شاعری) کی موجودگی کے ناقابل تردید ثبوت ملتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی حیات اور فکری کائنات کم و بیش ایک جیسی ہے سو شاعری کے موضوعات بھی یکساں ہیں۔ اپنے خیالات کا خوب صورت اظہار اور پھر اس کی دیگر افراد تک ترسیل کے لیے بے تابی؛ عین حقیقت ہے۔ ادب کے ساتھ انسان کا تعلق نہایت قدیم اور گہرا ہے۔ بہ قول نورالحسن ہاشمی:

> ادب زندگی کی تسخیر کا پہلا قدم ہے۔ افسوس ہے کہ لوگ اسے ابھی تک پہلا قدم ہی نہ جان سکے۔ حال آں کہ صحائف ادب کے ذریعے زندگی کی منزلوں کو عرصہ ہوا سر کر چکے۔ زندگی کے ازل اور ابد کو ہمیشہ کے لیے متعین کر چکے (۱)

ادب کسی قوم کے انفرادی اور اجتماعی رویوں کا عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ اس قوم کے زاویہ نگاہ کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ قوموں کو زندگی میں متعدد انقلاب آفرین تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک زمانے میں اردو کے قارئین کی عربی، فارسی، انگریزی اور روسی ادب تک رسائی ہوتی تھی، لیکن جدید عہد کی ایجاداتی تبدیلیوں نے اسے افریقہ کے غیر متمدن قبائل کے ادب سے لے کر امریکہ کے سرخ ہندیوں تک کے ادبی موضوعات سے آشنا کر دیا ہے۔ آگاہی کی یہ صورتیں بہ راہ راست ترجمہ اور ترجمہ در ترجمہ کے عمل سے وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ دنیا کی مختلف تہذیبیں باہم فکری اشتراکات کے باوجود اپنی انفرادی شناخت بھی رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا مطالعہ ایک دل چسپ عمل ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی مختلف اقوام کی اس انفرادیت کے بارے میں کہتے ہیں:

> ہر ادب اپنی مخصوص فضا رکھتا ہے۔ اس کے پس منظر میں ہی اس کے تخلیقی نمونے روبہ عمل آتے رہتے ہیں، اور پورے طور پر سمجھے اور سمجھائے جا سکتے ہیں۔ کوئی پارہ ادب اپنے معاشرے سے الگ ہو کر وجود پذیر اور قابل فہم نہیں ہو سکتا۔ تمام ادبی تخلیقات ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔ کسی بھی ادب کا جب ایک سانچہ متعین ہو جاتا ہے تو اس میں کیے جانے والے ہر تجربے کی ایک روایت ہوتی ہے۔ جس کے نقوش و اشارات ہی اس تجربے کی عمومی تشکیل کرتے ہیں (۲)

رواں صدی میں مواصلات کے ذرائع میں حیرت انگیز ترقی کے سبب دنیا کی مختلف زبانوں ادب اور ادیب کو باہم مجتمع کر دیا ہے۔ ایک بات قابل غور ہے کہ آیا تراجم کسی ادبی فن پارے کے بطن میں موجود حقیقی جوہر کی ترسیل کی قدرت رکھتے ہیں؟۔ انسان اور انسانی معاشروں کی فکری، تہذیبی اور سماجی تفریق کے باوجود انسان اور انسانیت کا تصور ایک جیسا تھا، پہلے جو بات

بندگان خدااور اولاد آدم (ع) کے تناظر میں کی جاتی تھی آج کے دور میں سائنسی انکشافات اور صنعتی ایجادات نے اس کی بھرپور تائید کر دی ہے۔ادب کا تعلق بہ راہ راست لسانیات سے ہے اور زبانوں کے مابین تہذیبی معانقہ ان زبانوں کے خاندانوں کے باہمی اشتراکات سے ممکن ہے۔ہر ادبی تخلیق مواد اور ہئیت سے مرکب ہوتی ہے۔عام طور پر ہئیت ایک مقامی اور محدود شے ہے، جب کہ مواد اور خیال عالمی اور آفاقی حیثیت اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ادبی فن پاروں کے مرکب میں موضوع اور اسلوب کے مبین ایک عضویاتی ربط ہوتا ہے۔اس کے باوجود عالمی ادب کے مطالعات کی یہ صورتیں خاصی دل چسپ ہیں۔بہ قول ڈاکٹر وہاب اشرفی:

> تاریخ اقوام عالم کی ایک شق تاریخ ادبیات قوموں کی لسانی، ادبی اور تہذیبی زندگی پر مبنی ہوتی ہے۔لیکن جہاں عالمی تاریخ میں عوام وخواص کی دل چسپی قائم رہی ہے وہاں عالمی ادبیات سے ان کا شغف شاید اتنا شدید نہیں رہا ہے۔حال آں کہ ادبی نگارشات وہ منظر نامے ہیں جن کی روشنی میں انسانی اقدار کے ہمہ جہت پہلوؤں سے آشنائی ممکن ہے۔ایک ملک کا ادب دوسرے ملک سے مختلف ہو سکتا ہے، بل کہ ہوتا بھی ہے لیکن متعینہ عہد کے حوالے سے مختلف قوموں اور ملکوں کے ادب عالیہ کا موازنہ ممکن بھی ہے اور مفید بھی (۳)

قوموں کے معاشرتی اور سماجی اشتراکات کو ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں۔اس سلسلے میں مکمل ابلاغ کی بجائے ادھوری اور نامکمل سی صورت سامنے لائی جاسکتی ہے۔بہ شرطے کہ اس عمل کے دوران ثانوی مباحث کو کسی حد تک نظر انداز کر دیا جائے۔ادبیات عالم کے موضوعاتی اشتراکات اور تنوعات کے مطالعے کے لیے درج ذیل اصول وضوابط وضع کیے جاسکتے ہیں۔ایک ادبی فن پارہ فکر اور فن کا آمیزہ ہوتا ہے۔اس لیے اولین شرط یہ ہے کہ ان مجموعی اقدار کو ایک دفعہ دیکھ لیا جائے، ڈاکٹر عبدالمغنی کے مطابق:

> ایک زبان کا ادب پارہ اپنے عناصر ترکیبی کے جو نتائج پیش کرے ان کا موازنہ دوسری زبان کے ادب پارے کے عناصر ترکیبی کے نتائج سے کر کے ایک تقابلی میزان کل نکالنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔اس طرح مختلف ادبیات کا مکمل تناسب اور اس کی روشنی میں مختلف ادبی نمونوں کے مراتب کی نسبت معلوم ہو سکتی ہے۔(۴)

ان اصولوں اور ضابطوں کے عمومی اور اصولی معیارات کا تعین ضروری ہے۔یہ مطالعہ ان تخلیقات کی اندرونی تراکیب کا تنقیدی تجزیہ کر کے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔اس تقابلی عمل کے دوران دو بنیادی اجزا یہ ہو سکتے ہیں:

الف: عالمی ادب کے فن پاروں کے اشتراکات کی کیا صورت ہے۔ان تخلیقات کا موضوع کیا ہے؟

ب: اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کون سا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

ان اصولوں پر عمل کر کے موضوعہ تخلیقات کے اندر موجود مواد تک بہ آسانی رسائی ہو سکتی ہے۔ان کے بطن میں موجود پیچیدگیوں کا جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے۔ادبی تخلیقات کے مستقل بالذات مطالعے کے لیے یہ ضابطے بہ آسانی ان کی عمومیت

اور ہمہ گیریت کو منکشف کر سکتی ہے۔یہی معیارات تجزیہ و تقابل کے عمل پر پورے اتر سکتے ہیں۔یہاں چند بنیادی سوالات پر غور کرنا ضروری ہے:

الف: اب تک ہمارے ہاں عالمی ادب کے اشتراکی موضوعات کے تقابل اور تجزیے کا کیا انداز رہا ہے؟

ب: عالمی ادب کے آفاقی معیارات کی مدد سے اب تک کوئی سنجیدہ اور باضابطہ کوشش بھی ہوئی ہے کہ نہیں؟

ج: کیا مشرقی اور مغربی ادب کے فن پاروں کا ان کے جغرافیائی بعد کے سبب تجزیہ ممکن ہے؟ اگر یہ درست ہے تو اس سلسلے میں کتنی سنجیدہ اور باضابطہ کوششیں ہوئی ہیں۔

اہل اردو کے ہاں شروع سے عالمی ادب کے موضوعات تک رسائی کی خواہش کا سراغ ملتا ہے۔اس سلسلے میں اخذ و استفادے کی بجائے باقاعدہ مکالمے کی پہلی جان دار صورت علامہ محمد اقبال کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔اہل ہند نے گوئٹے، نطشے، دانتے، ہیگل، رومی، سنائی اور باباطاہر عریاں کی فکر کا ابتدائی طور پر اقبال کے ہاں مشاہدہ کیا۔اختر حسین رائے پوری، سعادت حسن منٹو اور میراجی نے روسی اور فرانسیسی ادب کو پاک و ہند میں متعارف کروایا۔عالمی ادب سے اخذ و استفادے کے لیے اردو ادیبوں نے عملی نوعیت کا کام انجام دیا ہے، البتہ یہ کام ذرا انفعالی نوعیت کا ہے۔آج کا اردو قاری ٹالسٹائی، دوستوفیسکی، میکسم گورکی، چیخوف، موپاساں، ایڈگر ایلن پو، بالزاک، ہرمن ہیسے، پابلو نرودا، پال والیری، سٹیفن میلارمے، جیمس جوائس، فرانزکافکا، ایذرا پاونڈ، مارشل پرووسٹ، بودلیئر، البیغ کامیو، گارشیالوکا، ژاں پال سارتر، بورخیس، میلان کنڈیرا، اوکتاویو پاز، گبریل گارشیامارکیز، پاؤلو کوہلو، ناظم حکمت، محمود درویش، رسول حمزہ توف، نجیب محفوظ، پروین اعتصامی، فروغ فرخ زاد، عبدالوہاب البیاتی اور دیگر بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے ناموں اور ادبی کارناموں سے واقف ہیں۔موضوع کے اعتبار سے دانتے کی ڈیوائن کامیڈی اور اقبال کی جاوید نامہ سیر افلاک سے متعلق فن پارے ہیں۔ڈیوائن کامیڈی دراصل سیر ملکوت ہے، جس میں ورجل اور اور کی محبوبہ بیاترس یا بیاتریچے اس اس کے تخلیق کار دانتے کے ہم راہ سفر کرتے ہیں۔اقبال اپنا سفر پیر رومی کی معیت میں طے کرتے ہیں۔جزوی اختلافات کے باوجود دونوں شہ کار باہم مماثلت رکھتے ہیں، ڈاکٹر محمد ریاض کے مطابق:

> دانتے کو حیات بعد الموت سے زیادہ دل چسپی ہے اور اقبال کو اس حیات کے ابدی بنانے سے، مگر ڈیوائن کامیڈی اور جاوید نامہ دونوں شاہ کار ہیں۔دونوں فلسفی مزاج شاعروں نے ان کتابوں میں اپنے عقائد کے مطابق حقائق و معارف جمع کیے ہیں، مگر ڈیوائن کامیڈی میں منظر نگاری زیادہ ہے اور جاوید نامہ میں حقائق نگاری کا بحر مواج دکھائی دیتا ہے(۵)

امیجری اور حقیقت کے بیانیے نے دونوں کی مماثلت میں کمی نہیں آنے دی، ان میں شعرا کی ذاتی پسند ناپسند کا خاصا عمل دخل ہے۔یہاں یہ سوالات قابل غور ہیں کہ ڈیوائن کامیڈی کیا واقعی شاعری کے اعتبار سے بھی اتنا اہم تخلیق پارہ ہے جتنا کہ تفکر و تخیل کے لحاظ سے؟۔کہیں ایسا تو نہیں کہ اس میں فنی عظمت ہونے کے باوجود شعری تجربہ تحدید کا شکار ہے۔یہی صورت حال

گوئٹے کی ایک نظم the mohammet geasang کی بھی ہے۔علامہ اقبال نے اس کی جوئے آب کے عنوان سے فارسی میں ترجمانی کی ہے۔اس نعتیہ نظم کے تراجم کا یہ سفر دیگر شعرا سے شان الحق حقی تک پہنچا۔اس سے اخذ واستفادے کی یہ صورتیں خاصی دل چسپ ہیں۔ متن کے اقتباسات دیکھیں:

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود
مانند کہکشاں بگریبان مرغزار
در خواب ناز بود بہ گہوارہ سحاب
وا کرد چشم بہ آغوش کوہسار
از سنگریزہ نغمہ کشاید خرام او
سیمائے او چو آئینہ بے رنگ وبے غبار
زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ میرود
در خود یگانہ ازہمہ بیگانہ میرود(٦)

See the rock. born stream like the gleam
of a star so bright
kindly spirits
high above the clouds
nourished him while youthful
in the copse between the cliffs(7)

وہ پاکیزہ چشمہ
وہ اوج فلک سے چٹانوں پہ اترا
درخشاں ستارے کی تھی جوت جس کے بدن میں
سحابوں سے اوپر بلند آسماں میں پر افشاں ملائک
کی چشم نگہ دار کے سائے سائے
چٹانوں سے نیچے اترتے اترتے
وہ کتنے رنگا رنگ ان گھڑ خزف ریزے
دامان شفقت میں اپنے سمیٹے

بہت سے سسکتے ہوئے، رینگتے، سست، کم مایہ سوتوں کو
چونکاتا، للکارتا، ساتھ لیتا ہوا خوش خراماں چلا(۸)

ان شعری نمونوں میں مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے فکری اشتراکات کا بھرپور تقابل کیا جاسکتا ہے۔ بسا اوقات دو مختلف زبانوں کے تخلیق کار ایک تیسری زبان کے فکری سرمائے سے مواد کشید کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں نہ صرف موضوعات بل کہ بعض اوقات کردار بھی ابدی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں ولیم شکسپیئر کے ڈرامے کے ایک کردار شائی لاک کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ یہ لوگوں کو بھاری شرائط کے ساتھ سود پر رقم دیتا ہے۔ جب اصل زر تو کیا سود کی رقم بھی واپس نہیں ہوتی تو وہ قرض خواہوں کے جسم سے سود کی رقم کے برابر گوشت اتار لیتا ہے۔ فلسطینی شاعر ابراہیم طوقان کے ہاں یہ کردار اسرائیلی یہودیوں کا نقش ثانی بن کر سامنے آتا ہے:

یوسف باعہ ابوکم یہودا
ان حب الدینار فیکم قدیم
شکسبئیر خالد القول فیکم
امر شیلوخ فی الوری معلوم
غیر ان اللذین منکم شکسبئیر
تناسو اما قال ذلک العظیم(۹)

اردو ادب میں احمد فراز کے ہاں شکسپئر کا تخلیق کردہ یہی کردار ایک اور شکل میں وقوع پذیر ہوتا ہے :

شائی لاک نے صدیوں پہلے
ایک طلائی مہر کے بدلے
میرے بدن کے گوشت کے بدلے
میرے بدن کے گوشت کا ٹکرا مانگا تھا
اور دنیا حیران ہوئی تھی(۱۰)

یہاں بہ آسانی عربی اور اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثر و نفوذ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ عالمی ادب کے مطالعے کی یہ شکل سہ لسانی ادب کے اشتراک کی ایک صورت ہے۔ مشرق اور مغرب دو الگ فکری اکائیاں ہیں، اور دونوں کے مابین تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے بعد المشرقین ہے، جب کہ عربی اور اردو کے درمیان صدیوں کا مذہبی اور سماجی انسلاک ہے۔ یہاں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عربی اور اردو کے اہل دانش کے مابین وہ روابط نہیں جو دو قوموں کے ایک دوسرے کے ساتھ ہونے چاہیں۔ عرب دنیا نے پاک و ہند کے کلچر کو یہاں کی لیبر کلاس کے ذریعے سمجھا ہے جو سن ساٹھ کی دہائی میں وہاں مزدوری کرنے گئی تھی۔ ہمارے ہاں

(چند مستثنیات کے ساتھ) جدید عربی ادب بہ راستہ انگریزی تراجم وارد ہوا ہے۔ فیض احمد فیض فکری اعتبار سے ترقی پسند تھے۔ ان کی شاعری کے تراجم دنیا کی متعدد زبانوں میں ہوئے۔ اسرائیل میں قیام پذیر ایک یہودی شاعر موشے بینار وچ نے ان کی مشہور زمانہ نظم مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر ان کا جواب کچھ یوں دیا ہے:

اس محبت کو ایک بار پھر مانگو
اسی محبت کو پھر طلب کرو
لیکن تم نہیں مانگو گی، تم مجھے در گزر کرنے کی کوشش میں ہو
تم کچھ مانگنے، کچھ طلب کرنے کے بجائے مجھے تسلی دینے میں ہمہ وقت کوشاں ہو
اس محبت کو حاصل کرنا تمہارا اور میرا حق ہے
اگر ہمیں وہ محبت میسر تھی، اگر ہم اسے کھو چکے ہیں
اور اگر ہم اس کا ذائقہ جانتے ہیں
تو ہمیں اس محبت کو دوبارہ کرنے کا حق حاصل ہے
ہم صرف خود کو، زندگی کو اور خدا کو الزام دے سکتے ہیں(۱۱)

پاکستان میں مارشل لا کے اعلان اور ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد ایک یہودی شاعر ایرش فریڈ نے اس سانحے کو شدت سے محسوس کیا۔ مغربی دنیا کے لیے جنوبی ایشیا کے ایک دور دراز ملک کے سیاسی لیڈر کو اس انداز میں منظر عام سے ہٹایا جانا کوئی اہم خبر نہ تھی لیکن ایرش فریڈ کے ہاں یہی خبر ایک انوکھا شعری تجربہ بن گئی ہے:

جلاد!
پھانسی لگنے والے کے گھر میں
رسی کی بات نہیں کرتے
اس کے گھر میں تو اب جلاد نے ڈیرے لگائے ہوئے ہیں(۱۲)

چین اور پاکستان کے باہمی تعلقات تاریخ کا ایک عہد ساز باب ہیں۔ یہ پاکستان ہی تھا جس نے ماوزے تنگ کے کیمونسٹ چین کا مغرب سے باقاعدہ رابطہ کروایا۔ چین کے حق میں قرار دادیں پیش کیں۔ ان دنوں کا ایک منظر معروف چینی شاعر کو مورد کی ایک نظم میں دیکھیں۔ اس حوالے سے قابل توجہ بات یہ ہے کہ اقوام عالم کے باہمی تعلقات کو ارباب قلم کس انداز سے دیکھتے ہیں۔ یحییٰ امجد نے اس نظم کا دلیل و برہان کی روشنی میں (امن کی فاختہ کا گیت کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے:

ہر جگہ، چاہے کوئی بھی ملک ہو
میری طرح کی فاختائیں ہیں

سو میں ہر سرزمین کی زبان سمجھ سکتی ہوں
میں آسمانوں میں اونچی اڑ جاؤں گی
کسی گدھ، کسی عقاب اور کسی امریکی جہاز کا خدشہ کیے بغیر
کوئی بھی جارحیت یا غلامی نہیں چاہتا
سب زندگی چاہتے ہیں نہ کہ موت!!
میں چین کے وفد کی پر وقار تقریر سنتی ہوں
پھر سوویت یونین کی اختتامی تقریر
وہ اعلان جو آسٹریلیا کے وفد نے پڑھا،
اور پاکستان کو قرار دادیں پڑھتے ہوئے سنتی ہوں
آزادی میں جاپانی اور کوریائی وفود شانہ بہ شانہ
امریکی اور سوویت وفود ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
برہان کی روشنی میں تضادات پگھل گئے
اور کامل اتفاق کے لیے رضامندی پیدا ہو گئی
تو اے امن کے محافظو! آپ کو الوداع! (۱۳)

مغرب کی جدید ادبی تحریکوں کے بھی اردو ادیب کے ساتھ عالمی ادب کے رشتے کو مضبوط کیا ہے۔ اس سے ہمارے ہاں شاعروں اور ادیبوں کا موازنہ کرنے کی روایت نے جنم لیا۔ اقبال اور گوئٹے، فیض اور پبلو نرودا، چارلس بودلیئر اور میراجی، مجید امجد اور ٹی۔ ایس، ایلیٹ، احمد فراز اور محمود درویش کی شاعری کا تقابل ہوتا رہا۔ شعرا اور ان کے عہد کی مماثلتوں کو سامنے رکھ کر ان کے شعری موضوعات پر بحث کی گئی۔ یہاں سہیل احمد کے ایک مضمون میں دونوں کا موازنہ دیکھیں:

> بودلیئر اور میراجی دونوں نے صنعتی و مشینی ترقی کے تحت تشکیل پانے والی زندگی کا تجزیہ فرد کے احساس شکست، اس کی تنہائی، محرومی اور نارسائی کے تناظر میں کیا۔ یوں اپنے زمانے کے مروجہ معیارات سے ہٹ کر، مادی اقدار سے الگ ہو کر، روحانی عناصر کی بازیافت کے عمل کو باقاعدہ ایک طرز احساس کی صورت دی۔ صنعتی اور مشینی معاشرت کے خلاف فرد کے رد عمل کی مثالیں پیش کرنے کے لیے اپنی ذات کا دائرہ معاشرے تک پھیلا دیا۔ (۱۴)

دو مختلف معاشروں، علاحدہ زمانوں اور جداگانہ پس منظر رکھنے والی زبانوں کے شاعروں کا موازنہ بہت سے حوالوں سے درست ہو گا لیکن اس عمل کے دوران کچھ باتوں کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ جب دنیا کے کسی ادب کا دوسری زبان کے ادب سے تقابل ہو تو نیک نیتی کے ساتھ اصل حقائق تک رسائی کی کوشش کی جانی چاہیے۔ مشرقی ممالک کے اجتماعی لاشعور میں خوئے غلامی کا

وجود اس کے علمی اہداف کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ان کے دانش مند طبقے کو احساس محرومی کا شکار رکھا گیا ہے۔اہل مغرب کی فکر پر آغاز ہی سے عقل پرستی حاوی رہی ہے۔ان کی قومی نفسیات بین البراعظمی رہی ہے۔یہاں پروفیسر نظیر صدیقی کی یہ بات قابل غور ہے کہ :اہل مغرب نے جدید علم وحکمت کے تمام اثاثوں اور دعووں کے باوجود اپنے خطے کی زبانوں کی ادبیات کا توہر جہت سے مطالعہ کیا اور اپنی تنقیدوں کا انداز اکثر وبیش تر بین الاقوامی رکھا(۱۵)

اس باب میں اردو کی بے چارگی اور بے مائگی قابل غور ہے۔دنیا کی دیگر تہذیبوں کے فکری موضوعات تک ہماری رسائی انگریزی ادب کے تابع ہے۔بہ قول ڈاکٹر فاخر حسین:

> خارجی ممالک کی تہذیبوں،دانش وری اور ان کے ادبیات سے اردو دان معاشرہ کی روشناسی انگریزی زبان کی پابند اور اس کے اثاثہ سے محدود ہے(۱۶)

عالمی زبانوں کے ادب کے اس باہمی تعلق نے خوب صورت منظر نامے کو ترتیب دیا ہے۔آفاقی موضوعات پر مشتمل ادب سرحدوں کا محتاج نہیں ہوتا۔دنیا کی مختلف زبانوں کا ادب اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ قبولیت حاصل کرتا ہے۔دو زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں کا تقابل ایک دل چسپ عمل ہے لیکن اس کے لیے چند اصولوں اور ضابطوں کا ہونا لازمی ہے۔مثال کے طور پر:

ا: جب ایک زبان کے کسی ادبی فن پارے کا دوسری زبان کے کسی نمونے کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو اس کے عہد اور سماجی پس منظر کا تعین ضرور کیا جائے۔

ب: عالمی ادب سے ترجمہ کرتے ہوئے صرف اعلیٰ تخلیقات کو ہی منتخب کیا جائے۔

ج: اردو کے ادیبوں کا انفرادی طور پر دنیا کے دیگر ادیبوں کی تخلیقات کے ساتھ فکری موازنے کی روایت کو اور مضبوط بنایا جائے۔

د: ملکی جامعات میں زبانوں کے شعبہ جات کو متمول بنانے کے ساتھ ساتھ وہاں ایک مضبوط دارالترجمہ بھی قائم کیا جائے۔

ہ: جامعات میں ایم۔اے اور ایم۔فل کے درجے کے اسکالرز سے دیگر زبانوں کے ادب کے تراجم (مع حواشی وحوالہ جات) کروائے جائیں۔اس سلسلے میں انتظار حسین کے کیے ہوئے تراجم سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ان کے ہاں بعض تراجم کے ساتھ متعلقہ زبان کے محاورات، تلمیحات و تشبیہات وغیرہ کی وضاحت اس فن پارے کے معایب ومحاسن کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں ادب اور ادیبوں کے تقابل کے لیے مختلف افکار و نظریات متعارف کروائے گئے ہیں۔ تہذیبی اور جغرافیائی تفریق کے سبب سو فی صد ایمان داری یا حقائق پر مشتمل موازنہ ممکن نہیں۔اس حوالے سے بہت سے سوالات جنم لیتے ہیں جو تاحال جواب سے محروم ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔نورالحسن، ہاشمی، ڈاکٹر، ادب کیا ہے، لکھنو، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۶ء، ص ۱۶۶

۲۔عبدالمغنی، ڈاکٹر، اقبال اور عالمی ادب، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۲ء، ص ۵۶۰

۳۔وہاب اشرفی، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات عالم، جلد اول، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۶ء، ص ۸

۴۔۔عبدالمغنی، ڈاکٹر، اقبال اور عالمی ادب، ص ۵۶۷

۵۔محمد ریاض، ڈاکٹر، جاوید نامہ تحقیق و توضیح، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۹

۶۔علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال فارسی، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۷ء، ص ۲۱۳

۷۔شاکر کندان، گوئٹے کی ایک نعتیہ نظم، سہ ماہی، پیغام آشنا، اسلام آباد، شمارہ ۳۴، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۱

۸۔شاکر کندان، گوئٹے کی ایک نعتیہ نظم، ص ۱۴۲

۹۔ابراہیم طوقان، فلسطین کے چار شعرا، دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۹۴ء، ص ۲۲۱: ابراہیم طوقان کی اس نظم کا اردو ترجمہ محمد کاظم نے کچھ اس طرح کیا ہے: شیکسپیئر نے تم لوگوں کے بارے میں

لازوال بات کہی ہے
اور شائی لاک کے بارے میں تم لوگوں کو معلوم ہے
مگر وہ لوگ جو تمہاری قوم میں شیکسپیئر کی طرح ہیں
اس عظیم شخص کی کہی ہوئی بات بھول گئے ہیں

۱۰۔احمد فراز، شائی لاک، دنیازاد، کراچی، شمارہ ۵، ۲۰۰۱ء، ص ۳۲۱

۱۱۔موشے بینا روچ، مجھ سے پہلی سی محبت مانگ لو، مترجم، سحر انصاری، دنیازاد، کراچی، شمارہ ۵، ۲۰۰۱ء، ص ۴۰۵

۱۲۔ایریش فریڈ، عالمی ادبی تراجم، مرتبہ، سعود سلیم، کراچی، بک لینڈ، ۱۹۸۹ء، ص ۲۱۳

۱۳: کو مورد، دلیل و برہان کی روشنی میں (امن کی فاختہ کا گیت)، مترجم، یحییٰ امجد، ماہ نو، لاہور، چالیس سالہ مخزن، جلد دوم، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۳۵

۱۴۔ سہیل احمد، چارلس بودلئیر اور میراجی: مماثلتیں اور اختلافات، اسلام آباد، تخلیقی ادب، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، شمارہ ۶، ص ۲۴

۱۵۔ نظیر صدیقی، پروفیسر، مغربی ادب کے دریچے، ملتان، کاروان بک ڈپو، ۱۹۸۸ء، ص ۴۷

۱۶۔ فاخر حسین، فرانسوی ادب کے آثار، لاہور، نگارشات، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱

اردو کا ناول جس پر فحاشی کے الزام میں پابندی لگی

زیف سید

آپ نے فلموں میں دیکھا ہو گا کہ بلندی پر اڑتے جہاز کا دروازہ یا کھڑکی کسی حادثے سے کھل جاتی ہے اور جہاز کے اندر ایک تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ ہر شے بگولوں کی زد میں آ جاتی ہے، سامان، لباس اور خود مسافر اس جھکڑ میں کترنوں کی طرح اڑتے پھرتے ہیں اور ہیرو یا اس کے حواری بمشکل سیٹ یا کسی دیوار کو مضبوطی سے تھام کر خود کو خلا کا نوالہ بننے سے بچاتے ہیں۔

اکرام اللہ کے ناول 'گرگِ شب' پڑھتے وقت میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ جیسے کتاب کے ورق نہیں کھولے، غلطی سے 40 ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتے جیٹ کا دروازہ کھول لیا ہے۔ پھر جو جھکڑ چلے انہوں نے 'گرگِ شب' کے بارے میں پہلے سے پڑھی سنی باتیں، محمد خالد اختر اور محمد سلیم الرحمٰن (دونوں پسندیدہ ادیب) کے اسی ناول کے شروع میں دیے گئے دیباچے، اردو ناول کے اسالیب کے بارے میں نظریات، اردو نثر کے امکانات کے بارے تصورات سبھی دماغ کے اندر ادھر ادھر پھڑ پھڑانے لگے۔

یہ ناول نہیں ہے، فورس آف نیچر ہے، کوئی وبائے بیدرماں ہے، کوئی کلاؤڈ برسٹ ہے، آتش فشاں کے دہانے سے چھلکتا لاوا ہے جو ہر شے کو لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ بلکہ یہ استعارے ناکافی ہیں، 'گرگِ شب' کی شدت اور حدت کو اسی کی ایک ڈیوائس کی مدد سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ ناول کے مرکز میں چند کابوس ہیں، جو ہر رات اندھیرا پھیلتے ہی مرکزی کردار شفیع کو دبوچ لیتے ہیں اور اسے زندگی گزارنے جوگا نہیں چھوڑتے (ناول کا نام 'گرگِ شب' غالباً اسی وجہ سے رکھا گیا ہے)۔ بالکل ایسے ہی یہ ناول بھی ایک کابوس ہے جو قاری کے حواس پر سوار ہو جاتا ہے اور کتاب ختم ہونے کے بہت عرصے بعد بھی اپنے چنگل سے نکلنے نہیں دیتا۔

اکرام اللہ کے اس ناول کا ذکر ادھر ادھر سننے کو ملتا تھا، ساتھ میں یہ بھی حاشیہ بھی کہ اس پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ کس واسطے کہ اس کے مواد پر جنس کا غلبہ تھا۔ لیکن اس کے علاوہ نہ تو 'گرگِ شب' کا ذکر اردو ناول نگاری پر کسی تنقیدی کتاب میں آتا ہے نہ ہی اکرام اللہ پر کوئی نصف سنجیدہ تنقیدی مضمون پڑھنے کو ملا۔

'گرگِ شب' شروع کیا تو ایک نشست کے بعد دوسری نشست کا انتظار کرنا سوہان ہو گیا۔ ختم کر کے کتاب بند کی تو کان بھی ساتھ ہی یوں بند ہو گئے جیسے بم دھماکے کے بعد قوتِ سماعت کچھ دیر کو مختل ہو جاتی ہے۔ جب حواس بحال ہوئے تو اسے اردو ناول کی تاریخ میں الگ کھڑا پایا۔

ہمارے ہاں بڑا بڑا ناول لکھا گیا ہے، تاریخی ناول، سماجی ناول، نفسیاتی ناول، رومانوی ناول، دہشت ناک ناول، فلسفیانہ ناول، وغیرہ۔ لیکن 'نفسیاتی دہشت ناک (psychological horror)' ناول کی شاید یہ پہلی مثال ہے۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ ناول صرف نفسیات کی سطح پر تیرتا رہتا ہے۔ اس کی جڑیں اصل زندگی میں بھی دور تک پیوست ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب ناول اچانک حقیقت سے اٹھ کر نفسیاتی دہشت کی دنیا میں داخل ہوتا ہے اور اس کی کاٹ دونی ہو جاتی ہے۔

مرکزی کردار کے بچپن کے واقعات، سگی اور سوتیلی ماؤں کی آویزش، باپ اور بھائیوں بھابھیوں کے ساتھ مشترکہ گھر میں گزرا بچپن، دوستوں اور حمیدہ نامی لڑکی کے ساتھ اولین رومانس کے چھینٹے، کلب کی بوریت گزیدہ زندگی، اپر کلاس کا کھوکھلا پن اور منافقت، یہ سبھی جھلکیاں حقیقی دنیا کی عکاس ہیں۔ لیکن ان کے دوران دفعتاً، بعض اوقات ایک ہی فقرے کے اندر، ماضی حال میں اور خارج داخل میں گھل جاتا ہے۔ فکشن رائٹنگ کی کلاسوں میں ایسی چیزوں کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے اور ہدایت کی جاتی ہے کہ ہر حصے کو الگ رکھا جائے، مگر اکرام اللہ ایسی کسی ادبی چھوت چھات کے قائل نہیں اور اپنے قلم کے زوم لینس کی ایک ہی جنبش سے فوکس ذات سے بدل کر کائنات پر مرکوز کر لیتے ہیں، اور پھر اتنی ہی سہولت سے واپس زمین کو گرفت میں لے لیتے ہیں۔

لیکن میرے لیے سب سے چونکا دینے والی چیز یہ تھی کہ ناول نے جس نثری اسلوب کو ناول کی کہانی کے اندر بن دیا ہے اس کی کوئی مثال کم از کم اردو میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اردو قاری (اور کم سواد نقاد) اکثر ناول کے اندر منظر کشی ڈھونڈتا رہتا ہے، یہ سوچے بغیر کہ منظر کشی اگر کردار کی نفسیات سے ہم آہنگ نہیں ہے اور پلاٹ کو آگے نہیں بڑھاتی تو اس کی حیثیت ان بھدی آرائشی پٹیوں سے زیادہ نہیں جو کسی تہوار کے موقعے پر سڑک کے کنارے لگے شیشم کے کسی 'ساونت' درخت پر لگادی جاتی ہیں اور ہوا کے تھپیڑوں کے ساتھ بے مقصد پھڑ پھڑاتی رہتی ہیں۔

فکشن بنیادی طور پر کردار نگاری کا آرٹ ہے۔ تگڑا کردار تخلیق کر دیں، وہ اگر چھینک بھی مارے تو وہی پلاٹ ہے۔ تگڑا کردار جو اپنے ارد گرد دیکھتا ہے، جو محسوس کرتا ہے، وہی منظر کشی ہے۔ منظر کشی کچھ اور نہیں، کردار پر گزری ہوئی واردات ہے۔ ان گھڑ مصنف کہانی کو ڈوبتے سورج، دریا کی اٹکھیلیاں کرتی موجوں، گھاس پر اوس کے قطروں کے بدمزہ شیرے میں لتھیڑ دیتا ہے، کردار کونے میں کھڑا انتظار کرتا رہ جاتا ہے کہ پہلے مصنف صاحب منظر نگاری کا شوق پورا فرمالیں تو آگے بڑھیں۔ اصیل مصنف کردار کی ہڈ بیتی کو منظر بنا دیتا ہے۔

یہی کمال اکرام اللہ نے 'گرگِ شب' میں کیا ہے۔ یہاں منظر کشی موجود ہے، جس میں ساحلِ سمندر پر سر پٹکتی موجوں، آسمان پر چمکتے تاروں، شہر کی تاریک اور ویران سڑکوں، اور عورت کے عریاں بدن کی 'بدنام زمانہ' جزئیات تک شامل ہیں (جن کی بنیاد پر کسی بدذوق بابو نے ناول پر پابندی لگادی، جس کا ذکر بعد میں)۔ مگر یہ بیان کردار کی ذاتی واردات، کہانی کی نفسیات اور وقوعے کے تار و پود کے ساتھ یوں آمیخت ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ ہم نے سوچا کہ اس بات کو کسی مثال سے واضح کریں مگر ناول ہی سے تشبیہ مل گئی: 'وہ مجھ سے ایسے چمٹی ہوئی تھی جیسے میں سمندر میں بہتا ہوا تختہ ہوں اور وہ تباہ شدہ جہاز کی مسافر۔'

چلیں، ذکر آ ہی گیا ہے تو 'گرگِ شب' میں سے منظر کشی کی ایک ماسٹر کلاس دیکھیے :

'سامنے جفتی کی لذت سے کراہتا ہوا سیاہ سمندر اور اسی لذت میں ڈوبی ہوئی مدہوش کالی رات باہم دگر لپٹے ہوئے پڑے تھے۔ آسمان اپنی لاکھوں چمکدار آنکھیں پوری شدت سے پھاڑے حسرت سے دیکھ رہا تھا کہ کاش اگر میں اپنی بلندیوں سے پیچھا چھڑا سکتا تو میرا محبوب آج مجھ سے یوں مایوس ہو کر رقیب سے تسکین کا جویانہ ہوتا۔'

یہ وہ موقع ہے جب ناول کا مرکزی کردار شفیع ریحانہ نامی ایک عورت، جو اس کے دوست کی بیوی مگر اس پر ملتفت ہے، کو ساتھ لے کر ساحل پر آیا ہوا ہے، لیکن شفیع کی روح کے بگولے ہمہ وقت اس کے قدم اکھیڑے رہتے ہیں۔ بلانوشی کی لت، دانستہ بیخوابی اور اپنے گھر سے اندھیروں کو جلاوطن کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ریحانہ کی طرف التفات بھی ان بگولوں سے جان چھڑانے کے بہانے ہیں۔ مگر سمندر کے تاریک ساحل پر خود سپردگی سے چور ریحانہ اس سے اتنی ہی دور ہے جتنا آسمان سے سمندر۔ آسمان تو پھر بھی ایک فاصلے پر جا کر سمندر سے ہم آغوش ہو ہی جاتا ہے، مگر شفیع سمندر کے کنارے بھی پیاسے کا پیاسا رہتا ہے۔

'گرگِ شب' بیک وقت کئی سطحوں پر چلتا ہے اور یوں تہہ داری اس کے کاغذی پیرہن کے اندر کسی جاپانی اوریگامی کی طرح موجود ہے۔ ایک اور اہم عنصر ابہام ہے، کہ ناول بہت سی چیزوں پر پردہ ڈالے رکھتا ہے، حتیٰ کہ ناول کے مرکزے میں موجود طعنے کے بارے میں بھی آخر تک معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے اور نہ ہی ناول کو حقیقت معلوم کرنے اور قاری کو ہر شے 'کھول کھول کر بتانے' میں کوئی دلچسپی ہے۔ اسے غرض ہے تو بس اس سے کہ یہ نفسیاتی گتھی مرکزی کردار کی شخصیت کو کیسے چرمرا دیتی ہے۔

'گرگِ شب' کے بارے میں سوچتے ہوئے منٹو کے افسانے 'ٹھنڈا گوشت' کا خیال آنا لازمی ہے۔ ایک تو کہانی کسی حد تک ملتی جلتی ہے، دوسرے دونوں پر فحاشی کے الزام میں پابندی لگی۔ پابندی کا ذکر تھوڑی دیر بعد میں، پہلے مماثلت کا ذکر ہو جائے۔

'ٹھنڈا گوشت' میں ناول کا مرکزی کردار ایشر سنگھ تقسیمِ ہند کے دوران پیش آنے والے ایک واقعے کے باعث منجمد ہو جاتا ہے۔ 'گرگِ شب' میں ایک طعنے کا گرز مرکزی کردار شفیع کو چاروں شانے چت کر دیتا ہے۔

لیکن 'ٹھنڈا گوشت' سیدھا سیدھا افسانہ ہے، اس میں جو کچھ ہے سطح پر ہے۔ فیض نے اس پر چلنے والے فحاشی کے مقدمے کے دوران عدالت میں کہا تھا کہ 'اس افسانے میں مصنف نے فحش نگاری نہیں کی لیکن ادب کے اعلیٰ تقاضوں کو بھی پورا نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں زندگی کے بنیادی مسائل کا تسلی بخش تجزیہ نہیں۔'

'زندگی کے بنیادی مسائل کے تجزیہ' تو شاید ترقی پسند چورن بیچنے سے 'تسلی بخش' طریقے ہو جاتا، البتہ اس میں منٹو کا افسانہ یقیناً حلال ہو جاتا، اس لیے افسانہ یک رخا ہی سہی مگر موضوع کے تیکھے پن، مکالموں کی تیز دھار اور تکنیک کی چابک دستی کی

وجہ سے پڑھنے والے کی یاد کے پردے پر نقش ہو جاتا ہے۔ کم ہی کوئی فراموش کار قاری ہو گا جس نے یہ افسانہ پڑھا ہو اور اسے بھول گیا ہو۔

'گرگِ شب' پر فحاشی کے الزام میں پابندی ضرور لگی، مگر مقدمہ نہیں چلا۔ اس کی وجہ مصنف نے راقم کو یہ بتائی کہ منٹو اور عصمت وغیرہ پر انگریزی دور کے قوانین کے تحت مقدمے چلائے گئے تھے، مگر بعد میں مملکتِ خداداد میں یہ قوانین بدل دیے گئے، اور اب حکومت مصنف کو اٹھوانے کی بجائے صرف کتاب اٹھانے پر اکتفا کرتی ہے (البتہ صحافیوں کے لیے یہ سہولت حسبِ سابق اور حسبِ ضرورت اب بھی جوں کی توں موجود ہے)۔

'ٹھنڈا گوشت' پر چلنے والے مقدمے کی کارروائی کے دوران یہ نکتہ بارہا زیرِ بحث آیا کہ فحش اور مخرب الاخلاق کیا ہے، مگر کوئی تسلی بخش تعریف سامنے نہ آ سکی۔ یہ تو خیر ہمارے ملک کی ایک عام سی عدالت تھی، 1964 میں خود انکل سام کی سپریم کورٹ کے سامنے بھی فحش کی تعریف کا معاملہ پیش ہوا تھا، جس پر ایک جج پاٹر سٹیورٹ نے زچ ہو کر کہا تھا، I know it when I see it. انگریزی زبان میں یہ فقرہ اب محاورے کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔

اس معاملے پر خود گھوڑے کے منہ سے بھی سن لیجیے: منٹو ایک مضمون میں لکھتے ہیں، 'افسانہ ٹھنڈا گوشت پڑھ کر اگر کسی صاحب کے جذبات برانگیختہ ہوں تو انہیں کسی ذہنی معالج سے رجوع کرنا چاہیے۔۔۔ ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے۔ جو لوگ روحانی، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں، اصل میں انہی کے لیے شاعر شعر کہتا ہے، افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصور تصویر بناتا ہے۔ میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لیے ہیں۔'

ایسے ہی ایک تندرست صاحب اور استغاثے کے گواہ ایم ڈی تاثیر (پنجاب کے مقتول گورنر سلمان تاثیر کے والد) نے جرح کے دوران ایک دلچسپ بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ اس افسانے کو پڑھ کر جنسی کراہت تو محسوس ہو سکتی ہے، جنسی ترغیب نہیں۔

یہ بات 'گرگِ شب' پر بھی صادق آتی ہے کہ اس ناول کی دنیا میں جنس کو پہلے تو ایک گھناؤنی سماجی چال کے طور پر برتا جاتا ہے، جو آگے چل کے ایک لایعنی حیاتیاتی ذمہ داری بن جاتی ہے۔

اکرام اللہ صاحب مقدمے سے بچ گئے، لیکن اگر مقدمہ چلتا، اور فیض صاحب بھی موجود ہوتے (کتاب 1979 میں، یعنی ضیاء الحق کے دور میں چھپی اور اٹھوائی گئی تھی اور فیض صاحب اس وقت یقیناً موجود تھے) تو شاید وہی رائے دیتے کیوں کہ ناول میں سماجی مسائل کا 'تسلی بخش' تو کیا 'مولا بخش' تجزیہ بھی نہیں ہے، لیکن اگر روح کی تاریک ترین گہرائیوں کی گنجل گتھیوں کو روشنی میں لے آنا اور ایسا کرتے ہوئے اردو نثر کے امکانات کو پوری طرح سے نچوڑ کر رکھ دینا کوئی آرٹ ہے تو اس سے ناول یوں لبالب ہے جیسے۔۔۔ تشبیہ کے لیے ناول ہی پڑھ لیجیے۔

کلاسیکی اردو شعر اور طبِ یونانی
(ذوق، مومن اور غالب کے تناظر میں)

ڈاکٹر ارسلان راٹھور

کلاسیکی ادب سے رغبت رکھنا اور یونانی حکمت سے بے بہرہ ہونا، عجائب کا مقام ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے، انیسویں صدی کی دِلّی میں حکمت سے ناآشنائی بڑے حجاب کی بات تھی۔ شاعروں کو تین کام تھے: شعر کہنا، حکمت سیکھنا اور ذکر اذکار کرنا۔ نوبت بہ این رسید کہ غالب تک نے اپنے خط میں روزمرہ اذکار و وظائف کا ماجرا لکھا ہے۔ یہ سب ہمارے لیے بھلے ہی تضاد آمیز امر ہو، لیکن سچ یہ ہے، اِن صفات نے کلاسیکی شاعروں میں رنگارنگی اور یگانگت پیدا کر رکھی تھی۔ ایک طرف زبردست شعری معرکے، دوسری جانب ذاتی ہم دردی و ہم دلی۔ سارا غبار مشاعرے میں دھواں ہو جاتا۔ اِدھر شمعِ مشاعرہ گل ہوتی، اُدھر سب کدورتیں جل کر خاکستر ہو جاتیں۔ کینے کے بار کو کلاسیکی شاعروں سے بہتر کوئی نہ سمجھا:

آ جائے گر غبار ذرا سا پہاڑ ہے
کب ہے دلوں کو سدّ سکندر کی احتیاج

(ناسخ)

حکمت اور وید سے کون سا عہد خالی رہا ہو گا! لیکن انیسویں صدی میں اس کا ذکر بہت بڑھ گیا تھا۔ یا یوں کہیے، ہمیں دکھائی زیادہ دینے لگا تھا۔ یہ بھی ہے کہ نئی روشنی انسان کے لیے تاریکی کا بہت کچھ سامان میسر کر رہی تھی، اب طب و حکیم، ویدک و وید سے فرار کہاں! اگرچہ اٹھارویں صدی کے عظیم شاعر میر تقی میر کے دیوان بھی حکمت کے کنایوں کا خالی نہیں لیکن طب کے تلازمے بہ طور مضمون (Theme) انیسویں صدی میں زیادہ رائج استعمال ہوئے۔ شاید انگریزی دوا کی آمد سے دُونے کی قیمت کا احساس ہونے لگا ہو۔ دُونا، اس ورق کو کہتے ہیں، جس پر پرانے حکما اور اطباء دوائی باندھتے تھے۔ جنوبی ہند میں کیلے کے چھلکوں کو بھی دونے کے طور پر صرف میں لایا جاتا تھا۔ میر کے دو شعر دیکھیے:

طبیب سبک عقل ہرگز نہ سمجھا
ہوا درد عشق آہ دونا دوا سے

دیوان اول

میں جو نرمی کی تو دونا سر چڑھا وہ بدمعاش
کھانے ہی کو دوڑتا ہے اب مجھے حلوا سمجھ

دیوان دوم

میر نے دونوں شعروں میں دُونے کی طب و حکمت اور عام استعمال کی رعایت برتی ہے۔

انیسویں کے وسط تک چھاپہ خانوں کی بدولت متعدد طب کی کتابیں شائع ہونے لگی تھیں۔ اس سے پہلے یہ سارا کاروبارِ حیات سینہ بہ سینہ رواں تھا۔ حکیم اپنے گھریلو نسخے کسی کو نہ بتاتے اور سارے گنجینے سینوں میں دبائے دامنِ رحمت میں پہنچ جاتے۔

جہاں تک اردو زبان کی داستان ہے، غالب نے سب سے پہلے، اپنے خطوں میں طب کی شیشیاں سجائی ہیں۔ غالب کی اپنی صحت بھی قابل رشک نہ تھی، کچھ اپنے ذکر میں، کچھ دوستوں کے باب میں، دلی کی طبی دنیا اور اس کی رنگارنگی کھینچ کر خطوں میں آگئی ہے۔

شعر کی ذیل میں یہ حالت ہے کہ ذوق، غالب اور مومن حکمت کی اصطلاحوں کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے۔ ذوق کے قصائد، مومن کی غزلیات، غالب کے خطوط (کسی قدر غزلیات بھی) حکمت کے بغیر سمجھ آنے سے رہے۔ کون لکھے اور کتنا لکھے! چند شعر سناتا ہوں۔ عاقلے را اشارا کافی ست۔

ذوق نے پہلا قصیدہ بہادر شاہ ظفر کی ولی عہدی میں لکھا۔ ولی عہد بخار سے چُور تھے۔ حکیموں کی محنت رنگ لگائی، دعاؤں نے اثر دکھایا، رُو بہ صحت ہوئے۔ ذوق نے قصیدہ کہا اور استادی کا خلعت پایا۔ قصیدہ ہے: واہ واہ کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا۔ پچپن شعروں کا قصیدہ، حکمت کی اصطلاحوں سے لدا پھندا ہے۔ دو شعر سنیے:

ہو گیا زائل مزاج یار سے یاں تک جنوں
بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں ہے کچھ پتہ

بید مجنوں کو انگریزی میں Weeping Willow اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے پتے آہستہ آہستہ لرزتے رہتے ہیں۔ اس کیفیت کو Rigor کہتے ہیں۔ شعر کا لطف یہ ہے کہ جنوں ایسا زائل ہو گیا کہ بید مجنوں کا صحرا میں پتہ تک (بہ ہر دو معنی: نشان و برگ) نہیں ملتا۔

ہے مزاجِ اہل عالم یہ بہ قدر اعتدال
ساتوں اقلیمیں ہیں اب گویا اب بہ خطِ استوا

مناسبتوں کی وسعت ملاحظہ ہو۔ دوسرے شعر کا قصہ یوں ہے کہ طبِ یونانی کے قاعدے سے دنیا کو سات اقلیموں میں بانٹا گیا ہے۔ ہر اقلیم کا اپنا مزاج ہے اپنے مسائل۔ یہ بات نری شاعرانہ نہیں ہے، ابن خلدون بھی اس کا قائل تھا۔ ساتوں اقلیموں کے نام یہ ہیں: ہندوستان، چین، ترکستان، ایران، توران، بلخ، روم۔ سب سے زیادہ معتدل مزاج خطِ استوا کا ہے۔ خط استوا وسط آسمان کا ایک خط موہومی ہے جس کا ایک سرا قطب شمالی جب کہ دوسرا قطب جنوبی سے جڑا ہے۔ شعر پر غور کریں، زندگی میں چیزیں ایسی مناسبت سے اعتدال و توازن میں آگئی ہیں گویا ساتوں اقلیمیں ہی خط استوا پر ہیں۔ سبحان اللہ، من خندم کہ باغ خندد۔

پورے قصیدے میں طب کی اصطلاحیں گوناگوں ہیں: بغیر انتخاب کے چند اصطلاحیں لکھتا ہوں۔ مومیا، صفرا، کہربا، تولید، سمیّت، نربسی، مہرہ، نفخ، تقیح، جیدالکیموس۔

یہ تو قصیدے کا ذکر ہوا، ذوق کی غزل کے چند شعر بھی دیکھیے:

مجھ کو صدقہ کر اگر ہے بد مزہ تیرا مزاج
یہ اِدھر تو نے کیا اچھا اَدھر اچھا ہوا

حکمت میں مزاج کی بدمزگی خود بیماری نہیں، بل کہ آغازِ بیزاری کی علامت ہے۔ پرانے حکماء جہاں علاج کرتے تھے، وہیں دانائی کی باتیں بھی سُجھاتے تھے۔ دلی لکھنؤ میں حکیم صدقہ دینے کے طریقے، صدقے کا وقت، دن، مریض کے علم میں لاتے تھے۔ یونانی طب میں یہ لطافت یہاں تک پہنچی کہ طبیب کا مریض کو ہنس کر جانچنا بھی اہم ٹھہرا۔ حکیم اجمل کے مطب میں اس کی خاص اہمیت تھی۔ عبدالباری آسی نے اپنی کتاب، سانس کے عجائب، میں اس اہم بات کا ذکر کیا ہے۔ ذوق کا شعر دِلّی کے انھیں عاشقانِ دین وذوق کا نمائندہ ہے۔ دو شعر اور دیکھیے:

بعد مردن ہی ترے زخمی کو راحت کو تو ہو
جیتے جی راحت کہاں درد جراحت کو تو ہو

تلخابۂ حسرت کو پیوں کیوں نہ مزے سے
میرے لیے تبرید تپِ سوز دروں ہے

تبرید عمومی ٹھنڈک کے علاوہ مسہل کے اول تین دن، دل کو تقویت بخشنے والی دوا کا نام ہے۔ عام زبان میں اسے ٹھنڈائی یا سردائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حکماء میں اس کا استعمال عام ہے۔ تبرید پر قائم چاندپوری نے عمدہ مضمون نکالا ہے:

دو چند گریہ کی تبرید سے ہوئی تب عشق
زیادتی کا مرض کی ہے یاں دوا باعث

چند شعر غالب اور میر کے بھی ملاحظہ ہوں:

مومن:

کسی کو قشعریرہ سے عفونت کا جو دھیان آیا
تو آخر سونگھنے کو بول کا شیشہ منگایا ہے

قشعریرہ بخار کی حالت میں جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے کی کیفیت کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے قشعریرہ خود بیماری نہیں بل کہ علامتِ بیماری ہے۔ عفونت کے عام معنی سرانڈ کے ہیں لیکن عفونت الدم خون کے متعفن یا Infected ہو جانے کو کہتے ہیں۔ بول کا شیشہ، قارورہ کا برتن ہے۔

میر نے تلفظ کے فرق کے ساتھ قشعریرہ (دوم بالفتح) کو غضب طور سے باندھا ہے:

کچھ کم ہے ہولناکی صحرائے عاشقی کی
شیروں کو اس جگہ پر ہوتا ہے قشعریرہ

مومن:

بیمار کر دیا شبِ ہجر بتاں نے آہ
کیا ہو گئے وہ روز کہ پرہیز گار تھا

اس شعر میں پرہیز گاری سے مراد، پرہیزی ہونا ہے۔ عشق سے پرہیز علاج معالجے کا حصہ تھا، جو جاتا رہا۔ اس کی مثال جدید طب میں بھی مل سکتی ہے۔ مثلاً Broken Heart Syndrome وغیرہ میں جذباتی وابستگی سے خاص طور پر منع کیا جاتا ہے۔

مومن کے قصائد نہ صرف طب کی اصطلاحوں بل کہ علاج اور چارہ جوئی کے طبّی حربوں (Medical Strategies) سے بھرے ہیں۔ اپنی طب آگاہی کے بارے میں ایک قصیدے میں لکھتے ہیں:

مجھ تلک پہنچے ہیں اب و جد سے
ورثہ نکتہ ہائے لقمانی
وہ خرد مند ہوں کہے ہے مجھے
عقل اول حکیم لاثانی
ہوں وہ نباض جس کے ناخن میں
حرکات عروق شریانی

دوسرے شعر کا مصرع ثانی بے بدل ہے، اول وثانی کا استعمال خوب ہے۔ حکمت اور اول کے لفظ سے سقراط (استاد اول) کی طرف خیال جاتا ہے۔

غالب نے ذوق و مومن کے بر خلاف حکمت کی اصطلاحوں یا کیفیات کو شعر کی داخلی ساخت کا حصہ بنایا ہے۔ شاعری کے علاوہ ان کے خط، دلی کی معاشرت کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ظاہر ہے معاشرت طب و حکمت سے خالی نہیں:

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے

سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

خفقان غالباً Hallucination کی قائم مقام اصطلاح ہے۔ خفقانی طبیعت خارجی محرک کے بغیر یا محرک کے اصل کو بگاڑ کر نئی چیزوں کی موجودگی پر دلالت بل کہ ثبوت مہیا کرتی ہے۔ عطار کا شعر ہے:

راست کہ عطار داد حسن و جمال تو شرح
سینہ برآورد جوش دل خفقان در گرفت

غالب کے شعر میں خفقانی کی علامت ترسیدگی (Phobia) کا بھی پورا پورا تلازمہ موجود ہے۔

خفقان کا لفظ مومن اور ذوق کے دیوان میں عام ملتا ہے اور ہر جگہ کسی نہ کسی طبّی مناسبت کے ساتھ بکار لایا گیا ہے۔ غالب کے ہاں رسمیاتی طبّی اصطلاحوں کے علاوہ، بیماری کی نفسیاتی کیفیات پر بھی عمدہ شعر ملتے ہیں۔ نہایت شان دار اور زبان زد خاص وعام شعر ہے:

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے، ہندوستانی، پاکستانی معاشرے میں بیمار کا مسکرانا اس بات کا اعلان ہے گویا بیماری عنقا ہو گئی ہے۔ حالاں کہ بیماری میں پسندیدہ چیزیں وقتی طور پر مزاج پر اچھا اثر ڈالتی ہے اور طبیعت میں بہتری آتی ہے۔ اس بات کو اہل خانہ نہیں سمجھتے کجا کہ معشوق کی انداز۔ سامنے کی بات ہے لیکن بات کو ڈھنگ اور سلیقے سے بندھنے کے لیے غالب کی آمد کا انتظار کرنا پڑا۔

غالب کو یہ بھی سہولت تھی کہ سیکڑوں شاگردوں میں سے درجنوں طبیب تھے۔ یہی حال دوستوں اور لگے بندھنوں کا تھا۔ شیفتہ، مومن، حکیم احسن اللہ خاں، سرفراز الدولہ، آغا جان عیش، کی طبابت سے خط بھرے ہیں۔ عیش کے بارے میں۔ صاحب مرات الاشباہ نے لکھا ہے، لاعلاج مریض عیش سے رجوع کرتے تھے۔ عیش کی حذاقت کا ثبوت والی؟ پٹیالہ سردار نریندر سنگھ کا علاج ہے۔ جب شاہی حکماء سردار کے کندھے کا ورم ٹھیک کرنے میں نامراد رہے، عیش کو بلایا گیا۔ عیش نے معائنہ کرتے ہی پہلی رات ایک چھٹانک قیمہ کندھے سے بندھوا دیا۔ صبح تک قیمے کا ریشہ تک نہ تھا۔ اگلی رات ایک چھٹانک قیمے میں زہر ملایا گیا اور دوبارا باندھ دیا گیا۔ چوتھے دن تک ورم کا نشان نہ تھا۔ پوچھنے پر بتایا گیا، پہلا قیمہ ورم میں کیڑوں کی موجودگی کے آزمائش کے واسطے تھا، دوسرا قیمہ اور زہر جراثیم کا قلع قمع کرنے کے لیے۔ والیٔ ریاست اس فراست وحذاقت پر انگشت بدنداں رہ گئے۔ عیش شاعر بھی پورے دنوں کے تھے۔ دم تحریر دو شعر یاد آ گئے ہیں:

مریض عشق کو ہے درد دل دوا کے لیے
رہی غذا سو ہے خون جگر غذا کے لیے

وہ کارگر ہو دعا کیا بھلا شفا کے لیے
نہ جب دعا میں ہو ڈھونڈے اثر دوا کے لیے

غالب کا مشہور قطعہ سبھی کو یاد ہے:

سہل تھا مُسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی، اتنے روز حاضر بِن ہوئے

تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد
تین مُسہل، تین تَبریدیں، یہ سب کَے دِن ہوئے؟

(مسہل طریقۂ علاج ہے جس میں مریض کو دست آور دوائیں دے کر خون کا فساد دور کیا جاتا ہے۔)

ظاہر ہے یہ قطعہ استادی کے علاوہ کلیہ ساز بھی ہے۔ غالب کو اس طرح کے کلیے تراشنے سے رغبت تھی۔ یہ قطعے غالب کی شاعری کے نمائندہ بھلے ہی نہ ہوں، غالب کی شخصیت کے غماز ضرور ہیں۔ خطوں میں اس نوع کے شعر بے ساختہ قلم زد ہوئے ہیں۔ سرِ دست ایک شعر یاد آ رہا ہے:

چار اشیا بر رئیسوں فرض
پالکی قلقلی طوائف قرض

غالب کی اپنی صحت بھی قابل رشک نہ تھی۔ آخری دس برس تقریباً بستر پر گزارے۔ مسہل، تبرید، فصد اور جونکوں کا ذکر ان کی ذاتی رام لیلا ہے۔ زندگی میں کئی بار جونکیں لگوائیں۔ جونک لگانے کو کیڑیاں لگانا بھی کہتے ہیں۔ غالب کے فارسی خط میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے (زالو انداختن)۔ جونکیں لگوانے کو معمولی نہ جانیے۔ آج کی بات چھوڑیے، جب روس و جاپان اس طریق علاج پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ خود غالب کے دور سے بیس تیس سال بعد تک برطانیہ میں یہ منہاج (Leeching) بہت مشہور رہا۔ کچھ عرصہ پہلے میں دی ٹائمز کے مدیر کو بھیجے گئے خطوط پڑھ رہا تھا۔ 1915ء کا ایک خط نظر سے گزرا، عنوان تھا Leeches. خط میں برطانیہ میں جونکوں کی کمی کا رونا رویا گیا ہے۔ ان جونکوں کی کمی ہندوستان سے پوری ہوئی۔ یعنی فرنگی یہاں سے صرف کوہ نور نہیں لے کر گئے بل کہ ہندوستانی نباتیہ حیوانیہ کو بھی لندن کے کوچے دکھا ڈالے۔ خط کا ٹکڑا خالی از دل چسپی نہیں:

ہمارے وطن میں کئی ماہ سے جونکوں کا کال ہے۔ پچھلے نومبر تک لندن میں صرف چند درجن جونکیں باقی تھیں۔ ان میں سے بھی بیشتر استعمال شدہ۔ ہمیں بھارت کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس نے ہمیں تازہ جونکیں فراہم کیں۔ ایک دو دن پہلے میں نے بمبئی سے آنے والی تازہ دم جونکوں کو دیکھا۔ موسم کا تغیر، لمبا سفر، جغرافیہ کی تبدیلی، لیکن اس سب کے باوجود جونکیں صحت مند ہیں اور لندن کی فضا میں بھی فعال و سرگرم ہیں۔

یہ خط ہندوستانیوں کی طبابت کو دقیانوسی قرار دینے والوں کو مسکت جواب ہے۔

قصہ کوتاہ، اٹھارویں اور انیسویں صدی کو سمجھنے کے لیے، طب کی سوجھ بوجھ از بس کہ ضروری ہے۔ آخر کوئی وجہ تو ہے کہ ہمارے شاعروں نے حکمت اور شعر کو مترادف قرار دیا ہے!

تقسیم پاکستان سے قبل گورنمنٹ کالج لاہور کی تہذیبی زندگی کی چند جھلکیاں

ڈاکٹر ارسلان راٹھور

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے
ان کو اس روزگار میں دیکھا

بنگال کا قحط، دِلّی کا ہیضہ اور رامپور کا طاعون۔۔۔ یہ سب ناولوں اور خطوں کی بدولت زندہ ہے۔ لاہور کی جغرافیائی تاریخ جاننے کے وسائل کون سے ہیں؟ جدید دنیا میں History through Literature کی باقاعدہ اصطلاح رائج ہے۔ پرانے رِند اٹھتے جاتے ہیں، نئے ساقی میسر نہیں۔ کوہِ نور اخبار، سِول اینڈ ملٹری گزٹ، راوی کے پرانے شمارے، ہندی تختیاں۔۔۔ اتنا بار کون اٹھائے! یاد رکھنے کی بات یہ ہے، تاریخ کے میزان میں وہی باٹ گراں ٹھہرتے ہیں، جنھیں مؤرخ بے تہ جان کر ردّ کر دیتا ہے۔ لاہور کی تاریخ اس کی وباؤں، عوامی تہواروں اور عام زندگی کے ہنگاموں میں زندہ ہے۔ تاریخ دان انھیں لکھنے کا جتن کیوں کرے، ہم انھیں کھوجنے کا کسالہ کاہے کھینچیں:

دامن نہ دارم جامہ از کجا آرم

چند مہینے اُدھر میں بھگوانی کاغذوں کی چھان پھٹک کر رہا تھا کہ 1936ء کا ہنگامہ خیز سال سامنے آ گیا۔ اس برس گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی میں تنفس کی بیماریوں یعنی Respiratory Diseases کا کافی ذکر ملتا ہے۔ پیرس کے موسمیاتی سروے کے مطابق، 1935ء اور 1936ء کے برسوں میں جاڑے نے ہندوستانیوں کے جگر برف کر دیے۔ کاروبارِ حیات معطل، معمولات مشکل۔ سانس کی بیماریوں نے زور کیا۔ مدافعت کا خانہ خراب ہو چلا۔ وسائل کی قلت غریبوں کو پینے لگی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے طلباء کی نفاست محاورہ تھی۔ انگریز انتظامیہ کو تشویش ہوئی۔ طرح طرح کے حربے آزمائے جانے لگے۔ آج یہ ساری روداد پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔

کالج میں ملک بار کی بنیاد رکھی گئی۔ کیسی دل چسپ اصطلاح ہے۔ پرنسپل ڈینکلف کی مالی معاونت پر یہ بار ڈینکلف ملک بار (Dennicliff Milk Bar) کہلائی۔ قصہ اس بار کا سنیے اور سر دُھنیے۔ یہ لاہور کی پہلی جدید ملک بار تھی۔ بار میں دودھ اور دودھ سے بنی اشیاء فروخت کی جاتی تھیں۔ لیکن کیک، چائے اور بیکری کا سامان شجرِ ممنوعہ تھا۔ سردیوں میں گرما گرم دودھ بھی مہیا ہوتا تھا۔

کالج کے کھلاڑیوں اور امتحان میں نمایاں کارکردگی کے حامل طلباء کے لیے یہ سہولت مفت تھی (سوچیے بالکل مفت)۔ گرمیوں میں معتدل ٹھنڈے دودھ کی فراہمی یقینی بنائی جاتی تھی۔ بار کے ارد گرد سبزے کی روشیں تھیں۔ چہار اطراف دیوار نہ

تھی۔ فولادی چھتوں کو انگریزی انداز پر تعمیر کیا گیا تھا۔ سردیوں میں دیسی گھی کی فراہمی یقینی بنائی جاتی۔ کرنل محمد سلیم (پیدائش 27 اپریل 1927ء) نے اپنے انٹرویو میں منیر احمد منیر کو اس بار کا نقشہ بیان کیا ہے:

"یہ بار کالج کے اندر واقع تھی، ڈسٹرکٹ کورٹس کی طرف سے کالج میں اوپر چڑھتے ہی بائیں جانب اس بار کی عمارت تھی۔ بار کا ٹھیکہ سکھوں کے پاس تھا۔ یہ سکھ گوالے ساندے میں مقیم تھے۔ صبح و شام تازہ دودھ پہنچاتے تھے۔ باہر کے لوگ بھی جا کر دودھ پی سکتے تھے۔ دودھ کا ٹھنڈا یا گرم گلاس دو پیسے میں دستیاب ہوتا۔ میں اپنے دوست کو کبھی کبھار سائیکل پر گورنمنٹ کالج چھوڑتا تو ٹھنڈے دودھ سے کلیجہ ٹھنڈا کرتا۔ لاہور میں اس کے علاوہ کوئی دوسری ملک بار نہ تھی۔"

کرنل سلیم صاحب ابھی حیات ہیں۔

کالج کی ملک بار سے پہلے، انارکلی کے مشرق میں واقع تاریخی محکم الدین بیکری (1879ء) طلباء کے بعام کا مرکز تھی۔ محکم الدین وہی معروف بیکری ہے، جس کے لیڈی ہیریسن بسکٹوں کو ملک گیر شہرت حاصل رہی۔ علامہ اقبال بھی اسی بیکری میں گرم دودھ کے ساتھ بسکٹ کھانے جاتے تھے۔

یہ جگہ ڈیڑھ سو برس پہلے علمی جلسوں کے لیے مختص تھی۔ شام کو عوامی خطبات ہوتے تھے۔ آریا سماج کی بیٹھکیں، گیان سبھا کی مجلسیں۔ سائنس ہال اور شکشا سبھا کے ساتھ یہ مقام علمی تکون کا تیسرا زاویہ تھا۔ اس جگہ کے عین سامنے رام داس روسٹرم تھا۔ روسٹرم کا کمرہ انارکلی سے ہسپتال جانے والی سڑک کے بائیں جانب کنارے پر واقع تھا۔ یہ روسٹرم بحث و مباحثے کی لیے مختص تھا۔ ایک پیسہ دیجیے اور کہنے سننے کی جگہ لیجیے۔ گورنمنٹ کالج اور ایف سی کے طلباء شام کا وقت یہاں خوشی سے گزارتے تھے۔ نِت نئی بحثیں، گوناگوں موضوعات۔ شام کا وقت دل فریب معلوم ہوتا۔ آس پاس کے لوگ ٹھہر جاتے۔ چائے کی پیالیاں کھنک رہی ہیں، میز بجائے جا رہے ہیں۔۔۔۔ محکم الدین بیکر زپر آنے والا، ممکن نہیں روسٹرم کی دکان پر نہ آئے۔

گورنمنٹ کالج کی ملک بار زیادہ عرصہ مقبول نہ رہ سکی، باہر کے لوگوں کی بار پر ہنگامی خیزی نے طلباء کی جانب دی جانے والی توجہ کو نصف کر دیا۔ اگرچہ اس کے موجود ہونے کا ذکر آزادی کے کافی دیر تک ملتا ہے۔

ڈینکلف بار میں تازہ دودھ کے ساتھ دیسی گھی بھی دستیاب ہوتا تھا۔ ڈینکلف کے زمانے میں ہاسٹل (کوارڈرینگل) میں دیسی گھی کا استعمال ہوتا رہا۔ اسی بار کے دودھ کو استعمال کرتے ہوئے گورنمنٹ کالج لاہور کے مشرق کی جانب ایک آئس کریم بار (یا فیکٹری) بھی کھولی گئی۔ برف بنانے کا کاروبار راہ پا چکا تھا۔ آئس کریم فیکٹری سے قبل برف انارکلی کی بیرکوں میں جمائی جاتی تھی۔

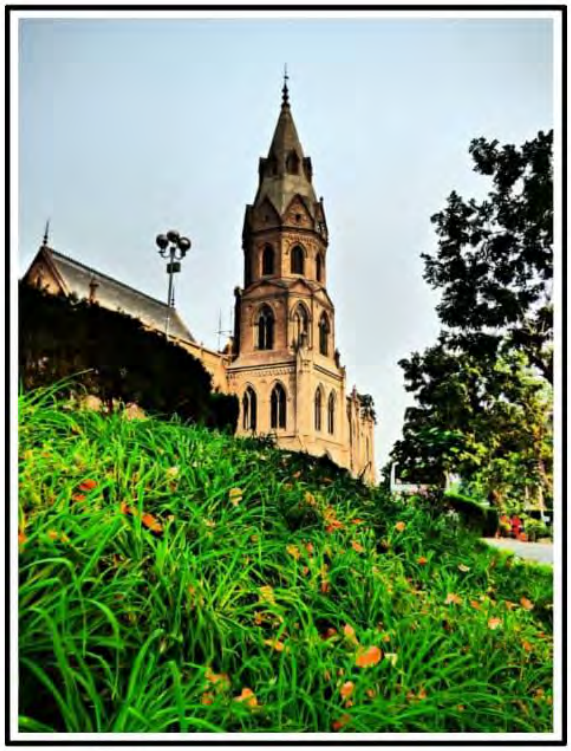
ان دنوں کم روشنی میں مطالعے کی عادت نے ہاسٹل کے طلباء کی بڑی تعداد کو ضعف بصری (Myopia) میں مبتلا کر دیا تھا۔ (خوشونت سنگھ اور پران نول کے بقول گورنمنٹ کالج کے لڑکوں کو صحت کی کمزوری کے اعتبار سے طنزاً پلپلے کہا جاتا تھا)۔ ڈینکلف کے لیے یہ بڑی چنوتی تھی۔ اس مصیبت کو دور کرنے کے لیے جہاں رہائشی کمروں میں روشنی کے بندوبست کو بہتر بنایا گیا۔

وہیں دیانند اینگلو ویدک کالج (DAV College) کے یوگ گرو کی خدمات بھی مستعار لی گئیں۔ ان ماسٹر صاحب کا دعویٰ تھا، صبح و شام سورج کی روشنی کو صحیح انداز سے دیکھنے اور ناک سے سانس کھینچنے کے درست طریقے نظر میں خاطر خواہ بہتری لا سکتے ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی نہانے کے تالاب کو صاف بنانا تھا۔ حال ہی میں انتقال کر جانے والی سونور حمان صاحبہ نے بھی تالاب کی غیر تسلی بخش حالت کا ذکر کیا ہے۔ اس دور میں صابن کی دستیابی آسان نہ تھی۔ لیکن طلباء کے نہانے کے اوقات کو تین پہروں میں تقسیم کر کے ہر بار نئے صابنوں کی فراہمی یقینی بنائی گئی۔

خوشونت سنگھ کے مطابق، نہانے کے تالاب میں سکھ طلباء کے اوقات مختلف تھے۔ (غالب ہے، ہندو اور مسلمان طلباء کے اوقات بھی مختلف ہوں گے، کیوں کہ کالج کی بعام گاہوں کی تقسیم بھی بعینہٖ ہی تھی: vegetarian Cafe and non-vegetarian Cafe)۔

بہر صورت ان قصوں کی روداد اور کنائے راوی کے پرانے شماروں میں ملتے ہیں۔ یہ شمارے اور ان میں بیان کردہ مسائل (بیماریاں اور دوادارو) لاہور کی تہذیبی زندگی کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہیں جن پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔



تصویر کشی: سید یاسر عثمان

افسانے

رُکی ہوئی زِندگی

محمد حمید شاہد

وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا، ندیدہ ہو کر۔

عاطف اُسے دِیکھ رہا تھا، ہک دَک۔ کراہت کا گولا پیٹ کے وسط سے اُچھل اُچھل کر اُس کے حلقوم میں گھونسے مار رہا تھا یوں کہ اُسے ہر نئے وار سے خود کو بچانے کے لیے دِھیان اِدھر اُدھر بہکانا اور بہلانا پڑتا۔

وہ بھوکا تھا۔ شاید بہت ہی بھوکا، کہ سالن کی رکابی اور روٹیوں کی چنگیر پر پوری طرح اوندھا ہو گیا تھا۔ جتنی دیر وہ چپڑ چپک چپڑ چپاک کر کے کھاتا رہا، عاطف اُس کے پراگندہ بالوں کے نیچے اور پیچھے چھپ جانے والے چہرے کو ڈھنگ سے دیکھنے کے جتن کرتا رہا اور اُن معصوم لکیروں کو تلاش کرتا رہا جو کبھی تھیں اَب کہیں نہیں تھیں۔ وقت کی سفاکی نے سب کچھ مِٹا کر ایک نئی تحریر لکھ دی تھی۔ ایسی تحریر جو پورے بدن میں اِضمحلال بھر رہی تھی۔

وہ پوری طرح جھکا ہوا تھا۔ اور اُس کے جبڑوں اور ہونٹوں کے باہم ٹکرانے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ وہ بہاول پور سے عاطف کے ہاں پہنچا تھا۔ کیوں؟ یہ اُس نے نہیں بتایا تھا۔

شاید اس کا ابھی موقع بھی نہیں آیا تھا کہ وہ تو دفتر سے گھر واپسی پر اُسے گیٹ پر ہی مل گیا تھا۔

عاطف جس دفتر میں کام کرتا تھا وہاں کوئی اور اُصول ضابطہ ہو نہ ہو چھٹی وقت پر مل جایا کرتی۔ وہ سیدھا گھر پہنچتا کہ شائستہ اُس کی منتظر رہتی تھی۔

شروع شروع میں عاطف کو یقین تھا کہ یہ سچ مچ کا اِنتظار تھا اَندر سے اُٹھتی تاہنگ والا، تبھی تو اُسے سیدھا گھر آنے کی عادت ہو گئی تھی مگر بعد ازاں یہ ہوا کہ سب کچھ اُس کے معمولات کا حصہ ہو گیا۔ شائستہ کو بھی پہلے پہل اِنتظار میں لطف آتا تھا۔ کھٹا میٹھا لطف۔ اگرچہ اوجھ جیسے وجود نے پہلے ہی دِن اُس کے اَندر کراہت کی ایسی گولی سی رکھ دی تھی جو اُسے دیکھتے ہی خود بخود دُھواں چھوڑنے لگتی مگر کہیں نہ کہیں سے لذت کی مہک بھی اُٹھتی رہتی۔ دوسرے بدن کو چھو لینے کی لذت یا پھر اُسے دِیکھنے اور دِیکھے چلے جانے کی لذّت۔

وہ جیسا بھی تھا؛ اُس پر نظر ڈالتا تھا۔ ایک تار نہ سہی؛ جھجک جھجک کر سہی اور لُکنت زدہ لفظوں سے اتنی پھسلن بنا ہی لیتا کہ وہ اُس پر کوشش کر کے ہی سہی پہروں پھسل سکتی تھی اور دُور تک، بہت دُور تک جا سکتی تھی۔ مگر رَفتہ رَفتہ عجب اُفتاد آن پڑی کہ پہر سُکڑنے لگے اور یُوں لگتا تھا کہ وہ دونوں لذّت کے زور سے جتنی دُور جا سکتے تھے جا چکے، کہ اَب تو بدن میں کساوٹ اُترنے لگتی اور شائستہ کو کوفت ہوتی تھی۔

جب اُس نے آہی جانا ہوتا تو انتظار کیوں؟ اور اضطراب کیسا؟؟

غیر مانے عادت نہ مانے۔ عادت نہ کہیں بدن کہہ لیں۔ عادت کی ڈوری میں بندھا بدن دُکھتا تھا۔ دُکھتا تھا اور ٹوٹتا تھا۔ اس ٹوٹتے بدن کو پھر بھی اِنتظار کی گرہ دِی جاتی رہی حتّٰی کہ عادت معمول ہو گئی۔ دونوں میں ہمت نہ تھی کہ وہ معمول کے اِس دائرے کو توڑ ڈالیں۔

یوں نہیں تھا کہ عاطف گھر آتا تو پھر باہر نکلتا ہی نہیں تھا۔ لاہور ایسا شہر تھا جو کئی کئی گھنٹوں کے لیے مصروف رَکھ سکتا تھا۔ بے تکلف دوستوں سے ملتا۔ احباب کی مہذب مجالس میں بیٹھتا یا پھر اُس سے ملتا جو سارے فاصلے ختم کر ڈالنے کے ہنر جانتی تھی۔ وہ فاصلے یوں ختم کرتی تھی، جیسے کہ وہ ہوتے ہی نہیں تھے۔

پہلے وہ اُن موضوعات کو چھیڑتی جو عاطف کی کم زوری تھے یا پھر عاطف جن پر سہولت اور رغبت سے کچھ کہہ سکتا تھا۔ وہ اَپنی بات کہہ رہا ہوتا تو وہ چپکے سے اَپنے جذبوں کے دھاگے کا سرا، اُس کی چلتی بات کے ساتھ باندھ دِیتی اور پھر گرہ پر گرہ دِیے چلی جاتی۔

یہ جذبے اُس فتنے کی خیزش سے بندھے ہوتے جو عاطف کو گھر پلٹنے تک برف کا تودہ بنا دیا کرتے تھے۔ اکثر یوں ہوتا کہ عاطف گھر لوٹتا تو شائستہ کا بدن خفگی کے تناؤ کی لہریں چھوڑ رہا ہوتا۔ بدن کی کوسوں کے اُوپر ہی اُوپر تیرتی یہ لہریں ایسے لمس کی تھپکی مانگتی تھیں جو عاطف کے اَندر رُوبی نے باتوں کے کھانچے میں کہیں یخ بستہ کر دِی تھی۔ جب کہ شائستہ غصے سے کھولتی تھی۔ کھولتی تھی اور کچھ نہ بولتی تھی کہ وہ پہل کر کے بولے چلے جانے کی عادِی نہیں ہوئی تھی۔

عاطف کبھی کبھی چاہتا کہ وہ اُس پر برس پڑے لڑے جھگڑے اور جو کچھ اُس کے بدن کی سطح مرتفع پر لہریں سی چھوڑ رہا تھا اُسے چیختے چنگھاڑتے لفظوں میں ڈال دِے۔ یوں کہ عاطف کے لیے اَپنی بات کہنے کی گنجائش پیدا ہو۔ وہ بات جس سے خیزش کی تانت بندھی ہوتی ہے۔ مگر اس کا بدن سمندر کی بھوکی بپھری لہروں کی طرح اُوپر نیچے ہوتا رہتا اور ایسا شور چھوڑتا جو ماحول کا حصہ ہو کر سکوت میں ڈھل جاتا ہے یا پھر ایسا شور جو اَپنی دہشت سے پَرے دھکیل دِیتا ہے اور سماعتوں کو بند کر دیتا ہے۔

وہ سننا چاہتا مگر کچھ بھی سُن نہ پاتا تھا کہ ایک سکوت تنا ہوا تھا۔ گاڑھا گھمبیر اور گھمس والا سکوت۔ یا پھر شاید ایک دہشت کا تناؤ تھا۔ دِل کھینچ لینے والی دِہشت کا طالح تناؤ۔

معمول کبھی کبھار ٹوٹ بھی جاتا تھا۔ ایسے کہ جیسے کوئی بے دِھیانی میں ایک ہاتھ دُوسرے ہاتھ کی طرف لے جاتا ہے۔ دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں بائیں کی اُنگلیوں میں بٹھاتا ہے، ہتھیلیوں کو سامنے کر کے دونوں کہنیوں کو تان لیتا ہے اور پھر عین انگلیوں اور ہتھیلیوں کے جوڑ سے چٹخارے نکال دِیتا ہے۔

احباب کے دَائرے میں وہ ایک مثالی جوڑا جانے جاتے تھے۔ جب کبھی تقاریب میں اُنہیں اکٹھے شریک ہونا پڑتا، تو وہ ایک دوسرے کے آس پاس ہی رہتے۔ شاید اُس فاصلے کو پرے دھکیلنے کے لیے جو دونوں کے بیچ تھا۔ وہ ایک دوسرے کو احتیاطاً دِیکھ لیا کرتے، کھسیانے ہوتے، ہنس دِیتے اور لوگ اُن کا یوں مسکرا کر ایک دوسرے کو دِیکھنا حسرت اور لطف سے دیکھا کرتے تھے۔

مگر کچھ تو تھا جو دُونوں کے بیچ تھا اور کچھ ایسا بھی تھا جو دونوں کے بیچ نہیں تھا۔ مرد اَپنی عورت سے چھپ چھپا کر باہر جو کچھ کرتا ہے عورت اُسے جان لیا کرتی ہے۔ شاید اِس لیے کہ باہر کی ساری کار گزاری وہ بے خبری میں اَپنے تن پر لکھ لایا کرتا ہے، یوں کہ وہ خود تو اُس تحریر سے بے خبر ہوتا ہے مگر عورت اُسے پڑھ لیتی ہے۔ ایک ایک لفظ کو۔ ایک ایک شوشے اور نقطے کو اور اُن وقفوں کو بھی جو اِن لفظوں اور سطروں کے بیچ پڑتے ہیں۔

شائستہ نے عاطف کے بدن کے اوراق پر لکھے متن کو جب پڑھا تھا تو وہ رُوبی کی خُوشبو تک سے آگاہ ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ کوئی بھی اور ہوتی تو وہ بپھر جاتی مگر وہ ایسی عورتوں میں سے تھی ہی نہیں جو کسی بھی بات کو خود ہی آغاز دِے لیا کرتی ہیں۔ اُسے تو خود آغاز چاہیے تھا۔ بھیگا ہوا آغاز۔ ایسا کہ جس کا اَنجام بھی بھیگا ہوا ہو۔

عاطف کے پاس اَیسے الفاظ کہاں تھے جو پہل قدمی کا ہنر جانتے ہوں کہ ایسے اَلفاظ تو ہر بار اُس کے بدن کی جھولی میں رُوبی ڈالا کرتی تھی۔ اور وہ اسی کا عادی تھا۔ اِس عادت نے شائستہ کے بدن میں کسمساہٹ بے قراری اور اِضطراب کی موجیں رَکھ دِی تھیں۔ وہ سارے گھر میں اِدھر اُدھر بکھرے تعطل کو باہر دھکیلتی رہتی، شاور لیتی تو پانی کی پھوار تلے سے نکلنا جیسے بھول ہی جاتی حتیٰ کہ اُسے یوں لگنے لگتا جیسے جسم کے اُوپر ایک جِھلی سی نمودار ہو گئی ہو۔ وہ لرزتے ہاتھوں کی لمبی پوروں سے اُس جِھلی کو چھوتی تو لمس بدن کے اُوپر ہی اُوپر تیرتا رہتا۔ اِدھر سے اُوب کر باہر نکلتی تو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر آئینے میں خود کو دِیکھے جاتی۔ پورا کمرا، اِمپورٹیڈ باڈی لوشنز اور پرفیومز سے مہکنے لگتا۔ اِسی مہک میں کپڑوں کی سرسراہٹیں جاگتیں، ویکسنگ اور پفنگ کے بعد بلش آن اور کاسمیٹکس کے اِنتخاب میں ایک مُدّت گزر جاتی۔ جب وہ اَپنے اطمینان کی آخری حد تک سنور چکی ہوتی تو وہ آئینے میں خود کو پہلو بدل بدل کر دیکھتی۔ دیکھتی اور دیکھے چلے جاتی حتیٰ کہ آئینہ وہ منظر دکھانے لگتا تھا جِس میں وہ نہیں ہوتی تھی۔

اِسی اَثنا میں کام کاج میں ہاتھ بٹانے والی آجاتی تو اُسے کئی کام سوجھ جاتے: جلدی جلدی ٹشو پیپرز سے چہرے پر جمی میک اَپ کی تہیں اُتار دِیتی۔ جب ٹشو پیپرز کا ڈھیر لگ جاتا تو اُس کی مصروفیت کا ڈھنگ بدل جاتا۔ گھر کو خوب چمکایا لشکایا جاتا، صاف ستھری چادروں کو پھر سے بدلا جاتا، اِدھر اُدھر دیواروں پر چھینٹے ڈھونڈ ڈھونڈ کر صاف کیے جاتے۔ یہاں تک کہ وہ نڈھال ہو جاتی۔

ایک اِنتظار کے لیے موزوں حد تک نڈھال۔ پھر وہ آجاتا تو اُس کے بدن پر لہریں سی اُٹھتیں۔ لہریں اُٹھتی رہتیں اور اُس کا بدن ٹوٹ جاتا؛ اُن لفظوں کی چاہ میں جو آگے بڑھ کر اُس کی ساری تھکن چُوس سکتے تھے۔ مگر عاطف تو خود پہل قدمی والے الفاظ کہیں سے مُستَعار لینے کا عادی تھا۔ رُوبی سے اور رُوبی سے پہلے ایک اور لڑکی تھی فرحانہ اُس سے۔ وہ بھی تو رُوبی جیسی ہی تھی۔ شائستہ

بہت بعد میں اُس کی زِندگی میں آئی جب دونوں نے اُس کا بدن اوجھ جیسا بنا دیا تھا۔ کچوکوں سے بیدار ہونے والا۔ یوں جیسے اس کا بدن نہ ہو مٹی میں مٹی ہو کر اور مکر مار کر پڑ رہنے والا وہ لسلسا کیڑا ہو جسے پھل سنگھی اَپنی لمبی چونچ کے ٹھونگوں سے جگاتی ہے۔

جب بہاولپور سے آنے والا میلا کچیلا شخص اُسے دروازے پر ملا، تب تک شائستہ کا ساتھ ہوتے ہوئے بھی کچوکوں سے بیدار ہونے کی عادت کو ساتواں برس لگ چکا تھا۔ اِس سارے عرصے میں وہ دو سے تین ہو چکے تھے۔ ڈیڑھ برس پہلے ہی اُن کے ہاں ننھے فرخ نے جنم لیا تھا جو اَب پوری طرح شائستہ کو اَپنی جانب متوجہ کیے رَکھتا۔

بہ ظاہر گھر مکمل تھا۔ مکمل اور پر سکون دِکھنے والا۔ سب کچھ ایک ڈَھنگ سے ہوتا نظر آتا تھا۔

مگر وقت کی ڈِھینگلی کے سرے سے بندھا معمولات کا بوکا جو پانی باہر پھینکتا تھا، وہ دونوں کی زبانوں پر پڑتے ہی کھولتا رَصاص ہو جاتا تھا، آبلے بنا دینے والا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

یہ سوال دونوں کے سامنے آتا رہا مگر وہ اِس کا صحیح صحیح ادراک کر سکنے اور اِس پر قابو پا لینے کی صلاحیت نہ رَکھتے تھے۔ وہ تو شاید اِس ساری صورتحال کے مقابل ہونے کو تیار ہی نہ تھے۔ تب ہی تو عاطف کے ہوتے ہوئے بھی شائستہ ننھے فرخ ہی سے مصروف رہے چلے جانے کو ترجیح دِیا کرتی۔

وہ جانتا تھا کہ وہ کیوں فرخ کو گھٹنوں پر اوندھا کیے مالش کیے جاتی ہے؟ کس لیے اُس کے پاؤں کے تلووں پر گال رَگڑ رہی ہے؟ اُس کے پیٹ پر منھ رکھ کر پھوکڑے مارتی ہے تو کیوں؟ اُس سے باتوں میں مگن رہنا لاڈ سے ہونٹوں میں لوچ ڈال لینا اور وہ کہے جانا جس میں کوئی ربط نہ ہو، عاطف کی سماعت سے ٹکرا کر مربوط ہو جاتا مگر عاطف تو صرف اپنے اوجھ بدن پر کچوکے چاہتا تھا لہذا ننھے وجود کی نازک جلد پر نرم نرم چکنے ہاتھوں کا یوں پھسلنا اُسے گیلے ہونٹوں کی لرزش دَبا کر بوسے دینا، ہونٹ جما کر اور پٹاخ کی آواز پیدا کرتے ہوئے ماتھے پر، ہونٹوں، گردن، ناف اور رانوں پر، حتیٰ کہ دائیں یا بائیں پاؤں کے انگوٹھے کے گرد ہونٹوں کو رَکھ کر گھما لینا سب کچھ رائیگاں چلا جا رہا تھا۔

تاہم فرخ اِس پیار کی بوچھاڑ سے کھل کھل ہنستا، غوں غوں کرتا اور زور زور سے اَپنے پاؤں مارنے لگتا تھا۔

جس روز بہاولپور سے اُن کے ہاں مہمان آیا، اس روز شائستہ پروگرام بنائے بیٹھی تھی کہ عاطف کے آتے ہی وہ ننھے فرخ کو نیم گرم پانی سے نہلائے گی کہ وہ اُسے قدرے مَیلا مَیلا لگ رہا تھا مگر جب وہ مہمان ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا نظر آیا جو آز حد مَیلا تھا تو وہ اَپنا پروگرام بھول چکی تھی۔

اُس کے وجود میں لسلسے وجود کی پہلے سے موجود کراہت کے ساتھ عجب طرح کی باسی گھن بھی گھس بیٹھی تھی۔

عاطف اَپنے مہمان کو بٹھا کر ذرا فاصلے پر کھڑی شائستہ کے پاس آیا، بوکھلایا ہوا۔ اُسے کچھ کہنا ہوتا اور شائستہ کسی دوسری کیفیت کو چہرے پر سجائے ہوتی تو وہ یوں ہی بوکھلا جایا کرتا تھا۔ شائستہ کچھ سننے کے موڈ میں نہ تھی۔ اُس نے مہمان کے سلام کا بھی

کوئی نوٹس نہ لیا تھا کہ اِس نئے وجود سے اُمنڈتی گھن کو اپنے بدن میں موجود کراہت کے پہلو میں بٹھا چکی تھی، حتیٰ کہ سب کچھ نفرت میں ڈھل کر اُس کے چہرے سے چھلکنے لگا۔ شائستہ کے لیے اَپنے اِن شدید جذبوں کے ساتھ وہاں رُکنا ممکن نہ رہا تو وہ اَپنے قدموں پر گھومی اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔ اِسی اثنا میں عاطف کچن میں خود کو معمول پر لاتا رہا۔ اگرچہ وہ مہمان کے لیے پانی لینے آیا تھا مگر ریفریجریٹر سے بوتل نکالنے کے بہانے اُسے پوری طرح کھول رکھا تھا یوں کہ اُس کا سینہ اور چہرہ دونوں یخ جھونکوں کے سامنے رہیں۔

اُسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کب شائستہ اُس کے عقب میں آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ تو تب بدحواس ہو کر ایک طرف ہو گیا جب اُس نے اَپنے دائیں ہاتھ سے اُس کے بائیں کندھے کو قصداً ذرا زور سے دبا کر اُسے ایک جانب دھکیلا تھا۔

وہ وہیں کھڑا دیکھتا رہا جہاں بوکھلا کر پہنچا تھا۔ شائستہ نے پانی کی بوتل نکالتے ہی قدرے جھٹکے سے ریفریجریٹر کا دروازہ بند کیا تھا۔ پھر اُس نے سنک کے کونے میں پڑا وہ گلاس نکالا جو دونوں کے اِستعمال میں نہیں آتا تھا اور اس چنگیر کی جانب لپکی جس میں پہلے سے روٹیاں لپٹی ہوئی پڑی تھیں۔ شائستہ بچ جانے والی روٹیوں کو اِسی چنگیر میں رَکھتی تھی کہ صفائی والی ماسی آتی تو لے جایا کرتی۔

رکابی میں سالن بھی پہلے سے موجود تھا، شوربا جس کی سطح پر ایک جھلی سی بن گئی تھی۔ شوربے کے بیچ میں پڑا ہوا اکلوتا آلو اَپنی رنگت بدل کر گہرا بھورا ہو گیا تھا۔ یقیناً ماسی آج نہیں آئی تھی۔ اُس نے اَپنے یقین کے استحکام کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کوئی اور نشانی تلاش کر لیتا شائستہ نے اُسے پھر چونکا دیا۔ وہ ایک ٹرے میں پانی کی بوتل، گلاس، چنگیر اور رکابی رکھ کر اُس کی سمت بڑھانے کے بعد لفظوں کو چبا چبا کر کہہ رہی تھی: ''جب وہ کھانا کھا چکیں تو اصرار کر کے انہیں روک نہ لیجئے گا۔''

اُس نے اُسے نہیں روکا تھا مگر وہ خود ہی رُک گیا تھا۔

شائستہ سارا وقت اَپنے بیڈ روم میں اُوندھی پڑی رہی اور بہت دیر بعد جب عاطف کمرے میں آکر آنے والے مہمان کی بابت اُسے بتا رہا تھا تو اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ اُسے کچھ بھی سنائی نہ دے رہا تھا۔ ''ضرورت مند''۔ ''پرانا کلاس فیلو'' اور ''مدد'' جیسے الفاظ اُس کے کانوں میں پڑے تھے۔ ایک میلے کچیلے شخص کی اوقات کے لیے یہ کافی تھے لہذا اُس نے اَپنی سماعتوں کو بند کر لیا، پہلو بدل کر لیٹ گئی اور سارے بدن کو موج در موج اُچھل جانے دیا۔

اَگلے روز ناشتے تک وہ نہیں اُٹھا تھا۔ دفتر کے لیے تیار ہونے کے بعد اور ناشتے کے لیے بیٹھنے سے پہلے عاطف نے ڈرائنگ روم میں جھانکا۔ وہ وہیں صوفے پر عین اُسی رُخ لیٹا ہوا تھا؛ رات اصرار کر کے جس رخ لیٹ گیا تھا۔ مہمانوں کے لیے بیڈ روم اوپر تھا مگر وہ وہیں صوفے پر لیٹنا چاہتا تھا۔ لیٹ گیا اور اَب اُٹھنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ عاطف نے دِل ہی دِل میں اسے وہی گالی دی جو اُسے بچپن میں دِیا کرتا تھا اور ناشتے میں مگن ہو گیا۔

جب وہ دفتر کے لیے نکلنے لگا تو عاطف میں ہمت نہ تھی کہ وہ شائستہ کو مہمان کے حوالے سے کوئی ہدایت دِیتا یا فرمائش کرتا۔ کوٹ کی جیبوں کو ٹٹول کر اپنا چرمی پرس نکالا اُس میں سے اَپنا وزیٹنگ کارڈ الگ کیا اور اُس میز پر رَکھ دِیا جس کے قریب پڑے صوفے پر وہ یوں بے خبر سو رہا تھا کہ سارا ڈرائنگ رُوم اُس کے خراٹوں سے گونجتا تھا۔

بے اِختیار وہی گالی عاطف کے ہونٹوں پر پھر سے گدگدی کرنے لگی۔ اُس کے ہونٹ بے اختیار پھیلتے چلے گئے۔ وہ منھ ہی منھ میں بڑبڑایا اور باہر نکل گیا۔

دفتر میں وقفے وقفے سے اُسے مہمان کا خیال آتا رہا۔ رات اُس نے جو دل چسپ باتیں کی تھیں اُنہیں یاد کرتا تو مسکرانے لگتا۔ شائستہ کے روّیے کے باعث اُسے جو خفت اُٹھانی پڑی تھی وہ اُسے ملول کرتی تھی لہذا اُس نے اپنے تئیں طے بھی کر لیا تھا کہ وہ اُس کی کیا مدد کرے گا۔

جب بھی ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی اُسے گماں گزرتا کہ گھر سے کال ہو گی حتیٰ کہ اُسے تشویش ہونے لگی۔ پھر وہ چاہنے لگا کہ خود فون کر کے مہمان کی بابت پتا کرے۔ اُس نے دو بار نمبر گھمایا بھی مگر اِس خیال سے کہ فون شائستہ اُٹھائے گی اُس نے اِرادہ ملتوی کر دیا۔ تیسری بار وہ گھر کا نمبر ملاتے ملاتے نہ جانے کیوں رُوبی کو ڈائل کر بیٹھا۔ وہ تو جیسے اُسی کے فون کی منتظر تھی۔ پہلے تو باتوں میں اُلجھا لیا پھر جذبوں کی ڈوری سے اُسے یوں باندھا کہ وہ دفتر سے غائب ہو کر سیدھا اُس کے پاس پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ چھٹی کا وقت ہو گیا۔

جب وہ گھر میں داخل ہو رہا تھا تو نہ جانے کیوں اُسے یقین سا ہو چلا تھا کہ مہمان جا چکا ہو گا مگر وہ تو وہیں تھا۔

اُس نے مدھم مدھم آواز کو سنا تو اُسے یقین نہ آتا تھا۔ شوخ سی آواز، مسلسل بولنے کی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے دے کر۔ اور الفاظ یوں شباہت بناتے تھے کہ جیسے انہیں اَدا کرنے والے ہونٹ لوچ دَار ہو گئے ہوں۔ باتوں کے وقفوں میں قہقہے اُمنڈتے تھے۔ شائستہ کے شیریں حلقوم سے۔ اس جھلی کو توڑتے ہوئے جو ایسے قہقہوں سے الگ رہنے کے سبب اُس کی آواز کے اوپر بن گئی تھی۔ یہی قہقہے سننے کی اُسے حسرت رہی تھی۔ اُسے اَچنبھا ہوا کہ شائستہ ایسے رسیلے قہقہے اُچھال سکتی تھی اور اُچھال رہی تھی۔

وہ تقریباً بھاگتا ہوا ڈرائنگ روم کے دَروازے تک پہنچا اور اُسے لگا کہ جیسے سارا ڈرائنگ روم مہمان کی دھیمی، مسلسل باتوں سے اور شائستہ کے بے اختیار قہقہوں سے کناروں تک بھر چکا تھا اور اَب چھلکنے کو تھا۔

مہمان نے اَپنے گیلے کھچڑی بالوں کو سلیقے سے یوں پیچھے سنوارا ہوا تھا کہ کنپٹیوں کی سفیدی دَب گئی تھی اور اُس کی آنکھوں میں چمک تھی جو اُس کے سارے چہرے پر ظاہر ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ جبڑوں کی مسلسل نمایاں نظر آنے والی ہڈیاں بھی اِسی چمک میں کہیں معدوم ہو گئی تھیں۔

جو شخص بول رہا تھا اس کے بَدن پر عاطف کا پسندیدہ لباس تھا جو اگرچہ اُس پر چست نہ بیٹھا تھا مگر اُسے بارعب بنا گیا تھا۔ دُھلا دُھلایا صاف ستھرا شخص اُس شخص سے بالکل مختلف ہو گیا تھا جسے وہ صبح صوفے پر خراٹے بھرتا چھوڑ گیا تھا۔ وہ مسلسل بول رہا تھا اور اُس کے ہونٹ ایک طرف دائرہ سا بنا رہے تھے۔

وہ عاطف کے نظر آنے تک بولتا رہا۔ شائستہ کے قہقہے اُچھلتے رہے۔ عاطف کے نظر آنے پر بھی وہ کسی رَخنے کے بغیر اُچھلتے رہے حالاں کہ بولنے والا شخص خاموش ہو چکا تھا۔ عاطف کو لگا: شائستہ قہقہے نہیں اُچھال رہی تھی ننھا فرخ اُس کے گھٹنوں پر اُوندھا پڑا کلکاریاں مار رہا تھا جب کہ نرم ملائم جلد پر مخروطی اُنگلیاں پھسل رہی تھیں اور پھسلے ہی جاتی تھیں۔

فیصلے کی گھڑی

شاذیہ مفتی

گڈ بائی مسٹر چپس اب تو اسے حفظ ہو چکا تھا۔ کچھ بچیاں اونگھ رہی تھیں کچھ آنکھوں میں آنسو لیے سن رہی تھیں کچھ بیزار تھیں اور چند ایک رٹو طوطا ٹائپ کے قلم کاغذ پر اس کا کہا ایک ایک لفظ لکھنے میں مصروف تھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا ہلکی ہلکی ہوا کے ساتھ برستی بوندیں اور پھولوں کی مہک، مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں پھیلی تھی۔ ناول مسز کیتھرین چپنگ کی ناگہانی موت کا ڈرامائی موڑ لے چکا تھا۔ مسٹر چپس کے کانوں میں محبوب بیوی کا آخری الوداعی سلام گونج رہا تھا اور پھر ٹن ٹن ٹن کی آواز سے کہانی کا سحر ٹوٹ گیا۔ سب سے زیادہ خوشی گھنٹہ بجنے کی کرن کو تھی۔ پرس سنبھالتی گنگناتی کالج کے گیٹ کی طرف تیز تیز قدم چلتی چلی گئی۔ مہینے کا پہلا جمعہ تھا۔ آج کے دن وہ آخری کلاس پڑھانے سے پہلے ہی سٹاف روم سے اپنی چیزیں سمیٹ لیتی اور پھر ٹن ٹن ٹن کی آواز کے ساتھ ہی سیدھی باہر کو بھاگتی۔ جمعہ سے اتوار کی رات تک سجاول شاہ اس کا ہوتا۔ ان ڈھائی دنوں میں اس کے ویران پڑے گھر میں بہار آجاتی۔ یوں جیسے چودھویں کا چاند آنگن میں اتر آیا ہو۔ وہ داسی بنی خدمت میں جٹی رہتی یہاں تک کہ پیر کا سورج طلوع ہوتا، سجاول شاہ صبح سویرے چلا جاتا۔ کرن پھر سے اگلے مہینے کے پہلے جمعے کا انتظار شروع کر دیتی۔ کیلنڈر پر ایک ایک تاریخ کاٹتی ستائیس طویل دن رات گزارتی۔

سجاول شاہ اس کا شوہر تھا کرن اس کی پہلی محبت، بچپن کی منگیتر اور لاڈلی بیوی تھی۔ تعلیم یافتہ اور حسین ترین عورت۔

لیکن بدقسمت بنجر زمین جس کی گود کبھی ہری نہیں ہو سکتی تھی۔ خاندان کے اکلوتے بیٹے کو وارث بھی چاہیے تھا اس لیے پہلی شادی کے پانچ سال بعد ہی دوسری شادی مجبوری بن گئی۔ دوسری عورت کے لیے دوسرا گھر بھی بن گیا۔ اس دوسرے گھر میں چراغ روشن ہوتے گئے اور ادھر تنہائی کے ساتھ ویرانی بڑھتی گئی۔ عام سی لڑکی ماں بننے کے بعد دن بدن خاص ہوتی گئی۔ کرن کا استحقاق گھٹتا گیا۔ بچوں کی مصروفیات اور ضروریات اس کے لیے انصاف سے طے کردہ وقت اور پیسے بھی کم کرتی گئیں۔ کرن کے پاس صبر اور سمجھوتے کے سوا چارہ بھی تو نہ تھا۔ پندرہ سال بعد اب مہینے کے ڈھائی دن ہی اس کے سونے گھر میں گھر کے مالک کی رونق ہوتی۔

مسٹر چپس، کالج اور کلاس رومز کو گڈ بائے کرتی کرن پھاٹک سے باہر لپکتی گئی پھر بچیاں نکلنے لگتیں تو ہجوم ہو جاتا۔ بائیں طرف جہاں ہمیشہ موڑ سے ذرا پہلے سجاول کی گاڑی کھڑی ہوتی آج وہاں کوئی اور ہی کار تھی۔ کھڑکی سے ہی آواز آئی "پیچھے بیٹھ جاؤ آگے سامان رکھا ہے۔" اور پچھلی سیٹ تو تھی ہی نہیں وہاں صرف ایک میل خورہ نمدہ یا قالین کا پائیدان سا پڑا تھا کیچڑ اور تیل کے دھبوں سے بھرا۔

"پکنک پر گئے تھے بچے یہاں گدہ ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں آگے بھی انہی کا سامان ہے"

اسے متذبذب دیکھ کر سجاول نے صفائی دی۔

"یہ بچوں کی گاڑی ہے نا بس جوان کا دل چاہے سلوک کرتے ہیں اب دیکھو سیٹ ہی نکلوادی ہے۔ تمہیں گھر چھوڑ دوں پھر ورکشاپ دے آؤنگا اس کی سروس وغیرہ ہو گی۔"

وہ پدرانہ فخر اور محبت سے بتا رہا تھا اور کرن منہ چھپائے بیٹھی سوچ رہی تھی۔

"ہائے لوگ مجھے گاڑی میں اکڑوں بیٹھا دیکھ رہے ہونگے۔"

برستی بارش، ہوا کی اٹکھیلیاں، پھولوں کی مہک، حسیں سماں سب یک لخت ہی غائب ہو گئے۔ ٹھنڈ کی شدت سے کرن کپکپا اٹھی۔

"یار میری گاڑی بچے لے گئے ان کے ننھیال میں شادی ہے میں بھی کل جاؤں گا۔ تم آرام سے بیٹھو بس ابھی پہنچ جاتے ہیں گھر۔"

پاؤں پر پورے جسم کا وزن ڈالے کپڑوں کو گندگی سے بچاتی، دروازے کا ہینڈل پکڑے اور ہر ہلکے سے جھٹکے پر ڈولتی کرن اپنی نظروں میں تنکے سے بھی ہلکی ہو چکی تھی۔

اسے لگ رہا تھا جیسے پنجرے میں بند بے بس بندر یا ہے اور دنیا تماشائی۔ احساس ذلت سے انکھیں بھر آئیں۔ کاش سجاول ذرا سا ہی اس کی محبت، وقار اور عزت نفس کا خیال کر لیتا۔ قسمت کو دوش دیتے اچانک خیال آیا

"اسے کل بھی تو جانا ہی ہے تو پھر آج کیوں نہیں!"

اگلے سگنل پر اشارے کی بتی لال تھی گاڑی رکی دروازہ کھول کر وہ اتری اور سڑک کنارے کھڑے رکشہ کی طرف بڑھ گئی۔ سجاول کے مڑ کر دیکھنے میں بتی سبز ہو چکی تھی گاڑی کھڑی رہنے پر پچھلی گاڑیوں کے بے تحاشا ہارن بجنے لگے۔ چھٹی کا وقت تھا نماز جمعہ کے لیے اذانیں بلند ہو رہی تھیں ٹریفک کا سیلاب سا تھا جس میں وہ گاڑی بھی بہتی چلی گئی۔

شاید

سجاول نے رکنے کی کوشش ہی نہ کی ہو۔ وہ کسی ایسے ہی موقع کا منتظر ہو اور اب اس کی زندگی میں اس پچھلے پہر کی ٹھٹھرتی ہوئی کرن کی کوئی ضرورت بھی تو نہ تھی۔

شاید

یہی دونوں کے لیے فیصلے کی گھڑی تھی۔

آدمی سے ڈرتا ہوں

ڈاکٹر سفیر حیدر

ہاں! آدمی سے ڈرتا ہوں۔۔۔۔

اسے اللہ کا کلام ازبر ہے۔ پابندِ صوم وصلوٰۃ ہے۔ تازہ تازہ امام مسجد ہوا ہے۔ مسجد کی نالی صاف ہونے والی ہے۔ چوہڑے کو دو تین بار بُلایا لیکن وہ آیا نہیں۔ کل اُس سے سامنا ہوا تو بہن کی گالی دے کر پاس بُلایا۔ حرامی چوہڑے مسجد کی نالی تیری ماں کا یار صاف کرے گا۔ اُس نے بھی سڑ کے جواب دیا ''مولبی صاحب سب گھر والے پہلی کی پہلی سو روپیہ دیتے ہیں مسجد کی نالی کا ایک پیسہ نہیں ملتا''۔ مولوی کے سرخ گال اور سرخ ہوتے ہیں۔ ''یہ اللہ کا گھر ہے بغیر تا!'' چوہڑا بھی جلا بُھنا بیٹھا تھا ''تو جس کا گھر ہے وہ دے دے، یہ کیسا خدا ہے جو کام کروا کے دیہاڑی نہیں دیتا مولبی صاحب!''

مولوی طیش میں آتا ہے۔ سپیکر کھولتا ہے اہلِ ایمان کو پکارتا ہے ''مسلمانو! مر گئے او سارے'' ایک چوہڑا توہین کر گیا جے! آج بھی جو خاموش رہا حشر والے دن اُس کا گریبان ہو گا اور خدا کا ہاتھ۔ جو آج گھر میں بیٹھا پھر گھر والی کے ساتھ نہ بیٹھے گا۔ نکاح فاسق سمجھے۔ اہلِ ایمان جو خدا کی توہین کا سن کر اور مولوی صاحب کی آواز میں لپٹی للکار پر پہلے ہی باؤلے ہوئے پھرتے تھے نکاح ٹوٹنے کا سن کر اُن کے جسموں میں تجرد کی راتوں کی سنسناہٹ ایک خوف کی لہر بن کر گزر گئی۔ رات رات بھر ننگی فلمیں دیکھ کر خلاصی پاتے تھے۔

سپیکر پر نعرے بلند ہوتے ہیں۔ مولوی کے منہ کا جھاگ اہلِ ایمان کے منہ میں جا گرتا ہے۔ گھر گھر سے مجاہد نکلتے ہیں۔ پٹرول، مٹی کا تیل، ڈنڈے، پستول۔۔۔۔ اگلے چار گھنٹوں میں کئی مکان مسمار، چوہڑا جس نے مولوی کی توہین۔۔۔۔ نہیں، نہیں خدا کی توہین کی تھی، شہر کے چوک میں ٹوٹے پھوٹے مردے کی صورت۔۔۔۔

چند لمحوں میں گستاخ چوہڑے کے جسم کی راکھ کا ذرّہ ذرّہ آسمان کے چہرے پر کالک مل دیتا ہے۔۔۔۔

ہاں آدمی سے ڈرتا ہوں۔۔۔۔

2----------

''آدمی سے ڈرتے ہو؟''

ہاں! آدمی سے ڈرتا ہوں۔۔۔۔

آدھی رات کا وقت ہے۔ بڑی مسافر بس خالی سڑک پر رواں ہے۔ دُور دُور تک آبادی کا نام و نشان نہیں۔ طویل صحرا ہے۔ چار سُو اندھیرا ہے۔ کہیں ایک چراغ بھی روشن نہیں۔ سہمی ہوئی ویرانی ہے۔ تیز ہوا سے ریت اُڑتی ہے تو تاریک غبار عجیب سے ہیولوں کی صورت بس کے میلے شیشوں سے ٹکراتا ہے۔ بھرے پُرے گھروں سے نکلے، دن کی روشنی میں آباد شہروں سے گزر

کر آنے والے، راستے میں ہنستے بستے لذیذ کھانوں اور چائے کی مہکار سے لبریز ڈھابوں پر رکتے ہوئے پندرہ گھنٹوں کے بعد خاموش، مہیب صحرا میں سے گزرتے ہوئے مسافر پہلی بار غریب الوطنی کے احساس میں ڈوبے جا رہے ہیں۔ خاص طور پر جو وطنِ عزیز کے اس حصے سے پہلی بار گزر رہے ہیں۔

بعض چہروں پر کبھی کبھی نیم تاریک بس میں بھی خوف کی زردی کی اچانک ابھرنے والی لہر بھی نظر آجاتی ہے۔ جیسے کوئی ڈراؤنی کہانی جو کبھی سُنی ہو، یوں محسوس ہو کہ اس کی دہرائی کا وقت قریب ہے۔ بعض مسافر سو رہے ہیں۔ بعض اگلی سیٹ کی پشت پر لگی سکرین پر فلم دیکھ رہے ہیں۔ وہ اس راستے پر معمول کا سفر کرنے والے ہیں۔ بس کے اندر بیک وقت تین چار زبانیں بولنے والے بچے، بوڑھے نوجوان اور عورتیں سوار ہیں۔ بس کے اندر کی اگر کوئی پینٹنگ بنائے تو بڑی رنگا رنگ اور خوبصورت ہو۔ کہیں پگڑی، کسی گلے میں عمامہ، کسی سر پر نماز والی ٹوپی، کہیں چادر، کہیں عبائیہ، کہیں ٹوپی والے برقعے، کسی نوجوان کی ٹریولر جینز اور پولو کی شرٹ اور لہریں بناتی بلوچی شلوار قمیص اور سندھی اجرک اور ٹوپی کا اپنا رنگ۔

مسافروں کے چہرے پر طویل سفر کی تھکن کی شکنیں بھی پینٹنگ میں کسی نہ کسی رنگ میں ظاہر ہو ہی جاتیں۔ اسی طرح کچھ آنکھوں میں آنسو بھی تصویر ہو سکتے تھے۔ یہ وہ زائرین ہیں جو ہینڈ فری لگا کر بھی بہت نیچی آواز میں مرثیے سُن رہے ہیں۔ کیونکہ آج صفر کی دس تاریخ ہے۔ وہ اس بار چہلم پر اپنے امام کو پُرسہ دینے کے لیے کربلا کی طرف روانہ ہیں۔

اچانک ڈرائیور بس کو بریک لگاتا ہے۔ آگے دو گاڑیوں نے سڑک بلاک کر رکھی ہے۔ آٹھ دس بندوقوں والے نقاب پوش بس کے دونوں دروازوں پر آتے ہیں پانچ چھ بس کے اندر چلے جاتے ہیں۔ ایک ایک کر کے مسافروں کو اُتارا جا رہا ہے۔ کمانڈر چیختا ہے۔ عبدالرحمٰن جلدی کرو، وقت ضائع نہ کرو، کارڈ دیکھتے جاؤ اور نام بولو۔

''سید علی حسن''

''ماردو''

''فاطمہ بتول''

''ماردو''

''شہلا بی بی''

''چھوڑ دو''

''عبداللہ خان''

''چھوڑ دو''

عبدالرحمن جلدی کرو، کرنل صاحب نے کہا تھا ایک گھنٹہ ہے پھر دوسری پارٹی گشت پر ہو گی۔

''یوسف مسیح''

''چھوڑ دو''

''زینب بی بی''

''مار دو''

''حسین۔۔۔ حسین علی''

''مار دو''

''بوڑھے جلدی آ، کدھر ہے تمہارا کارڈ؟''

''کارڈ تو نواسے کے پاس ہے''

''نام بتا۔ نام کیا ہے تیرا''

''محمد''

''مار دو۔۔۔۔ نہیں چھوڑ دو''

''کیا کروں کمانڈر؟''

''ماردوں کہ چھوڑ دوں؟''

''پورا نام بتا بوڑھے؟''

''محمد حسین''

''مار دو''

آدمی سے ڈرتا ہوں۔۔۔۔

3۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''آدمی سے ڈرتے ہو؟''

ہاں! آدمی سے ڈرتا ہوں۔۔۔۔

اُس کی جب پہلی بیٹی پیدا ہوئی تو پھیکی پھیکی، روہانسی مسکراہٹ کے ساتھ اُس نے چند مبارک بادیں وصول کیں۔ جب دوسری بیٹی پیدا ہوئی تو وہ ہسپتال سے چلتا بنا اور رات دیر تک دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتا رہا کہ تازہ سانحہ کی طرف سے دھیان ہٹا رہے۔ جب وہ ہسپتال واپس نہ لوٹا تو سسرالی اپنی بیٹی اور نومولود بچی کو لے کر اپنے گھر چلے گئے اور ڈیڑھ دو مہینے بعد خود ہی کچھ نئے کپڑوں جوتوں کے ساتھ اُس کے پاس چھوڑ گئے۔ تیسری بار وہ بہت پُر اُمید تھا کہ لازمی بیٹا پیدا ہو گا۔ اِس بار ایک حکیم کی خاص

مسیحائی تھی جو اِس حوالے سے بڑی شہرت کا حامل تھا اور دو تین دربار جو بیٹا سپشلسٹ تھے اُن کے مجاروں کو بھی نذرانے کی مد میں کافی کمک پہنچا چکا تھا۔ لیکن قسمت کی دیوی اُس کو رحمت کی ہیڑک سے محروم نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

تیسری بیٹی کی آمد نے اُس کو کہیں منہ دکھانے لائق نہ چھوڑا۔ وہ باؤلے کتے کی طرح غُراتا رہتا اور سدا کی سیاہ بخت گھر والی پر بات بات پر لگّے، جوتے برسا دیتا۔ اگلے چار سال شیداں بیچاری تین مہینے میکے میں بھابھیوں کے طعنے سہتی، جب روح نڈھال ہو جاتی اور بدن کے زخم بھر جاتے تو وہ دوبارہ بچیوں اور اُن کے کپڑوں سے رِکشہ بھرتی اور واپس عقوبت خانے کا رُخ کرتی۔

چار سال بعد مجید کی طبیعت اچانک بحال ہو گئی۔ اِس بار معاملہ ہی بڑا مختلف اور پکا تھا۔ ایک مومن ملنگ کے ساتھ اُس کی دعا سلام ہوئی۔ ملنگ نے جو کہا اب اُس سے زیادہ تسلّی کی حاجت نہ رہی۔ سابقہ نتائج ننانوے اعشاریہ ننانوے بھی نہیں تھے بلکہ ہزار فی صد تھے۔ اِس بار شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔ سراسر منکر ہونے والی بات تھی۔ دوسرا ملنگ نے کہا ہدیہ بھی منّت پوری ہونے کے بعد۔ اور جب نعرۂ مستانہ کے ساتھ ملنگ نے یہ دعویٰ کیا تو مجید کی رہی سہی تھکن بھی اُتر گئی۔ ''ویکھ بھا مجیدے، جے ایس واری تیری مراد پوری نہ ہوئی تے آکھیں ملنگ یزید دی اولاد اے، شمر دا پُتّر اے''

چوتھی بار نرس ہانپتی ہوئی لیبر روم سے باہر نکلی۔ گھبرائی ہوئی آواز میں بتایا، ''شیداں زچگی کے عمل سے صحیح سلامت گزر گئی، ہوش میں تھی۔ بچی کو سینے سے لگایا پھر اچانک بلڈ پریشر ایسا گرا، ساری بھاگ دوڑ اکارت''۔

وہ آدھی رات کو گھر پہنچا۔ ایک ایک کر کے ادھ سوئی جاگی بچیوں کے گلے کاٹ دیئے۔۔۔۔ اور ایک گھنٹے میں وہ نہا دھو کر وزیر آباد کے ریلوے سٹیشن پر ریل گاڑی کا منتظر تھا۔ اُس کی اگلی منزل کراچی شہر تھا۔ نئی زندگی کی شروعات کا احساس اُسے تازہ دم کیے دیتا تھا اور نئی نوکری کے ساتھ ہی اِس بار کم عمر دلہن لانے کے خیال سے اُس کے بدن میں پیشگی لذّت کی لہر سی دوڑ گئی۔

ہاں! آدمی سے ڈرتا ہوں۔۔۔۔

4۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ہاں آدمی سے ڈرتا ہوں۔۔۔۔

صاحب اپنی بارہ سالہ گڑیا کی پیشانی چومتا ہے۔

wish you good luck my princess

آج بچوں کا عالمی دن ہے۔ سکول میں ''چائلڈ لیبر'' کے موضوع پر تقریری مقابلہ ہے۔ گڑیا بھی حصہ لے رہی ہے۔ صاحب آج ناسازیِ طبع کی وجہ سے چھٹی پر ہے۔ بیگم کو بیٹی کے ساتھ سکول جانے کا کہتا ہے۔ تاکہ گڑیا کی حوصلہ افزائی ہو۔ ویسے بھی بزرگ ڈرائیور کے ساتھ بھی کبھی اکیلی بچی کو نہیں بھیجتا۔ زمانہ ہی ایسا ہے۔ بیگم کو نوٹوں کی تھدّی پکڑاتا ہے۔ ''واپسی پر شاپنگ بھی کرتے آنا، اگلے ہفتے گڑیا کی سالگرہ ہے، اس کی پسند کا لباس خرید دینا، میں اب آرام کروں گا، پتہ نہیں طبیعت کب سنبھلے''۔

ماں بیٹی کو لے کر سکول کے لیے نکلتی ہے۔ وہ کم سن ملازمہ کو بُلاتا ہے۔ ٹی وی کی آواز اونچی کرتا ہے۔ ننگے فرش پر ریپ کرتا ہے کہ بستر پر کوئی داغ نہ رہ جائے۔

(سچے واقعات پر مبنی جھوٹی کہانیوں کا سلسلہ جاریہ)

ایک اندھیری رات میں

محمد عباس

جب اس گاڑھے کھوبے میں پہلی دفعہ اس کا پاؤں اترا تھا اور پورا زور لگانے کے باوجود باہر نہ آسکا تو اس وقت بھی اس کے ذہن کے کسی گہرے خانے میں یہ احساس ابھرا تھا کہ اس کا پاؤں نکلے گا نہیں لیکن وہ زندگی میں کبھی مایوس نہیں ہوا تھا اور اس کی آنکھیں ہمیشہ امید کی روشنی سے چمکتی رہتی تھیں سو اس نے اِس احساس پر دھیان نہ دیا تھا اور اپنے دائیں کندھے پر لٹکتے جھولے کو سنبھال کر، اسی ہاتھ میں جوتے پکڑے، بائیں ہاتھ سے ڈنگورے کو کھوبے میں دبا کر اس کے ہل پر اپنے دائیں پیر کو کھوبے سے باہر کھینچنے کی کوشش کی۔ پاؤں چکناہٹ سے پچپچاہٹ کی آواز پیدا کر کے رہ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ پاؤں کسی گاڑھی گوند میں ڈوبا ہوا ہے اور وہ اس کی پوری پنڈلی سے چپک کر اسے حرکت نہیں دے رہی۔ پچھلے اٹھائیس سال میں ہزاروں دفعہ وہ چھوٹے دریا کے اس کھوبے سے گزرا تھا۔ اسے اس کھوبے کا ہر رنگ پتا تھا اور جانتا تھا کہ کس طرح موسم کے ساتھ ساتھ یہ بدلتا جاتا ہے۔ لاکھوں دفعہ اسی طرح اس کھوبے میں اس نے پاؤں رکھا تھا اور وہ ہر دفعہ پاؤں کے اندر اترنے تک جان جاتا تھا کہ واپس باہر کھینچنے کے لیے کتنا زور لگانا پڑے گا۔ کوئی جھنجھٹ نہ ہوتا۔ اپنے علاوہ بھی سینکڑوں لوگوں کے پیر کھُبتے اور زور لگا لگا کے نکالتے دیکھا تھا۔ اگر آج کی طرح کھوبہ گاڑھا ہوتا تو اکثر صرف پاؤں نکلتے تھے، جوتے اندر ہی رہ جاتے۔ لوگ کیچڑ میں ہاتھ ڈال کے جوتے نکالنے کی کوشش کرتے اور دونوں ہاتھوں کی پوری طاقت سے جوتے نکل آتے۔ کبھی کبھار زور کام نہ آتا اور جوتے کو چھوڑ کر ننگے پاؤں اپنی راہ پکڑتے۔ یہی وجہ تھی کہ عام طور پر سیانے لوگ اس کھوبے میں داخل ہونے سے پہلے جوتے ہاتھ میں پکڑ لیتے تھے۔ پاؤں نکلنا آسان تھا جوتے کا نکلنا مشکل۔ اس کے جوتے بھی ہاتھ میں تھے۔ ایک دفعہ جب پاؤں نہ نکلا تو اس نے 'مایہنا' کہہ کر دونوں جوتے تھوڑا آگے کھوبے کے اوپر جمے خشک کھرن ڈپر رکھے اور ڈنگورے پر دونوں ہاتھوں کا زور دے کر پاؤں کھینچا۔ دائیں پیر سے بائیں بازو تک اس کا بوڑھا بدن پوری طرح تن گیا مگر پاؤں کیچڑ میں ذرا بھی نہ ہلا۔ جیسے اندر کوئی ایسی طاقت تھی جو اتنے ہی زور سے پاؤں کو مخالف سمت کھینچ رہی تھی۔ اسے تھوڑی سی تشویش ہوئی اور اس نے اپنے ارد گرد دیکھنے کی کوشش کی۔ مگھر کی چوتھی رات تھی۔ کاتک کے آخر سے ہی لوگ بیلے کی طرف آنا چھوڑ دیتے تھے اور اب تو کئی دنوں سے اس نے کسی کو بیلے میں دیکھا ہی نہیں تھا۔

اس کا گاؤں کافی بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ مقامی انتخابات میں اس گاؤں کو فیصلہ کن سمجھا جاتا تھا۔ گاؤں جہاں ختم ہوتا، وہاں کھیتوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو بہت کشادہ بھی تھا۔ تقریباً ایک میل چلنے کے بعد کھیت ختم ہو جاتے اور چھوٹا دریا شروع ہو جاتا۔ اس کی چوڑائی دس بارہ قدم تھی۔ ساون میں اس کے گاؤں سے تھوڑا پیچھے کناروں سے کاٹ کر باہر آجاتا تھا اور پانی کا گدلا ریلا قوس کی شکل میں نالہ سا بناتا ہوا اگلے گاؤں میں جا کر دوبارہ دریا میں گر جاتا تھا۔ دریائے جہلم کے مقابلے میں یہ ایک چھوٹی نہر ہی کہلا سکتی تھی۔ اس نہر کو چھوٹا دریا کہتے تھے۔ دونوں دریاؤں کے درمیانی علاقے کو بیلہ کہا جاتا۔ جس نے اپنے جانوروں کو مفت چرانا ہو، وہ

بیلے میں لے جاتا تھا۔ یہاں خر گوش، گیدڑ، لومڑ یا اکا دکا سؤر وغیرہ موجود تھے جن کا شکار سردیوں میں کھیلا جاتا تھا۔ گرمیوں کی تمام بارشوں کے دوران پانی بہتا رہتا اور بعض اوقات پانی اُچے لمبے آدمی کی رانوں سے بھی اوپر ہو جاتا۔ اسوج میں بارشیں نہ ہونے سے پانی کا بہاؤ گھٹنے لگتا اور نالہ جوہڑ کی شکل اختیار کر جاتا۔ پانی گھٹنوں گھٹنوں رہ جاتا۔ بیلے کی سخت چکنی مٹی میں یہ پانی سوکھنے میں بہت وقت لیتا تھا۔ کاتک کے وسط تک آتے آتے یہ پانی ٹخنوں تک رہ جاتا لیکن تب اس کی حالت ایسی ہوتی کہ اسے پانی کہا ہی نہیں جاتا تھا، لوگ اسے چونبھلا کہتے۔ چکنی مٹی پانی میں گھل کر اسے بہت گاڑھا کر دیتی تھی، دہی کی طرح۔ بھینسیں اس میں لیٹ کر نکلتیں تو انہیں گھر واپس پہنچنے پر نہلانا پڑتا۔ آدمی جو گزر کے آتے انہیں اس کیچڑ کو مل مل کر اتارنا پڑتا۔ یہ چونبھلا مزید خشکی پڑنے پر گاڑھا ہو جاتا اور کھوبے کی شکل اختیار کر لیتا۔ جمے ہوئے شہد کی طرح۔ مٹی گلو کی طرح گاڑھی اور چپکو/چمٹو ہو جاتی۔ رہتا تو آٹھ دس دن تھا لیکن یہ کھو بابہت تنگ کیا کرتا تھا۔ جانور یا آدمی پاؤں رکھتے تو پاؤں گاڑھے کیچڑ میں اندر دھنستا چلا جاتا اور واپس باہر نکالنے کے لیے باقاعدہ زور لگانا پڑتا۔ ان دنوں لوگ جوتے اتار کے ہاتھ میں پکڑ کے اور ہر قدم پر پاؤں کھینچتے چلتے۔ یہ دس بارہ قدم ان کے لیے آدھ کوس چلنے کے برابر ہوتے۔ کاتک کے وسط تک کھیتوں میں گندم کی بیجائی مکمل ہو جاتی اور بیلے میں جانے کا راستہ بند ہو جاتا۔

یہ چھوٹا دریا گاؤں کی خوش قسمتی اور بد قسمتی دونوں کی نشانی تھی۔ بد قسمتی اس لحاظ سے کہ چھوٹے دریا اور دریائے جہلم کے درمیانی جزیرے پر جو تقریباً چودہ پندرہ مربع میل کا علاقہ تھا، پانی کے اندر ٹپ آنے سے بیلہ بن گیا تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ اور کنڈیارے درختوں، بیری، کیکر، کریر، وغیرہ کی کثرت کی وجہ سے وہاں فصل نہیں ہو سکتی تھی۔ اور خوش قسمتی یہ کہ، جو آس پاس کے کسی گاؤں کو نصیب نہ ہوئی تھی اور وہ لوگ پورا سال جانوروں کو ہاتھ سے چارہ کاٹ کے کھلاتے تھے لیکن اس بیلے میں گھاس کی فراوانی تھی۔ ایک مفت کی چراگاہ بن گئی تھی جو پورے گاؤں کی مشترکہ چراگاہ تھی، جہاں کوئی بھی اپنے جانوروں کو لا کر چرا سکتا تھا۔ دن بھر گھاس چرنے کے بعد جانور جب واپس پہنچتے تو ان کی بکھیاں ابھری ہوتی تھیں۔ لیارے ڈنگروں کو اس کے بعد صرف ونڈا ڈالنے کی ضرورت ہوتی تھی جب کہ پھنڈر یا نر ڈنگروں کو تو محض نہلا دھلا کر کلے پر باندھ دیا جاتا۔ ان کی کھرلیاں چرنے کے تمام موسم میں گھاس کا تنکہ تک نہ دیکھتی اور جانور تمام رات جگالی کرتے گزار دیتے۔ اس چرائی کے اتنے فائدے تھے کہ جو اپنے جانور خود نہ لے جا سکتے، وہ کسی اور کے حوالے کر دیتے اور اس کا ماہانہ معاوضہ ادا کرتے۔

بیلہ چونکہ کھیتوں کے بعد آتا تھا، اس لیے وہاں تک پہنچنے کے لیے کھیتوں میں سے گزر کے جانا پڑتا تھا۔ بارانی زمین پر صرف ہاڑی ہوتی تھی۔ کھیتوں میں کاتک کے وسط تک گندم بو دی جاتی تھی جس کے بعد گاؤں کے باہمی غیر تحریری معاہدے کے تحت سبھی لوگ اپنا مال ڈنگر کھیتوں کے پار بیلے میں لے جانا بند کر دیتے۔ مگھر پوہ ماگھ کے سخت سردی کے دنوں میں جانوروں کو کھیتوں میں سے جڑی بوٹیاں نکال کر، بنّوں سے کھبل گھاس کھود کے ڈالی جاتی جس میں دوگنا بھوسہ ملا ہوتا۔ جانور دوگھڑی کھاتے اور پورا پہر جگالی کرتے رہتے۔ ان کی پسلیاں اور کولہوں کی ہڈیاں نظر آنے لگتیں۔ بکرے مال کو، جس کے لیے قیمتی گھاس ضائع نہیں کی جا سکتی تھی، یا تو پہاڑوں پر لے جا کر جھاڑیوں پر چرایا جاتا یا کلے پر باندھ کے دھریک کے پتے یا کیکر، بیری کی جھام اتار کے ڈال دی

جاتی اور وہ ندیدوں کی طرح پتے پتے پر لپک کر چاٹتے جاتے۔ بیساکھ آتے آتے جانور بھوک سے بے حال ہو چکے ہوتے اور دودھ دوہنے والی عورتیں جب بھینس کے تھن چھوڑ کے اٹھتیں تو کمنڈل کھڑکنے کی آوازیں آتیں۔ بیساکھ میں چھوٹے زمیندار فوراً اپنی فصل سنبھال، دانے گھر میں ڈال اپنے سوکھے اور گزرے ہوئے پالے کی سردی اور بھوک کے مارے جانوروں کو بنّوں پر ٹٹکارتے بیلے کی طرف چلتے نظر آنے لگتے۔ گو کھڑی فصل کے قریب بھی کسی جانور کو نہ آنے دیا جاتا پھر بھی جن کی فصل کھڑی ہوتی، وہ ان جانوروں کے مالکوں کو خوب کوستے اور خود مہیز پکڑتے کہ کہیں ان کی غیر موجودگی میں جانور فصلیں اجاڑ نہ دیں۔

بیساکھ کے بعد جانور بھوک سے اس قدر بے حال ہوتے کہ پوہلی اور لیہہ جیس کنڈیاری بوٹیوں پر بھی منہ ضرور مارتے، بھلے ہونٹ چھل جائیں۔ جیٹھ، اساڑھ میں جب کھیتوں میں ہر طرف سوکھا پڑا ہوتا اور دور تک صرف اڑتی مٹی کا دھول رنگ نظر آتا، بیلے میں جانوروں کے پیٹ بھرنے کا وافر سامان ہوتا۔ بارانی کھیت دوسری فصل تو دے نہیں سکتے تھے، کاتک تک انہیں فارغ چھوڑنا ہوتا تھا تاکہ زمین اناج دیتے وقت تھکی پڑی نہ ہو۔ آجڑی صبح کو دھوپ تیز ہونے سے پہلے چھوٹا دریا جو اُن دنوں ٹانٹ سوکھا ہوتا، پار کر کے بیلے میں پہنچ جاتے۔ خود کسی درخت کے نیچے ٹولیاں جما کے بیٹھ جاتے اور جانور ان کی آنکھوں کے سامنے چرتے رہتے۔ اگر کوئی جانور نظر سے اوجھل ہونے لگے تو پکار کر یا جا کر واپس لے آتے ورنہ سارا دن ٹولی میں ہنستے کھیلتے رہتے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے سب کے جھولے میں روٹیاں، اچار اور پیاز وغیرہ بندھے ہوتے۔ کھا کر عصر تک ستاتے اور دھوپ کی نوک گھِس جانے پر درختوں کی پناہ سے نکل کر اپنے جانور اکٹھے کرتے اور واپس گاؤں کی طرف ہانک لاتے۔ ساون بھادوں کی تیز بارشوں والے چند دن چھوڑ کر، جب بیلے میں پانی قابض ہوتا، یہ سلسلہ گندم کی دوبارہ بیجائی تک چلتا رہتا۔

شرف دین نے اپنی جوانی فوج میں گزاری تھی اور 21 سال کی نوکری کے بعد حوالداری پنشن کے ساتھ گھر آگیا تھا۔ گھر آنے کے بعد اس نے فوج کی اپنی پنشن اور زمینداری سے اپنے گھر کا خرچ چلائے رکھا تھا۔ آٹھ بیگھے زمین تھی جو اس کے گھر کی خوراک پوری کرنے کے ساتھ ساتھ سال کی کچھ اضافی آمدنی بھی دے جاتی۔ ساتھ دو بھینسیں، ایک گائے اور چند بکریاں اس نے پالے رکھی تھیں، ان سے اولاد کو دودھ گھی بھی پورا رہتا اور تھوڑا خرچ پٹھا بھی نکل آتا۔ پچھلے 28 سال سے اس کا معمول باقی گاؤں والوں کے ساتھ ہی جڑا تھا۔ بیساکھ تک گندم کا خیال اور گندم سے فارغ ہوتے ہی جانور لے کر روزانہ بیلے جانے کا معمول بندھ جاتا۔ اس کے پاس جانور کم زیادہ تو ہوتے رہتے لیکن اس کا یہ معمول پکا رہا۔ بیلے میں جانے والے سبھی لوگ ایک خاندان کی طرح تھے اور وہ اس خاندان کا ایک پرانا اور شوخ رکن تھا۔ گرمی کی طویل دوپہروں میں جب بیلے میں سنسانی کا راج ہوتا اور غم کی رات کی طرح سکوت کا دن گزرتا نہ دکھائی دیتا تو تمام آجڑی وقت گزاری کے لیے کچھ مشغلے ڈھونڈتے، کہیں لڈو بچھ جاتی، کسی درخت کے نیچے تاش کی بازی جم جاتی، کہیں زمین پر لکیریں ڈال بارہ گاٹ، تین گاٹ کا کھیل شروع ہوتا، کسی ٹولی سے ماہیے یا سیف الملوک کی آوازیں اوپر اٹھتیں اور دریائے جہلم کے ساکت سینے پر جا کر ٹھہر جاتیں۔ کوئی پرانا بزرگ ہوتا تو اس سے جوانی کے پر لطف قصے کہانیاں سننے کی فرمائش کی جاتی۔ شرف دین بیلے میں اک عمر گزارنے کے بعد ان سبھی مشغلوں میں مہارت رکھتا تھا۔ خاص طور لڈو

اور کہانی سنانے کا۔ لڈو میں تمام انحصار دانے پر ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس کی گوٹ چلنے کی مہارت کے سبھی قائل تھے اور کہانی کہنے کا انداز ایسا کہ اس سے ایک ایک کہانی دس دس دفعہ سننے والے بھی ایک دفعہ پھر کی فرمائش کرتے تھے۔

اس کے گھر میں اولاد جوان ہوئی، ان کی اولادیں بھی جوان ہوئیں۔ شرف دین ابا سے بابا بن گیا اور گھر کے نظام میں اس کی حیثیت مرکزی کی بجائے حاشیے میں چلی گئی۔ اس کا بدن اب بڑھاپے کے آثار سے اٹا پڑا تھا لیکن اس کا دل ابھی بھی جوانی کے جذبات رکھتا تھا۔ گھر میں سب ہی اسے کام چھوڑ دینے کا کہتے تھے لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتا۔ آرام کا وقت تو قبر میں آئے گا، دنیا میں تو میں ہاتھ چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ ابھی چھ مہینے پہلے بیساکھ میں اس نے اپنی اولاد کے برابر مشقت کرنے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ وہ اپنے بیل جیسے بیٹوں کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا لیکن ان سے ہار بھی نہ مانتا تھا۔ وہ گھر کی چلتی چکی میں اپنا پورا حصہ ڈالنا چاہتا تھا سو جب ڈنگر چرانے کا موسم آیا تو اس نے کسی سے پوچھے بغیر اپنی پرانی ذمہ داری سنبھال لی۔

آج کل اس کے گھر میں دو بھینسیں تھی اور ایک بکری۔ وہ ان تینوں کو لے کر بیلے میں آرہا تھا۔ کاتک کے دنوں میں جب کھیتوں میں ہر طرف بیجائی کی تیاری ہو رہی تھی، کہیں ٹریکٹر سیں لگا رہے تھے، کہیں کسان دیسی یا ولایتی کھاد بکھیرتے دکھائی دیتے، کوئی سہاگا پھیر رہا ہوتا یا کیرا لگا کر بیج بو یا جا رہا ہوتا۔ سبھی آجڑی اپنی اس سال کی محفل اجڑنے کا ذکر کیا کرتے۔ کئی ایک تو اپنی بیجائی کے لیے جانے لگے اور بیلہ چھوڑ گئے۔ شرف دین کی طرح آٹھ دس بوڑھے جو گھر والوں کی طرف سے فارغ تھے، آتے رہے۔ جب سبھی کھیتوں میں ہر طرف کیرے کی سیدھی لکیریں نظر آنے لگیں تو یہ بڈھے بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوتے گئے۔ اب کھیتوں کی طرف آنے والا جانور یا آدمی پورے گاؤں کی نظر میں مطعون ٹھہرتا۔

آج صبح جب اس نے بھینسوں کو کھولا تو اس کے بیٹے نے اسے روکا تھا کہ گندم بیجی جا چکی ہے، اب بیلے تک جانے کا راستہ ہی نہیں ہے۔ اس پر شرف دین نے تھوڑی اکڑ سے کہا تھا۔ دو ہی تو بھینسیں ہیں، گھما پھرا کے نکال لے جاؤں گا۔ کسی کی فصل کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ تو کیا لے جانا ضروری ہے۔ یہاں کوئی بہانہ بنانا ہے لے جانے کے لیے۔ کوئی بھی معقول قسم کا۔ کچھ پہن تو لیں، سویٹر ہی پہن لیں، ٹھنڈ ہوتی جا رہی ہے۔ بابے نے اپنی سوکھی چھاتی نکال کے کہا تھا، پرانی خوراکیں کھائی ہوئی ہیں، ہمیں سردی کیا کہتی ہے۔ بیٹا ہنس دیا تھا۔

آج بیلے میں پہنچا تو وہ اکیلا ہی آجڑی تھا۔ حسبِ توقع سبھی لوگ گھروں میں بیٹھ گئے تھے۔ دن بھر اس نے اپنی دونوں بھینسوں کو خوب ٹہلایا، چرایا اور تنہائی کا احساس کم کرنے کے لیے ان سے ایسے باتیں کیں جیسے وہ اس کا ہر لفظ سمجھ رہی ہوں۔ عصر ڈھلی اور ہوا میں خنکی سی ہوئی تو اس نے بھینسوں کو واپسی کے لیے ہنکارا۔ چھوتے دریا کے کھوبے سے وہ تو سر ہلاتے ہوئے گلے کی گھنٹیوں کو ٹن ٹن کرتی نکل گئیں لیکن اس کے پاؤں کو چکنی مٹی نے جیسے جکڑ لیا تھا۔

دوسری دفعہ زور لگانے پر بھی پیر باہر نہ نکلا تو اس کی ہنسی نکل گئی۔ اسے فیضو پدل یاد آگیا تھا۔ اس کی کم ہمتی کی وجہ سے اسے پدل کہتے تھے۔ ذرا سا کہیں خطرہ یا سخت مقام آتا تو اس کے پد نکل جاتے۔ ایک دفعہ، کافی مدت پہلے فیضو پدل اسی کی طرح اس

کھوبے میں پھنس گیا تو اس کا بڑا تماشا بنا تھا۔ وہ پاؤں کیچڑ میں سے نکالنے کے لیے جتنا زور لگاتا، اتنے ہی زور سے اس کی ہوا خارج ہو جاتی۔ شرف دین اور اس کے ساتھ دو تین قدرے جوان آدمی بھی وہاں کنارے کھڑے تھے، وہ اس کی مدد کرنے کی بجائے اس کی اس کم ہمتی پر ہنستے رہے تھے۔ آج اسے اپنا پاؤں پھنسنے پر اس کی یاد آئی اور وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ حوالدار شرف دین! فیضو پدل مت بننا۔ ابھی تھوڑا سا زور لگانا ہے اور پاؤں باہر آجائے گا۔ البتہ یہ کہتے ہوئے اسے احساس تھا کہ یہ کھوبا تھوڑے سے زور کا کام نہیں ہے۔ جب اس نے پاؤں رکھا تھا تو اس کی آدھی پنڈلی کیچڑ سے باہر تھی لیکن اب گھٹنے تک پاؤں نیچے اتر گیا تھا۔ اس نے ڈنگورے پر دونوں ہاتھوں کا زور دے کر بایاں پاؤں اوپر اٹھایا جو کھوبے کے اندر حرکت کر رہا تھا، جب وہ پاؤں نکل آیا تو اس نے پورے بدن کا زور ڈنگورے پر ڈالا اور دائیں ٹانگ کو بائیں ٹانگ کا سہارا دے کر باہر نکالنا چاہا لیکن پیر باہر آنے کی بجائے اس کا بدن ہوا میں جھکولا کھا کر رہ گیا اور توازن بگڑنے سے بایاں پاؤں واپس کھوبے میں چلا گیا جہاں گاڑھے کیچڑ میں اس کے پاؤں کا گڑھا ابھی مٹا نہیں تھا۔ مشقت سے وہ بے طرح ہانپ کر رہ گیا تھا۔ ڈنگورے پر دونوں ہاتھ رکھے اس نے اپنا سانس بحال کیا اور ایک دفعہ پھر اس نے آگے پیچھے نظر دوڑائی۔ بیلے میں تو آج سارا دن کوئی شخص نہ تھا۔ ادھر تو ویرانی تھی۔ سامنے کھیتوں میں ہر طرف ڈوبے سورج کی سرخیلی دھوپ تھی اور گندم کے ہلکے ہلکے بالے زمین سے سر نکال رہے تھے جیسے خرگوش کے چھوٹے بچے بِل میں سے سر باہر نکال کر جھانکتے ہیں۔ گندم کے ان بالوں کو اس نے ہمیشہ کسان کی محبت سے دیکھا تھا لیکن آج وہ ان باتوں کے درمیان کسی انسان کا متلاشی تھا۔ دور گاؤں کے قریب جہاں تک پہنچتے اس کی دھندلی پڑتی نظر بھی دم توڑ جاتی تھی، کافی ایک ہیولے حرکت میں تھے جنہیں وہ پہچان نہ سکتا تھا لیکن جہاں تک اس کی نظر واضح تھی، کھیتوں میں کوئی نہ تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا۔ اسے چھوٹے دریا سے گاؤں تک پورا علاقہ نظر آرہا تھا۔ گاؤں والوں نے اپنی سہولت کے لیے اس وسیع علاقے کو الگ الگ نام دے رکھے تھے۔ یہ اس کے سامنے کھیتر کا علاقہ تھا جس میں بڑے بڑے کھیت تھے اور سخت پتھریلی زمین تھی، یہاں سب لوگ منڈیروں پر ہی چلتے ورنہ کھیتوں کے اندر چلنے والے کو مٹی کی سخت تراڑیں باقاعدہ نوکیلے پتھروں کی طرح جوتوں کے اندر بھی تکلیف دیتی تھیں۔ ان سے تھوڑا آگے لمیوں کا علاقہ تھا جہاں تھوڑے کم بڑے کھیت تھے۔ اسے لنڈا کیکر واضح نظر آرہا تھا جو لمیوں کے علاقے کے درمیان میں تھا۔ گاؤں کے قریب ٹوٹیوں کا علاقہ تھا جہاں کنال اور دو کنال کے چھوٹے چھوٹے کھیت تھے۔ اسے لمیوں کے کیکر تک واضح نظر آرہا تھا۔ زمین سے چار فٹ اوپر دھوئیں کی ایک ایسی لہر بنی تھی جو سردی کے موسم میں ہر شام کھیتوں کے اوپر تیرتی تھی۔ اس دھند میں اسے گاؤں کی طرف جاتی ہوئی بھینسیں دکھائی دیں جو لنڈے کیکر تک پہنچ چکی تھیں اور یقیناً اس کی آواز سے دور نکل چکی تھیں۔ اس نے گھبرا کر انہیں پکارا۔ اگر بھینسیں واپس آجاتیں تو اس کے پاس بچنے کی امید رہ جاتی۔ بھینسیں گھر نہ پہنچتیں تو اس کے بیٹے ضرور ان کی تلاش میں بیلے کی طرف آتے لیکن اگر بھینسیں گھر پہنچ جاتیں تو یقیناً یہی سمجھتے کہ ابا جی بھی گاؤں آگئے ہیں اور برادری کے کسی گھر بیٹھے گئے ہیں۔ اس نے بھینسوں کو اسی امید پر بار بار پکارا لیکن وہ اپنی مستی میں گھر کی سمت رواں چلتی رہیں۔

بھینسوں کے نظر سے اوجھل ہو جانے پر اسے اندازہ تھا کہ اب جو کچھ کرنا ہے اس نے خود ہی کرنا ہے۔ اس کی طرف گاؤں سے اتنی جلدی کوئی مدد نہیں آنے والی۔ اس نے دو تین دفعہ پاؤں کو باہر کھینچنے کی کوشش کی لیکن بے سود رہا۔ ٹانگ کسی پرانے درخت کے تنے کی طرح کھوبے میں دھنسی ہوئی تھی۔ بار بار پاؤں کو زور سے کھینچنے پر اس کی ٹانگ میں کھنچاؤ بھی پیدا ہو رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ زیادہ زور لگانے سے ٹانگ کا جوڑ نکل جائے گا۔ بوڑھے بدن کے جوڑ بدن کا ساتھ چھوڑنے کے لیے اتاولے ہوتے ہیں۔ اس نے اب متبادل طریقہ سوچا اور ڈنگورے کو دائیں ٹانگ کے ساتھ ساتھ کھوبے میں گھسا کر پاؤں کے چاروں طرف جکڑا ہوا گاڑھا کیچڑ ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈنڈا ایک دفعہ تو سیدھا کیچڑ میں اترتا گیا اور واضح محسوس ہوا کہ ڈنڈا کیچڑ کو ہٹاتا نیچے جا رہا ہے لیکن جب اس نے ڈنڈے کو ہلا جلا کر پیر کے چاروں طرف سے کیچڑ کو ہٹانا چاہا تو ڈنڈا اپنی جگہ سے ایک سوتر بھی نہ ہلا۔ جیسے پاؤں جما ہوا تھا، ایسے ہی ڈنڈا بھی جم گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کا زور لگا کے ڈنڈا واپس کھینچا اور بمشکل تمام ڈنڈے کو آزاد کرا پایا۔ دوبارہ ڈنڈا اس کیچڑ میں گھسایا گیا تو یہ بھی نہیں نکلے گا۔ یہ آخری سہارا تو ہے، اسے اب ایک طرف ہی رکنا پڑے گا۔

جس حقیقت کی طرف وہ دن کی روشنی میں نہیں دیکھ رہا تھا، وہ رات کی امڈتی تاریکی نے اس کے سامنے لا کر کھڑی کر دی۔ 'کیا وہ رات بھر اسی کھوبے میں کھڑا رہے گا؟' مگھر کی چوتھی رات تھی۔ دن کو ٹھنڈ اتنی سی ہوتی کہ اس کی بوڑھی ہڈیاں ''پرانی خوراک'' کہہ کر لطف لیا کرتیں لیکن رات کمبل کے بغیر نہ گزرتی تھی۔ اور پھر دریا کے کنارے کھلے ویرانے میں تو سردی بہت زیادہ ہو گی۔ اسے یاد آیا کہ صبح اس کا بیٹا سویٹر پہننے کا مشورہ دے رہا تھا اور اس نے کس طرح شیخی میں آکر انکار کر دیا تھا۔ اتنا بھی بوڑھا نہ سمجھ مجھے۔ اب اگر یہاں اس ٹھنڈ میں رات گزارنی پڑی تو ساری شیخی بتیسی کے ساتھ اکڑی ہوئی نظر آئے گی۔

رات کی تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ آج چاند کی ساتویں یا آٹھویں تھی۔ مگھر کی دھندلی ہوتی رات میں نکلتا ہوا چاند، اس کی ماند پڑتی بینائی کو مزید دھندلا ہو کر دکھائی دے رہا تھا۔ اسے یہ امید تو تھی کہ اس کے بیٹے اسے ڈھونڈتے ہوئے ادھر آ پہنچیں گے لیکن پھر بھی کیا پتا ان کے ذہن میں ادھر کا خیال ہی نہ آئے۔ آج تک کسی کے متعلق نہ سنا گیا تھا کہ چھوٹے دریا میں اس بری طرح سے پھنس گیا ہو۔ وہ ذہنی طور پر تسلیم کر چکا تھا کہ اب اسے پوری رات اسی حالت میں کھڑے رہنا ہے اور صبح کسی اور شخص کے ادھر آنے کا انتظار کرنا ہے۔ صبح تک اسے بھوک اور سردی دونوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ بھوک کا مقابلہ تو خیر وہ کر سکتا تھا، ایک رات کھانا نہ ملنا ایسی بات نہ تھی لیکن رات بھر یوں ٹھنڈے کھوبے میں گزارنا محال تھا۔ اس کی بوڑھی ہڈیاں سردی سے جلدی ٹھٹھر جاتی تھیں۔ اس نے گاؤں کی طرف آنکھوں میں امید کے دیے بھرے ہوئے نگاہ کی کہ شاید اس کے بیٹے ٹارچ لے کر نکلیں اور اس تک پہنچ جائیں۔ لیکن گاؤں کی طرف سے اسے دھند میں سوائے ایک آدھ روشنی کے کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ اس کے بیٹوں کا خیال ہو گا کہ وہ معمول کے مطابق بیٹھک میں چلا گیا ہو گا۔ ایسا کئی دفعہ ہو چکا تھا کہ وہ شام کو بھینسیں باندھ بیٹھک میں چلا جاتا اور رات بولنے پر واپس آتا۔ اس کے بیٹے دس بجے تک تو فکر کرنے والے نہ تھے۔ بیٹھک اجڑنے کے وقت کے بعد وہ اس کی تلاش شروع کریں گے اور پھر بھی معلوم نہیں کہ اس طرف آتے ہیں یا نہیں۔

اسی طرح کی کیچڑ مٹی میں اس نے کتنا ہی وقت گزارا تھا۔ اسوج اور کاتک میں گھروں کی چھتوں کی لیپائی کی جاتی تو کئی جوان مل کر گھانی بناتے تھے۔ گیلی مٹی پر بھوسہ ڈال کر اسے کسّی اور پاؤں کی مدد سے ایسے ملانا کہ مٹی اور بھوسہ الگ نہ رہیں۔ جوانی کے دنوں میں تو اکثر گھروں کی گھانی میں اس کا حصہ ہوتا تھا۔ اب بہت سے گھروں کی چھتیں پکی تھیں لیکن پھر بھی جن دو چار گھروں کی چھت کے لیے گھانی بنوانی ہوتی، بابے کے تجربے سے فائدہ ضرور اٹھاتے تھے۔ بابا اکثر گھانی بناتے ہوئے اپنی عمر کے کسی آدمی کے ساتھ ڈائیلاگ مار دیتا تھا۔ بس جی! آخر اسی مٹی میں رَل مٹی ہو جانا ہے۔ آج اسے اپنا یہ کہا یاد آیا تو اس کا پورا بدن سہم کر رہ گیا۔ یوں مٹی میں رلنے پر وہ تیار نہ تھا۔ یہ نہیں کہ اس نے کبھی موت کے متعلق نہ سوچا ہو، اکیس سال فوج کی ملازمت کرنے والا آدمی موت سے کب ڈرتا ہے۔ فوج کی ملازمت کے دوران اسے کبھی موقع ملتا تو وہ ایک پل سوچے بغیر اپنی جان دے سکتا تھا۔ بعد میں بھی کبھی اسے مرنے سے ڈر نہیں لگا تھا۔ اگر کبھی عزت پر بن جاتی تو وہ فوراً اپنا گلا کٹوا سکتا تھا۔ عزت کی موت کے علاوہ اس کے ذہن میں موت کا دوسرا تصور وہی تھا جس طرح اس کے پورے گاؤں کے لوگ مرتے تھے، دو چار ہفتے مہینے یا ایک آدھ سال بیمار ہو کر چارپائی پر پڑے رہنا اور دھیرے دھیرے ملک الموت کے سامنے سرنگوں کرنا۔ یہ جو تیسری قسم کی موت کا تصور اس کے ذہن میں آرہا تھا بلکہ حقیقتاً اس کے قدموں تلے دھرا تھا، اسے انتہائی مضحکہ خیز لگا تھا۔ اس کھوبے میں کھب کے مر جانا اتنا ہی مضحکہ خیز تھا جتنا فیضو پدل کا پدمارنا۔ لوگ اس کی موت پر رونے کی بجائے ہنسیں گے کہ مرا بھی تو کہاں اور کیسے اسے تصور میں گاؤں کے کتنے ہی لوگ اس کے مردا جسم کے گرد کھڑے ہنستے نظر آئے۔ اس نے دانت پر دانت جما کر اپنے آپ سے پکا عہد کر لیا کہ یہ مضحکہ خیز موت وہ قبول نہیں کرے گا۔ جتنی بھی سردی ہو، اسے برداشت کرنی ہے۔

اسے کھبے ہوئے ایک پہر گزر گیا۔ بایاں پاؤں شام کو ہی اپنی جگہ جم گیا تھا۔ ٹھنڈ کافی بڑھ گئی تھی اور اس کے ٹھٹھرتے بدن کے مختلف تقاضے اسے ستا رہے تھے۔ بھوک لگ رہی تھی۔ ٹھنڈ کی وجہ سے پیشاب بھی زور کا آرہا تھا اور کھبا ہوا پاؤں بھی سونے لگا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے قمیض کا دامن دانتوں میں لیا اور شلوار اتار کے پیشاب کر لیا۔ مردہ ہوئے عضو میں اتنی جان نہ تھی کہ گندے چھینٹے جسم سے زیادہ دور پھینک سوتا۔ نتیجتاً اس کی شلوار کے اندر بھی کئی قطرے گر گئے۔ خیر اب ناپاکی کا خیال کسے تھا۔ اس نے شلوار کے ساتھ رگڑ کر ہی پونچھ ڈالے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ اس کا جھولا بالکل خالی تھا۔ اس میں سلور کا گلاس تھا جو پانی کے لیے تھا اور ساتھ ایک دھجی تھی جس میں صبح ایک روٹی اور اس پر اچار رکھ کر وہ لایا تھا۔ اس کی بھوک اتنی نہ تھی کہ پوری روٹی کھا سکے لیکن اس نے معمول کے مطابق آدھی روٹی کھا کر باقی آدھی کے باریک بھورے کر پرندوں کو ڈال دیتے تھے جو مگھر کے دنوں میں بھوکے ہونے لگتے تھے۔ اب اس کے جھولے میں کھانے کو کچھ نہ تھا، سوائے اچار کی اشتہا انگیز خوشبو کے، جو باوجود یکہ اس کی قریب المرگ قوتِ شامہ کے اس کے معدے میں اتر کر بھوک عفریت کو مشتعل کر رہی تھی۔ عشاء کی اذان کی آواز آئی۔ ملک ظہور اس سے دور چھوٹا تھا۔ شاید اس کے بیٹوں کے ساتھ کھیلا تھا۔ اس کی آواز پورے گاؤں میں مشہور تھی، اتنی توانا اور بلند آہنگ آواز تھی کہ جب سپیکر سے برآمد ہوتی تو ان سے احتجاج کی ہلکی سی صدا بھی بلند ہوتی سنائی دیتی۔ اس

نے منہ میں امڈتے ہوئے لعابِ دہن کو گالوں سے چوس کر منہ میں اکٹھا کیا اور لعاب کا میٹھا سا گھونٹ بھر کر اپنے گھر کے توے پر مہکتی روٹیوں کا تصور کیا۔ اب تک تو گھر میں چولہا سرد پڑ چکا ہو گا کہ اس کی بہوؤں کا معمول تھا کہ سورج غروب ہونے کے وقت روٹیوں سے بھرا چنگیر مردوں کے سامنے رکھ دیتی تھیں۔ ان سے بچنے والی روٹیاں اٹھا کر بہویں اور بیٹیاں کھاتیں اور عشاء کے وقت جب ملک ظہور کی آواز رات کے سناٹے میں گونجتی، اس وقت تک بہویں برتن مانجھ کر ٹوکرے میں رکھ چکی ہوتی۔ پورے گاؤں میں اگر عشاء کے بعد بھی کسی کے برتن کھڑک رہے ہوں تو اس گھر کو منحوس سمجھا جاتا تھا۔

سردی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بڑے دریا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا تو آ ہی رہی تھی، ساتھ چھوٹے دریا کی گیلی زمین سے ٹھنڈ بخارات بن کر نکل رہی تھی۔ اس ٹھنڈ کے سامنے مزید کپڑوں کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنا صافہ سر سے اتار کر اسے کانوں کے گرد کس کر لپیٹا، اپنے جھولے میں موجود دھجی کو گردن کی پشت پر رکھ دیا۔ جھولہ بھی کام آ سکتا تھا۔ اس نے جھولے کی نچلی سلائی ادھیڑ کر اس ایک غلاف کی شکل دے دی اور سویٹر کی طرح اوڑھ لیا۔ کپڑے کا بنا جھولہ گرمی تو نہ دے سکتا تھا لیکن کچھ نہ ہونے سے تو بہتر تھا۔

بھوک نے ستایا تو اس نے ایک دفعہ پھر ہلنے کی کوشش کی مگر اب اس کے دونوں پاؤں کھوبے کا حصہ بن چکے تھے۔ وہ ایک پاؤں اٹھانے پر قادر تھا۔ اس کا ڈنگورا تیسری ٹانگ کے طور پر کام کر سکتا تھا۔ ایک ہی جگہ پر اتنی دیر پاؤں رہنے سے ہی سونے لگے تھے اور ان میں سوئیاں تو پہلے ہی چبھنے لگی تھی اور اسے پاؤں، تختوں اور پنڈلی پر خارش کرنے کے لیے اچپی ہو رہی تھی لیکن اب ٹھنڈ کے افسانے سے یہ سوئیاں مدھم ہو کر بے حسی میں بدل رہی تھیں اور رانوں تک اس کا بدن بے حس ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنی رانوں کو زور زور سے ملا اور اوپری بدن کو ہوا میں جھلانے کی کوشش کی تاکہ نچلے بدن میں حرارت پیدا ہو لیکن سردی زیادہ تھی اور اس کے مقابلے میں حرکت بالکل نہ تھی سو کچھ خاص فرق نہ پڑا۔

چاند کی مریل سی روشنی ڈوبنے جا رہی تھی۔ دھند میں اضافہ ہو رہا تھا اور تاریکی کا اندھیرا اسے اپنی آمد سے پہلے ہی مایوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنی اکڑی ہوئی ٹانگوں کو ہاتھوں سے ملا اور ہاتھوں کی مٹھیاں بنا کر اپنے سانس کی گرمی دیتے ہوئے اس نے خود سے عہد کیا کہ وہ مایوس نہیں ہو گا۔ اس کی آنکھوں میں امید کے دیے بھرے رہتے ہیں اور آج بھی یہ مایوسی کے غلبے سے بجھیں گی نہیں۔ اس نے حساب لگایا کہ آخر اس کے پاس وقت کتنا ہے۔ آدھ پہر رات گزر گئی تھی۔ رات نسبتاً لمبی ہو گئی تھی، اس کا مطلب ہے کہ صبح سورج نکلنے تک اسے تقریباً چار پہر مزید ادھر گزرنے ہوں گے۔ فوج کی نوکری کے دوران اس نے مہینوں رات کی ڈیوٹی دی تھی۔ کبھی چوکیداری، کبھی پاسبانی، کبھی نگرانی۔ جاگنا اس کے لیے ہر موسم میں مسئلہ ہی نہ تھا اور تھکتا وہ ہرگز نہ تھا۔ اب جسم ڈھلا ہوا تھا اور یہاں حالات بھی الگ تھے۔ جوانی کی قوت ہوتی تو شاید وہ اپنا پاؤں بھی ایک جھٹکے سے نکال لیتا۔ اس بوڑھے جسم کے سہارے اس نے وہ رات گزارنی تھی جو شاید جوانی میں بھی مشکل سے گزارتا۔ اسے بہت جوانی میں شکار کا ایک منظر یاد آنے لگا تھا جب کاتک کے اسی مہینے میں وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ کتوں کے ساتھ خرگوش کا شکار کھیلنے بیلے آیا تھا۔ ان کے پاس تیز شکاری

لائٹیں تھیں جب کتے خرگوش کے پیچھے بھاگتے تو لطف لینے کے لیے وہ اس خرگوش کو اپنی لائٹ کے دائرے میں لے آتے اور اس کو کتوں سے زیر ہوتے دیکھتے۔ کتے جب خرگوش کے اوپر پہنچتے تو اسے ایک ہی ہلے میں پچھاڑ دیتے اور ادھ موئے خرگوش کے سرہانے کھڑے ہانپتے ہوئے مالک کا انتظار کرتے رہتے۔ ایسے ہی ایک خرگوش کے پیچھے کتے بھاگے اور وہ لائٹوں کی مدد سے دیکھتے رہے تھے کہ خرگوش چھوٹے دریا میں پہلی چھلانگ لگاتے ہی کیچڑ میں کھب گیا تھا اور کتے کھوبے کے کنارے کھڑے اسے دیکھتے رہے تھے۔ خرگوش نے پہلے تو پیر چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہونے پر بے بسی سے آنکھیں موند کر کتوں کے سامنے سر جھکا کر لیٹ گیا تھا۔ کیا وہ بھی اب اسی خرگوش کی طرح موت کے خونی درندے کے سامنے سر نیہوڑا کر پڑ رہے؟ نہیں، اسے امید نہیں ہارنی تھی۔ اس کی آنکھوں سے امید کے دیے کبھی بجھے نہیں تھے۔

اس نے بہت سوچا کہ اتنا وقت کیسے گزارے گا؛ حساب رکھنا ضروری تھا کہ کتنا وقت گزر گیا اور کتنا رہ گیا ہے۔ ورنہ تاریک ٹھنڈی رات میں گزرے گا کم اور محسوس زیادہ ہوگا اور اس کی گزران کا احساس تھکا کے رکھ دے گا، گنتی گن کر، اپنی نبض پر ہاتھ رکھ کر دھڑکنیں شمار کرنے سے یا ڈنگورے کو زمین پر وقفے وقفے سے مار کر گننے سے۔ اس کا خیال تھا کہ چھوٹے حساب سے وقت کے ختم ہونے کا احساس ہوگا ہی نہیں۔ وقت کے حساب کے لیے کوئی ایسا پیمانہ ہو جو کافی دیر بعد ہوتا ہو، ایک نکتے سے دوسرے نکتے تک پہنچنے میں آسانی ہوگی۔ ٹھنڈ سے اسے دوسری دفعہ پیشاب آرہا تھا۔ اس نے سوچا پیشاب کرنے کے وقفے گننے سے وقت صحیح گزرے گا۔ کافی وقفے کے بعد آتا ہے۔ لیکن یہ خیال اسے بڑا مضحکہ خیز لگا۔ پیشاب کو وقت ناپنے کے آلے کے طور پر استعمال کرنے کا خیال ہی کس قدر شرمناک تھا۔ دوسرے کچھ دیر میں جسم سے پانی کا ذخیرہ ختم ہونے کے بعد اسے پیشاب آئے گا ہی نہیں۔ گھڑی تو رک جائے گی۔

بیلے سے گیدڑ کے کوکنے کی آواز بلند ہوئی۔ پہلے ایک بولا۔ پھر دوسرا بولا اور پھر قطار بندھ گئی۔ اسے کچھ خاصی پریشانی نہ تھی۔ گیدڑ اس کے قریب آنے والے نہ تھے۔ بزدل جانور۔ انسان کی خوشبو سے بھی بھاگتے تھے۔ ہمیشہ رات کے وقت بیلے سے نکلتے اور چھوٹا دریا عبور کر کے کھیتوں میں گاؤں کے قریب جا رات بھر ہلڑ مچاتے اور صبح ہوتے ہی واپس بیلے میں روپوش ہو جاتے۔ رات کو اتنے گیدڑ بولتے تھے کہ لگتا بیلہ بھرا پڑا ہے لیکن دن بھر کبھی کسی گیدڑ کی پرچھائیں تک نظر نہ آتی تھی حالانکہ تمام بیلے میں آجڑی گھومتے تھے۔ شاید چھپ چھپ کر اپنے بلوں سے دیکھتے ہوں مگر سامنے نہ آتے ہوں۔ خیر اسے گیدڑوں سے خطرہ نہ تھا۔ اسے باہر کی کسی چیز سے خطرہ نہ تھا بلکہ اپنے ہی اندر اترتی کمزوری سے خطرہ تھا۔ اس مایوسی سے خوف تھا جو اس کے ہزار روکنے کے باوجود اس کے اندر گھس کر امید کے دیے کو پھونکیں مار رہی تھی۔ وہ لاکھ خود کو سمجھاتا تھا کہ یہ صبح کا سورج طلوع ہونے والا ہے لیکن مایوسی اسے بتاتی تھی کہ ابھی تو رات کے آٹھ بجے ہیں۔ صبح کے آٹھ بجے سورج چمکے گا۔ بارہ گھنٹے کا سرد حملہ تو جسم کے اندر دوڑتے خون کے ہر ہر قطرے کو ٹھنڈا کر دے گا۔ اس نے امید کی آنکھوں سے گاؤں کی طرف دیکھا۔ جو روشنیاں پہلے جلتی نظر

آرہی تھیں، وہ بھی اب نہ تھیں۔ بلب بجھا دیے گئے تھے۔ عشاء کے نمازیوں کی واپسی کے بعد کم ہی بلب جلتے تھے۔ اوپر سے چاند بھی دور ٹیلہ جوگیاں کی چوٹی پر پہنچ کر رات کی آغوش میں سونے والا تھا۔ رہ جائے گا وہ اکیلا اور یہ اندھی ظالم رات۔

ٹھنڈے ہوتے جسم کو اس نے گزرے زمانے میں کھائے یادگار کھانوں کی یاد سے گرمانے کی کوشش کی۔ کیسے کیسے کھانے اس نے کھائے تھے۔ فوج کے دنوں میں ایک پہاڑی گاؤں میں کیمپنگ کے دوران تحفے میں ملنے والے بکرے کی سالم ران جو لانگری نے بہت ہی خستہ اور ہلکے مصالحوں میں بھونی تھی۔ اس کے منہ میں بہت پرانے سواد نے انگڑائی لی۔ شاید بھوک جاگ رہی تھی۔ مگر کھانے سے گرمی ملنے کی بجائے بھوک ہی زیادہ ستائے گی۔ فوراً اس کا دھیان اپنی عورت کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کی طرف چلا گیا۔ بہت پیچھے پچاس سال قبل جب اٹھارہ سال کی عمر میں اس کی شادی پندرہ سالہ فضیلت سے ہوئی تو وہ یہی کاتک کا مہینہ ہی تھا۔ پہلا ہفتہ تو وہ جب بھی اس سے ملتا، وہ تکلیف سے بل کھاتی رہتی۔ ملاپ کے اگلے دن اس کے چہرے پر تکلیف کا ہلکے سے آثار نظر آتے رہتے۔ فضیلت کے اس درد کے احساس تلے اس نے شادی کے ابتدائی دنوں میں ہلکا ہاتھ رکھا تھا لیکن جب گھر شروع ہوا تو فضیلت اس کے بدن کی عادی ہو گئی تھی اور اس کی قربت میں بھیگنے لگی تھی۔ وہ بھی اس کے بدن سے چپک کر اس حدت کو اپنے اندر اتارتا اور یخ ٹھنڈی راتیں اس کے بستر سے باہر شرمندہ کھڑی رہ جاتیں۔ جوانی کے سرد موسم جب فضیلت اس کے ساتھ لپٹی ہوتی تو وہ سردی پر تمسخر سے ہنستا تھا۔ فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد اس نے فضیلت کے ساتھ بھرپور زندگی گزاری تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ شادی پرانی ہو جائے تو بدمزگی ہوتی ہے۔ جب کہ اس نے تو اپنی پرانی بیوی کے ساتھ زیادہ پر لطف زندگی گزاری تھی۔ یوں لگتا کہ وہ اس کی زندگی کا کوئی اٹوٹ حصہ ہے۔ جب وہ رات کی تاریکی میں اپنی منجی سے اتر کر اس کے رانگلے پلنگ پر چپکے سے آلیٹتی تو اس کے گداز بدن کے لمس سے اس کی کھردری نیند ریشمی ہو جاتی۔ بیوی اتنی خوبصورت نہ تھی لیکن اس کے نرم وجود سے تمام عمر اس کی کلفتوں نے راحت پائی۔ جب وہ پانچ سال پہلے مر گئی تب سے اس کا اپنا جسم بھی کھرنے لگا تھا۔ بہوؤں کا کھلانا جتانے کے احساس سے آلودہ ہو جاتا ہے۔ فضیلت جب کھلاتی تھی تو کھانے سے پھٹیک کا کچا پن نہیں جھلکتا تھا بلکہ اپنائیت کی لگن خوشبو دیتی تھی۔ فضیلت کی یاد اب بھی اس کے راکھ بدن میں کسی مرتی ہوئی چنگاری کو بھڑکا دیتی تھی۔ یادوں کی اس کرید سے اس کے ٹھٹھرے بدن کو ذرا سہارا ملا لیکن یہ بدن اب وہ نہ تھا جو فضیلت کے خیال سے لو لو تک سلگنے لگتا بلکہ مرمری ہڈیوں والا جسم تھا جس کی ہڈیاں کب سے ٹھنڈے گوشت کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں۔ فضیلت اگر آکر چپک بھی جاتی تو اس کا جسم باہر کی ٹھنڈ کا ٹھٹھانہ اڑا سکتا۔

سردی اب ہڈیوں کے گودے تک اتر گئی تھی اور جسم کپکپانے لگا تھا۔ اس نے اپنے کپڑوں کو کھینچ کر بدن پر مزید کس لیا۔ اس کا نچلا بدن سن ہو کر جیسے سو کھ چلا تھا۔ سوائے پیشاب کی حاجت کے جو بار بار تنگ کر رہی تھی، اس کے نچلے بدن میں کوئی احساس نہ تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے مسل کر دیکھا، مکے مارے، چٹکیاں کاٹیں مگر کچھ بھی محسوس نہ ہوا۔ ٹھنڈ چاروں طرف سے اس کے بدن پر حملہ آور تھی اور اس کا بوڑھا ہانڈھال بدن مدافعت چھوڑ کر برداشت کے مرحلے تک آگیا تھا۔ اسے بس ساڑھے تین

پہر مزید برداشت کرنا تھا۔ امید کے دیے بجھنے نہیں دینے تھے۔ لیکن اس کے اندر بیٹھی مایوسی کا وسوسہ اسے کہے دیتا تھا کہ تمام رات برداشت ہونے والی نہیں ہے۔

اس نے گاؤں کی طرف دیکھا۔ مکمل خاموشی اور تاریکی تھی۔ رات کی سنسانی بولنے لگی تھی۔ اب چوپال اجڑ گئی ہو گی اور شاید اس کے بیٹوں کو باپ کی فکر ہونے لگی ہو۔ پورا گاؤں تلاشنے کے بعد شاید وہ بیلے کی طرف بھی آجائیں۔ اگر وہ ادھر آجائیں پھر تو وہ بچ جائے گا لیکن اگر وہ نہ آئے تو۔۔۔ آنکھوں میں امید کے دیے بھرے ہوئے تھے لیکن مایوسی کے وسوسے انہیں دھندلاتے تھے۔ اس کی تمام برداشت کا انحصار اب بیٹوں پر تھا۔ اگر اس کے بیٹے وقت پر آجاتے ہیں تو ٹھیک ورنہ وہ صبح تک برداشت نہیں کر پائے گا۔ مایوسی اسے اندر سے کھوکھلا کرنے لگی تھی اور اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ صبح تک اس سردی کا مقابلہ نہیں کر پائے گا۔ گیدڑ کی آواز کہیں قریب سے گونجی اور وہ ایک دفعہ تو ہل گیا۔ گیدڑ اس کے تھوڑی دور ہی تھے۔ سبھی مل کر کوکنے لگے۔ اس نے کیچڑ سے اپنا ڈنگورا نکالنا چاہا تو وہ بھی اب گاڑھے کھوبے میں پھنس چکا تھا۔ اس کے وزن نے ڈنگورے کو اتنا گہرا دھنسا دیا تھا کہ اب اس کی طاقت اسے نکالنے سے عاجز تھی۔ گیدڑ کمزور جانور ہی سہی لیکن ہے تو گوشت خور۔ انسان کو بے بس دیکھ کر اس پر حملہ کر سکتا تھا۔ اسے ڈرانے کے لیے کوئی ہتھیار تو ہونا چاہیے۔ ادھر حالت یہ تھی کہ دونوں پاؤں آگے پیچھے کیچڑ میں دھنسے تھے اور وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہل سکتا تھا۔ ڈنگورے پر بھروسہ تھا جو گیدڑوں کو بھگانے کے کام آسکتا تھا اور وہ بھی اب بے جان ہو گیا تھا۔ گیدڑ کوکتے ہوئے اس کے قریب آتے جا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے محسوس ہوا کہ اس کے ارد گرد درجنوں گیدڑ ہیں۔ وہ چپ اور بے بس کھڑا رہا۔ کیچڑ پر سخت مٹی کی تہہ بنی ہوئی تھی اور گیدڑ اس پر آسانی سے گھوم رہے تھے۔ ایک دو گیدڑوں نے قریب آکر اسے اور ڈنگورے کو بھی چھوا۔ ایک نے ڈنگورا منہ میں لے کر چبانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ایک گیدڑ نے ٹانگ اٹھا کر اس کی ٹانگ پر پیشاب کر دیا۔ کم بخت اسے آدمی کی بجائے بجو کا سمجھ رہے تھے جو کھیتوں میں بے جان کھڑا ہوتا ہے اور ان کی شرارتوں کو دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ انہوں نے اپنی راتوں کی آوارہ گردی میں بہت بجو کے دیکھے ہوں گے اور اسے بھی ویسی ہی ڈرانے والی چیز سمجھ کر اس کے ساتھ تحقیر کا سلوک کر رہے تھے۔ 'ماں یہنا۔ ڈنگورا چل سکتا تو اس کا سر پھاڑ دیتا' پھر اسے خیال آیا کہ اچھا ہی ہوا، ڈنڈا نہیں اٹھایا، ورنہ وہ اسے زندہ جان لیتے اور اکیلا اور بے بس دیکھ کر چیر پھاڑ دیتے۔ وہ دل ہی دل میں گالیاں دیتے انہیں دیکھنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ ان کی دور ہوتی آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہ گاؤں کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ آدھی رات تک ہلڑ مچانے کے بعد فجر سے پہلے یہ پھر ادھر سے ہوتے ہوئے لوٹیں گے۔

اس کے اندازے کے مطابق نو اور دس کے درمیان کا وقت ہو گا۔ اسی طرف ساکت رہ کر اسے ابھی دس گھنٹے مزید گزارنے تھے جو اس کے حوصلہ ہارتے بدن کو ممکن نہ لگ رہا تھا۔ اس کی حالت اپنی چھاؤنی کے باہر لگے فوجی کے اس مجسمے کی طرح تھی جو بندوق اٹھائے آگے کو جھکا ہوا شست باندھ رہا تھا۔ فرق یہ تھا کہ یہاں بندوق کی جگہ ڈنگورا تھا جو اس کی تیسری ٹانگ نظر آرہا تھا۔ ٹانگیں ایک ہی جگہ رہ رہ کر جسم کا وزن سہارنے سے عاری ہو چکی تھیں اور کسی بھی وقت وہ گر سکتا تھا۔ گرنے سے بچنے کے لیے

اس نے ڈنگورے کو تھاما ہوا تھا۔ ڈنگورا نہ ہوتا تو اب تک وہ کسی بے ہودہ انداز میں گر چکا ہوتا۔ جس طرح وہ کھڑا تھا، وہاں بیٹھنے، لیٹنے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ صرف گرنا ممکن تھا اور گرنے سے پہلے ان میں سے ایک ہڈی ٹوٹنی ضروری تھی جنہوں نے ایک ستون کی طرح اسے سنبھال رکھا تھا۔ اس نے مضبوطی سے ڈنگورے کو تھاما اور امید کے دیے زندہ رکھتے ہوئے گاؤں کی طرف نظر جما دی۔ اسے یقین تھا کہ اس کے بیٹے ضرور آئیں گے۔

کھڑے کھڑے زمانے گزر گئے۔ سن ہوتے دماغ میں پرانی یادوں کا سلسلہ چل پڑا۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی ہر بات اسے یاد آنے لگی۔ ماں باپ، بہن بھائی جو سبھی دنیا سے گزر چکے تھے، ان کی صورت، ان کا لمس اور ان کی خوشبو تک اسے یاد آنے لگی۔ نوجوانی کے پہلے کھیل، فوج کی نوکری سبھی منظر دماغ میں گھومنے لگے۔ وہ بھی ان سب کو یاد کر کے دل بہلاتا رہا۔ اس بہانے وقت کے گزرنے کا احساس تو نہ رہا تھا۔ وقت جو دھیرے دھیرے اس کے اندر اتر کر اس کی زندگی کے لیے جگہ کم کرتا جا رہا تھا۔ گزرتے ہر لمحے کے ساتھ اسے بھوک اور پیاس زیادہ ستا رہی تھی اور سردی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

بجو کا کی طرح کھڑے کھڑے اس کا پورا بدن لکڑی کی طرح اکڑ گیا تھا لیکن امید ابھی بھی اسے حواس میں رکھے ہوئے تھی۔ سردی سے جسم سن ہو چکا تھا اور کہیں سے کاٹا جاتا تو شاید اسے ذرا درد نہ ہوتا۔ جبڑے بھنچ گئے تھے اور دانت اتنی شدت سے جم گئے تھے جیسے پلاس ہو۔ جمے ہوئے بدن میں زندگی صرف آنکھوں اور کانوں میں تھی۔ کان جو کسی آواز کی طرف لگے ہوئے تھے اور آنکھیں جو سامنے گاؤں کی طرف روشن تھیں۔

رات کے سناٹے میں غلام محمد کی آواز سپیکر پر گونج اٹھی۔ درود شریف پڑھ رہا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ آدھی رات کو اٹھ کر مسجد جا پہنچتا اور درود پڑھنا شروع کر دیتا۔ کوئی اسے منع نہیں کرتا تھا کہ کون سا غلط کام کرتا ہے لیکن شرف دین کی طرح کتنے ہی لوگ اس کی آواز سے تنگ پڑ کر بڑبڑاتے تھے کہ درود پڑھنا ہے تو درود پڑھ، دوسروں کو سنا کر دکھاوا کیوں کرتا ہے۔ پتا نہیں کون کس حالت میں ہو اور یہ پاک نبی ﷺ پر درود پڑھ کر اسے گنہگار کر رہا ہو۔ شرف دین تو خیر اس سے پانچ سال ہی چھوٹا تھا اور اس کے تمام کرتوت سے واقف تھا۔ جوانی میں اس نے ٹکا کے لونڈے بازی کی تھی۔ کوئی لونڈا اس کے ہتھے چڑھ گیا تو پھر دوبارہ آنے سے توبہ کرتا تھا۔ جب عمر ڈھلنے لگی تب شادی کی مگر بیوی چھ مہینے میں بھاگ گئی کہ اس کے پاس مردانگی ہی نہیں۔ دوسری شادی کی اور وہ ابھی تک ساتھ تھی۔ محلے کی سبھی عورتیں جانتی تھیں کہ وہ غلام محمد کو دونوں طرف سے دیتی ہے اس لیے رہ رہی ہے۔ خیر اس قبیح عادت کی وجہ سے غلام محمد کے گھٹنے بہت جلد ختم ہو گئے تھے اور وہ کئی برسوں سے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر چلتا تھا۔ گناہ اسے دھکیل دھکیل کر مسجد میں لے جاتے تھے۔ غلام محمد کے بولنے سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آدھی رات گزر گئی ہے۔ اب تک اس کے ماں جنے بیٹوں کو ادھر آ جانا چاہیے تھا۔

بیٹے تو نہ آئے تھے لیکن اس کے مرے ہوئے سبھی رشتہ دار آنے لگے تھے۔ پہلے ماں اس کے پاس آئی، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ماتھے کو چوما۔ باپ آیا اور اس کے سر پر صافہ باندھ، شانے پر تھاپڑا مار کر ماں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ دونوں بہنیں، بڑا بھائی

سبھی آئے اور اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ان کا نظر آنا اس کے لیے خوشی کا باعث نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اسے اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں لیکن اس کی آنکھوں میں تو امید کے دیے روشن تھے، اس نے ماں کے کندھوں کے اوپر سے گاؤں کی طرف دیکھا۔ اس کے بیٹے اب تک چل پڑے ہوں گے، پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ 'ماں یہنو۔ میں نہیں جانا۔ بھاگ جاؤ۔' وہ کھڑے مسکراتے رہے۔

گیدڑوں کی آواز جو کافی دیر سے نہیں آئی تھی، دوبارہ آنے لگی۔ وہ واپس بیلے کی طرف آ رہے تھے۔ تو کیا صبح ہو گئی؟ اس نے پیچھے پلٹ کر افق کی طرف دیکھا، رات کا ماتھا اسی طرح تاریک تھا۔ ابھی تو آدھی رات ہی تھی تو پھر گیدڑ واپس کیوں آ رہے ہیں۔ وہ ڈنگورے کو دونوں ہاتھوں سے جکڑے جکڑے آنکھیں سکیڑ کر گاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان ماں یہنوں کی آمد خطرناک تھی۔ وہ کوکتے ہوئے واپس آ رہے تھے اور کچھ ہی دیر میں چھوٹے دریا کے بالکل قریب آ گئے۔ ان کی کوک سے لگتا تھا کہ وہ معمول سے ہٹ کر کسی گھبراہٹ میں ہیں۔ تب شرف دین کو گاؤں کی طرف سے دو روشن جگنو دکھائی دیے۔ یہ یقیناً کافی دور جلتی ٹارچیں تھیں۔ اس نے ان روشنیوں پر نگاہ جمالی۔ دھند میں یہ روشنیاں ماٹھی سی نظر آتی تھیں لیکن آہستہ آہستہ بڑھتی دکھائی دے رہی تھیں۔ گیدڑ اس کے آگے کھڑے کوکتے رہے اور وہ اپنی امیدوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کے کانوں میں ہلکی سی آواز آئی۔ 'اباجی!' اس کا دل اچھل پڑا۔ بیٹے کی آواز اس نے پہچان لی تھی۔ آخر اس کی امیدیں پوری ہوئیں۔ اس کی ہمت پھر جوان ہو گئی۔ آواز بتا رہی تھی کہ وہ لمبیوں کے لنڈے کیکر تک آ گئے تھے۔ اس نے فوراً ہی اس پکار کا جواب دیا۔ 'میں یہاں ہوں۔' لیکن اسے بڑی حیرت ہوئی جب اس کے کانوں نے اس کی اپنی پکار کی آواز نہ سنی۔ کیا اس کے کان بند ہو گئے ہیں؟ اگر گیدڑوں کی آواز سن رہا ہے تو سماعت تو ٹھیک ہے۔ کیا اس کی گویائی ختم ہو چکی ہے؟ اس نے ایک دفعہ پھر پکارا 'میں یہاں ہوں۔' اس کے حلق سے بہت کمزور، بہت ہلکی سی آواز نکلی۔ یہ آواز تو شاید گیدڑوں تک بھی نہ پہنچی ہو، بیٹوں تک کیسے پہنچتی۔ وہ دہل کر رہ گیا۔ روشنی کے دائرے قریب آ رہے تھے۔ وہ کیکر سے آگے نکل آئے ہوں گے اور اب کھیتر آ گئے ہوں گے جہاں سخت پتھریلی تراڑیں انہیں چلتے میں چبھتی ہوں گی۔ گیدڑ اس کے قریب سے گزر کر چھوٹے دریا کے پچھلے کنارے جا پہنچے اور وہاں کوکنے لگے۔ ان کی کوک کے درمیان اسے اپنے دوسرے بیٹے کی اونچی آواز سنائی دی۔ 'اباجی!' جواباً اس نے بھی پورے جوش سے پکارا: 'میں دریا میں ہوں۔' لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی گیدڑوں نے اس قدر کوکنا شروع کر دیا تھا کہ اس کی خشک آواز دم توڑ کر رہ گئی۔ رات کے سناٹے میں بیٹوں کی آواز اتنی دور سے آ رہی تھی لیکن ادھر گیدڑوں کی لشکری کوک اس قدر زیادہ تھی کہ بابے کو اپنی آواز باجرے کے دانے جیسی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں گیدڑوں کو گالی دی اور ان کے خاموش ہونے کا انتظار کرنے لگا لیکن شاید انہوں نے بھی ٹھان رکھی تھی کہ اب چپ کرنا ہی نہیں۔ ٹارچوں کی روشنی ادھر ادھر گھوم رہی تھی لیکن ابھی تک وہ ان کے دائرے سے باہر تھا۔ کاش وہ تھوڑا اور آگے آئیں۔ گیدڑوں کی کوک جاری تھی، پھر بھی وہ آوازے لگاتا رہا۔ منہ سے آواز کم اور خوف کا جھاگ زیادہ نکل رہا تھا: 'میں یہاں ہوں۔ دریا کے کھوبے میں کھبا ہوا۔ گیدڑ ماں یہنے چپ کریں تو تمہیں میری آواز آئے۔ تم لوگ تھوڑا آگے آؤ۔ قریب

آؤ گے تو میری آواز آئے گی۔ قریب آؤ۔ ماں یہنو۔ واپس کیوں ہو گئے۔ تھوڑا اور آگے آجاؤ نا۔ میں سامنے ہی تو کھڑا ہوں۔ ماں یہنو۔ تم تو چپ کر وماں یہنے گیدڑو۔ 'ٹارچ کی روشنیاں ایک دفعہ چاروں طرف گھومی تھیں اور پھر غائب ہو گئی تھیں۔ وہ واپس چل پڑے تھے۔ گیدڑ اسی رفتار اور تیزی سے کوکتے رہے تھے۔ اس نے بیٹوں کو پلٹتے دیکھا تو ایک دفعہ پھر زور لگا کر مٹی سے نکلنا چاہا لیکن اب تک تو مٹی پکا مصالحہ بن چکی تھی۔ وہ جھول کھا کر ڈنگورے کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ روشنیاں غائب ہونے پر وہ ہانپتے ہوئے تاریکی کی مایوسی کو دیکھتا رہا۔ اب اس کا کوئی آسرا نہ رہا تھا۔ سہارا ملنے کی امید بھی کھوبے میں کھُب کر اس کی چوتھی ٹانگ بن گئی تھی۔ تو کیا اب سردی کے ہاتھوں اس کا جسم اکڑ کر یہیں ٹوٹ جائے گا؟ اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے پیدا کرنے والا شاید بہت اوپر کہیں اس پر ہنس رہا تھا۔ جب لکھ دی گئی ہے تو اب بلبلا کر کیا کرو گے؟ امید نہ ہارنا اس کی فطرت تھی۔ اس نے جواباً اسی استہزا سے کہا: ''ہونہہ۔ میں ماں یہنا بھی آج مرنے والا نہیں ہوں۔'' امید کا دیا ابھی بھی روشن تھا۔

گیدڑ جو چھوٹے دریا کے پچھلے کنارے کوک رہے تھے، پھر اس کے آس پاس آگئے۔ وہ اس کے ارد گرد شوخی سے کوک رہے تھے گویا اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ پھر ایک گیدڑ نے اس کی ٹانگ کو بھنبھوڑا۔ اسے ٹانگ پر نہ کوئی درد نہ کوئی احساس ہوا۔ گیدڑ پیچھے ہٹ گیا اور اس کے چاروں طرف چکر لگا کر اس کی دوسری ٹانگ پر موتنے لگا۔ 'ماں یہنے۔ میرا پنڈا لیٹرین سمجھ رکھی ہے۔ 'وہ ماں یہنا پیچھے ہٹا اور پورا گروہ دوبارہ گاؤں کی طرف چل دیا۔ وہ ایک بار پھر اکیلا رہ گیا تھا۔ اس نے باقی آدھی رات ابھی کاٹنی تھی۔ ٹوٹے ہوئے بدن کے ساتھ۔ روشن امید کے سہارے۔

صبح جب پہلے آدمی نے اسے دور سے دیکھا تو دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا۔ پچھلی رات کی تلاش کے بعد گاؤں میں یہ بات سب تک پہنچ چکی تھی کہ بابا شرف دین گھر نہیں پہنچا۔ پاس آکر اس نے دیکھا کہ بابا شرف دین مضحکہ خیز طریقے سے پیچھے کی طرف گرا ہوا ہے اور اس کے دونوں پاؤں چھوٹے دریا کے خشک ہو چلے کھوبے میں کھبے ہوئے ہیں۔ اس کی آنکھیں ایک عجیب سی شوخ امید کے ساتھ کھلی تھیں۔ شاید اندر کوئی دیا ابھی بھی روشن تھا۔ لاش کے سامنے اس کا سات فٹ لمبا ڈنگورا کھوبے میں کھڑا تھا۔ شاید متوفی مرتے وقت بھی موت کو ٹھینگا دکھا رہا تھا۔

گاب اور فُضلہ

سلیم ہارون

عبادت کے بعد پادری صاحب نے برادری کی معتبر شخصیت ایلڈر ریاض مسیح کو سٹیج پر آکر اس سال کی فصل میں سے خدا کے حضور نذرانہ دینے کا آغاز کرنے کی باقاعدہ دعوت دی۔ اس کے ساتھ ہی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل چرچ کوائر نے طبلہ اور ہارمونیم بجا کر شکر گزاری کے گیت اور معنی داؤد کے مزامیر گانے شروع کر دیئے۔ آخر میں پادری صاحب نے دعائے ربانی اور کلماتِ برکات کے ساتھ عبادت کا اختتام کیا۔

اُس شام بستی عیسائیاں میں گہما گہمی تھی۔ چرچ سے ملحقہ جنج گھر کے احاطہ میں دیگیں پک رہی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں آجا رہے تھے۔ اس کے علاوہ چرچ کے صحن اور جنج گھر میں دریاں بچھا دی گئی تھیں تاکہ لوگوں کو بیٹھنے بٹھانے میں کوئی دقت نا ہو۔ آس پاس کے دیہاتوں میں سے بھی کچھ لوگ عبادت میں شامل ہونے آئے تھے۔

پادری صاحب بستی کے ہر گھر میں جا کر اپنے حصے کا چندہ اور آٹا دانہ وصول کر رہے تھے۔ دو تین لڑکے ان کی معاونت کے لئے ساتھ ساتھ تھے۔ عورتوں نے خوب گہرے رنگوں کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ لڑکوں نے سکن ٹائٹ جینز، شرٹ اور اکثر نے اپنے لمبے بالوں میں پونیاں، کلائیوں میں سرخ رنگ کے ربن اور کڑے چڑھا رکھے تھے۔ پان اور گٹکا چبانے کی وجہ سے شاید ہی کسی کے دانت سفید اور سلامت ہوں۔ چھوٹی لڑکیوں اور لڑکوں نے گلے میں لکڑی اور دھات کی بنی صلیبیں پہن رکھی تھیں۔ جوان لڑکیوں پر مذہب کے گہرے اثرات معلوم پڑتے تھے جو ابھی تک چرچ کے ہال میں داؤد کے زبور گا رہی تھیں۔ ایک خوش شکل لڑکی بول پکڑنے میں پیش پیش تھی۔ اس کی آواز بھی سب سے نمایاں تھی۔ لڑکیوں کے گانے کی گونج تقریباً پوری بستی میں سنائی دے رہی تھی۔ باہر مردوں کے ساتھ حُقّہ پیتے ریاض مسیح نے سینہ چوڑا کر کے کہا۔ :"دیکھا، میری جوزفین کیسا گاتی ہے۔۔۔"

جنج گھر اور کئی گھروں کی باہری دیواروں کے ساتھ بانس کی پھانک کر کے بنائی گئی کھچیاں، ونجھیاں، سریے، پھاوٗڑے اور بڑی مٹھیوں والے جھاڑو بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ اس سامان کو کسی چور ڈاکو سے کوئی خطرہ نہیں تھا البتہ بستی کا اِکا دُکا پڑھا لکھا لڑکا یا لڑکی ادھر سے گزرتا تو نفرت سے ناک سکیڑ کر منہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ رات کے تقریباً نو بجے لڑکوں نے گھروں کے سامنے کھلی جگہ پر ڈیک لگایا اور باری باری ڈانس کرنے لگے۔ کوئی پھٹی پرانی جینز، اسٹائلش شرٹ، لنڈے کے جوگرز، انگریزی طرز کی ٹوپیاں اور چوڑے بیلٹ پہن کر مائیکل جیکسن بنا ہوا تھا تو کوئی سائڈ پف بنا کر اجے دیوگن۔۔۔۔

"Clap۔۔۔Clap۔۔۔Clap"

تالیوں اور خوشی سے چیختے لڑکوں کے شور میں ایک ڈانسر تھک جاتا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا۔

"Clap۔۔۔Clap۔۔۔Clap" ایک لمبے بالوں والا لڑکا جو ڈیک کا مالک تھا اونچی آواز میں Clap،Clap بول رہا تھا اور ڈانس کرنے والوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

عورتیں، جوان لڑکیاں، بچے اور بوڑھے شغل دیکھنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ تیس سے چالیس سال کی عمر کے مرد ایک طرف بیٹھ کر شراب پینے لگے۔ یہ دیسی شراب تھی جو گڑ اور کیکر کی چھال سے بھانڈا پکا کر کشید کی گئی تھی۔ اس کی تیز بو کے بھبوکے بڑی تیزی سے پھیلنے لگے۔ ادھر ناچنے والوں میں دو تین لڑکیاں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ اپنی بستی، اپنے لوگ۔۔۔ کسی کو۔۔۔ کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔۔۔ بے ہنگم شور اور ہنسی۔۔۔ چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں انہیں یوں ناچتے دیکھ کر بہت متاثر ہو رہے تھے۔ ان کی دلچسپی ان کی آنکھوں سے عیاں تھی جہاں مائیکل جیکسن، اجے دیوگن اور مادھوری دکشٹ بننے کے سپنے تیر رہے تھے۔

"Clap۔۔۔Clap۔۔۔Clap"۔۔۔اُو، اُو، اُو!

اُن کی یہ خوشی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی کیوں کہ جاٹوں کے دو شرابی لڑکے اس طرف آ نکلے تھے۔ سفید مے کے مایا لگے سوٹ پہنے، گورے رنگ اور مونچھوں کو تاؤ دیتے دونوں جوان نشے میں دھت ہانگرے مار رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔ عورتیں اور بچے بھاگ کر گھروں میں دبک گئے۔۔۔ لڑکوں نے آتے ہی آرڈر کیا کہ انہیں بھی ڈانس کر کے دکھایا جائے اور وہ لال چنی والی لڑکی بھی ڈانس کرے۔۔۔ انکار پر ایک جاٹ نے ڈیک پر اینٹ دے ماری۔۔۔ جو لڑکا ڈیک کا مالک تھا اس نے آگے بڑھ کر ان کو روکنے کی کوشش کی لیکن ریاض مسیح بیچ میں حائل ہو گیا اور سب کو اپنے اپنے گھر جانے کو کہا۔ جب سب چلے گئے تو جاٹ بھی وہاں سے ہانگرے مارتے ہوئے چلتے بنے۔ رات کافی ہو چکی تھی اور اب وہاں خاموشی کا راج تھا۔ شیروں نے شور مچانے والے گیدڑوں کو مار بھگایا تھا۔۔۔ صبح ہوئی تو بستی کی کسی بھی دیوار کے ساتھ نجھی، کھجی، پھوڑا، سریا یا جھاڑو نہیں تھے۔ بلدیہ، پرائیویٹ فیکٹریوں، پبلک واشروم کے ملازمین اور خاکروب کا کام کرنے والے ایک ہفتے کی چھٹی کے بعد اپنے اپنے کام پر واپس چلے گئے تھے۔ ان چھٹیوں میں سب نے گندم کی کٹائی کر کے دانے کمائے تھے اور اتفاق کی بات یہ تھی کہ کچی بستی کی اکثریت کو چھٹی مل گئی تھی۔ ریاض مسیح اپنی سائیکل پر سوار ہو کر ڈیوٹی پر پہنچا۔ اس کی یہ مسافت کچی بستی سے صرف پانچ کلو میٹر تھی۔ وہ بلدیہ میں ملازم تھا۔ گٹر کھولنے میں ماہر ہونے کی وجہ سے سیوریج گینگ کے جونیئر ملازمین اسے استاد جی کہتے۔ دفتر میں حاضری کے بعد اسے تین چار اہم کام سونپے گئے۔ سب سے پہلے اسے ایک خاص مقام کی طرف روانہ کیا گیا جہاں معاملہ بہت گھمبیر تھا اور اس کے ساتھی بے صبری سے وہاں انتظار کر رہے تھے۔ یہ ایک مصروف ترین چوک تھا جو سرد صبح کے وقت ہی ویران نظر آتا۔ مغرب سے آتے ہوئے چوک کی دائیں اور بائیں اطراف میں دکانیں تھیں۔ سیدھا راستہ شہر سے باہر کی طرف نکلتا، دکانوں کے آخر پر دائیں طرف ایک راستہ اندرون شہر مڑ جاتا اور بائیں طرف مڑنے والا راستہ عیسیٰ نگری یا بوملز کی طرف نکل جاتا۔ گٹر لائن بھی اسی طرف جاتی تھی اور جا کر عیسیٰ نگری کے گندے نالے میں گرتی تھی۔ سارا چوک گٹر کے گندے اور بدبودار پانی میں ڈوبا ہوا تھا اور فضلہ پانی پر تیر رہا تھا۔ ریاض کو دور سے ہی اندازہ ہو گیا کہ مسئلہ شدید نوعیت کا ہے۔ اس کے دو ساتھی پہلے ہی وہاں موجود تھے جو اسے دیکھتے ہی

کھڑے ہو گئے اور بڑے تپاک سے اسکا استقبال کیا۔ اس نے سائیکل اپنے کم عمر ساتھی کے حوالے کی اور جلدی سے مین گٹر لائن کے درمیانی گٹر کے ڈھکّن کے پاس پہنچ گیا۔ وو پنڈلیوں تک پانی میں تھا۔ اس نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا:

''اوئے جانسن! یہاں سے ڈھکّن اٹھانا پڑے گا۔''

''استاد جی، ہم نے کونے والے گٹر میں بہت و نجھی چلائی ہے۔۔۔ مگر کام نہیں بنا!''

''اوئے تم ابھی بچے ہو! لاؤ و نجھی اور سریا!''

یہ کہہ کر ریاض نے قمیص اتار کر سائیکل کی کاٹھی پر رکھی اور پانی میں ڈوبے ڈھکّن کو خم دار سریے سے پوری طاقت لگا کر اوپر کی طرف کھینچا۔ جونہی ڈھکن اوپر اٹھا، جانسن اور لاسن جھپٹ کر اسے پکڑ لیا اور کھینچتے ہوئے اسے گٹر کے دہانے سے پیچھے لے گئے۔ پانی اور تیزی سے باہر آنے لگا۔ ریاض ایسی صورتِ حال سے نمٹنے کا عادی تھا۔ اس نے بارہ تیرا گز لمبی و نجھی گٹر کے سینے میں گھونپ دی اور پھر اُسے گھماتے ہوئے پانی کے بہاؤ والے رُخ میں لے گیا۔ محلے کے کچھ بچے بیدار ہو کر باہر آ گئے تھے۔ سیوریج گینگ کے تینوں ملازمین اور گٹر کھولنے کا عجیب کام بچوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ و نجھی اندر جا کر تقریباً پھنس گئی تھی۔ تینوں نے ایک ساتھ زور لگا کر اسکو باہر کھینچا، پھر قوت کے ساتھ اندر دھکیلا۔ چار پانچ بار ایسا کرنے سے گٹر میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی، پھر پانی پورے زور کے ساتھ بہاؤ والی سمت بہنے لگا۔ وہ و نجھی چلاتے جا رہے تھے، انہیں اس چیز کی قطعی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ عجیب و غریب کثافتوں والے سیاہی مائل اور بدبودار پانی کے چھینٹے ان کے منہ اور پورے جسم پر پڑ رہے ہیں۔ بہاؤ بہتر ہو گیا تھا۔ ریاض نے ایک طرف بیٹھ کر اپنی شلوار سے ہاتھ صاف کیے اور سگریٹ سلگا کر فاتحانہ انداز میں کش لگانے لگا۔ ابھی کچھ کام باقی تھا۔ اس کے ساتھی پھاوڑے سے پلاسٹک بیگز، جھاگ اور بوتلیں ایک طرف کو ہٹا چکے تو وہ کمر سے حفاظتی رسی باندھ کر گٹر میں اتر گیا۔ چونکہ پانی دہانے سے نیچے چلا گیا تھا، اس لیے ریاض کو زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ اس نے ڈبکی لگائی اور اگلے ہی لمحے پلاسٹک بیگز، تاروں اور رسیوں کا گچھا گٹر سے باہر پھینکا۔ رہی سہی کسر سریے نے نکال دی۔ وہ باہر نکلا تو مجسم گندگی لگ رہا تھا۔ چھوٹے بچوں کو یہ کھیل بہت اچھا لگا۔ انہوں نے ریاض کو باہر آتے دیکھ کر تالیاں بجائیں۔

چوک سے پانی کا اخراج ہو گیا تھا لیکن سیاہی مائل گاب اور فضلہ زمین پر جم گئے تھے۔

لاسن اور جانسن پھاوڑے سے صفائی کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے پر غلاظت اس درجہ پھیلی ہوئی تھی کہ اس کو دو تین آدمی اتنی جلدی صاف نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اگلے کام کی طرف بھی بڑھنا تھا۔ وہاں آمد و رفت کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ بدبو اور گندگی سے بیزار ہو کر ایک خوش لباس شخص نے نفرت سے کہا؛

''سسٹم ہی خراب ہے۔ یہ بھنگی بھی حرام کی کھاتے ہیں!''

ریاض اور اس کے ساتھیوں نے حیرانی سے اس خوش لباس شخص کی طرف دیکھا جو انہیں گٹر کی گندگی سے بھی زیادہ غلیظ نظر آیا۔ وہ اپنے اگلے کام کی طرف بڑھ گئے۔ سارا دن یونہی گزرا۔ جمعدار آتا اور کام چیک کر کے چلا جاتا۔ شام پانچ بجے کے قریب

ریاض عیسٰی نگری کی طرف چل دیا جہاں اسے اپنے علاقے کے پادری سے ضروری کام کے سلسلے میں ملنا تھا۔ اسے عیسیٰ نگری سے ایک خاص انس تھا حالانکہ وہ کبھی وہاں کی ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر سائیکل نہ چلا سکا تھا۔۔۔ بلکہ وہاں داخل ہوتے ہی سائیکل سے اتر جاتا اور پیدل چلنے لگتا۔ راستے میں جاننے والے اکثر مل جاتے جو اسے سلام انکل جی یا سلام ایلڈر صاحب کہتے۔ وہ بھی سب کو سلام کرتا۔ اس کی شروع دن سے خواہش رہی تھی کہ یہاں اپنا پلاٹ خرید کر گھر بنائے مگر اسکا یہ خواب پورا نہ ہو پایا۔ یہاں اسے اپنے پن کا احساس ہوتا۔ ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، گندے نالے، کوڑا کرکٹ، گدھا گاڑیا، کالے کلوٹے لوگ۔۔۔

اسے یہ سب اپنا لگتا۔ گندے نالے کی بو عیسٰی نگری کی فضا میں رچی بسی رہتی۔ یہ نالہ آبادی کے شمال میں بہتا تھا اور پھر آگے جا کر مشرق سے مغرب کی طرف سست روی سے بہتے ہوئے اور عیسیٰ نگری کو دو حصوں میں کاٹتے ہُوئے جنوب مغرب کی طرف بہنے لگتا۔ کنارے کے ساتھ ساتھ جنگلی کیکر کے درختوں کے سائے میں جگہ جگہ گدھا گاڑیاں کھڑی نظر آتیں۔ سیلن زدہ اور ادھ تعمیرے گھروں سے کالے رنگوں اور پھولے پیٹوں والے بچے جھانکتے نظر آتے۔ مکھیوں کے چاق و چوبند دستے ہر وقت ان کی غلیظ چوسنیوں پر بھنبھناتے اور جب دل چاہتا وہ اپنے پھولے ہوئے پیٹوں کو آسودگی کا پُرسہ دینے کے لئے ان چوسنیوں کو منہ میں ڈال لیتے اور کچھ دیر بعد جب روتے ہوئے منہ کھول دیتے تو مکھیوں کے لشکر ان کے گلے میں لٹکتی چوسنیوں پر سے تھوک اور ناک سے بہتی غلاظت اڑاتے۔ ان کے بڑے بہن بھائی ندی اور آس پاس کی ہاؤسنگ سوسائٹیوں کے کچرے کے ڈھیروں سے بوتلیں اور پلاسٹک کی بے کار اشیاء اکھٹی کر کے لاتے اور کباڑیوں کے ہاتھ بیچ کر اپنا جیب خرچ بناتے۔ شام کے وقت وہ کالونی کی دکانوں سے مرغیوں کے پروں کی چھیچھڑا نما بوٹیاں، پنجے، سریاں، گردنیں، انڈے اور سستی کیچپ سے تیار کیے بر گر کھاتے، ساتھ میں روکا کولا، ٹوپسی اور سپرڈائیٹ کی بوتلیں پیتے۔ کچھ پڑھی لکھی لڑکیاں اور لڑکے ہاتھوں میں بائبل کے نسخے پکڑے شام کے درس کے لیے اپنے اپنے فرقے کے گرجا گھروں کی طرف رواں نظر آتے۔ بازار میں غیر معیاری خورد و نوش اور دیگر چیزوں سے بھری دکانوں کے باہر ''خداوند میرا چوپان ہے مجھے نہ ہو گی'' اور ''تیرا فضل ہی میرے لئے کافی ہے'' جیسی آیتیں لکھی نظر آتیں۔ ہر محلے میں انٹرنیشنل ایڈ سے تعمیر کیے گئے چرچ اور ''سوسائٹی فار کمیونٹی ڈویلپمنٹ'' کی مقفل عمارتیں دکھائی پڑتیں۔ شام کے وقت اگر کسی چرچ میں زیادہ رش ہو اور پادری گلا پھاڑ پھاڑ کر کلیسا کو چندہ دینے اور شفایاب ہونے کے لیے کہہ رہا ہو تو اسکا مطلب یہ ہے کہ کسی یورپی ملک یا امریکہ سے کوئی نجات دہندہ آیا ہوا ہے جو ابھی کچھ ہی دیر میں اٹھے گا اور لوگوں کو اپنی زبان میں خطبہ دے گا اور مقامی پادری اسکا ترجمہ کرتے ہوئے ویسے ہی پرجوش انداز میں بتائے گا کہ ''میرے پیارے بھائیو اور بہنو! آپ سب پر ابلیس کا غلبہ ہے، اِسی لئے بیماریاں آپ کے جسموں میں گھر کیے ہوئے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ آپ سچے دل سے ''ہالے لوہیا'' کا نعرہ لگائیں اور اپنا داہنا ہاتھ اپنے جسم کے بیمار حصے پر رکھیں، دیکھیں کہ آپ شفایاب ہو چکے، یقیناً خداوند کے جلالی نام میں بہت طاقت ہے۔''

اس کے علاوہ عیسیٰ نگری میں رومن کیتھولک مشن کے فادروں کی کوٹھیاں، ان کے کالے کلوٹے ملازم، چند ایک پڑھے لکھے لوگوں کے گھر، بازار میں ہر سُو پھیلے سیاہ اور زردی مائل چہرے اور ان کے چہروں کی طرح باسی سبزیاں نظر آتیں۔۔۔ مگر پھر بھی ریاض یہاں آکر آباد ہونے پر بضد تھا۔۔۔ پادری صاحب نے اسے کسی پروگرام کے دعوتی کارڈ پر ایک شفائیہ عبادت کے اشتہار دیے تاکہ گاؤں کے لوگ بھی عبادت اور چیریٹی پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

ریاض کو اپنے گاؤں کے ساتھ ساتھ ملکی معاملات کی بہت فکر رہتی تھی۔ اس لیے وہ تازہ ترین خبروں سے مستفید ہونے کے لیے اپنے گاؤں کے رکشوں والے اڈے سے چائے پیے بغیر کبھی گھر نہ لوٹتا۔ اس کا پیالہ چائے والی دکان پر بسکٹوں اور کیک رس والی الماری کے نیچے دھرا ہوتا جسے وہ چائے پینے سے پہلے اور بعد میں دھو کر وہیں رکھ دیتا۔ چائے والا اسکے پیالے کو بالکل ہاتھ نہ لگاتا اور کیتلی کافی اوپر رکھ کر چائے انڈیلتا۔ گاؤں میں لوگ ریاض کو راجو عیسائی کے نام سے جانتے تھے۔ ریاض کے نہ تو ہونٹ موٹے اور کالے تھے، نہ ہی ناک بھدّی اور چپٹی۔۔۔ وہ سانولے رنگ اور اونچے قد کا ایک وجیہ مرد تھا جو اپنے رکھ رکھاؤ سے خالصتاً پنجابی معلوم پڑتا۔ معاشرے میں اس کے چھوٹے مقام و مرتبے اور ذات پات کے فرسودہ نظام نے اسے معاشرتی تقسیم کی اندھیری غار میں دھکیل دیا تھا جہاں بغیر ضرورت کسی بھی انسانی شبیہ کو اُجالنا مشکل تھا۔ اس کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ تینوں جوان تھے اور اسے ان کی شادیوں کی فکر تھی۔ وہ اپنے آل دوالے اور اونچ نیچ کے فرق کو خوب سمجھتا تھا۔ اس دن جب وہ اڈے والی دکان پر چائے پینے رکا تو وہاں کچھ لوگ اسے کاٹ کھانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سفید داڑھی والا ایک شفیق سا شخص اس کے پاس آیا اور اسے وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ اس نے حیرانی سے اس بات کا سبب پوچھا تو بوڑھے شخص نے اسے بتایا کہ پورے گاؤں میں یہ بات پھیل گئی ہے کہ عیسائی رات کے وقت شراب پی کر تیز موسیقی کے ساتھ ناچ گانا کرتے ہیں اور اس ناچ گانے میں ان کی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ گاؤں والوں کا کہنا ہے کہ اس سے پورے گاؤں کی عزت خراب ہو رہی ہے۔ چائے والا پیالہ ریاض کے ہاتھ میں تھا اور آخری گھونٹ پیالے میں۔۔۔ گاؤں کی پنچایت میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ جو شخص اس گھناؤنے عمل کا سرغنہ ہے اور عیسائی برادری کا سرکردہ بھی ہے، اسے اور اس کے خاندان کو بے عزت کر کے گاؤں سے نکال دیا جائے۔ اس فیصلے کے طے پانے میں سب سے بڑا ثبوت، ریاض مسیح کی بیٹی جوزفین تھی جسے پچھلی رات وہاں ناچتے دیکھا گیا تھا۔ جاٹ برادری کے دو لڑکے گواہ کے طور پر موجود تھے۔۔۔

ریاض نے سر جھٹکتے ہوئے مگر تذبذب کے عالم میں آخری گھونٹ کے لئے پیالہ منہ کی طرف بڑھایا مگر پیالہ نیچے آ رہا۔۔۔ کوئی تیس کے قریب لوگوں پر مشتمل ایک جتھا گاؤں کے وسط کی طرف سے وہاں آنکلا تھا۔

''نکال باہر پھینکو اس کچرے کو یہاں سے!''

ساتھ ہی ایک زوردار تھپڑ ریاض کے منہ پر پڑا اور پھر لاتوں اور گھوسوں کی بارش۔۔۔

''اوئے لڑکو! مار کٹائی بند کرو اور اسے لے کر کچی بستی کی طرف چلو!'' ایک بزرگ کی گرج دار آواز گونجی

''چلو لے چلو اسے۔۔۔۔ بازو سے پکڑو۔۔۔ بھاگنے نہ پائے!''

وہ اس قدر دہشت زدہ تھا کہ نہ تو چیخ رہا تھا، نہ رو رہا تھا اور نہ ہی اس ذلت اور رسوائی کا سبب پوچھ رہا تھا۔ اس کی سائیکل وہیں کھڑی تھی۔ لعن طعن اور گالیوں کی بوچھار میں اس نے کچھ بولنے کی کوشش کرتے ہوئے دونوں جاٹ لڑکوں کی طرف انگلی اٹھائی مگر اب اسکا تمام جثہ زمین پر ڈھیر ہو رہا۔ کسی نے کوئی بھاری چیز اس کے ماتھے پر دے ماری تھی۔

''چل نکال اس لال چنی والی کو۔۔۔''

''تیری ماں کی''

''تیری بہن کی''

وہ زمین پر پڑا تھا اور تمام آوازیں اس کی سماعت سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کا چہرہ ماتھے سے بہنے والے خون سے سرخ ہو گیا تھا۔ ایک دم سب لوگ اس کے اوپر جھکنے لگے تو اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی ایسے گٹر میں ڈبکی لگا بیٹھا ہے جہاں گاب اور فضلہ بہت گاڑھا ہے اور ان گاڑھی کثافتوں کی دلدل، اسے اپنے اندر دھنسائے چلی جا رہی ہے!!!

پانی پُوردے وسنیک

سلیم ہارون

پہلا منظر:

اوہنوں لگدا اوہدا پنڈ دریادِیاں ٹھلاں اُتے ڈولڈی اک بیڑی اے تے اوہ ایہدا ملاح۔ پِنڈاں ورگے پِنڈ ہُوندے نیں، لوک وی لوکاں ورگے پَر، اوہ ہر شے نوں اپنے ای ڈھنگ نال ویکھدا تے پرکھدا۔ ہاڑ تے سون دیاں مہینیاں وچ ایناں مینہ ورھدا ئی سارِیاں زمیناں پانی وچ ڈُب جاندیاں۔ واہی واناں نوں ایہناں بارشاں دا بوہت فیدہ ہندا ائی اوہناں دی زمین مونجی دی فصل لئی چھیتی تیار ہو جاندی. دَکھن تے پہاڑ پاسیوں لنگدے دریاوی جاگ پیندے تے روہڑ و پانی اپنے راہ وچ آؤن والی ہر شے نوں روہڑ کے لہندے ول لے جاندا جتھے سُورج وی ڈُبیا نئیں لبھدا۔ پانی دے ایہہ اتھرے دیوتے ایس پنڈ دا کجھ ناں وگاڑ سکدے، کیوں جے ایہنوں اِک اجیہے تھاں تے وسایا گیا سی جیہدے آل دوالے نہراں، سُوویاں، برساتی نالیاں تے کھالاں دا جال وچھیا ہویا سی۔ ایس کرکے روہڑ و پانی دھرتی دی ہِک اُتے آت مچاؤندا، ایہناں نالَیاں راہیں ایتھوں بوہت دور ٹُر جاندا۔

اوہ کدی جَل پَریاں نال تے نئیں سی ملیا پَر، جَل کُڑیاں اوہدے ہر پاسے جھلیاں پاؤندیاں۔ ایس پُکھونُوں ویکھن لئی اوہ وڈے سویرے گھروں نکلدا تے پُرانے پانی دیاں ڈھاباں تے چھپڑاں کنڈے جا بہندا۔ ہورے ایہناں پُکھواں نال اوہدی کوئی رشتے داری سی یاں اوہ اوہدی موجودگی دے عادی ہو گئے سن۔ اوہنوں ستمبر تے اکتوبر دے مہینیاں وچ ایتھے آؤنا ہور وی چنگا لگدا کیوں جے ایس موسم وچ ایہناں چھپڑاں، ڈھاباں تے کول وگدی نہر دا پانی نِتر کے جَنتاں دے پانی ورگا ہو جاندا۔

اوہدیاں آوارہ گردیاں وَدھدیاں گئیاں تے شیواں بارے جانن دا شوق وی۔ ایہہ اوہ عمر ہندی اے جدوں بندہ جاگدیاں ہویاں وی خواب ویکھدا اے تے تعبیراں وی آپ کر دا اے۔ اپنا اُستاد آپ ہون پاروں اوہنوں ایس گل دی پَرکھ کجھ ایس طراں ہوئی پئی جیہڑیاں گلاں، سِکھن نال نئیں آؤندیاں اوہ خواب ویکھن نال آؤندیاں نیں۔

اوہدے من وچ بلدی اگ تے بارش دے پانی نال بنڑدیاں ٹھلاں، اوہنوں دنیادی سیر کراؤندے تے واپس پانی پورول وی لے آؤندے۔ پَر، ہوش وچ ویکھیا اک خواب اوہنوں عملی طور تے گھروں نکلن تے مجبور کرن لگ پیا۔ اوہدے ماں پیو وی تے ایہو چاہندے سن۔ ایس کرکے اوہنے اک وڈی جیہی بیڑی بناون دا سُفنہ ویکھیا۔ ایہہ کوئی ایڈا وڈا کم وی نئیں سی، پئی، کباڑیا، سراج ترکھان کاٹھ دی اک بیڑی وی ناں بناؤندا.... ! دُنیا دا نقشہ تے پہلوں ای اوہدے من وچ سی تے فیر کیوں ناں بندہ کاٹھ دی بیڑی تے بہہ کے سمندروں پار نکل جاوے۔ مویاں دی مڑھی تے کھلو کے اِڈاں تے گارے دی بیڑی نوں ویکھدیاں رہنا کیہڑا کماں وچوں کم آکھدے نیں۔ ایس طراں تے ہر کوئی کر سکدا اے !

بِستر ے تے پئیاں اوہ اپنے ماں پیو دی کُرھ کُرھ سُنڑ دا جیہڑے ہر رات دے پچھلے پہر اپنا سمان بنھ کے ایہہ دیس چھڈ جاندے۔۔۔اوہناں نال ٹُر دا لگا جاندا اوہ مڑ مڑ پچھاں ویکھدا نالے ہتھ ہلا ہلا کے جل کُکڑیاں، پانیاں تے اپنے سنگیاں نوں خُدا حافظ کہندا۔ پر ایہہ کیہ۔۔۔وڈی سرگی ویلے پسار وچوں شُکرانہ پڑھن دیاں آوازاں نال اوہدی اکھ کھل جاندی تے اوہنوں سارا خواب وی یاد ناں رہندا۔ کیوں جے اوہ اپنا استاد آپ سی، ایس لئی چیتا پکا کرن دا علاج وی اوہنے آپ ای لبھ لیا۔ ہو یا اِنج ئی اک دن اوہنوں، پنساری دی دُکان توں چارے مغز تے مربے لین واسطے جانا پیا۔ پنڈوں باہر کھجل خواری کرن والا پنڈ دے اندر جاوڑیا تے کیہ ویکھدا ئی جسڑی جل پَری ڈھاباں تے دریا دے پانیاں وچوں باہر نئیں سی نکلدی، اوہ پنساری دی دُکان تے بہہ کے قسمتاں دے سودے ئی ویچدی سی۔ جدوں قسمت ماڑی ہووے اودوں کوئی چارہ نئیں چلدا۔۔۔اوہ پیسے دے کے یاداں نال بھریا ہویا اک تھیلا گھر لے آیا۔

پنڈ دے سارے بال پچھلے پہر کُھلن والے اوہدے ماں پیو دے پرائیویٹ پرائمری سکول وچ تعلیم حاصل کر دے سن تے اوہ آپ اوتھوں دے ہائی سکول وچ مڈل پاس کرن دا آہر کر دا پیا سی۔ اک کیٹیکیسٹ Catechist ہر اتوار نوں یسوع مسیح دی گواہی دین آؤندا تے جاندیاں جاندیاں نِکے بالاں نوں وی کوئی سبق دے جاندا۔ جل پَری دے ماں پیو نیں وی اوہنوں ایس سکول وچ داخل کرادِتا سی۔ اوہنوں کیتھولک دے باؤدی تعلیم بوہت چنگی لگدی۔ ایسے پاروں اوہ باؤ ہوراں دی ہر گل بڑے دھیان نال سُنڑ دی۔

پانی پور دے لوک بوہتیاں گلاں رمزاں تے اکھاناں راہیں کر دے جنہاں نوں سمجھن لئی اوہ لوکائی نوں سمجھن دا آہر کرن لگ پیا۔ ایہہ کم ایڈا سوکھا نئیں سی۔ جسطراں اوس علاقے دے دوالے دریاواں، نہراں، سُویاں، کھالاں تے برساتی نالایاں دا جال وِچھیا ہویا سی ایسے طراں لوکائی نیں اپنے دوالے مذہباں، فرقیاں، ذاتاں، گوتاں تے اونچ نیچ دا جال بُن لیا سی۔ جدوں ایہہ گور کھ دھندا سمجھیں ناں پیا، اوہ واپس اپنے آپ نوں سمجھن ٹُر پیا۔ ایسے جھج نس دے دوران اوہدا ایف اے دا امتحان وی پاس ہو گیا۔ ایس سارے کھیڈ توں باہر ہون واسطے ایس توں چنگا ویلا ہور کیہڑا ہو سکدا سی۔۔۔تے بس فیر۔۔۔اک دن انج ای ہو یا۔۔۔اوہ سمندروں پار ٹُر گیا۔۔۔تے۔۔۔سمے دی روہڑ تے رُڑھدیاں رُڑھدیاں۔۔۔اپنے پروار دے دُوجے لوکاں نُوں وی لے گیا۔

پچھے رہ گئے سن چاچا جُمعہ تے اوہدی دھی کلارہ جنہاں دی کہانی پانی پور ہی نئیں، دوالے دے سارے پِنڈاں وچ وی مشہور ہوئی۔ چاچی مار تھا ایس کہانی دا اک پروہنا کردار سی جسڑی اپنی دھی کلارہ نُوں جیوندے جاگدے لوکاں دی دُنیا وچ لیا کے آپ اگلے جہان ٹُر گئی۔

کلارہ چاچے جُمعے دی پچھلی عمر دی اولاد سی جنہوں اوہنیں مار تھا دے مرن توں بعد بوہت پریت نال پالیا۔ ایہہ پالن کجھ ایس طراں دا سی ئی اوہنے اپنی رُوح اپنی دھی دے جُثے وچ پا دتی تے آپ اک اجیا جِن بن گیا، جیہدی جان اک نِکی جیہی گُڈی وچ ہندی اے۔ کلارہ وڈی ہو کے ہُو بہ ہُو اپنی ماں ورگی لگن لگ پئی، پتلے نین نقش تے اُچی لمی۔ اوہدے تائے دی دھی ماریہ تے اوہ،

دونویں، ہانی سن پر تائے دے پروار دے ٹُر جان مگروں اوہ کلی ہو گئی سی۔ شام پینڈی تے اوہ اپنے رنگی ہنیرے دی بُکل وچ جالُکدی جد تیکر اوہدا پیو گھر ناں آؤندا۔ ایہہ اوہ وڈا گھر سی جیہدے وچ اوہناں دے پروار دیاں کئی پیڑیاں اپنی وسوں کر کے اگا نہہ ودھ گئیاں سن۔ جے کل دی گل سی، ایہناں وچوں ہی، جِیاں دا اِک پراگا، اِک نواں پانی پُور وسان واسطے سمندروں پار جا وسیا۔ کلارہ اوہناں نوں ہر دم یاد کر دی تے چِٹھیاں لکھدی تاں جے، ٹُر جان والے، پچھاں مڑ آؤن۔

جُمعہ دُدھ دی نکی جیہی ولٹوہی موڈھے چائی شام نوں گھر وڑدا تے کلارہ چھال مار کے اوہنوں جپھا جا پاؤندی۔ ڈنگراں نال ڈنگر ہو یا جُمعہ پٹھے دَتھے تے واہی بیجی دی دُنیا وچوں باہر نکل کے پیار پریت دی دُنیا وچ آ کھلوندا۔ دوہاں نُوں چمبڑیا اکلاپے دا بُھوت گھر دے بنیرے تے جا بہندا تے سرگی ویلے تائیں تھلے ناں لہندا۔

پنڈ وچ عیسائیاں دا اکو گھر رہ گیا سی۔ کلارہ تے اوہدا پیو جُمعہ، اپنے آپ وچ ساری برادری سن تے اپنی برادری دے آگو وی۔ ایہہ سلسلہ کلارہ دے جوان ہون تک ایسے طراں چلیا، فیر اک دن کلارہ دا وہاہ ہو گیا کیوں جے جُمعے نُوں اپنی دھی دی جوانی ویکھ کے لوکاں توں ڈر آؤن لگ پیا سی۔ کلارہ پانی پُور توں جھوک اُچیاں دی جاؤ سی پر، اکلاپے دا بُھوت اوہدا پچھا کر دیاں ہویاں جھوک اُچیاں دی وی جا اپڑیا۔ ہُونی کجھ ایس طراں ہوئی پئی کلارہ دے ویاہ دے اک مہینے مگروں ای اوہدے سر دے سائیں نُوں سَنگ چُور ڈنگ گیا تے اوہ جھوک اُچیاں توں سدھا جنتیں جا وسیا۔ بِستر ے وچ لکے اوس شرمیلے تے زہر بھرے شیطان دا سر، کلارہ اوس ویلے تیکر کٹدی رہی جدوں تک اوہدا زہر کلارہ دی حیاتی دے سارے راہواں وچ ناں کِھلر گیا۔ اوہنوں اوہدے داج سَنے پانی پُور گھل دتا گیا۔

دُوجا منظر:

یاداں بُھل تے تارے بن کے اوہناں دیاں راہواں وچ وچھیاں پیاں سن۔ اوہ تھوڑا اگا نہہ ودھے تے پانی پُور دی چُپ ہوا نیں اوہناں نُوں سینے نال لا لیا۔ مینہ کھلوندیاں سارا ای چن بدلاں وچوں باہر نکل آیا سی۔ اوہناں ایدھر اودھر ویکھیا، بندہ ناں بندے دی ذات۔

راہ تے اوہو پُرانا سی، دو میل لمی کالی سڑک، نہر دا کنڈا تے دُوہاں پاسے رُکھاں دا ساتھ۔ یشوع نُوں لگیا، رُکھ اِک دُوجے دا ساتھ نئیں چھڈدے، ناں چنگے ماڑے بَھل پاروں اک دُوجے توں نفرت کر دے نیں تے ناں ای اوہناں دے وکھرے وکھرے دھرم نیں۔ اوہنوں اپنے پروار دے اوہ دیہاڑے یاد آئے جدوں اوہ علم دی صُورت اپنا بَھل ہر چنگے ماڑے دی جھولی پاندے۔ اوہدے ماں پیو پنڈ دے بالاں نوں پنجویں تیکر مفتِ تعلیم دیندے سن۔ پنڈ دے کجھ پروار اوہناں نوں ہاڑی سونی وی گھل دیندے۔ اُنج تے، سرکاری سکولاں دے ریٹائرڈ استاد ہون پاروں، اوہناں دا خرچہ سرکار دے کھاتے وچوں وی آ جاندا۔

ریٹائر منٹ توں بعد اوہناں اپنی باقی دی حیاتی نکے بالاں نوں پڑھان دے لیکھے لادِتی، پر، اوہناں کولوں اوہ سکول کھو لیا گیا جیہدے وچ اوہ اک بڑا وڈا کم کر رہے سن۔ پنڈوں ٹُر جان توں ستاں وَرھیاں بعد اوہ دونویں کار حادثے وچ مارے گئے۔ ایس حادثے مگروں، یشوع نُوں، انسان دی پیدائش بے مقصد لگن لگ پئی۔

ٹُر دیاں ٹُر دیاں اوہ کھلو گیا تے اپنا دھیان اُتاں چُک کے ویکھیا جتھے ٹاہلی تے کِکر اِک دُوجے دیاں بانہاں وچ بانہاں پا کے ہورے کدوں دے اِکو تھاں تے کھلوتے ہوئے سن۔ اوہنوں لگیا، موت وی انساناں نوں ای چھیتی آ جاندی اے، یاں فیر انسان ایہدا حدوں بوہتا ویر وا کر دے نیں۔ کئی سوال اوہدے دماغ وچ گھمن لگ پئے۔ انسان پانی دے بُلبلے ورگے کیوں ہُوندے نیں؟ یاں جگت دی ہر اوہ شے جیہدے وِچ جان اے مرن واسطے پیدا ہوئی اے؟ اک موٹا جیہا پانی دا تُبکا کسے رُکھ دی ٹاہنی توں اوہدے متھے اُتے آ ڈِگیا تے اوہ سوچاں دیاں گھمن گھیریاں توں باہر نکل کے کالھیں کالھیں ٹُرن لگ پیا۔ شارلٹ اوہناں توں اگے چڑھدے ول ٹُر دی لگی جاندی سی، کیوں جے اوہ اپنے پنڈ دا راہ نئیں سی بُھلی۔ بُھلدی وی کیویں، ایتھے اوہدے باراں ورھے لنگھے سن۔ اوہناں دی نِکی بھین ماریہ، رہ رہ کے کجھ سیانن دا آہر کر دی تے اِک ڈُونگی سوچ وچ ڈُبی فیر اگاں ٹُر پیندی۔ اج اوہدی اٹھارویں ورھے گنڈھ سی، نالے اوہدی کزن کلارہ دی وی۔۔۔ اج ای کلارہ نیں اک نِکی جیہی دھی نوں جنم دِتا، تے، آپ اپنا سَنگ ملک الموت نال رلا لیا۔۔۔ جُمعہ ناناتے بنیا، پر، حیاتی دے دُکھاں توں مُنہ موڑ لیا کیوں جے اوہدی جان تے کلارہ وچ سی۔۔۔ دونویں پیو دھی ہورے ایکا کر کے مار تھانوں مِلن ٹُر پئے سن۔۔۔ اِنج لگدا سی اکلاپے دا بُھوت پانی پور دے ایہناں وسنیکاں مگر ہتھ دھو کے پئے گیا وے۔۔۔

اج ہی یشوع تے اوہدیاں بھیناں وطنیں مڑے سن، دَساں وَرھیاں بعد۔۔۔ شارلٹ نوں بوہت کجھ یاد سی، اپنے ماں پیو دِیاں گلاں، اوہناں دی باشناں، گلی محلے دے لوک، ایتھوں تک کہ پنڈ دا راہ وی۔ ماریہ اَٹھاں ورھیاں دی سی جدوں اوہ ایتھوں ٹُر گئے سن۔ ایس کر کے اوہ بوہتا کجھ نئیں سی جانڑ دی۔ یشوع دی گل ہور سی۔ اوہ اپنے آپ نوں پانی پُور دیاں سنگھنیاں دُھنداں، سون بھادروں دِیاں جھڑیاں، سَیاں ورگیاں زہریلیاں راتاں تے شُوکدیاں دوپہراں وچوں کدی باہر نئیں سی کڈھ سکیا۔ ایسے سڑک اُتے اگے جا کے اِک چھوٹا جیہا قصبہ سی جنہوں آلے دوالے دے سارے پنڈاں دا مرکز منیا جاندا۔ لوک اوتھوں ورتوں دا سمان لین جاندے پر یشوع اپنے ماں پیو نال کجھ سمے واسطے اوس قصبے دے گرجے وچ عبادت کرن جاندا رہیا سی کیوں جے اوہناں دے اپنے پنڈ والے گرجے تے سکول اُتے اِک وڈی مالکی والے قبضہ کر بیٹھے سن۔ ایہہ سکول اوہدے ماپیاں نیں اوس "اک وِگھے" زمین وچ بڑے چاہ نال بنایا سی جیہڑی سرکار نیں ہر ماڑی برادری نُوں اوہناں دے پرورپالن واسطے دِتی سی، پر، ایہدے وچ واہی بیجی کرن لئی معاملہ تارنا پینداا، تے، ماڑے لوک معاملہ کتھوں تار دے۔

جد یشوع نیں جوانی دی پوڑی تے پیر دھریا تے اوہنے لوکاں کول بہنا کھلونا چھڈ دِتا۔ اوہ ہر ویلے اک نَواں پنڈ وسان دا سُفنا ویکھدا۔ ایہہ نظارہ کسے وڈی سکرین تے چلدی فلم ورگا ہُوندا۔ بے بے سلکھنی عُرف بے بے عینکاں والی، اوہنوں اِک نویں پاسے لادِتا۔ اوہ آکھدی: ''سنتالی دی ونڈ ویلے ایس دھرت دے ادھے لوک چڑھدے ول منہ کر گئے سن جیہڑے کدی ناں کدی

پچھاں جرُور مڑن گے۔''یشوع نوں مویاں دی مڑھی توں خوف آؤن لگ پیندا، ہورے کیہڑے لوک ایس زمین اندر دبے ہوئے سن یاں کنّاں لوکاں دی چِتا ایہناں مڑیاں تے سڑ کے پانی پور دیاں ہواواں وچ رَل گئی سی؟ اوہ ٹپ کھلوندا تے دُڑکی لاؤن دی سوچدا پَر اک نظارہ اوہدے پیر پھڑ لیندا۔۔۔مینہ دیاں پرتاں وچوں جیوندے جاگدے لوکاں دے قافلے، اپنا سمان سراں تے چکی، پانی پُور ول تُرے آؤندے نظریں پیندے تے ویکھدیاں ویکھدیاں ایہہ جتھے اوہدے کولوں دی ہو کے لنگ جاندے۔

پانی پُور کدی سِکھاں، مسلماناں تے ہندوواں دا سانجھا پنڈ سی۔ تائیوں بے بے سلکھنی نہر دے کنڈے تے بہہ کے، ٹُر جان والیاں دا انتظار کر دی رہندی۔۔۔پر، ہائی سکول دا ماسٹر بے بے دی گل نال اختلاف کر دا، اوہ کہندا:

''دو نہہ قوماں واسطے دو وکھرے دیس ہی ہُونے چاہیدے سن، بھلا ہنُدو تے مسلمان اکٹھے کس طراں رہ سکدے نیں۔''

یشوع نیں جد ماسٹر ہوراں دی گل دی ڈُونگھ وچ جھات پائی تے اوہنوں خیال آیا پئی، جے، ہندوواں تے مسلماناں نوں وکھ رہنا چاہیدا اے تے فیر عیسائی تے سِکھ ایہناں نال رَل کے کیوں رہندے پئے نیں؟! جدوں اوہدے پلے کجھ ناں پیندا، اوہ اپنے دماغ دا سوچ کسے ہور پاسے مروڑ لیندا۔

اوہدی یاداں دے بینک وچ، اک یاد، نہر دے کنڈے توں امباں تے جامنواں دے باغ دا وڈیا جانا وی سی۔ سووا ں پنچھی کئیاں دِناں تیکر رولا پاؤندے ایدھر اودھر اُڈدے رہے، مردے رہے تے کرموکرمی پنڈ چھڈ کے جاندے رہے۔

جس دیہاڑے پردیس جان لئی اوہ پنڈوں نکلے اوہ دیہاڑ قیامت ورگا سی۔ پانی پور دے عیسائی تے مسلمان اک دُوجے دے گل لگ لگ کے روئے تے نشانیاں وٹائیاں۔ سارے جلاہ، موچی، کمیار تے چھوٹیاں مالکیاں والے اوہناں نُوں ودیا کرن آئے سن۔ بس کجھ وڈیاں مالکیاں والے اوہناں دے جان پاروں بوہت خوش سن۔ پر، یشوع دے ماں پیو نیں اوہدے چاچے جُمے نوں اوس وڈے گھر وچ وسا کے اک نشان چھڈ دِتا تاں جے کدی کوئی مڑ آئے تے سدھا اپنے گھار آئے۔ چاچا جُمہ آپ وی جان تے راضی نئیں سی۔

سال تے مہینے گزر گئے کسے نیں مڑ کے پنڈ وَل ناں ویکھیا، پر، فیر اک دن اوہناں نوں پَر تنا پیا۔ فرق بس ایناں سی، اوہ لہندے وَلوں آئے سن۔ یشوع نوں اپنا کردار مقدس یشوع والا لگیا جیہڑا موسیٰ دے مرن توں بعد بنی اِسرائیل نُوں کنعان واپس موڑ لیایا سی۔ اوہنے اپنی عینک لاہ کے بوجھے وچ پا لئی تاں جے اوہ بے بے سلکھنی دے وکھائے خواب نوں اپنیں اکھیں ویکھ سکے۔ اوہنوں جھلّے ملاح تے اوہدے پُتر جھلّے دی کہانی یاد آئی جیہڑا دریاں بے رحم ٹھلاں وچ رُڑھ گیا تے اوہدی یاد وچ اوہدا پیو جھلّا ہو گیا۔ یشوع نوں لگیا اوہ تے اوہدیاں بھیناں ماڈرن دُنیا دے جھلّے نیں جیہڑے سَمے دی کانگ تے رُڑھ کے سمندروں پار ٹُر گئے سن تے لوڑ پئی نُوں فیر مڑ آئے نیں۔ یشوع دی حیاتی دے ویہہ ورھے ایتھے لنگھے سن۔

رات دے یاراں وجے ،اوہ اڈے تے اپڑے پر،اوس ویلے اوتھے اُلو بولدے پئے سن۔اوہناں نُوں پتہ نئیں سی پئی اپنی چَراک ہو جانی اے۔شید لین آؤن والے انتظار کر کے ٹُر گئے سن یاں ٹُٹ کے ورھدے مینہ نیں کسے نُوں آون دی مہلت ای نئیں سی دِتی۔ کھیتاں وچ پانی ای پانی نظریں آوندا سی تے ہوا ہورے اوہناں دے آؤن دی خبر لے کے پنڈ ٹُر گئی سی۔ ویکھدیاں ویکھدیاں پانی اُتے دُھند دی اک چادر جیہی تَن کتی تے اوہ ایس دُھند دی ہر پَرت نُوں پچھے چھڈدے اگانہہ ای اگانہہ ودے گئے۔ اک تارا اپنا سارا اٹِل لا کے ایسطراں اوہناں دے سراں تے چمکیا جیویں بیت الحم ول جان والے تِن مجوسیاں نوں تارے راہ وکھایا سی۔ نیڑے دے کسے ڈیرے توں ڈنگراں دے گلاں وچ پئیاں ٹلیاں دی واج اوہناں دے کنیں پئی تے اوہ کجھ دیر واسطے اپنے پیراں دی دھمک بُھل گئے۔ایہہ اوہ استھان سی جتھے کھلو کے یشوع بیڑی ورگے پنڈ نوں پانی تے ڈولے کھاندیاں ویکھدا۔ ویکھدیاں ویکھدیاں کئی قافلے اوہدے کولوں لنگھ گئے۔اوہنوں لگیا مویاں تے مڑی تے کوئی میلہ لگیا ہویا اے تے بے بے سلکھنی،اپنے سارے ہانیاں نوں نال لے کے اوہناں نوں اگوں وانڈی لین آئی ہوئی اے۔یشوع نیں وڈے وڈے چار پیر پُٹے تے،اپنیاں بھیناں سَنے پانی پور دی حد وچ داخل ہو گیا۔

تریجا منظر:

اج پانی پور دے لوک سوگ دی حالت وچ نیں۔پورا پنڈ دولاشاں تے اک نکی جیہی جان دوالے انج گھیرا پائی بیٹھا اے جیویں ایہناں نوں کسے دُشمن دا خطرہ ہووے۔چندا پنسارن نوں اندر باہر آؤندیاں جاندیاں ویکھ کے انج لگدا اپیا سی جیویں ایہہ اوہدا اپنا گھر ہووے۔ کجھ دیر ایسے طراں شیواں دی ترتیب درست کرن توں بعد اوہنے چنگی طراں اپنے ہتھ دھوتے ،بسملہ پڑھی تے اِک پاسے بہہ کے اپنی چھاتی کلارہ دی دھی دے سُپرد کر دِتی۔ بالڑی نیں رونا بند کر کے اپنا نکا جیہا ہتھ چندا دے سینے تے رکھ دتا۔چندا نیں اکھاں بند کر کے اپنی رُوح نوں اپنے بچپن دے پنڈ دیاں دُھندلیاں نظاریاں دے سُپرد چا کیتا۔اوہ جوانی چڑھدی اک الڑھ مٹیار سی تے پنڈ دا سب توں لیق منڈا اوہنوں ویکھن لئی اوہناں دے پنسار خانے آوندا ہُوندا سی فیر جدوں اوہ اوس منڈے دے ماں پیو دی شاگرد پئے گئی تے اوہناں نوں اک دوجے دے درشن واسطے بوہتے جتن ناں کرنے پینڈے۔شید ہر سچی محبت دا اخیر وچھوڑا اے۔پَر۔۔۔۔کلارہ دی دھی دی ماں بن کے اوہنوں اِک اجیہا سُرور ملیا جیہڑا اوہدے گمان وچ وی نئیں سی۔ ہنجواں دے اِک ہڑ نال ذاتاں، گوتاں، برادریاں تے مذہباں دیاں ساریاں بنیاں ڈیھ گئیاں تے اوہدیاں اکھیاں دے سامنے بس اک نکی جیہی پَری رہ گئی۔کلارہ دی دھی نیں دُدھ نال رَج کے، قصِیاں کہانیاں وچ ملن والی ماں ولوں ویکھیا تے چندا نیں اوہدیاں خوابی اکھاں چُم لئیاں جنہاں وچ نیند سی تے جل پَریاں دے خواب سن۔ایہہ منظر ویکھ کے پانی پور دیاں ساریاں ماواں بگھرے موم دِیاں گُڈیاں بن گئیاں تے اوہناں دے سینیاں وچ حیاتی دے دریا ٹھلاں مارن لگ پئے۔

چوتھا منظر:

''اوہ آ گئے!''

''اوہ آ گئے!''

اک واہی وان لہندے ولوں نسدا ہو یا لوکاں دے اکٹھ وچ آ وڑیا۔ اوس نیں تِن جی اپنا سمان چُکیں مویاں دی مڑی ولوں آؤندے ویکھے سن۔ سارا اِپنڈ جیہڑا بدلاں دے نال لُکن میٹی کھیڈ دے چَن دے سہارے، رات دی بُکل ماری بیٹھا سی اوہناں نوں اگوں وانڈی لین جا اپڑیا۔ یشوع نیں اکھاں اگے آئی دھند دا تھان لپیٹ کے اک پاسے رکھیا تے جینتیں وسدے اپنے ماں پیو، بہشتن بے بے سلکھنی تے بابے سراج ترکھان نوں، عین راہ وچ کھلوتیاں ویکھیا۔ ایہہ سارے بہشتی پچھاں مڑِ آون والیاں نوں جی آیاں نوں آکھن آئے سن۔ اوہنوں رسُولاں مراثن دے مونہوں سُنیا اک گاؤن یاد آیا:

''آؤن کُو نجاں

دین بچے

ندی نہاؤن چلیاں''

کجھ ایسے طراں دی ہی کہانی اوہنیں پٹیر یشیا دے ناول ''فلائی اَوے ہوم'' وچ وی پڑھی سی۔ تائیوں، اوہنوں اپنی حیاتی اوس ناول دِیاں کُو نجاں ورگی لگی جیہڑیاں موسماں دے بدلن پاروں کدے نارتھ کیرولینا ٹُر جاندیاں تے کدے کینیڈا آ جاندیاں۔

ماریہ دا دل کیتا پئی اوہ کھل کے روو ے۔ اوہنوں پتہ سی، اوہ ہون، کدی وی اپنا جمن دیہاڑ نئیں مناوے گی۔ اوہدا دل کیتا پئی اوہدے بچپن دی سہیلی تے بہن، کلارہ، مرن داڈھونگ بند کر کے اوہدے سامنے آ کھلووے تے اوہ سارے پنڈ دے سامنے رَج کے کیکلی پاؤن۔ پَر اج ناں تے کیکلی پاؤن دا دن سی تے ناں ای گدا پاؤن دا۔

تریوے بھین بھرا بڑے دُکھی دل نال اپنے گھر ول جاندی گلی دی نُکر تے آ کھلوتے۔ شید اوہناں دی ہمت جواب دے گئی سی.... ہورے اوہ پچھاں مڑِ جاندے، پَر، پُورا پانی پور اوہناں دے پچھے کھلوتا ہو یا سی تے ہر بندے دیاں اکھاں وچ اتھرو سن۔ یشوع نوں اپنے گھر دیاں تازہ روٹیاں دی خوش بو آئی نالے اپنی ماں دی طاقت ور واج وی کنیں پئی:

''آ جاؤ۔۔ اگاں آؤ۔۔''

کسے نیں بُوہے وچ کھلو کے اوہناں نوں واج ماری۔ ایہہ واج تے جانی پچھانی سی، پَر، دُکھ وچ ڈُبی ہوئی۔

یشوع، شارلٹ تے ماریہ ٹُٹے ہوئے دِلاں نال اپنے گھر دے بُوہے تے اپڑے ہی سن کہ اک نظارے نیں اوہناں دیاں اکھاں چانن نال بھر دِتیاں۔ اوہ ماتم بُھل گئے تے کُھلیاں بانہواں نال اگاں ودھے جتھے کلارہ دی دھی اک جَل پَری دے پَنکھاں وچوں اپنا سوہنا مُنہ باہر کڈھ کے اوہناں نوں ''جی آیاں نوں آکھدی پئی سی!''



تصویر کشی: سید یاسر عثمان

غزلیں

خورشید رضوی

جو ہماری نہیں تھی، سر وہ مصیبت نہیں لی
شہر تیار تھا پر ہم نے ہی بیعت نہیں لی

جو میسر تھا لٹاتے رہے سرشاری میں
اہلِ دنیا سے کسی چیز کی قیمت نہیں لی

یک بیک ٹوٹ گیا، چارہ گری سے پہلے
دلِ بیمار نے ہم سے کوئی خدمت نہیں لی

ہم نے جو کچھ بھی کیا عمرِ دو روزہ میں کیا
ابدیت کے لئے مرگ سے مہلت نہیں لی

چاہنے والوں نے میرے، مجھے چاہا تو بہت
پر کسی نے مری میراثِ طبیعت نہیں لی

اس گرانی کی سکت ہی مرے کاندھوں میں نہ تھی
بھول کر ہاتھ میں آبا کی وصیت نہیں لی

کچھ اگر لیں تو صلہ اس کا چکائیں کیسے
اسی مشکل میں رہے، کوئی سہولت نہیں لی

بے سبب مشقِ سخن سے ہے خموشی اچھی
حرف باطل ہیں اگر دل سے اجازت نہیں لی

خورشید رضوی

یوں تو وہ شکل کھو گئی گردش ماہ و سال میں
پھول ہے اک کھلا ہوا حاشیۂ خیال میں

اب بھی وہ روئے دل نشیں زرد سہی حسیں تو ہے
جیسے جبین آفتاب مرحلۂ زوال میں

اب بھی وہ میرے ہم سفر ہیں روش خیال پر
اب وہ نشہ ہے ہجر میں تھا جو کبھی وصال میں

ان کے خرام ناز کو بوئے گل و صبا کہا
ہم نے مثال دی مگر رنگ نہ تھا مثال میں

اہل ستم کے دل میں ہے کیا مرے کرب کا حساب
ان کو خبر نہیں کہ میں مست ہوں اپنے حال میں

کیسا پہاڑ ہو گیا وقت گزارنا مجھے
زخم پہ جم گئی نظر خواہشِ اندمال میں

تو نے مرے خمیر میں کتنے تضاد رکھ دیئے
موت مری حیات میں، نقص مرے کمال میں

ظفراقبال

کب وہ ظاہر ہوگا اور حیران کر دے گا مجھے
جتنی بھی مشکل میں ہوں آسان کر دے گا مجھے

روبرو کرکے کبھی اپنے مہکتے سرخ ہونٹ
ایک دو پل کے لیے گلدان کر دے گا مجھے

روح پھونکے گا محبت کی مرے پیکر میں وہ
پھر وہ اپنے سامنے بے جان کر دے گا مجھے

خواہشوں کا خوں بہائے گا سرِ بازارِ شوق
اور مکمل بے سر و سامان کر دے گا مجھے

منہدم کر دے گا آ کر ساری تعمیراتِ دل
دیکھتے ہی دیکھتے ویران کر دے گا مجھے

ایک ناموجودگی رہ جائے گی چاروں طرف
رفتہ رفتہ اس قدر سنسان کر دے گا مجھے

یا تو مجھ سے وہ چھڑا دے گا غزل گوئی ظفرؔ
یا کسی دن صاحبِ دیوان کر دے گا مجھے

ظفراقبال

بے وفائی کرکے نکلوں یا وفا کر جاؤں گا
شہر کو ہر ذائقے سے آشنا کر جاؤں گا

تو بھی ڈھونڈے گا مجھے شوقِ سزا میں ایک دن
میں بھی کوئی خوبصورت سی خطا کر جاؤں گا

مجھ سے اچھائی بھی نہ کر میری مرضی کے خلاف
ورنہ میں بھی ہاتھ کوئی دوسرا کر جاؤں گا

مجھ میں ہیں گہری اداسی کے جراثیم اس قدر
میں تجھے بھی اس مرض میں مبتلا کر جاؤں گا

شور ہے اس گھر کے آنگن میں ظفرؔ کچھ روز اور
گنبد دل کو کسی دن بے صدا کر جاؤں گا

احمد مشتاق

خیر اوروں نے بھی چاہا تو ہے تجھ سا ہونا
یہ الگ بات کہ ممکن نہیں ایسا ہونا

دیکھتا اور نہ ٹھہرتا تو کوئی بات بھی تھی
جس نے دیکھا ہی نہیں اس سے خفا کیا ہونا

تجھ سے دوری میں بھی خوش رہتا ہوں پہلے کی طرح
بس کسی وقت برا لگتا ہے تنہا ہونا

یوں مری یاد میں محفوظ ہیں تیرے خد و خال
جس طرح دل میں کسی شے کی تمنا ہونا

زندگی معرکۂ روح و بدن ہے مشتاقؔ
عشق کے ساتھ ضروری ہے ہوس کا ہونا

صابر ظفر

کام اتنی ہی فقط راہ گزر آئے گی
ہم سفر جائے گا اور یادِ سفر آئے گی

دور تک ایک خلا ہے سو خلا کے اندر
صرف تنہائی کی صورت ہی نظر آئے گی

میں نے سوچا تھا مگر یہ تو نہیں سوچا تھا
تیرگی روح کے آنگن میں اتر آئے گی

جاگنے والا کوئی سویا ہمیشہ کے لیے
اب تو ماتم ہی کرے گی جو سحر آئے گی

اک عجب بوئے نفس آتی ہے دیواروں سے
اور کچھ روز میں یہ بھی نہ ادھر آئے گی

ہائے کیا لوگ تھے زنداں میں بھی ہم سے پہلے
اک دن اس یاد کی صورت بھی بکھر آئے گی

پڑھ رہا ہوں میں ظفرؔ اس کے بچھڑنے کی خبر
اور کچھ روز میں اپنی بھی خبر آئے گی

نذیر قیصر

دعا کا پھول پڑا رہ گیا ہے تھالی میں
ہوا اسے بھی اڑا دے نہ بے خیالی میں

وہ مجھ سے مانگ رہا ہے مجھے مری خاطر
میں خود کو ڈال نہ دوں کاسۂ سوالی میں

بس ایک موجۂ باد بہار گزری تھی
پرو گئی ہے مرا جسم ڈالی ڈالی میں

بکھرتا جاتا ہے کمرے میں سگرٹوں کا دھواں
پڑا ہے خواب کوئی چائے کی پیالی میں

دیے کے سامنے وہ سر جھکائے بیٹھی ہے
چمک رہی ہے مری رات اس کی بالی میں

سعادت سعید

صندلیں زمیں اپنی مرمریں مکاں اپنا
کون مرنا چاہے گا چھوڑ کر جہاں اپنا

مہر کے تماشے ہیں ماہ کے مناظر ہیں
رہنا مستقل ہوتا ان کے درمیاں اپنا

عمر جس کی جتنی ہے نقش اس کے اتنے ہیں
کون پھر زمانے میں پائے گا نشاں اپنا

جس پہ ہو سکے روشن نجم خوش حقیقت بھی
ڈھونڈھتی پھرے خلقت اک وہ آسماں اپنا

سلیم کوثر

دست دعا کو کاسۂ سائل سمجھتے ہو
تم دوست ہو تو کیوں نہیں مشکل سمجھتے ہو

سینے پہ ہاتھ رکھ کے بتاؤ مجھے کہ تم
جو کچھ دھڑک رہا ہے اسے دل سمجھتے ہو

ہر شے کو تم نے فرض کیا اور اس کے بعد
سائے کو اپنا مدمقابل سمجھتے ہو

دریا تمہیں سراب دکھائی دیا اور اب
گرد و غبارِ راہ کو منزل سمجھتے ہو

خوش فہمیوں کی حد ہے کہ پانی میں ریت پر
جو بھی جگہ ملے اسے ساحل سمجھتے ہو

تنہائی جلوہ گاہِ تحیر ہے اور تم
ویرانیوں کے رقص کو محفل سمجھتے ہو

جس نے تمہاری نیند پہ پہرے بٹھا دیئے
اپنی طرف سے تم اسے غافل سمجھتے ہو

افتخار عارف

انہیں میں جیتے انہیں بستیوں میں مر رہتے
یہ چاہتے تھے مگر کس کے نام پر رہتے

پیمبروں سے زمینیں وفا نہیں کرتیں
ہم ایسے کون خدا تھے کہ اپنے گھر رہتے

پرندے جاتے نہ جاتے پلٹ کے گھر اپنے
پر اپنے ہم شجروں سے تو باخبر رہتے

بس ایک خاک کا احسان ہے کہ خیر سے ہیں
وگرنہ صورتِ خاشاک در بہ در رہتے

مرے کریم جو تیری رضا مگر اس بار
برس گزر گئے شاخوں کو بے ثمر رہتے

کشمکش کم نہیں ہوتی کہ جہاں کھینچتا ہے
جب اُدھر جائیں ترا شوقِ عناں کھینچتا ہے

سامنا سہل نہیں ہے تری زیبائی کا
سحر ایسا ہے ترا جسم سے جاں کھینچتا ہے

اس طرح کھینچتی رہتی ہے تمنا تیری
جس طرح دشت میں چشمے کا گماں کھینچتا ہے

تیری آواز بلاتی ہے کنارے پہ ہمیں
اور کشتی کو اُدھر سیلِ رواں کھینچتا ہے

یاد آتا ہے خدا دیکھ کے صورت اُن کی
ذہن کعبے کی طرف حسنِ بتاں کھینچتا ہے

لوٹ آتے ہیں پرندے بھی نشیمن کی طرف
شام ہوتے ہی مکینوں کو مکاں کھینچتا ہے

تیرانداز پسِ پردہ چھپے رہتے ہیں
بھید کُھلتا ہی نہیں کون کماں کھینچتا ہے

باز گلزار نہ ہم آئیں گے سچ کہنے سے
کھینچ لے کوئی اگر منہ سے زباں کھینچتا ہے

عباس تابش

جاری ہے غزل پور کا میلہ اُسے کہنا
اور اُس میں کوئی اب بھی ہے تنہا اُسے کہنا

ہم لوگ تو پہلے ہی بہت ٹوٹے ہوئے ہیں
برتے نہ بہت سخت رویہ اُسے کہنا

کہنا کہ زمانے تو گزر جائیں گے لیکن
مجھ سے نہیں گزرے گا وہ لمحہ اُسے کہنا

کہنا کہ ابھی خود کو ہلاکت میں نہ ڈالے
اک سا تو نہیں وقت نے رہنا اُسے کہنا

یہ تلخ کلامی مری عادت تو نہیں ہے
انسان ہوں آجاتا ہے غصہ اُسے کہنا

اختر عثمان

ملو کہ سلسلہ رفتگاں رہے نہ رہے
ہمارے بعد ہمارا نشاں رہے نہ رہے

نہیں ملے گی پھر ارزانیِ ہنر ایسی
سو مال اُٹھا لو کہ پھر یہ دُکاں رہے نہ رہے

یہ اُن کا کام ہے جن کو نہیں ہے فکرِ فنا
یہ شعر یاد رہیں گے زباں رہے نہ رہے

نبود و بود سے آئندگاں کو کیا لینا
اُنہیں غرض ہی نہیں ہم یہاں رہے نہ رہے

جو ہو سو ہو بھلا صیاد کو ہے کیا پروا
چمن میں طوطیِ شیریں بیاں رہے نہ رہے

یہاں ہے کارِ حیات و ممات ایک ہی بات
مکیں رہے نہ رہے پھر مکاں رہے نہ رہے

یہ کُنجِ عافیت اختر بہت ہے جینے کو
کسے خبر کہ یہ جائے اماں رہے نہ رہے

ریاض مجید

رات دن محبوس اپنے ظاہری پیکر میں ہوں
شعلۂ مضطر ہوں میں لیکن ابھی پتھر میں ہوں

اپنی سوچوں سے نکلنا بھی مجھے دشوار ہے
دیکھ میں کس بے کسی کے گنبدِ بے در میں ہوں

دیکھتے ہیں سب مگر کوئی مجھے پڑھتا نہیں
گزرے وقتوں کی عبارت ہوں عجائب گھر میں ہوں

جرم کرتا ہے کوئی اور شرم آتی ہے مجھے
یہ سزا کیسی ہے میں کس عرصۂ محشر میں ہوں

تجھ کو اتنا کچھ بنانے میں مرا بھی ہاتھ ہے
میری جانب دیکھ میں بھی تیرے پس منظر میں ہوں

میرا دکھ یہ ہے میں اپنے ساتھیوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں

کون میرا پوجنے والا ہے جو آگے بڑھے
میں اکیلا دیوتا جلتے ہوئے مندر میں ہوں

شاہین عباس

موجۂ خونِ پریشان کہاں جاتا ہے
مجھ سے آگے مرا طوفان کہاں جاتا ہے

میں تو جاتا ہوں بیابانِ نظر کے اس پار
میرے ہم راہ بیابان کہاں جاتا ہے

اب تو دریا میں بندھے بیٹھے ہیں دریا کی طرح
اب کناروں کی طرف دھیان کہاں جاتا ہے

چائے کی پیالی میں تصویر وہی ہے کہ جو تھی
یوں چلے جانے سے مہمان کہاں جاتا ہے

داستاں گو کی نشانی کوئی رکھی ہے کہ وہ
داستاں گوئی کے دوران کہاں جاتا ہے

بات یوں ہی تو نہیں کرتا ہوں میں رک رک کر
کیا بتاؤں کہ مرا دھیان کہاں جاتا ہے

گھر بدلنا تو بہانہ ہے بہانہ کر کے
اندر اندر ہی سے انسان کہاں جاتا ہے

آفتاب حسین

کہاں کسی پہ یہ احسان کرنے والا ہوں
میں اپنے آپ کو حیران کرنے والا ہوں

عجیب رنگ کی خوشبو ہے میرے کیسے میں
میں شہر بھر کو پریشان کرنے والا ہوں

کھلا رہے گا کسی یاد کے جزیرے پر
یہ باغ میں جسے ویران کرنے والا ہوں

دعائیں مانگتا ہوں سب کی زندگی کے لیے
اور اپنی موت کا سامان کرنے والا ہوں

کچھ اور طرح کی مشکل میں ڈالنے کے لیے
میں اپنی زندگی آسان کرنے والا ہوں

منصور آفاق

کوئی تھا ریت پہ پیشانیاں رکھنے والا
دشت میں مر گیا طغیانیاں رکھنے والا

کیسے مشکل سے تعلق میں مجھے ڈال گیا
میری دہلیز پہ آسانیاں رکھنے والا

جسم پر آگ برسنے کا مزا لیتا تھا
ذہن میں ہجر کی ویرانیاں رکھنے والا

صحنِ سیلاب میں خوش کتنا نظر آتا ہے
دوش پر بے سروسامانیاں رکھنے والا

اب کسی اور محبت کا تمنائی ہے
ہر ملاقات میں حیرانیاں رکھنے والا

کیسے لاہور سے منصور نکل سکتا ہے
دل میں ہجویر کی تابانیاں رکھنے والا

فیصل عجمی

خواب کا اعتبار کر لوں کیا
آنکھ پر انحصار کر لوں کیا

میں نے کچھ بھی نہیں کہا تجھ سے
اور بھی اختصار کر لوں کیا

تیر آ کر مرے قریب گرا
کیا کروں، آر پار کر لوں کیا

ایک منظر بنانے والا ہوں
اس میں شامل بہار کر لوں کیا

شاخ سے پھول کیوں اتاروں میں
ہاتھ کو زیرِ بار کر لوں کیا

آنکھ میں اور کتنے آنسو ہیں
آج سب کو شمار کر لوں کیا

زندگی تو گزار سکتا ہوں
زندگی کو گزار کر لوں کیا

دل بھی خاموش ہوگیا فیصل
رفتگاں میں شمار کر لوں کیا

میر احمد نوید

خراب و خستہ واماندگاں گزر رہے ہیں
سبو ہٹاؤ کہ تشنہ دہاں گزر رہے ہیں

خوشی میں حد سے کہیں بڑھ نہ جائے ساز کی لے
رہے خیال کہ آزردگاں گزر رہے ہیں

اشارہ ہائے جرس ہیں نہ مژدۂ ناقوس
مثالِ یوسفِ بے کارواں گزر رہے ہیں

فقط ہمارا نہیں ہے تری گلی سے گزر
زمیں گزر رہی ہے آسماں گزر رہے ہیں

رکوع ہوتے چلے جارہے ہیں کون و مکاں
جدھر جدھر سے یہ آوارگاں گزر رہے ہیں

ملال یہ ہے ذرا بھی نہیں کسی کو ملال
ملال یہ نہیں ہم رائیگاں گزر رہے ہیں

کسے خبر کہ ہمیں داستاں سنا رہی ہے
یا ہم سناتے ہوئے داستاں گزر رہے ہیں

حسنین اکبر

ان پہ جتنا یقین تھا ٹوٹا
آج اک اور آئینہ ٹوٹا

ہم تعلق کی چھت سے پھینکے گئے
کانچ کی طرح حوصلہ ٹوٹا

پیڑ سے شاخ شاخ سے پتے
یوں ہمارا بھی قافلہ ٹوٹا

سوگواروں کی خیر، دل زدگاں
کیا بتاتے پھریں کہ کیا ٹوٹا

یہ عبادت میں پہلی بار ہوا
پوجنے سے مجسمہ ٹوٹا

چار حصوں میں بٹ گئی کڑیاں
اس تناؤ سے سلسلہ ٹوٹا

ہاتھ لرزے، ہوا میں پھیلی شراب
جام پھسلا، اڑا، گرا، ٹوٹا

اب دلاسوں سے کچھ نہیں اکبر
اس نے توڑا کہ رابطہ ٹوٹا

انجم سلیمی

اُن دنوں شہر میں معمار ہوا کرتے تھے
لوگ بھی شوق سے مسمار ہوا کرتے تھے

آج تو پرسشِ احوال کی امید نہیں
ہم بھی اک وقت تھا، بیمار ہوا کرتے تھے

نہر تھی، قریۂ شاداب تھا، اور گھر تھا کوئی
گھر جہاں نیند کے انبار ہوا کرتے تھے

ایک آواز کی زحمت ہی بہت ہوتے تھی
ہر دریچے پہ خریدار ہوا کرتے تھے

دیر لگ جاتی تھی کمرے سے نکلنے میں ہمیں
آئینے مائلِ گفتار ہوا کرتے تھے

ہائے کیا ماجرا پرور تھی وہ خم دار گلی
ہم بھی واں نقش بہ دیوار ہوا کرتے تھے

اک دیا، روز جگاتا ہے مجھے
سائے کا جسم بناتا ہے مجھے

ان کہی بات بھی سن لیتا ہوں
غیب سے بھی نظر آتا ہے مجھے

آئینوں نے بھی کہاں دیکھے ہیں
وقت جو چہرے دکھاتا ہے مجھے

کیسا بنتا ہے وہ میرے آگے
اور پھر کیسا بناتا ہے مجھے

اپنی تنہائی مٹانے کے لیے
ایک ویرانہ بلاتا ہے مجھے

نصرت صدیقی

خیال و فکر کی سرحد کے پار جاتے ہوئے
گریز پا ہے کوئی خواب میں بھی آتے ہوئے

کسی نے دیکھا نہیں کون ہے نشانے پر
کسی نے سوچا نہیں گولیاں چلاتے ہوئے

یہ سارے ہارنے والے بھی میرے اپنے ہیں
کہیں میں رو نہ پڑوں تالیاں بجاتے ہوئے

نجانے کونسا فرقہ خلاف ہو جائے
میں سہما رہتا ہوں مسجد میں آتے جاتے ہوئے

یہ فرض بھی ہے سنت بھی ایسا لگتا ہے
کسی کا بارِ علم دوش پر اٹھاتے ہوئے

گزرنا ہوتا ہے کٹھنایوں سے باز اوقات
الگ سے اپنا کوئی راستہ بناتے ہوئے

ہزار بار مجھے سوچنا پڑا نصرت
دیا جلاتے ہوئے اور دیا بجھاتے ہوئے

خواجہ رضی حیدر

گزری جو رہگزر میں اسے درگزر کیا
اور پھر یہ تذکرہ کبھی جا کر نہ گھر کیا

چشمِ سلیقہ ساز تو خاموش ہی رہی
رخصت پہ تیری دل نے بہت شور و شر کیا

آزردگانِ ہجر کی وحشت عجیب ہے
نکلے نہ گھر سے اور نہ آباد گھر کیا

بے برگ و بار جسم تھا محرومِ اعتبار
سرگرمیِ صبا نے شجر کو شجر کیا

اپنے سوا کسی کو یہ دل مانتا نہ تھا
اس دل کو استوار تری آنکھ پر کیا

یہ عشق مرحلہ تو سفر در سفر کا ہے
اب دیکھنا ہے کس نے کہاں تک سفر کیا

ایسے کشادہ دست کہاں کے تھے ہم رضیؔ
شاید لحاظ زحمت دریوزہ گر کیا

افضال احمد سید

یہ نہر آب بھی اس کی ہے ملک شام اس کا
جو حشر مجھ پہ بپا ہے وہ اہتمام اس کا

سپاہ تازہ بھی اس کی صف نگاہ سے ہے
صفائے سینۂ شمشیر پر ہے نام اس کا

امان خیمۂ رم خوردگاں میں باقی ہے
کہ نا تمام ہے اک شوق قتل عام اس کا

کتاب عمر سے سب حرف اڑ گئے میرے
کہ مجھ اسیر کو ہونا ہے ہم کلام اس کا

دل شکستہ کو لانا ہے رو بہ رو اس کے
جو مجھ سے نرم ہوا کوئی بند دام اس کا

میں اس کے ہاتھ سے کس زخم میں کمی رکھوں
شروع ناز بھی اس کا ہے اختتام اس کا

سعود عثمانی

عشق سامان بھی ہے بے سر و سامانی بھی
اسی درویش کے قدموں میں ہے سلطانی بھی

ہم بھی ویسے نہ رہے دشت بھی ویسا نہ رہا
عمر کے ساتھ ہی ڈھلنے لگی ویرانی بھی

وہ جو برباد ہوئے تھے ترے ہاتھوں وہی لوگ
دم بخود دیکھ رہے ہیں تری حیرانی بھی

آخر اک روز اترنی ہے لبادوں کی طرح
تن ملبوس یہ پہنی ہوئی عریانی بھی

یہ جو میں اتنی سہولت سے تجھے چاہتا ہوں
دوست اک عمر میں ملتی ہے یہ آسانی بھی

اکرام عارفی

تمہاری یاد کا ساون کہاں سے آتا ہے
یہ میری جان کا دشمن کہاں سے آتا ہے

شریکِ جام نہیں ہوں مگر یہ سوچتا ہوں
ترا بھرا ہوا برتن کہاں سے آتا ہے

یہ پائلیں تو مری طبع زاد ہیں لیکن
مرے کلام میں کنگن کہاں سے آتا ہے

فلک کو دیکھ رہا ہوں سوال کرتے ہوئے
ستارۂ رخِ روشن کہاں سے آتا ہے

حضور ہم تو رہینِ درِ محبت ہیں
حضور آپ کا راشن کہاں سے آتا ہے

اگر تجھے بھی خیالِ گدائے یار نہیں
تو روز رات کو سالن کہاں سے آتا ہے

واجد امیر

شام تک بچ رہیں جو چشمِ خریدار سے پھول
دل کرے سارے اُٹھا لاؤں وہ بازار سے پھول

عطر کی نہر میں رنگوں سے لدی ناؤ چلی
باندھ کر لائے ہیں ملاح بھی پتوار سے پھول

ابھی رکھنا ہے محبت کا تعلق تُجھ سے
جھانکتے ہیں ترے گھر کے دَر و دیوار سے پھول

پاس کی ساری زمیں مخملیں ہو جاتی ہے
صبح تک اتنے برس جاتے ہیں اشجار سے پھول

اُس نے جس شئے کو بنایا اُسے ویسا رکھا
پھول سے خار بنایا، نہ کبھی خار سے پھول

دائرے کھینچ کے رنگوں سے مزیّن کرکے
ہم بھی بچپن میں بناتے رہے پَرکار سے پھول

وسیم بریلوی

اسے سمجھنے کا کوئی تو راستہ نکلے
میں چاہتا بھی یہی تھا وہ بے وفا نکلے

کتاب ماضی کے اوراق الٹ کے دیکھ ذرا
نہ جانے کون سا صفحہ مڑا ہوا نکلے

میں تجھ سے ملتا تو تفصیل میں نہیں جاتا
مری طرف سے ترے دل میں جانے کیا نکلے

جو دیکھنے میں بہت ہی قریب لگتا ہے
اسی کے بارے میں سوچو تو فاصلہ نکلے

تمام شہر کی آنکھوں میں سرخ شعلے ہیں
وسیم گھر سے اب ایسے میں کوئی کیا نکلے

عتیق احمد جیلانی

ہوا کے ہوش اُڑانے اِدھر اُدھر ہوئے ہیں
چراغ دن کے بہانے اِدھر اُدھر ہوئے ہیں

شجر کے سائے سے نکلے ہوئے یہ خفتہ نصیب
ذرا سی دھوپ کمانے اِدھر اُدھر ہوئے ہیں

ہمیں تو ہجر کے آغاز ہی سے ہے معلوم
تمہارے ساتھ زمانے اِدھر اُدھر ہوئے ہیں

مجھے خبر ہی کہاں تھی رمِ غزالاں کی
میں سوچتا تھا نشانے اِدھر اُدھر ہوئے ہیں

میں خوش ہوں شہر کے دیوار و در سے مل کے عتیق
مگر جو یار پرانے اِدھر اُدھر ہوئے ہیں

ضبط گریہ میں بھی گریہ تو کیا ہے میں نے
چپ رہا ہوں پہ تماشا تو کیا ہے میں نے

اب اڑاؤں گا اسے تیرے فلک پر اک دن
اپنی مٹی کو اکٹھا تو کیا ہے میں نے

دیکھیے کس کے خد و خال نظر آتے ہیں
ایک دیوار کو شیشہ تو کیا ہے میں نے

اب میں کچھ اور بنوں ایسی بیابانی میں
ٹوٹ جانے کا ارادہ تو کیا ہے میں نے

کھل کے میں وصل کی باتیں نہیں کرتا پھر بھی
باتوں باتوں میں تقاضا تو کیا ہے میں نے

پیار کی حد ہی نہیں کوئی یہ مانا لیکن
جتنا ہو سکتا ہے اتنا تو کیا ہے میں نے

شاید آ جائے خبر اپنے علاوہ ہوں کہاں
خود کو تنہائی میں تنہا تو کیا ہے میں نے

مجھ میں تشکیک بھی سر اپنا اٹھا سکتی ہے
اے خدا تجھ پہ بھروسہ تو کیا ہے میں نے

جانے اب کون گلی میں کہیں نکلوں جا کر
ایک ویرانے میں رستہ تو کیا ہے میں نے

وہ کہیں ہے کہ نہیں ہے مجھے معلوم نہیں
اپنے ہونے کا اشارہ تو کیا ہے میں نے

اب فقط آخری عشق آخری مقصود وفاؔ
آخری عشق کہ پہلا تو کیا ہے میں نے

راجیش ریڈی

زندگی تو نے لہو لے کے دیا کچھ بھی نہیں
تیرے دامن میں مرے واسطے کیا کچھ بھی نہیں

آپ ان ہاتھوں کی چاہیں تو تلاشی لے لیں
میرے ہاتھوں میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں

ہم نے دیکھا ہے کئی ایسے خداؤں کو یہاں
سامنے جن کے وہ سچ مچ کا خدا کچھ بھی نہیں

یا خدا اب کے یہ کس رنگ میں آئی ہے بہار
زرد ہی زرد ہے پیڑوں پہ ہرا کچھ بھی نہیں

دل بھی اک ضد پہ اڑا ہے کسی بچے کی طرح
یا تو سب کچھ ہی اسے چاہئے یا کچھ بھی نہیں

افتخار حیدر

ناراض ہیں بچپن کے کئی یار ہمارے
افسوس کہ بدلے نہیں معیار ہمارے

اک دید پڑی رہتی ہے دہلیز کے اس پار
کچھ چہرے ہیں دہلیز کے اس پار ہمارے

ہم حسن کی چوکھٹ پہ یہاں سجدہ کناں ہیں
اور مصر میں آئے ہیں خریدار ہمارے

ہر دور میں ظالم کی ثنا کا تھا وطیرہ
ہر دور میں بکتے تھے قلمکار ہمارے

اک عشق ہی ناقابلِ تسلیم نہیں تھا
اخلاص و مروت بھی تھے بیکار ہمارے

تقلید کے قدموں میں جھکاتے رہے دانش
معبد ہی بناتے رہے معمار ہمارے

قمر رضا شہزاد

کسی کے عکس کو حیران کرنا چاہتا ہوں
میں سنگ و آئنہ یک جان کرنا چاہتا ہوں

بلند کرتا ہوں دست دعا کہ جیسے میں
کسی کی ذات پر احسان کرنا چاہتا ہوں

بہت حقیر ہے لیکن تجھے عطا کر کے
میں دل کو تخت سلیمان کرنا چاہتا ہوں

مجھے یہ زندگی دشوار بھی قبول مگر
کہیں کہیں اسے آسان کرنا چاہتا ہوں

میں ایسی کون سی شے کھو چکا ہوں جس کے عوض
سبھی کو بے سر و سامان کرنا چاہتا ہوں

علی زریون

بھڑک اُٹھی ہے وہی نارِ آتشیں مجھ میں
چمک رہا ہے ترا غم کہیں کہیں مجھ میں

صلوۃِ فجر سے لے کر عشائے آخر تک
درود پڑھتے ہیں اسمائے صابریں مجھ میں

ملائکہ بھی یہیں اور لائکہ بھی یہیں
کوئی جھلک ہی کسی غیر کی نہیں مجھ میں

کئی دنوں سے یہیں پر سکون سو رہی ہے
کسی مدار سے بچھڑی ہوئی زمیں مجھ میں

جو کیسٹوں سے کتابوں سے عشق کرتی تھی
کلام کرتی ہے وہ نسلِ آخریں مجھ میں

جو رسم اب صفِ دلدادگاں میں رائج ہے
یہ سربلند ہوئی تھی تو اوّلیں مجھ میں!

خدا ہی جانے کہ اب کیا کلام ہو زریون!
کہ اٹھنے والی ہے سجدے سے اک جبیں مجھ میں!

اظہر فراغ

کسی کسی کا الگ انتظام ہوتا ہے
خدا کے ہاں بھی سفارش سے کام ہوتا ہے

مغالطے میں ہوس آزما نہ ہو جانا
وہ بے لباس نہیں بے نیام ہوتا ہے

کسی کو اشک بہاتے ہوئے بہا دینا
یہ صبر سے بھی بڑا انتقام ہوتا ہے

غبارِ راہ کا چسکا نہ ہو اگر ہم کو
سفر تو اصل میں دو چار گام ہوتا ہے

حویلی اتنی کشادہ بنی ہوئی ہے فراغ
مہینوں بعد کسی سے کلام ہوتا ہے

ادریس بابر

ربط اسیروں کو ابھی اس گل تر سے کم ہے
ایک رخنہ سا ہے دیوار میں در سے کم ہے

حرف کی لو میں ادھر اور بڑھا دیتا ہوں
آپ بتلائیں تو یہ خواب جدھر سے کم ہے

ہاتھ دنیا کا بھی ہے دل کی خرابی میں بہت
پھر بھی اے دوست تری ایک نظر سے کم ہے

سوچ لو میں بھی ہوا چپ تو گراں گزرے گا
یہ اندھیرا جو مرے شور و شرر سے کم ہے

وہ بجھا جائے تو یہ دل کو جلا دے پھر سے
شام ہی کون سی راحت میں سحر سے کم ہے

خاک اتنی نہ اڑائیں تو ہمیں بھی بابرؔ
دشت اچھا ہے کہ ویرانی میں گھر سے کم ہے

عدنان محسن

نہ تشنہ لب تھے نہ تشنہ لبی سے خالی تھے
بھرے ہوئے تھے کسی سے کسی سے خالی تھے

تو کیا ان آنکھوں میں کاجل بکھرتا جاتا تھا
تو کیا وہ ہونٹ گلابی ہنسی سے خالی تھی

ہماری راتیں مہکتی تھیں تیری باتوں سے
ہمارے دن تری موجودگی سے خالی تھے

ترے اجالے کے ہالے سے انخلا کے سبب
خلا میں رہتے تھے اور روشنی سے خالی تھے

ابھی تو باندھ رہا تھا وہ اپنا رخت سفر
خیال و خواب کے رستے ابھی سے خالی تھے

قمار خانۂ ہستی میں ہارتے بھی تو کیا!
ہمارے ہاتھ تو آغاز ہی سے خالی تھے

کسی کو میر کی مسند پہ لا بٹھایا گیا
کسی کے لفظ مگر شاعری سے خالی تھے

عجیب چہرے تھے کتبے دکھائی دیتے تھے
مزار جیسے بدن زندگی سے خالی تھے

ذوالفقار عادل

مجھ کو یہ وقت وقت کو میں کھو کے خوش ہوا
کاٹی نہیں وہ فصل جسے بو کے خوش ہوا

وہ رنج تھا کہ رنج نہ کرنا محال تھا
آخر میں ایک شام بہت رو کے خوش ہوا

صاحب وہ بو گئی نہ وہ نشہ ہوا ہوا
اپنے تئیں میں جام و سبو دھو کے خوش ہوا

ایسی خوشی کے خواب سے جاگا کہ آج تک
خوش ہو کے سو سکا نہ کبھی سو کے خوش ہوا

چھانی اک عمر خاک خوشی کی تلاش میں
ہونا تھا رزق خاک مجھے ہو کے خوش ہوا

عادلؔ مرا لباس ہی ہم رنگ داغ تھا
کار رفو کیا نہ کبھی دھو کے خوش ہوا

شاہد ذکی

بہار آئے گی اور میں نمو نہیں کروں گا
خزاں کو اب کے برَس سرخرو نہیں کروں گا

یہ دودھ کوزۂ آلودہ کے لئے نہیں ہے
میں ہر کسی سے تری گفتگو نہیں کروں گا

دکھاؤں گا تری بے چہرگی تجھے کسی دن
اور آئینہ بھی ترے رُو بہ رُو نہیں کروں گا

کروں گا میں ترے ساتھ دشمنی لیکن
ترے قبیلے کو بے آبرو نہیں کروں گا

مجھے چراغِ خموشی جلانا آتا ہے
میں روشنی کے لئے ہاؤ ہو نہیں کروں گا

مجھے نشان زدہ کوئی شے پسند نہیں
وہ زخم ہو کہ تبسم، رفو نہیں کروں گا

اختر رضا سلیمی

وہ حسن سبز جو اترا نہیں ہے ڈالی پر
فریفتہ ہے کسی پھول چننے والی پر

میں ہل چلاتے ہوئے جس کو سوچا کرتا تھا
اسی کی گندمی رنگت ہے بالی بالی پر

یہ لوگ سیر کو نکلے ہیں سو بہت خوش ہیں
میں دل گرفتہ ہوں سبزے کی پائمالی پر

اک اور رنگ ملا آ کے سات رنگوں میں
شعاع مہر پڑی جب سے تیری بالی پر

میں کھل کے سانس بھی لیتا نہیں چمن میں رضاؔ
مبادا بار گزرتا ہو سبز ڈالی پر

افضل خان

رشتوں نے رسی باندھ کے کھینچا نکیل سے
اٹھا نہیں اٹھایا گیا ہوں میں ریل سے

دلواؤں گا شجر کو اماں اس چڑیل سے
الجھا ہوں بال کھولتی آکاس بیل سے

تنہائی اور غم کے بنے تال میل سے
آنسو فرار ہو گئے آنکھوں کی جیل سے

نکلا ہوں نجم و مہر و قمر کے شکار پر
چڑیوں کو خوف آئے نہ میری غلیل سے

اک حد تلک ہے ٹھیک، خوشی ہو کہ مال و زر
میں مطمئن ہوا نہ کبھی ریل پیل سے

دنیا سے پیٹھ موڑ کے بیٹھے ہوئے ہیں ہم
کیوں ہو دعا سلام پرائی رکھیل سے

خالد ندیم شانی

خط کے چھوٹے سے تراشے میں نہیں آئیں گے
غم زیادہ ہیں لفافے میں نہیں آئیں گے

ہم نہ مجنوں ہیں نہ فرہاد کے کچھ لگتے ہیں
ہم کسی دشت تماشے میں نہیں آئیں گے

مختصر وقت میں یہ بات نہیں ہو سکتی
درد اتنے ہیں خلاصے میں نہیں آئیں گے

اس کی کچھ خیر خبر ہو تو بتاؤ یارو
ہم کسی اور دلاسے میں نہیں آئیں گے

جس طرح آپ نے بیمار سے رخصت لی ہے
صاف لگتا ہے جنازے میں نہیں آئیں گے

نعیم گیلانی

تیرے ہوتے ہوئے بھی خانہ پری میں گم تھی
آخری شام تھی اور پہلو تہی میں گم تھی

ایسے لمحوں کی وضاحت نہیں کی جاسکتی
خامشی کیسی تھی، اور کس کی ہنسی میں گم تھی

ڈھونڈتے پھرتے تھے سب ثابت و سیّار جسے
جانے کیا شے تھی کہ جو اس کی گلی میں گم تھی

اب تو یہ آنکھ ہے اور آنکھ کا خالی پن ہے
کیا زمانہ تھا کہ جب جلوہ گری میں گم تھی

جو مجھے پار لگانے پہ مقرر تھی یہاں
ایک ہی لہر تھی اور بہتی ندی میں گم تھی

اس کے ہونے پہ بھی اندوہِ جدائی تھا وہی
سر خوشی کیا تھی کہ افسردہ دلی میں گم تھی

روح سے خالی بدن تھا مرے پہلو میں نعیم
ساعتِ وصل تھی اور اس کی کمی میں گم تھی

کاشف حسین غائر

سو طرح کی مشکلیں ہیں مجھ کو آسانی کے ساتھ
شہر میں آباد ہوں میں اپنی ویرانی کے ساتھ

حبس بڑھتا تھا تو پھر اُس پر برس پڑتا تھا میں
اور بادل دیکھتا تھا مجھ کو حیرانی کے ساتھ

خاک ہو کر بھی تعاون کر رہا ہوں، دیکھیے
اِس ہوا کے ساتھ میں، اِس آگ، اِس پانی کے ساتھ

آدمی کو دہر میں ہے کس قدر مہنگی پڑی
عمر بھر رہنے کی خواہش، لمحۂ فانی کے ساتھ

جانے کیوں اس راہ پر کچھ دور تک چلنے کے بعد
لوگ تھک کر بیٹھ جاتے ہیں پشیمانی کے ساتھ

میں لباسِ آبرو مندی میں گوشہ گیر ہوں
اور وہ محفل میں نمایاں اپنی عریانی کے ساتھ

غائر اُس کو بھول جانے سے عجب عقدہ کھلا
میں کسی کو بھی بھلا سکتا ہوں آسانی کے ساتھ

شبیر حسن

ہم باوجود خیر و خبر گُم ہوئے ملے
سب سے ملے ہیں روز مگر گُم ہوئے ملے

آئے گا کوئی شہرِ تغافل سے ڈھونڈھنے
ہم کو سنبھال رکھنا اگر گم ہوئے ملے

اس عالمِ خراب میں بہتر ہے کم نگہ
جتنے بھی آئے تیز نظر گم ہوئے ملے

شہرت کمانا خامہ بدوشوں کا کام ہے
ہم سے ہزار خانہ بسر گم ہوئے ملے

کھویا ملے گا وہ بھی کسی خوش نصیب کو
اک خوش نظر کو ہم بھی ادھر گم ہوئے ملے

تہذیب حافی

وہاں اس نے جانے کی بات کی یہاں میرا چہرہ اتر گیا
مرا آئینہ مجھے دیکھ کر مرے خال و خد سے مکر گیا

وہ مرا نہیں بھی تو کیا ہوا مجھے اس کی خوشیاں عزیز ہیں
اسے پہلی بیٹی عطا ہوئی مرا گھر کھلونوں سے بھر گیا

میں محبتوں کی قبیل سے کسی گھر کا آخری فرد ہوں
کہیں چاند دیکھا تو رو پڑا کہیں پھول دیکھے تو ڈر گیا

ہمیں فرصتیں ہی کہاں ملیں کہ ہم ایک دوجے کو دیکھتے
کبھی چاند آگیا ابر میں کبھی میں بھی چھت سے اتر گیا

مرے بے نیاز تری طلب کا معاملہ ہی کچھ اور ہے
کوئی تیری دھوپ میں جی اٹھا کوئی تیری چھاؤں میں مر گیا

تو پکارتا نہ پھرے کہیں مجھے دشت زعم گریز میں
میں ہوں ایک لمحۂ رائیگاں ، میں گزر گیا تو گزر گیا

جواد شیخ

نہیں ہے منحصر اِس بات پر یاری ہماری
کہ تُو کرتا رہے ناحق طرف داری ہماری

اندھیرے میں ہمیں رکھنا تو خاموشی سے رکھنا
کہیں بیدار ہو جائے نہ بیداری ہماری

مگر اچھا تو یہ ہوتا کہ ہم اک ساتھ رہتے
بھری رہتی ترے کپڑوں سے الماری ہماری

ہم آسانی سے کھل جائیں مگر اک مسئلہ ہے
تمہاری سطح سے اوپر ہے تہہ داری ہماری

کہانی کار نے کردار ہی ایسا دیا ہے
اداکاری نہیں لگتی اداکاری ہماری

ہمیں جیتے چلے جانے پہ مائل کرنے والی
یہاں کوئی نہیں لیکن سخن کاری ہماری

عمار اقبال

رویا میں خواب میں اِدھر، اور اُدھر جناب کی، نیند خراب ہو گئی
اوس کی ایک بوند سے، آدھے کھلے گلاب کی، نیند خراب ہو گئی

عشق کی اندھی راہ میں، درد کو بھر کے آہ میں، فقر سے رسم و راہ میں
ایک فقیر چل بسا اور کسی نواب کی نیند خراب ہو گئی

چشمِ غزالِ مست میں دیکھا سگانِ دشت نے دشت کے عین وسط میں
کیسے محیط وقت میں سوئے ہوئے سراب کی، نیند خراب ہو گئی

برف کو چپ کی توڑ کر چھیڑی جو بات آپ نے، تار ہزار چھڑ گئے
سازوں کی خوابگاہ میں جیسے کسی رباب کی نیند خراب ہو گئی

دید میں دقتوں کی تھا سوچ میں رفعتوں کی تھا خواب میں وسعتوں کے تھا
اور پھر اس خمار میں اڑتے ہوئے عقاب کی نیند خراب ہو گئی

پہلے کہاں جنون تھا، پانی تو پر سکون تھا، لیکن یہ کیا سے کیا ہوا
روکی جو راہ آپ نے، راوی کی اور چناب کی نیند خراب ہو گئی

ایک دن اپنی جان لی، ایسی خموشی تان لی، موت کی بات مان لی
شام کے چارہ ساز کی رات نہیں خراب کی نیند خراب ہو گئی

سجاد بلوچ

فضل گیلانی

یہ زمیں گھومتی ہے یا مرا سر گھومتا ہے
کچھ تو ایسا ہے کہ جو آٹھ پہر گھومتا ہے

وقت تھم جاتا ہے جب میز پہ رکھا یہ گلوب
میری مرضی سے ادھر اور ادھر گھومتا ہے

میں تو مدت سے یہیں خاک بسر پھرتا ہوں
یہ بتا دشت میں تو آج کدھر گھومتا ہے؟

اک تعلق ہے تمدن کا بھی ویرانے سے
ہر بیاباں میں کوئی شہر بدر گھومتا ہے

رقص یوں کرتا ہے آہنگِ جنوں پر درویش
جس طرح موج کی مستی میں بھنور گھومتا ہے

بے قراری ہے نہ ہونے کو عجب ہونے کی
ایک ساکن ہے یہاں، صفر مگر گھومتا ہے

نہیں جاتی یہ حیرانی ہماری
وہی ہے خواب سامانی ہماری

ہمارے پاس اس کی مشکلیں ہیں
اور اس کے پاس آسانی ہماری

سبھی کی دسترس میں آ رہے ہیں
کوئی دیکھے تو ارزانی ہماری

بتا قدموں پہ تیرے کیا جچے گا
ہمارا دل کہ پیشانی ہماری

اسی پت جھڑ میں کوئی فصلِ گل ہے
رہے آباد ویرانی ہماری

کسی کو کیوں بتائیں حال اپنا
ہماری ہے پریشانی ہماری

فیصل ہاشمی

مٹنے والا تھا جو اک نقش اُبھارا میں نے
اپنے ہونٹوں سے لگا زنگ اُتارا میں نے

آئینہ عمر کی تفصیل بتا دیتا ہے
اک نظر دیکھ لیا خود کو دوبارہ میں نے

ویسی ہی شکل کا اک شخص مرے سامنے تھا
ٹوٹتی نیند میں جو نام پکارا میں نے

رقص فرماتی ہوئی (گاتی ہوئی) ٹہنی سے
اک مجاور کی طرح پھول اتارا میں نے

جو دریچے میں دیے رکھ کے چلا جاتا تھا
اس کو بھیجا تھا سرِشام ستارا میں نے

اُٹھ کے درویش مرے پاس چلا آیا تھا
رکھ دیا کاسہء خالی میں اشارا میں نے

رنگ دریا کا مرے سامنے تبدیل ہوا
تیغِ خوش رنگ کو پانی سے گزارا میں نے

حماد نیازی

کس کو معلوم بھلا کتنے جتن سے آئی
ایک شادابی جو برسوں کی تھکن سے آئی

نو بہ نو پھول کھلے جاتے تھے سر شاری میں
اس کے آنے کی خبر سرو و سمن سے آئی

نشۂ چشم کوئی ایسے لہو میں اترا
اک جنوں خیز مہک میرے بدن سے آئی

ساعتِ وصل تھی یا ساعتِ مسعود کوئی
میری سیرابی کی تصدیق چمن سے آئی

جس نے بھی نام لیا نام محبت مرے دوست
روشنی بہتی ہوئی اس کے دہن سے آئی

زینۂ صبح پہ اس یاد کی بوندیں برسیں
اور وہ مانوس ہوا ارضِ وطن سے آئی

توقیر تقی

اب تک جو جی چکا ہوں جنم گن رہا ہوں میں
دنیا سمجھ رہی ہے کہ غم گن رہا ہوں میں

متروک راستے میں لگا سنگ میل ہوں
بھٹکے ہوئے کے سیدھے قدم گن رہا ہوں میں

ٹیبل سے گر کے رات کو ٹوٹا ہے اک گلاس
بتی جلا کے اپنی رقم گن رہا ہوں میں

تعداد جاننا ہے کہ کتنے مرے ہیں آج
جو چل نہیں سکے ہیں وہ بم گن رہا ہوں میں

اس کی طرف گیا ہوں گھڑی دیکھتا ہوا
اب واپسی پہ اپنے قدم گن رہا ہوں میں

انگلی پہ گن رہا ہوں سبھی دوستوں کے نام
لیکن تمہارے نام پہ ہم گن رہا ہوں میں

میں سنتری ہوں عورتوں کی جیل کا حضور
دو چار قیدی اس لیے کم گن رہا ہوں میں

آرشؔ صراحی دار سی گردن کے سحر میں
زمزم سی گفتگو کو بھی رم گن رہا ہوں میں

جاگا جو پور پور میں قندیل کی طرح
اس راہبہ کا لمس تھا انجیل کی طرح

بے وصل ہی رہی ہے ملاقات حسن سے
مریم سے بھی ملے ہیں تو جبریل کی طرح

جتنا میں اُس کے دل میں اترتا چلا گیا
گہری وہ اور ہوتی گئی جھیل کی طرح

تصویرِ خود نمائی میں میں بھی شریک تھا
دیوار پر لگائی ہوئی کیل کی طرح

کس کس کا دل وہ روند کے آئی مری طرف
شوخی سے سر پٹختی ہوئی ہیل کی طرح

سر چڑھ کے بولتا ہے نشہ پہلے پیار کا
بوتل کے کارک پر سے ہٹی سیل کی طرح

بنتا ہے دوستوں کا مرے بارے پوچھنا
گردن پہ پہلی رات پڑے نیل کی طرح

کھینچوں تو کٹ نہ جائے محبت کی ڈور سے
رشتہ ہے اُس پتنگ سے اب ڈھیل کی طرح

فیضان ہاشمی

ہوتا نہیں تھا مجھ سے محبت پہ کوئی شعر
اُس کو گلے لگا کے ہی تکمیل کی طرح

توقیر کوئی جاتے ہوئے دیکھ لے مجھے
پتھر پہ میں بھی نقش ہوا میل کی طرح

اگرچہ اس میں کئی مشکلات دیکھتی ہے
مگر یہ خواب وہ ہر ایک رات دیکھتی ہے

یقیں ہے رُشد سا اسکو حواسِ خمسہ پر
فزکس کھولتی ہے دینیات دیکھتی ہے

کسی کو رد نہیں کرتی ہے وہ خدا کی طرح
ہر اک عمل میں چھپی نفسیات دیکھتی ہے

ہم ایک دوسرے کے سامنے ہیں اور اس وقت
اسی نظارے کو کل کائنات دیکھتی ہے

اسی سرائے میں ٹھہرو کہ ایک رقاصہ
یہاں پہ قافلے والوں کے ہاتھ دیکھتی ہے

عابد ملک

گھر مرا تھا، نہ وہاں کوئی گلی میری تھی
اس جگہ صِرف غریبُ الوَطنی میری تھی

یونہی کرتا تھا میں لوگوں سے گلہ دوری کا
مجھ میں اوروں سے زیادہ تو کمی میری تھی

جتنے چہرے مجھے یاد آئے، سی کے آئے
وہ جو اِک شکل مجھے بھول گئی، میری تھی

باغ میں پھول کے موسم کا بھی اِک موسم ہے
میں ہی یہ بات نہ سمجھا، غَلَطی میری تھی

آج احساس ہوا ہے کہ جدا ہیں ہم لوگ
ایک تصویر ملی ہے جو تِری میری تھی

بن گیا حال اب اس کا جو مرا ماضی تھا
ہو گئی اس کی وہ حالت جو کبھی میری تھی

عقیل شاہ

یقیں کی سمت دلِ بے یقیں سے تیر آیا
ہمیں ہدف پہ رہے اور ہمیں سے تیر آیا

کسی سے رابطہ کوئی نہ واسطہ کوئی
پھر اِس جزیرے پہ کس سر زمیں سے تیر آیا

ابھی قدم ہی نکالا تھا سیرِ دُنیا کو
کہیں سے گولی چلی اور کہیں سے تیر آیا

ہلاکِ ثابت و سیار ہم تو پہلے ہی تھے
پر اب کی بار جو ماہِ مبیں سے تیر آیا

ذرا سنبھلنے کا موقع نہیں ملا مجھ کو
میں کیا بتاؤں کہ کتنے قریں سے تیر آیا

عقیل دوستی میں شک حرام ہے لیکن
جہاں ہے خیمہء یاراں وہیں سے تیر آیا

اسامہ ضوریز

اب ایک سانس کے بدلے میں اک صدی کم ہے
تمہارے ساتھ تو لگتا تھا، زندگی کم ہے

ہمارے ساتھ گزارے تھے اس نے کچھ لمحے
ہمیں اِسی لیے احساسِ کمتری کم ہے

وہ چار پائی جہاں ہم نے خواب دیکھے تھے
وہیں پڑی ہے مگر ایک آدمی کم ہے

تمہارے جانے کا دکھ تو بہت زیادہ تھا
مگر تمہارے پلٹ آنے کی خوشی کم ہے

عجیب دسترسِ یار کا معاملہ ہے
ابھی ابھی تھی زیادہ، ابھی ابھی کم ہے

نہ پوچھ کیسے مرے منظروں سے دور ہوئے
وہ لوگ جن پہ تری روشنی پڑی کم ہے

فہد محمود سوختہ

دستک جو نہیں اس کی میسر اسے کہنا
دیوار میں اک زخم ہے یہ در اسے کہنا

ہم خود تو سنبھل آئے ہیں کچھ ہجر میں اس کے
حالات بھی ہو جائیں گے بہتر اسے کہنا

ہر شے کی شکایت سے تو ملتی نہیں راحت
کانٹوں سے مہکتا نہیں منظر اسے کہنا

کب دیکھتے رہنے سے ہوا کچھ مگر اس کے
دیکھے سے سنورتے ہیں مقدر اسے کہنا

اس سمت اٹھا لے گئے ہم شیشۂ جاں کو
جس سمت سے آیا کبھی پتھر اسے کہنا

ہر اشک تو آنکھوں سے بہایا نہیں جاتا
کچھ زخم تو رہ جاتے ہیں اندر اسے کہنا

درکار جہاں وقت ہو پیسہ نہیں چلتا
سب رشتے مٹا دیتا ہے دفتر اسے کہنا

تجمل کاظمی

ارسلان راٹھور

رنجِ وارفتگاں کا حصہ ہو
شورشِ جاوداں کا حصہ ہو

تم ہو، معدوم لفظیات کا دکھ
اور اُردو زباں کا حصہ ہو

اس قدر نیلگوں سمندر ہے
جیسے اس آسماں کا حصہ ہو

ایک وحشت بھری اداسی بھی
چاہتی ہے مکاں کا حصہ ہو

ساحلوں کے سپرد کر دینا
جو بھی آبِ رواں کا حصہ ہو

میں سمجھتا تھا، خیر، آخر تُم
اِسی بے حِس جہاں کا حصہ ہو

چشموں کے خواب میں رہے ڈوبے پڑے ہوئے
حلقے تھے اس کی آنکھ میں گہرے پڑے ہوئے

تازہ گُلوں کے عطر سے بازار گرم ہے
چاروں طرف کے باغ ہیں ٹھنڈے پڑے ہوئے

بستر پر ایک عمر سے شب بے سکون ہے
اک روز تھے یہاں ترے تکیے پڑے ہوئے

بے دَم غبار چاند ستارے پڑے ہوئے
اس کی شکار گاہ میں لوٹے پڑے ہوئے

پھرتے ہیں دل کے زخم میں گریے ملال کے
بے آب ہو رہے ہیں نگینے پڑے ہوئے

رانا عامر لیاقت

دلوں میں خوف کے چولھے کی آگ ٹھنڈی ہو
کبھی نہ ملنے ملانے کی آگ ٹھنڈی ہو

ہم ایک ساتھ اٹھا لائے تھے یہ ہجر کی آگ
خدا کرے، ترے حصے کی آگ ٹھنڈی ہو

پگھل رہے ہیں ہم اک فاصلے پہ بیٹھے ہوئے
گلے لگو کہ یہ سینے کی آگ ٹھنڈی ہو

پکارتا ہے مجھے کیوں ابھی سے دوسرا عشق
ابھی تو فکر ہے پہلے کی آگ ٹھنڈی ہو

میں اس لئے بھی تری ہاں میں ہاں ملاتا رہا
کسی طرح ترے لہجے کی آگ ٹھنڈی ہو

مرے حریف سے کہہ دو اسے معاف کیا
میں چاہتا ہوں کہ بدلے کی آگ ٹھنڈی ہو

خرم آفاق

خبر تو ہو کہ جوازِ کتاب کونسا ہے
ہمارا ذکر ہے جس میں وہ باب کونسا ہے

کسی نے شاخ پہ اس طرح ہونٹ رکھے ہیں
کوئی پتہ نہیں چلتا گلاب کونسا ہے

وہ پیاس ہے کہ قریب آ کے بھی نہیں کھلتا
کہ پانی کونسا ہے اور سراب کونسا ہے

میں تیری سمت کئی راستوں سے آیا ہوں
سو جانتا ہوں زیادہ خراب کونسا ہے

یہ روز وقتِ مقرر پہ کُھلنے والی آنکھ
لحاظ ہی نہیں کرتی کہ خواب کونسا ہے

عقیل عباس

فیاض بوستان

غار تھا غار کی تنہائی تھی آگے میں تھا
دفعتاً آگ سی لہرائی تھی آگے میں تھا

اسی ٹیبل پہ جہاں بیٹھ کے کھاتے تھے کبھی
تو کسی اور کے ساتھ آئی تھی آگے میں تھا

رات کھڑکی سے کوئی چیز گری کمرے میں
موم بتی سی وہ تھرائی تھی آگے میں تھا

زندگی میں تجھے رستے سے اٹھا لایا ہوں
تو کسی اور سے ٹکرائی تھی آگے میں تھا

پیش رو کوئی سر راہ نجف تھا ہی نہیں
پیچھے پیچھے مری مولائی تھی آگے میں تھا

جگنوؤں کی قسم دیوں کی قسم
خوبصورت ہے تو دنوں کی قسم

تیرے بن دنیا چل نہیں سکتی
گھر کے متروک برتنوں کی قسم

مجھ سے نیندوں نے پردہ کر لیا ہے
تیرے مستور بازوؤں کی قسم

ختم ہے تجھ پہ داستانِ حیا
تیرے ہمراز آئینوں کی قسم

تو بہت سیدھی سادی لڑکی ہے
شکن آلود بستروں کی قسم

تیرا ساتھ اچھا لگتا ہے مجھ کو
راستوں کی قسم گھروں کی قسم

زندگی سے مجھے محبت ہے
رسیوں کی قسم کنوؤں کی قسم

میرے احباب مجھ سے مخلص ہیں
مجھ کو یوسف کے بھائیوں کی قسم

علی قائم نقوی

گلی سے قافلۂ رنگ و بُو گزرتا تھا
کبھی فقیر بہاروں کا کرتا دھرتا تھا

تری کمی نے بتایا کہ ریگِ صحرا ہوں
میں اپنے آپ کو دریا شمار کرتا تھا

کہاں سے آ گئی پیچیدگی محبت میں
یہ قافیہ تو بڑی سادگی سے بَرتا تھا

یہ کیسی دیدہ دلیری سِکھا دی دنیا نے
وہ ابتداء میں تو آئینے سے بھی ڈرتا تھا

مرے سخن کی رسائی پہ اُنگلیاں نہ اُٹھا
کبھی یہ زینہ ترے دل میں بھی اُترتا تھا

راکب مختار

خاکی پیکر ہے مگر خاک نشینوں سے نہیں
شہر سے جائے گا عشاق کے سینوں سے نہیں

تو نے لڑتے ہوئے گالی کا سہارا لیا تھا
صلح انسان سے کرتا ہوں کمینوں سے نہیں

دھوکہ دیتی ہے یہ محراب کی کالک اکثر
لوگ کردار سے کھلتے ہیں جبینوں سے نہیں

ان کی قسمت جنہیں دریا سے محبت تھی بہت
کوئی شکوہ مجھے غرقاب سفینوں سے نہیں

مجھ سے اک پل کی بھی غفلت نہ برتنے والے
رابطہ خود سے مرا کتنے مہینوں سے نہیں

بادشاہا تجھے آئینہ دغا دیتا ہے
تاج انصاف سے سجتا ہے نگینوں سے نہیں

صرف اک قبر مقرر کے علاوہ راکب
کوئی لالچ مجھے پرگھوں کی زمینوں سے نہیں

احسان اصغر

مرے سمیت یہاں جو بھی ہے، یہ سب میں ہوں
وجودِ علتِ اولیٰ! ترا سبب میں ہوں

یہی کہ نیزۂ تشکیک کے نشانے پر
کبھی خدا ہوا کرتا تھا اور اب میں ہوں

بہت سکون میں ہیں سب درونِ شہرِ وجود
عدم کے پار۔۔ اگر ہوں۔۔ تو جاں بَہ لَب میں ہوں

یہ دشت کیا ہے؟ یہ دریا سے مختلف کیوں ہے؟
یہ مختلف کا تصور بھی تب ہے، جب میں ہوں

مرے سفر میں کئی بار وہ مقام آیا
کہا تھا جس جگہ منصور نے، کہ رب میں ہوں

میں کس سے جان بچاوں کسے شکار کروں؟
غزالِ زخم زدہ میں ہوں! گرگِ شب میں ہوں

اگر میں ہوں۔۔ اور اگر تم بھی ہو۔۔ تو پھر سن لو
اداس مت ہو کہ ہر شے سے بے طلب میں ہوں

نگارِ خواب سرِ چشمِ تر ٹھہر کوئی دیر
کہ کوئی دیر ہیں ہم اور یہ سفر کوئی دیر

بکھر رہا ہے رگوں میں بلا کا سناٹا!
سکوت اوڑھنے والے کلام کر کوئی دیر

مگر یہ دیکھ کہ جھڑنے لگے نظر کے گلاب
ہوائے تند اگرچہ ہے تو اِدھر کوئی دیر

پھر ایک پیچ و خمِ شاخ کا تماشا ہے
دکھائی دیتی ہے جنگل میں رہگزر کوئی دیر

نہیں رہیں گے تماشے میں کوئی دم ہم لوگ
رہی وہ آنکھ اگر ہم سے بے خبر کوئی دیر

ہم اپنی خاک کہیں دیکھ لیں تو دیکھیں گے
پرے رکھو ابھی افتادِ خیر و شر کوئی دیر

نگاہِ خاک میں نم آسماں پہ ابر رہا
وہ سرخوشی تھی ہواؤں سے پیشتر کوئی دیر

چلی چلے گی ابھی رسم بے نیازی کی
بسا رہے گا ابھی اور یہ نگر کوئی دیر

کفیل رانا

اگر وہ چومتا نہیں
تو میں بھی جاگتا نہیں

وہ پھول ہاتھ لگ گیا
مگر میں توڑتا نہیں

وہ نیند یاد ہے مجھے
میں گود بھولتا نہیں

تو جس طرح گلے ملا
تجھے مرا پتا نہیں

اے ساحلو اے کشتیو
نہیں وہ لوٹتا نہیں

زوہیب عالم

وہ شوخ رنگ جب اپنی قبا بدلتی ہے
بجھے بجھے سے دلوں کی فضا بدلتی ہے

میں ایک پھول ہوں دل میں کھلا ہوا اک پھول
مرا لباس تو بادِ صبا بدلتی ہے

میں حرف حرف بہ نیزہ بلند ہوتا ہوا
قدم قدم پہ مری کربلا بدلتی ہے

کئی خیال مرے ذہن میں پنپتے ہیں
ہزار موج مرے زیرِ پا بدلتی ہے

اسے بھی شوق ہوا ہے دیے جلانے کا
کہ جس دماغ کی ہر دم ہوا بدلتی ہے

اب اس کے حسن کی تعریف کیا کرے کوئی
وہ بے مثال یونہی آئینہ بدلتی ہے

شرابِ اشک ملا کر ذرا پیا کیجیے
کہ جامِ درد کا یہ ذائقہ بدلتی ہے

میں اس روش سے ذرا ہٹ کے خاک اڑاوں گا
مجھے خبر ہے ندی راستہ بدلتی ہے

زنیر نقوی

سبھی کو برسرِ امکان تھوڑی کرنا ہے
ترے بچھڑنے کا اعلان تھوڑی کرنا ہے

جو بالکونی سے سب کچھ نثار کر رہی ہے
پھر اسکو مائلِ دالان تھوڑی کرنا ہے

ہم اپنے پاس رکھیں گے اداسیاں اپنی
ترے حوالے یہ سامان تھوڑی کرنا ہے

یہ کہہ کے چھوڑ دی تلوار اس بہادر نے
نڈھال فوج کو بے جان تھوڑی کرنا ہے

تو جب پتا ہے کہ لشکر ہمیں مٹا دے گا
پھر اسکا راستہ آسان تھوڑی کرنا ہے

علی ارتضیٰ

ہم اب تو روز ہی ملتے ہیں اس لیے کم ہیں
ہمارے بیچ تکلف کے مسئلے کم ہیں

پرانی چیز کو میں دیرپا سمجھتا ہوں
سو زیادہ دوست پرانے ہیں اور نئے کم ہیں

ہم ایک ساتھ ہیں مثلِ خطوطِ متوازی
نہیں ملیں گے کبھی گرچہ فاصلے کم ہیں

میں خاندانِ ارسطو سے کب ہوں، قیس سے ہوں
سو میرے ہاں بھی جنوں زیادہ فلسفے کم ہیں

نہیں انہیں نہ کہو اٹھ کے حق پہ بات کریں
یہ نو سے پانچ کے نوکر ہیں، بولتے کم ہیں

کہا بھی تھا کہ محبت کی بات مت چھیڑو
ہمارے بیچ بھلا پہلے مسئلے کم ہیں

میں جانتا ہوں ترے دل میں بھیڑ کیسے لگی
کہ لوگ آئے زیادہ ہیں اور گئے کم ہیں

ہمارے ساتھ نہ بیٹھیں کبھی، علی جن کے
مزاج کوفی، جگر چھوٹے، حوصلے کم ہیں

حارث بلال

گوشے گوشے پہ کوئی نقشِ قدم بنتا ہے
بنتے بنتے کسی رستے کا بھرم بنتا ہے

کہیں اشکوں کے ذخیرے سے ابھر آتی ہے آنکھ
کوئی مجموعہ ء الفاظ قلم بنتا ہے

جس طرح رکھا گیا تھا مرا دل سینے میں
اب محلات میں شاہوں کا حرم بنتا ہے

میری نیندوں میں جگہ ڈھونڈنے والے مرے دوست!
نم کسی آنکھ میں ہوتا نہیں، نم بنتا ہے!

بیج گملوں میں کبھی پیڑ نہیں بن سکتا
دکھ ترے ہجر میں آتا ہے تو غم بنتا ہے

تیری خوشبو سے ترے شہر کا نقشہ سمجھا
اس حوالے سے مرا فاصلہ کم بنتا ہے

انس رحمان

دل کے بے لاگ اظہار پر ہچکچاہٹ کا پہرا تو ہے
بات کی سرزمیں اپنے ہونے میں لکنت کا صحرا تو ہے

جسم ہلکے تو ہیں عمر سے نیند کا بوجھ اٹھائے ہوئے
خود کو دہراتے رہنے کی پاداش میں خواب اکہرا تو ہے

اور کیا چاہیے سادہ لوحوں کو احوال کے باب میں
گندمی لمس کی دھوپ پڑتی رہے دن سنہرا تو ہے

ہنستے رہنے سے پر ماجرا ہیں بہت دن گزرتے ہوئے
اپنی دانست میں ہم نہ مانیں مگر زخم گہرا تو ہے

رنج ایسا نہیں کہ حکایت کریں کیوں شکایت کریں
دیر کے بعد متروکہ املاک میں کوئی ٹھہرا تو ہے

سیف علی

منتظر تھے تمہارے پھول کھلے
مر رہے ہیں بچارے پھول کھلے

دل کی مٹی بدل کے دیکھا ہے
کھل گئے پر، تمھارے پھول کھلے

کون خواہش ہماری کرتا ہے
کس زمیں پر ہمارے پھول کھلے

دیکھتے رہ گئے مسافر کو
پٹریوں کے کنارے پھول کھلے

روئیے موسمِ گریزاں کو
بانٹیے ابر پارے پھول کھلے

دیکھنا لڑکیوں کے تیور تم
دیکھنا اتنے سارے پھول کھلے

میاں محمد طلحہ

دماغ الجھا رہے زندگی میں جی نہ لگے
خدا کرے یہ مرض دشمنوں کو بھی نہ لگے

خدا کرے نہ لگے دل میں آگہی کی آگ
اگر لگے تو دعا مانگ سرسری نہ لگے

کبھی تو یوں ہو کہ تنہا گزار کر کوئی رات
میں صبح دیکھوں تو آئینہ اجنبی نہ لگے

کبھی تو تو بھی حقیقت میں خوش لگے مرے ساتھ
کبھی تو میرا بھی ہنسنا نمائشی نہ لگے

سنی سنائی سناتے ہیں آج کل کے لوگ
اور اس طرح کہ ذرا بھی سنی سنی نہ لگے

میں اس کو تکتا ہوں ہر روز ایسی حیرت سے
کسی لحاظ سے جو پہلے ہو چکی نہ لگے

یہ معجزہ تری موجودگی سے ممکن ہے
کہ میرا ہونا مجھے میری بزدلی نہ لگے

میں چاہتا ہوں مرا ایسا شخص دوست نہ ہو
کہ جس کو روٹی تو لگتی ہو شاعری نہ لگے

کمال حسن

وصل کے باغ میں یہ خواری بہت ہوتی ہے
سیر کم سیر کی تیاری بہت ہوتی ہے

جاتے جاتے کبھی رہ جاتے ہیں جانے سے کہیں
جیب میں رکھی ٹکٹ بھاری بہت ہوتی ہے

اس کے زخموں کی مسیحائی پہ آ جاتے ہیں
یار لوگوں میں یہ بیماری بہت ہوتی ہے

خواب در خواب جہانوں کا سفر ہوتا ہے
نیند کے نام پہ بیداری بہت ہوتی ہے

بات بے بات الجھنے کی جو عادت ہے ہمیں
جب بھی ملتے ہیں تو منہ ماری بہت ہوتی ہے

وہ مرے سامنے روتا ہے مری حالت پر
آنسوؤں میں بھی ریاکاری بہت ہوتی ہے

میری جانب سے وہ رد ہے تو تعجب کیسا
تھل کی مٹی ہے یہ انکاری بہت ہوتی ہے

شعر کو شعبدہ بازی سے الگ کرنے کو
وقت کی حاشیہ برداری بہت ہوتی ہے

شاہنواز ہائم

مجھ کو سپردِ سایہِ اغیار کر نہ دے
ڈر ہے کہ رد مجھے مری دیوار کر نہ دے

میں جتنا دے رہا ہوں اُسے خود پہ اعتماد
آسودگی میں کل مرا انکار کر نہ دے

خود میں بجھا دوں آگ محبت کے نام کی
یہ بے حسی اگر مجھے بے کار کر نہ دے

شاخِ تمنا کھل تو گئی زیرِ زخمِ دل
اب داغِ اندمال کو مسمار کر نہ دے

میں جتنا بے خطر ہوں اُسے چھوڑ ہی نہ دوں
وہ جتنا ڈر گیا ہے کہیں وار کر نہ دے

کر تو رہا ہوں تجھ سے شب و روز بات چیت
یہ رابطہ مجھے ترا بیمار کر نہ دے

حمیدہ شاہین

تفصیل کا نہیں وہ، خلاصوں میں بانٹ دے
اس خواب کو تمام حواسوں میں بانٹ دے

پن گھٹ پہ کیا سماں ہے بتایا نہ جائے گا
گاگر میں جتنا صبر ہے پیاسوں میں بانٹ دے

اپنا نہیں ہُوا تو اسے دیکھنا بھی کیا
اس آئینے کو عیب شناسوں میں بانٹ دے

تجھ میں بچی پڑی ہے جو دو گھونٹ زندگی
اوندھے پڑے تمام گلاسوں میں بانٹ دے

وہ ہاتھ آگیا تو سمجھ میں بھی آئے گا
تب تک معاملات قیاسوں میں بانٹ دے

کس کام کی ہے سینت کے رکھی ہوئی ہنسی
یہ ڈھیر شہر بھر کے اداسوں میں بانٹ دے

میرے خواص تیرے اثر کو بڑھائیں گے
مجھ تلخ کو بھی اپنی مٹھاسوں میں بانٹ دے

جانے کدھر کدھر ہے کہاں کی لگی ہوئی
کس کس نئے کو لو ہے پرانی لگی ہوئی

نقشے میں آگئی تو اسے ماننا پڑا
کونے میں اک لکیر تھی یوں ہی لگی ہوئی

رکھیو قدم سنبھال کے گھر بھر کی لاڈلی
سیڑھی ہے اعتبار کی اونچی لگی ہوئی

بازی گروں کو جب سے بنایا ہے منتظم
میلے میں ہر دکان ہے جھوٹی لگی ہوئی

بارش ہی طے کرے گی حدِ انجذابِ جاں
اس کوٹھری میں اینٹ ہے کچی لگی ہوئی

مدت سے اک خدا پہ گزارا ہے روح کا
رہنے بھی دے غریب کی روزی لگی ہوئی

فیشن میں لگ رہی ہے سو مشکل ہے جانچنا
جھوٹا ہے کون، کس کو ہے سچی لگی ہوئی

یاسمین حمید

مسلسل ایک ہی تصویر چشم تر میں رہی
چراغ بجھ بھی گیا روشنی سفر میں رہی

رہ حیات کی ہر کشمکش پہ بھاری ہے
وہ بیکلی جو ترے عہد مختصر میں رہی

خوشی کے دور تو مہماں تھے آتے جاتے رہے
اداسی تھی کہ ہمیشہ ہمارے گھر میں رہی

ہمارے نام کی حق دار کس طرح ٹھہرے
وہ زندگی جو مسلسل ترے اثر میں رہی

نئی اڑان کا رستہ دکھا رہی ہے ہمیں
وہ گرد پچھلے سفر کی جو بال و پر میں رہی

یاسمین حمید

مثالِ عکس مرے آئنے میں ڈھلتا رہا
وہ خد و خال بھی اپنے مگر بدلتا رہا

میں پتھروں پہ گری اور خود سنبھل بھی گئی
وہ خامشی سے مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا

اجالا ہوتے ہی کیسے اسے بجھاؤں گی
اگر چراغ مرا تا بہ صبح جلتا رہا

میں اس کے معنی و مقصد کے سنگ چنتی رہی
وہ ایک حرف جو احساس کو کچلتا رہا

زمیں خلوص کی مٹی سے بے نیاز رہی
رفاقتوں کا شجر واہموں پہ پلتا رہا

صائمہ آفتاب

وارفتہ و سرشار و فدا چاہیے مجھ کو
یعنی دمِ آغاز جو تھا چاہیے مجھ کو

افلاک میں جل بُجھتے رہیں جو بھی ستارے
روشن ترے ماتھے کا دیا چاہیے مجھ کو

اک شخص مجھے شوقِ دو عالم سے سوا ہے
جتنا بھی ملے میرے خدا چاہیے مجھ کو

تُم تک بھی مری عرضِ تمنّا نہیں پہنچی؟
رہ رہ کے بتایا تو ہے کیا چاہیے مجھ کو

دریا میں اسے ڈال تو آتی ہوں ہمیشہ
لیکن مری نیکی کا صلہ چاہیے مجھ کو

وہ زخمِ تغافُل ہو کہ شاخِ گلِ امید
جو تجھ سے ملے خوب ہرا چاہیے مجھ کو

بے شرک تعلق تو خدا کو بھی ہے درکار
کیا اس میں تعجب کہ وفا چاہیے مجھ کو

کب تک یہ چُھپے گا پسِ اظہارِ محبت
اظہارِ ہوس ہے، تو جدا چاہیے مجھ کو

صائمہ آفتاب

عکس میں جھانکتی کمی کو دیکھ
آئینے میں اس اجنبی کو دیکھ

عشق آزار تیرے بس کا نہیں
تُو مری جان نوکری کو دیکھ

دشت پیما، ہمارے باغ میں رک
پھول بنتے ہوئے کلی کو دیکھ

یہ ترا حیرتی ہے سب سے قدیم
اے خدا، تُو بھی آدمی کو دیکھ

میں ترا ٹھیک وقت ہوں پیارے
میرے آگے تو مت گھڑی کو دیکھ

صائمہ زیدی

خرام موجۂ بادِ صبا سے ملتی رہے
تری خبر مجھے ابرِ رسا سے ملتی رہے

تری کشش سے نہ نکلے کبھی زمین دل
تری رتوں ترے ارض و سما سے ملتی رہے

میں جانتی ہوں کوئی معجزہ نہ ہوگا مگر
مری دعا ترے دستِ دعا سے ملتی رہے

میں کاٹ دوں پسِ دیوارِ باغ عمر تمام
اگر مجھے تری خوشبو ہوا سے ملتی رہے

ترے چمن میں میں اک شاخ زرد رو ہی سہی
مجھے نمو تری آب و ہوا سے ملتی رہے

تری جھلک کا میسر ہو زادِ راہ مجھے
پھر اس کے بعد مسافت بلا سے ملتی رہے

وہ دشت عمر ہو یا ریگزار ہجر مجھے
سفر کی سمت ترے نقش پا سے ملتی رہے

صائمہ زیدی

طلسم لب میں کیا کچھ ہے وہ چشم مہرباں کیا ہے
ابھی سے کیا کہیں زر خانۂ دل میں کہاں کیا ہے

تمہاری کہکشائیں کون سی دنیا کا پرتو ہیں
یہاں تو چاند ہے بادل ہے تارے ہیں وہاں کیا ہے

وہاں بھی کیا ستارے ان کے پہلو میں ترشتے ہیں
وہاں ساز زماں کیا ہے رمِ سیارگاں کیا ہے

ابھی وہ میکدہ بر دوش آنکھیں روبرو ہوں گی
ابھی وہ ہنس کے پوچھیں گے کہ رنگ مے کشاں کیا ہے

یہ کیسی روشنی مٹی تلے کروٹ بدلتی ہے
وہ آئینہ تو خاکی تھا یہ عکس جاوداں کیا ہے

وہاں بھی کیا کوئی ہجر ابد آباد بستا ہے
یہاں تو پوچھیے مت صورت درد نہاں کیا ہے

یہ سیل ہجر تھم جائے ذرا تو پھر کھلے شاید
کہ یہ رنگ جدائی از کراں تا بہ کراں کیا ہے

کسی دریا کی بانہوں کے بلاوے آگئے ورنہ
ہمارے واسطے یہ وسعتِ ریگ رواں کیا ہے

ڈاکٹر آمنہ ندیم قاضی

عشق تقصیر کے حوالے سے
عمر تعزیر کے حوالے سے

جامنی رنگ ہے محبت کا
اپنی تاثیر کے حوالے سے

لوگ دیوار بھانپ لیتے ہیں
ایک تصویر کے حوالے سے

درد کا رنگ سرخ ہوتا ہے
نیم کش تیر کے حوالے سے

اِک چھنک آ رہی ہے سینے سے
رقصِ زنجیر کے حوالے سے

آتشیں ہے مزاج آنسو کا
غم کی تفسیر کے حوالے سے

سیماب ظفر

اپنے اپنے رائیگاں جانے کے غم سے مضمحل
خواب، پورا چاند، میرا شعر، شب، میں، اور دل

جانے تیرے بعد کس کس نام کا مرہم رکھا
ہائے پر وہ گھاؤ، جو ہوتا نہیں ہے مندمل

دوست! تیرا وقت بہتوں میں بٹا ہو گا، مگر
جس قدر میرا ہے تُو، اتنا تو اِن گالوں پہ کھل

ایک جانب میں، کہ سر تا پا سماعت ہوں فقط
اور تیرے دوار سے ملتی ہے اک چُپ! مستقل!

چل کسی دن! لفظ کی سرحد کے پار اک راہ ہے
آ کسی شب! مجھ کو اس رستے کے بیچوں بیچ مل!

فریحہ نقوی

سب جن کے لیے جھولیاں پھیلائے ہوئے ہیں
وہ رنگ مری آنکھ کے ٹھکرائے ہوئے ہیں

اک تم ہو کہ شہرت کی ہوس ہی نہیں جاتی
اک ہم ہیں کہ ہر شور سے اکتائے ہوئے ہیں

دو چار سوالات میں کھلنے کے نہیں ہم!
یہ عقدے ترے ہاتھ کے الجھائے ہوئے ہیں

اب کس کے لیے لائے ہو یہ چاند ستارے؟
ہم خواب کی دنیا سے نکل آئے ہوئے ہیں

ہر بات کو بے وجہ اداسی پہ نہ ڈالو!
ہم پھول کسی وجہ سے کملائے ہوئے ہیں

کچھ بھی تری دنیا میں نیا کیوں نہیں لگتا
لگتا ہے کہ پہلے بھی یہاں آئے ہوئے ہیں

ہے دیکھنے والوں کے لیے اور ہی دنیا
جو دیکھ نہیں سکتے وہ گھبرائے ہوئے ہیں

سب دل سے یہاں تیرے طرف دار نہیں ہیں!
کچھ صرف مرے بُغض میں بھی آئے ہوئے ہیں

"ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور" بڑے لیکن
کہتے ہیں کہ سادات یہاں چھائے ہوئے ہیں

فریحہ نقوی

ہمیں وراثت میں اپنا لہجہ ملا ہوا ہے
کلام کر لے جسے بھی کوئی مغالطہ ہے

ہمیں نہ سمجھا! فلاں برا ہے، فلاں برا ہے
ہمارے ہاں در گزر کا رستہ ہے اور کھلا ہے

جسے بہت دیر میں بنایا سخن وَروں نے
بنے بنائے سے اس کا کیسا مقابلہ ہے!!!

یہ ظاہری حال اپنی ترجیح میں نہیں ہے
ہمارے گھر کا ہر آئنہ گرد سے اٹا ہے

وہ مسکرایا ہی اتنے دن بعد ہے کہ ہم نے
اب اس کے کھلتے لبوں کا صدقہ نکالنا ہے

ترے ہرے پانیوں میں کب تک رکیں کہ ہم کو
ہماری بنجر زمیں سے کوئی پکارتا ہے

امن شہزادی

اچھا خواب دکھایا تم نے خواب دکھانے والوں میں
ایسی بات کہاں ہوتی تھی اس سے پہلے والوں میں

دروازے پر تالا ہو تو پھر بھی دستک دے دینا
نام تو شامل ہو جائے گا دستک دینے والوں میں

جو بھی شخص برا لگتا ہے صاف برا کہہ دیتے ہیں
یہ بھی اچھی بات ہے تجھ کو اچھا کہنے والوں میں

سرگوشی بھی کرنی ہو تو زور سے کرنا پڑتی ہے
کس نے آن بٹھایا مجھ کو اونچا سننے والوں میں

جتنے آنسو بہہ جاتے ہیں روزانہ اس دھرتی پر
دریا دوسرے نمبر پر آئے گا بہنے والوں میں

آدھے لوگ یہیں سے اپنے گھر کو واپس لوٹیں گے
آگے کی باتیں پہنچی ہیں پیچھے آنے والوں میں

عائشہ شفق

فریبِ دنیا نے ہلکان کر دیا ہے مجھے
خدا نے رنج و الم جان کر دیا ہے مجھے

میں اتنی دور سے غم خوار بن کے آئی تھی
تری ہنسی نے تو حیران کر دیا ہے مجھے

شکار چھوڑ کے آ جاؤ میرے شہزادے!
سپاہیوں نے پریشان کر دیا ہے مجھے

اِسی کی لو سے وہ تصویر جل کے راکھ ہوئی
دیے نے بے سر و سامان کر دیا ہے مجھے

پرائے دکھ پہ میں آنسو بہاتی رہتی ہوں
کسی نے اپنا سفر دان کر دیا ہے مجھے

وہ آ گیا ہے مگر شام خوشگوار نہیں
فضا نے کتنا پشیمان کر دیا ہے مجھے

بہت بھی کہہ لیں تو میں اک اضافی عورت ہوں
برادری نے بھی قربان کر دیا ہے مجھے

کوئی گلی بڑی آباد ہو گئی ہے شفق
بس اتنی بات نے ویران کر دیا ہے مجھے

نیلوفرافضل

نیلوفرافضل

پلٹنے والوں نے دشنام جب تمہارا دیا
اجل کے ہاتھ نے خود بام سے اتارا دیا

جوابی کاپی میں لکھی ہوئی غزل پہ مجھے
کسی نے ہنستے ہوئے سرخ سا ستارہ دیا

وہ فاصلہ تھا کہ میں نے ہوا کے ہاتھ اسے
دعا کی ڈور سے باندھا ہوا غبارہ دیا

چمن کی اوٹ سے رخ پھیر کے پری وش نے
ہوائے شام کو تھم جانے کا اشارہ دیا

کسی نے چھتری خریدی تو ربِ باراں نے
مری بھی چھت پہ برسنے کو ابر پارہ دیا

مویشی ہانکتے لڑکے کو کیا خبر کس نے
پیام بر کو مری قوم پر اجارہ دیا

جا نکلے عجب دشت میں اوراق پلٹ کر، اطراف سے کٹ کر
اور خواب سے ابھرے ہیں بدن خاک سے اٹ کر، بیٹھے ہیں سمٹ کر

ہم اس کو ستارہ تو نہیں جانتے لیکن۔۔ہر چند ہے ممکن
ٹکڑا سا گرے صحن میں افلاک سے کٹ کر، نظروں سے نمٹ کر

بے اسم بھی ہوتا ہے طلسم ایسا کہیں پر؟ موقع ہے یہیں پر
دکھلایئے جام آپ ان آنکھوں کے الٹ کر، دل وِل رہیں پھٹ کر

اجداد کی سینچی ہوئی اینٹوں کی عمارت اور سبز عبارت
بک پائے نہ ٹِک پائے گی میراث میں بٹ کر، تعظیم میں گھٹ کر

اب ایسے خرابے میں کہاں نکلئے گھر سے کچھ دن ہوئے سر سے
اک ابر کا ٹکڑا ہے کہ چھٹتا نہیں چھٹ کر، سب رہ گئے کٹ کر

اترے تھے خیالوں کے پرند اتنے دنوں بعد اور نیند کا صیّاد
سر پر سے اڑا لے گیا پل بھر میں جھپٹ کر، لکھئے کبھی ڈٹ کر

فاطمہ مہرو

جانے میَں نے کن لفظوں کو کن لوگوں کا بار کیا
کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے کاروبار کیا

میں نے اپنے سرخ لبوں سے اس کے درد سمیٹے تھے
اور اک وہ ہے جس نے میرے بوسوں کو اخبار کیا

پہلے ہی وہ کتنے لہجے چھوڑ کے تم تک آئی تھی
اب وہ خود کو چھوڑ ہی دے گی، گر تم نے انکار کیا

کیوں رستے میں پھینک رہے ہو گلدستے کو غصے میں
میں نے تو اک پھول چُنا تھا تم نے ہی اصرار کیا

یار اس صبح کی بات نہ پوچھو جب اک اُجلے بادل نے
بارش کی بوندوں سے مجھ کو چُپکے سے بیدار کیا

فاطمہ مہرو

کہیں ملے گا تو یہ اہتمام کر لیں گے
نہیں کیے جو ابھی تک، وہ کام کر لیں گے

سبھی نے اس کے لیے پھول لے کے رکھے ہیں
قدم اٹھائے سہی ، احترام کر لیں گے

دُعا سلام سے اچھا ہے کون سا رشتہ؟
خفا جو ہونے لگے گا ، سلام کر لیں گے

سب اُس کے شہر میں جاتے ہوئے جھجکتے ہیں
کہ جیسے اُس کے مضافات رام کر لیں گے

تمام ہوتی نہیں یوں تو گفتگو اُس پر
کہا جو اُس نے تو سب سے تمام کر لیں گے



تصویر کشی: سید یاسر عثمان

نظمیں

نعت

وحید احمد

"تم اپنے مرد لے آؤ
ہم اپنے مرد لاتے ہیں
تم اپنی عورتیں لاؤ
ہم اپنی عورتیں لاتے ہیں
اور پھر خود کو لے آؤ
ہم اپنے خود کو لاتے ہیں
تمہیں ہم یوں بلاتے ہیں۔۔۔۔۔!!!"
یہ جو نجران سے نصرانیوں کا وفد آیا ہے
بڑا ہنگام لایا ہے
چنیدہ
سر برآوردہ بشپ اور پادری
انجیل کے حافظ
پرانے عہد نامے کے مفسّر اس میں شامل ہیں
نہایت شان و شوکت اور شکوہ و تمکنت ہے
سطوت و جبروت ہے
بس جس طرف دیکھو
ہر اک فرغل میں موتی ہیں
ہر اک حبّے میں تارے ہیں
ہر اک کی ریشمی چادر میں سونے کے شرارے ہیں
یہ جب پلو جھٹکتے ہیں
تو جھلمل اس قدر بوچھاڑ کرتی ہے
کہ گلیوں میں مچلتی ریت کے ذرے چمکتے ہیں
مدینے کے در و دیوار پر جگنو دمکتے ہیں
انہیں کتنی سہولت ہے
کہ سارے مسجد نبوی کے اندر
رو بہ مشرق ہو کے اپنے عہد نامے کی عبادت کر رہے ہیں
گفتگو آغاز کرتی ہے
جو اک جانب ہر اک برہان پر مہرِ نبوت ثبت ہے
تو دوسری جانب
مسیحی گردنوں میں بھاری مالائیں ہیں
جن میں گفتگو کرتی صلیبیں جھولتی ہیں
جھنجھناتی ہیں
تو پھر تثلیث اور وحدانیت کی بحث طولانی ہوئی
اور حجتی لہجوں میں شدت آ گئی
اب پیشتر اس کے
کہ کج بحثی در آئے
خَلطِ مَبحث بات کی منطق پراگندہ کرے
تو طے ہوا
کہ اب ترازو درمیاں لانی پڑے گی
جو بھی جھوٹا ہو
اسے اپنی ہلاکت کی قسم کھانی پڑے گی
(Imprecation تو بس اک duel ہوتا ہے
کہ اس میں ایک جانب کی ہلاکت لازمی ہے)
طے ہوا آخر
تم اپنے مرد لے آؤ
ہم اپنے مرد لاتے ہیں
تم اپنی عورتیں لاؤ

ہم اپنی عورتیں لاتے ہیں
اور پھر خود کو لے آؤ
ہم اپنے خود کو لاتے ہیں
مباہل اپنی بیٹھک شہر سے باہر لگاتے ہیں

تو پھر
یہ دیکھنے والوں نے دیکھا
ایک جانب ساٹھ نصرانی
چنیدہ علم سلطانی
صحیفوں کی عبارت میں اتر کر آسماں کی سیڑھیاں چڑھتے
فلک پیما
مقدس آیتوں کی راہداری میں سفر کرتے
مسافر
شہر سے باہر کھلے صحرا میں بیٹھے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں
جو حال ماضی اور آئندہ کو
اپنے علم کے ہاون میں رکھ کر پیستے ہیں
اور پھر اس کا سفوف
آبِ حیات اور سوم رس میں گھول کر پیتے ہیں
روشن ہو کے وہ
کون و مکاں کو ایک خط پر اس طرح سے دیکھتے ہیں
جس طرح تحریر ہو
جیسے کوئی تصویر ہو

پھر دیکھنے والوں نے دیکھا
دوسری جانب
اچانک روشنی نے اپنی مٹھی کھول دی ہے
اور پانچوں انگلیاں چمکا دیتی ہیں
تو ایم نے کہا:
"اے حارثہ بن علقمہ!
یہ کون بچہ ہے جو ان کی انگلی تھامے چل رہا ہے؟
ہو بہو ان سا ہے
یوں لگتا ہے ان کا ہاتھ تھامے ان کا بچپن چل رہا ہے"
بشپ حارث یہ سن کر مسکرایا
اور بولا:
"سیدی!
یہ تو شباہت کا اثاثہ ہے
نواسہ ہے۔۔۔۔!!!"
تو پھر عاقب نے پوچھا:
"قیس بتلاؤ
شب معراج جیسی اون کی کالی عبا سے جھانکتا
یہ کون بچہ ہے
جو ان نے گود میں لپٹا کے رکھا ہے
اور اس بچے کے پیاسے ہونٹ کتنے خشک ہیں
اب دیکھئے
حلقوم پر اک چیر آجاتا ہے
اور جب دیکھئے
اڑتے فرشتے ہاتھ کے پھاہے سے
گردن کے لہو کو صاف کرتے ہیں۔۔۔؟"
خویلد قیس سے پہلے ہی بول اٹھا:

"یہ ظلمت کے مقابل روشنی کا استعاثہ ہے
نواسہ ہے۔۔۔۔!!!"
اوس بن حارث نے پوچھا:
"سیدی ایم!
یہ بی بی کون ہے
جو ان کے پیچھے
ان کے نقش پا پہ اپنے پاؤں دھرتی آ رہی ہے؟
اور کلائی کے کڑے میں
آستیں سے جھانکتی
جنت کے دروازوں کی ساری چابیاں لٹکی ہوئی ہیں
جن کے گرد اگرد
فردوسِ بریں کے جھنڈ سے چلتی ہوا مہکار دیتی ہے
وہ چلتی ہے تو اس کی آستیں جھنکار دیتی ہے
تو ایم نے کہا:
"پیارے
رئیل اسٹیٹ اس کی ہے
یہ جس نے کہکشاؤں سے بنی چادر لپیٹی ہے
یہ بیٹی ہے۔۔۔۔!!!"
خویلد نے کہا:
"یہ کون ہے
جو سب سے پیچھے آ رہا ہے
جس طرح طوفان آتا ہے؟"
تو عاقب نے کہا
"بھائی
یہی تو ہے
جو سب کچھ ہے
یہ جب یلغار کرتا ہے
تو دیو اندام دروازوں کی کیلیں ٹوٹ جاتی ہیں
یہ جب نہج البلاغہ میں قدم رکھتا ہے
تو مدمقابل کی دلیلیں ٹوٹ جاتی ہیں۔۔۔۔!!!"

"یہ کن کا کوندتا کنبہ ہے
کن کا ہے؟"

"یہ ان کا ہے۔۔۔۔!!!"

"یہ کس کا خاندان آتا ہے
صحرا جن کے قدموں سے لپٹ کر آج رشکِ آسماں ہے
یہ پریوار اس طرح سے پاؤں دھرتا ہے
کہ جیسے کوئی فاتح
اپنے مفتوحین کی سہمی ہوئی گلیوں میں چلتا ہے
یہاں تو نوریوں کے نور دیتے پنکھ جلتے ہیں
سو بہتر ہے
کہ ہم نجران چلتے ہیں۔۔۔۔۔!

نومبر کے پہلے ہفتے پر ایک نظم

اختر حسین جعفری

خنک ہوا کا برہنہ ہاتھوں سے زرد ماتھے سے
پہلا پہلا مکالمہ ہے
ابھی یہ دن رات سرد مہری کے اتنے خوگر نہیں ہوئے ہیں
تو پھر یہ بے وزن صبح کیوں بوجھ بن رہی ہے
سواد آغاز خشک سالی میں کیوں ورق بھیگنے لگا ہے

دھواں دھواں شام کے الاؤ میں کوئی جنگل جلے
کہ روٹھی ہوئی تمنا
خزاں کا پانی کوئی اشارہ نہیں سمجھتا
یہ نہر اب تک پرانے پہرے میں چل رہی ہے
عجیب تاثیر آخر شب کے آسماں کی
ہوا چلے یا زمین گھومے

فصیل کہرے کی کوئی سورج نہیں گراتا
زمین سے ملبہ گئے دنوں کا کوئی ستارہ نہیں اٹھاتا

طویل راتیں کہ مختصر دن
کثیر وعدے قلیل عمریں

عبث حساب و شمار اس کا جو گوشت اس سال ناخنوں سے جدا
ہوا ہے

سکڑتے لمحے کی ایک سرحد سے تا بہ حد دگر وہی کار ستر
پوشی

وہ موئے تن ہو کہ تار پنبہ کہ بال و پر عکس آئینہ کے
ہر ایک کترن پہ زرد یاں بانٹنے درختوں کے فیصلے ہیں

اداس پتا
خزاں کا پانی نئے معانی نہیں سمجھتا
سو نہر اب تک پرانے پہرے میں چل رہی ہے

اے لاہور

جیلانی کامران

ترے درختوں کی ٹہنیوں پر بہار اترے
تری گزرگاہیں نیک راہوں کی منزلیں ہوں
مرا زمانہ نئے نئے موسموں کی خوشبو
ترے شب و روز کی مہک ہو
زمین پر جب بھی رات پھیلے
کرن جو ظلمت کو روشنی دے تری کرن ہو
پرندے اڑتے ہوئے پرندے
ہزار سمتوں سے تیرے باغوں میں چہچہائیں
وہ رات جس کی سحر نہیں ہے
وہ تیرے شہروں سے تیرے قصبوں سے دور گزرے
وہ ہاتھ جو عظمتوں کے ہجے مٹا رہا ہے
وہ ہاتھ لوح و قلم کے شجرے سے ٹوٹ جائے
کلس پہ لفظوں کے پھول برسیں
تری فصیلوں کے برج دنیا میں جگمگائیں
اکیلے پن کی سزا میں دن کاٹتے ہزاروں
تری زیارت گہوں کی بخشش سے تازہ دم ہوں
ترے مقدر کی بادشاہت زمیں پہ نکھرے
نئے زمانے کی ابتدا تیرے نام سے ہو
خوشی کے چہرے پہ وصل کا ابر تیر جائے
تمام دنیا میں تذکرے تیرے پھیل جائیں

درخت، میرے دوست

ثروت حسین

درخت، میرے دوست
تم مل جاتے ہو کسی نہ کسی موڑ پر
اور آسان کر دیتے ہو سفر ——
تمہارے پیر کی انگلیاں
جمی رہیں پاتال کے بھیدوں پر
قائم رہے مرے دوست
تمہارے تنے کی متانت اور قوت
دھوپ اور بارش تمھیں اپنے تحفوں سے نوازتی رہے
تم بہت پُر وقار اور سادہ ہو
میرے تھیلے کو جاننا چاہتے ہو
ضرور —— یہ لو میں اسے کھولتا ہوں
روٹیاں، دعائیں اور نظمیں
میرے پاس اس سے زیادہ کچھ نہیں
ایک شاعر کے پاس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا
اگر میرے پاس ایک اور زندگی ہوتی
تو میں اپنی پہلی زندگی
تمہاری جڑوں پر گزار دیتا
مگر میں گھر سے خاندان بھر خوشیوں کے لیے نکلا ہوں
اور وہاں میرا انتظار کیا جا رہا ہے
تم نے، مرے دوست
ہاں تم نے
بہت کچھ سکھایا ہے مجھے

مثلاً زمین اور آسمانی بجلی
اور ہوا
اور انتظار
اور دوسروں کے لیے زندہ رہنا
بہت قیمتی ہیں یہ باتیں
میں کیا دے سکتا ہوں اس فیاضی کا جواب
میرے پاس تمھارے لیے
ایک روٹی اور دُعا ہے
روٹی: تمھاری چیونٹیوں کے لیے
دعا: تمھارے آخری دن کے لیے
مجھے معلوم ہے تم نے کلھاڑی کے مصافحے
اور آری کی ہنسی سے کبھی خوف نہیں کھایا
مگر تم روک نہیں سکتے انھیں
کوئی بھی نہیں روک سکتا

خدا کرے——
خدا کرے تمھاری شاخوں سے ایک جھونپڑی بنائی جائے
بازوؤں کے گھیرے میں نہ آنے والے تمھارے تنے کی
لکڑی
بہت کافی ہے
دو پہیوں اور ایک کشتی کے لیے
دوست! ہم پھر ملیں گے
مسافر اور چھکڑا
مسافر اور کشتی
کہیں نہ کہیں ہم پھر ایک ساتھ ہوں گے
کہیں نہ کہیں
ایک ساتھ——ہم سامنا کریں گے
ہوا کا
اور راستوں کا
مسرت کا اور موت کا

محبت میں دیر ہو سکتی ہے

ذیشان ساحل

جب تم مجھے سنو
یہ کہتے ہوئے
ایک خوبصورت لڑکی پہ مرنا
کتنا آسان ہے
اور اسی کے لیے مر جانا
میں پسند کرتا ہوں
اور اس کے بعد
تم مجھے دیکھو
کئی برس تک
اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑتے
گرے ہوئے ستاروں کو
دوبارہ آسمان میں ٹانکتے
مٹی میں ملے ہوئے پھولوں کو
پھر سے کھلانے کی کوشش کرتے
ایک خوبصورت لڑکی کے لیے
محبت میں دیر ہو سکتی ہے

ہم کہ ہیرو نہیں

جاوید انور

ہم خزاں کی غدود سے چل کر
خود دسمبر کی کوکھ تک آئے
ہم کو فٹ پاتھ پر حیات ملی
ہم پتنگوں پہ لیٹ کر روئے

سورجوں نے ہمارے ہونٹوں پر
اپنے ہونٹوں کا شہد ٹپکایا
اور ہماری شکم تسلی کو
جُون کی چھاتیوں میں دودھ آیا

برف بستر بنی ہمارے لیے
اور دوزخ کے سرخ ریشم سے
ہم نے اپنے لیے لحاف بُنے

زرد شریان کو دھوئیں سے بھرا
پھیپھڑوں پر سیاہ راکھ ملی
ناگاساکی میں پھول کاشت کیے
نظم بیروت میں مکمل کی

لورکا کو کلائی پر باندھا
ہوچی منہ کو نیام میں رکھا
ساڑھے لینن بجے سکول گئے

صبح عیسیٰ کو شام میں رکھا
ارمغانِ حجاز میں سوئے
ہولی وڈ کی اذان پر جاگے
ڈائری میں سدھار تھا لکھا

درد کو فلسفے کی لوری دی
زخم پر شاعری کا پھاہا رکھا
تن مشینوں کی تھاپ پر تھرکے
دل کتابوں کی تال پر ناچا

ہم نے فرعون کا قصیدہ لکھا
ہم نے کوفے میں مرثیے بیچے
ہم نے بوسوں کا کاروبار کیا
ہم نے آنکھوں کے آئینے بیچے

زندگی کی لگن نہیں ہم کو
زندگی کی ہمیں تھکن بھی نہیں
ہم کہ ہیرو نہیں، ولن بھی نہیں

زندگی ہمارے لیے کتنی آسان کر دی گئی ہے

افضال احمد سید

ہم کسی بھی رعایتی فروخت میں
کتابیں،
کپڑے، جوتے
حاصل کر سکتے ہیں
جیسا کہ گندم ہمیں امدادی قیمت پر مہیا کی جاتی ہے
اگر ہم چاہیں
کسی بھی کارخانے کے دروازے سے
بچوں کے لیے
رد کردہ بسکٹ خرید سکتے ہیں
تمام طیاروں، ریل گاڑیوں، بسوں میں ہمارے لیے
سستی نشستیں رکھی جاتی ہیں
اگر ہم چاہیں
معمولی ضرورت کی قیمت پر
تھیٹر میں آخری قطار میں بیٹھ سکتے ہیں
ہم کسی کو بھی یاد آ سکتے ہیں
جب اسے کوئی اور یاد نہ آ رہا ہو

اسمِ اعظم

سرور کامران

زمیں پہ پھیلے اداس لوگو!
قریب آؤ!
مری صداؤں کے دائروں میں
کہ میری لہجے کی اوس، لفظوں کے ہاتھ، فقرے کی ہر تسلی
فقط تمہارے دُکھے ہوئے دل کے واسطے ہے
میں جن دنوں گونجتی ہوا تھا
تو سایہ و جسم، رنگ و آواز سے ملا میں
محبتوں، نفرتوں، عقیدوں کی سرزمینوں
منافقت کی سیہ فصیلوں سے سر پٹختا
نگر نگر، شہر شہر گزرا
(یہ ہست کے بازوؤں کے مابین فاصلہ تھا)
تلاش کے اس کڑے سفر سے پگھل گیا میں
تو جسم سے لفظ بن گیا میں۔۔۔
اداس لوگو!
میں لفظ ہوں، سایہ و سکوں ہوں
جہاں پہ جسموں کے ہر سہارے کا خاتمہ ہے
تمہارے شانوں پہ میں وہاں دستِ ریشمیں ہوں
وہ تم جسے پا کے بھی نہ بھی پاؤ گے
میں اسی لمحہء مسلسل کا آشنا ہوں
اداس لوگو!
تم آسمانوں پہ جا بسو گے، دکھی رہو گے
سمندروں کی تہوں سے موتی اچھال دو گے۔۔۔ دکھی رہو گے
رقابتوں کے وسیع میدان مار کر بھی تم اپنے دشمن بنے رہو گے
جواز اندر جواز جینے پہ سوئی نفرت لہو رلائے
نہ چاہنے پر بھی بیتے وقتوں کی یاد آئے
کبھی اکیلے کا دکھ ستائے۔۔
تو میرے شعروں کو گنگنانا
یہ اسمِ اعظم اسی مصیبت کے واسطے ہے

ایک عام سے دن کی نظم

ہمایوں احمد منصور

یہ کیا عمر ہے کہ
قدم آنے والے تو آنکھیں کہیں پچھلے گزرے دنوں کی
طرف بھاگتی ہیں

.

یہ دو مختلف منظروں کی زبانیں ہیں اور میرا سارا اسے
ان میں موجود جو مشترک لفظ ہیں
اب انھیں تولنے چھاننے میں گزرتا ہے
دن بھر یہی بیچتا ہوں

.

میں خوابوں کے رستے پہ
وعدوں کی لو میں تجھے
سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے
یادیں بھی شاید
درختوں سے لپٹے ہوئے
شہد کے خالی چھتّے ہیں
اور شہد یونہی اترتا رہے گا

.

بہت بھولتا ہوں
سبھی یاد رکھنے کی کوشش میں ایسا ہی ہوتا ہے
کیا عمر ہے کہ
مری اور تری مٹھیوں سے لکیریں کہیں گر رہی ہیں
نہ تو چن رہی ہے
نہ میں گن رہا ہوں

کینوس

قیس قیصرانی

آخر کو ایک دن، ستارہ ساز،
ستارہ سازی سے تھک گئے
پوجا کو آتے لوگ
مندر کی نچلی سیڑھی پر ہی بیٹھ کر
سوچ کی پتنگیں اڑانے لگے۔۔۔
بخت کی فیروزی چادر میں
پھول کاڑھتی لڑکی کے ہاتھ میں سوئی چبھ گئی
اور وہ رونے لگی
پر اس نے مرے کاندھے کو استعمال نہیں کیا۔۔
میرے شعور نے مجھے اپنی محرومی پر طعنہ دیا۔
اور سارا منظر پتھر کا ہو گیا

ہم کبھی خوبصورت نہیں تھے

عدنان بشیر

ہم نے جس کو بھی چاہا
وہ اوروں کو بھی چاہنے کے عمل میں تھا مصروف
بالکل ہماری طرح۔۔۔
ہم نے ٹوٹے ہوئے آئینوں میں شبیہوں کو جوڑا
یعنی وہ پھول جو ہم کو لوٹا دیے تھے کسی نے
وہ کسی اور کو ہم نے بھیجے
ہم کتابوں سے کاٹے گئے نیم پختہ خیالوں کا ازلی خلا ہیں
آنکھ کھلتے ہی سورج نے ہم کو زوال آشنا راستوں سے پکارا
ماں کے بوسے میں بھی باپ کی آستینوں سے بہتے پسینے کی
خوشبو کو ہم نے تلاشا
مان جانے کے لمحوں میں روٹھے
روٹھ جانے کے لمحوں میں ٹوٹے
ٹوٹ جانے کے لمحوں میں جھوٹے
جھوٹ بھی جو ضروری نہیں تھا
ہم کسی کی ضرورت نہیں تھے
ہم کبھی خوبصورت نہیں تھے

محبت کا میوزیم

نوازش ملک

اُس دل کو محفوظ کر لیا گیا جو محبت میں کام آیا
پھول کھلتے ہیں
چوراہوں میں بکنے کے لیے
گلدستوں، کلائیوں اور قبروں کے لیے
ہجوم میں گلفام اور پری مل نہیں پاتے
میزوں پر بدذائقے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے
وہ محبت پر بات کرتے ہیں
باہر درخت جھومتے ہیں
بادل سورج کو اپنی نرم بانہوں میں بھر لیتا ہے

کھڑکی سے آسمان دیکھنے کے لیے
کھڑکی کا ہونا ضروری ہے
دیگر ضروری چیزوں کی طرح
جیسے سانس لینے کے لیے ہوا ضروری ہوتی ہے
نیند کے لیے بستر ضروری ہوتا ہے اور کوئی خواب
ایک اجلے دن کا
ایک پھول کا
خوشبو اور راستوں کا

نظم

وکاس انجم

میں نے اپنے لیے ایک خندق کھودی
اس میں آگ جلانے کے لیے
کسی کی مدد درکار تھی
جس نے مجھے آگ دی
اس کا باپ اپنی ماں کے ساتھ سوتا تھا
پر جو شہر میں نے بسایا تھا اس پر دیوتاؤں نے قبضہ کر لیا
مجھے ہجرت کرنا پڑی
جلاوطن دوسروں کی عورتوں پر انحصار کرتا ہے
میں اپنی نسل کا آخری آدمی بچا ہوں
ان عورتوں کے بچے جو میرے نہیں ہیں
میرا مذاق اڑاتے ہیں
اکیلے پن سے بچنے کے لیے میں اپنے ختم ہو گئے ہوئے
شہر کا نقشہ بناتا ہوں
اسی وجہ سے میں زندہ ہوں
اس شہر کی جوان ہوتی لڑکیاں میرے ساتھ ملاپ چاہتی ہیں
لیکن
میں کسی نئی نسل کی شروعات کرنے سے گھبراتا ہوں
اب مجھ سے اس عمر میں خندق نہیں کھودی جاتی

مرے درخت تری بے کنار خواہش میں

احسان اصغر

مسافتوں سے پرے پاؤں رکھنے والوں کو
نگلنے لگتے ہیں آثار اجنبیت کے
دل و نگہ میں اترتے تھکن بھرے رستے
پکارتے ہیں تو چلنے کو دم نہیں ہوتا
عجیب رنج ہے رنجِ مفارقت بھی جسے
ہزار رنگ سے بہلاؤ کم نہیں ہوتا
گھنے درخت! تری یاد کب نہیں آتی
کہ رخت دھوپ کے نیزوں کی زد میں رہتے ہیں
تو شاخ شاخ کا احسان یاد آتا ہے
ہوائے سبز کا امکان یاد آتا ہے
اور اپنا دیدۂ حیران یاد آتا ہے
جسے خبر ہی نہ تھی ساعتوں کے ڈھلنے کی
ترے سخن تھے ہواؤں میں تیرتے بادل
تری ادا تھی خموشی میں کوکتی کوئل
تری صدا تھی سرِ باغ خامشی کی طرح
ترا وجود تھا بھرپور زندگی کی طرح
زمیں پہ آمدِ نایاب سرخوشی کی طرح
تجھے پکارنے والے لبوں پہ قفل پڑا
کہ تیری خامُشی حد سے گزر گئی مجھ میں
یہ لفظ شعر و سخن ہیچ اور میں بھی ہیچ
کہ تیری چھاؤں سے باہر کوئی وجود نہیں
کوئی نمود نہیں رنگ اور تمنا کی

تری نگاہ میں دنیا سراب جیسی ہے
مری نگاہ میں حسرت تری نگاہ کی ہے
سراب و خواب کے مابین کون رکتا ہے
رکا ہے آج تلک کوئی دو گھڑی کے لیے؟
میں شاخ شاخ سے پتوں سا ٹوٹ گرتا ہوں
یہ کھیل خلوت و جلوت میں چلتا رہتا ہے
کچلتے رہتے ہیں رہرو تری پناہ سے دور
تری نگہ سے پرے تیری بارگاہ سے دور
میں پیشِ پا ہوں زمانے کے انتباہ سے دور
گھنے درخت! تری مہربان چھاؤں میں
زمانے بیت گئے اک پلک جھپکنے میں
زمانے بیت گئے اور مجھے خبر نہ ہوئی
زمانہ اپنا چلن ایک سا نہیں رکھتا
اور آج دیکھ میں وہ آئنہ نہیں رکھتا
جو مجھ کو تجھ سے گھڑی بھر جدا نہیں رکھتا
یہ شہر شہر نہیں دشت ہیں سرابوں کے
بگولہ وار جہاں آدمی بکھرتے ہیں
وہ دشت دشت نہ تھا شہرِ خواب تھا اپنا
جہاں پہ تو ہے تری مہربان بانہیں ہیں
تری ہوا ہے ترے لوگ تیری مٹی ہے
ترے پہاڑ مجھے کیوں رہا نہیں کرتے
میں سوچتا ہوں تو کچھ ذہن میں نہیں آتا
میں بولتا ہوں تو مفہوم جاتا رہتا ہے
ترے پہاڑ مجھے کیوں فنا نہیں کرتے
وہ نخل زار جو آوارگانِ وحشت کو
لگا کے سینے سے رکھتے ہیں مار دیتے ہیں
مری نگاہ سے اوجھل کبھی نہیں ہوتے
جو تو نہیں تو بہت تیز رو اندھیرا ہے
جو مجھ سے پہلے مرے درمیان آ بیٹھا
سورو شنی کی طلب گار آنکھ بجھتی ہے
مرے درخت! تری بے کنار خواہش میں
میں راستوں سے اٹھی گرد ہوتا جاتا ہوں
میں مردگاں کی طرح سرد ہوتا جاتا ہوں
میں سبز تھا مگر اب زرد ہوتا جاتا ہوں...

بوڑھا عیسائی

شہباز گوہر

تمام عمر ہم نجانے کون سے خدا کو پوجتے رہے
نجانے کونسی ندی کے پانیوں میں چاند ڈھونڈتے رہے
پرائی رونقوں میں خوش رہے

عجیب روشنی تھی جس میں کچھ نظر نہ آسکا
شہر میں روزگار ڈھونڈتے "دہاتیوں" کو کیا پتا بڑے گھروں
کی لڑکیوں کی عادتیں
کبھی کسی کے واسطے گر اپنے آپ کو سنوارتے تو اور بھی
برے لگے
کبھی کسی کی آنکھ سے بہے بھی تو پتہ نہیں چلا ہمیں
کبھی کسی کو پیار کا یقین نہ دلا سکے
فقط ہم اپنے دوستوں کے نامہ بر بنے رہے

کوئی نہیں ملا ہمیں
ہجوم در ہجوم ہاتھ تھے جو ایک دوسرے کو چومتے چلے گئے
کوئی نہیں ملا ہمیں
ہمارا دل ہماری جیب میں پڑا رہا

جہان دل سے دیکھتے یا جیب سے یہ فیصلہ نہیں ہوا کبھی
مگر ہمیں یہ علم تھا
خدا کے گھر میں سب کے سامنے کسی کے ہونٹ چومنا بُرا
نہیں

ایک مضافاتی دن

اویس سجاد

بگلوں نے ہل چلتے کھیت میں
اپنے نام کا دانہ اٹھایا
اور آسمان میں گم ہو گئے
رات سے جاگتی نامانوس آوازیں
تمام کانوں کے لیے مانوس ہو گئیں
سورج کے ہاتھوں سے دن کی پہلی کرن گری
اور چھت کے بنیروں نے ہاتھ پھیلا دیے

پھیری والے نے آواز لگائی
کمہار نے مٹی گوندی
اور روٹی کو سوچتے ہوئے تندور بنانے لگا
گھروں کے آنگن جھکی کمروں نے یوں سجا دیے
جیسے وہاں کانسی کے پھول کبھی بکھرے ہی نہ تھے
چوراہے پر بیٹھے بوڑھوں نے
دھول اڑاتی سفید گاڑی کو اجنبی نگاہوں سے دیکھا
گلی گلی سورج نے آواز لگائی
آدھی دھوپ اور آدھی چھاؤں میں بیٹھی بڑھیا نے کہا:
"سورج کتھوں ٹریا سی
تے کتھے آن کھلویا"
اور چارپائیاں حرکت میں آگئیں....!

شام ایک بوڑھے بدن سے جاگی

اور ویران سڑکوں پر پھیل گئی
شرنیہہ کے پھول خوشی میں مرجھانے لگے
آنگن آنگن چائے کی خوشبو مہکی
خاموشی کے سائے طویل ہونے لگے
بیل تھک کر بیٹھ گئے
بچوں نے کھیل کے میدانوں میں آخری نعرہ لگایا
اور مائیں ان کی راہ تکنے لگیں

راستے کمہلانے لگے
اور تھکن جوتوں کے تلوؤں میں اکٹھی ہو گئی
بوڑھے بدن مسکرانا بھول گئے
کہ زندگیاں تو خسارے میں تھیں
آسمان پر پھیلے پرندے
آہستہ آہستہ مغرب میں غروب ہو گئے
اور
ایک اور دن خاموشی سے ڈوب گیا

نظم

فاطمہ مہرو

دل جلو!
دل کو تھامے چلو
عشق منزل یہاں سے بہت دُور ہے
اور بہت دُور ہے اُس کا تم سے تمہارے لیے بات کرنا
بہت دُور ہے--

عاشقو!
یوں نہ خود پر ہنسو!
وقت آنے دو ایسا کہ وہ تم پہ ہنسنے لگے
اور پھر اک زمانہ تمہی پر کئی طعنے کسنے لگے

شاعرو!
اُس پہ کچھ مت لکھو!
درد موصول ہونے میں شامل کئی مرحلے ہیں ابھی
جن کو سَر نہ کیا تمہارے سخن سے لہو کی مہک تک نہیں آئے گی

پاگلو!
دل نہ چھوٹا کرو
اُس کا کیا!! وہ ضرورت کے رنگین بازار میں پھر سے مل جائے گا
پر تمہارا یہ چھوٹا سا دل دستِ قاتل میں چھل جائے گا!!

تم بہت خوبصورت ہو

صدیق شاہد

تم بہت خوبصورت ہو
جیسے میں تمہیں شیر کے پنجوں سے چھین لیتا ہوں
تم بہت خوبصورت ہو

میرا پیمبرانہ شان سے کیا ہوا انکار
تمہیں مجبور کر دیتا ہے
ایمان لانے پر
جس نے موت اور بلی کے بچے بنائے
جس نے آنسو اور ہونٹوں کے رومال بنائے
جس نے لیونارڈو کو ہن اور اداسی کے نغمے بنائے
تم بہت خوبصورت ہو
جیسے میں تمہیں مسکرا دینے پہ مجبور کر دیتا ہوں
تم بہت خوبصورت ہو

میں گھٹنوں کے بل کسی فوجی جرنیل کی طرح اکڑ جاتا ہوں
میرے چوڑے شانے کھلی کھڑکی پہ چِق کی طرح آ جاتے
ہیں
تاکہ تم دیکھ لو
اپنا مفتوحہ علاقہ اور مال غنیمت
اپنا بے نیاز کبر اور پیار کی سلطنت
اپنا طلسماتی حسن اور Dorian Gray کا آئینہ
تم بہت خوبصورت ہو

جیسے میں تمہیں فاتح اور خوش قسمتی کی طرح مغرور بنا دیتا
ہوں
تم بہت خوبصورت ہو

میں جانتا ہوں
تم جانتی ہو
سب جانتے ہیں
تم بہت خوبصورت ہو
جیسے میں تمہیں آدھے سچ اور ادھوری نظموں میں دکھا دیتا
ہوں
تم بہت خوبصورت ہو

جیو اُس زندگی کو

توحید زیب

کسی کی آنکھ کی اُترن کسی بھی آنکھ کو پوری نہیں آتی
جیو اُس زندگی کو جس کا تم محصول بھرتے ہو!
اُتر جاؤ نئی دنیا کے خوشبودار باغوں میں
یہی وہ باغ ہیں
جن کی نگہبانی میں گزری ہے تمہاری عمر
تم صُبحِ ازل سے پوچھتے آئے
ہمارے سوٹ کیسوں میں بھری اِن آرزوؤں کا ٹھکانہ؟
آؤ،
تھوڑا اور قریب آؤ کہ تم یہ جان لو
شہرِ خدا میں داخلہ ہو جائے جب،،،
تم آخری موسم سے پہلے کھول دینا سوٹ کیسوں کو!
تمہارا بوجھ ہلکا ہونے پر
تم صاف پانی میں وہ سب کچھ دیکھ پاؤ گے
جسے تم بوجھ کہتے ہو تمہارا عکس ہی تو ہے!
جسے اِک عمر سے تم نے
اندھیرے میں کہیں پر قید کر رکھا تھا
تم نے رقص کی مشقیں اکیلے کیں
تمہارے روبرو کوئی نہ تھا ورنہ
تمہارا رقص تو ترتیب میں ہوتا!
ریاکاری کے سارے رنگ
تم پر خوب جچتے ہیں کہ تم بھی
زندگی کی روشنی سے بے خبر ہو——

زندگی کی روشنی سے بے خبر انساں!
پریشانی،.....پشیمانی کے پہلو میں
تمہاری منتظر بیٹھی ہوئی ہے
سو چمن ویران ہونے سے تو اچّھا ہے
پلٹ جاؤ لطیفوں کے جہاں سے اور
جیو اُس زندگی کو جس کا تم محصول بھرتے ہو

بازگشتِ خواب

ذیشان حیدر

چڑیوں کی چہکار اور برتن بجنے کی آواز پہ آنکھیں کھلتی ہیں
کچے دودھ کی دھاریں.....
جستی برتن میں گرتی ہیں
اور مہک سے آنگن بھرنے لگتا ہے..!
اندر چولہے میں اُپلوں کی سازش سے جلتی لکڑی پر چائے
رکھی ہے
اور دھواں کمرے کی چھت سے لگ کر بہتا
دروازے سے باہر نکل رہا ہے
سب بیٹھے ہیں.....!!!
وہ جو بعد میں اُٹھ جائیں گے....وہ بھی
آنکھیں پھر سے مندنے لگتی ہیں.....!

عشق معنی سے بہر حال بہت آگے ہے

زاہد خان

میں نے کیا عشق میں سیکھا ہے تمھیں سمجھادوں
میں نے سیکھا ہے جو کیا تم کو سمجھ آئے گا؟
میری کوشش ہے کہ بس تم کو سمجھ آجائے
میرے لکھے ہوئے ہر حرف میں جاں آجائے

تم کو سمجھادوں بلالِ حبشی کا قصہ
تم کو بتلادوں کلیجے کا نکلنا کیسا؟
دشت میں پیاس کا احساس تمھیں کیا معلوم؟
تم کو بتلادوں وہ کربل میں تڑپنا کیسا؟

تم اے منصور کو سولی پہ چڑھانے والے
عشق کو آگ میں اے زندہ جلانے والے
خود پہ اترائے ہوئے شخص تمھیں کیا معلوم
خود سے بیزار یہ خود مست تمھیں کیا معلوم

قیس و لیلیٰ کی کہانی سے اے ناآشنا شخص
ہر کہانی کے تو کردار سے ناواقف ہے
قیس کے دشت سے بھی تو ابھی ناواقف ہے
اسلئے عشق کی تفسیر سے ناواقف ہے

عشق کو اندھے ہوس سے اے جلانے والے
عشق کو خود سے الگ معنی دلانے والے
عشق معنی سے بہر حال بہت آگے ہے
تیرے ناسودہ خیالوں سے بہت آگے ہے۔

نسیان نامہ

انس رحمان

ٹھیر جاتے ہوئے پانی پہ غم آگین شفق کی جھلمل
کون سے وعدوں کا بہلاوا ہے
دور سایے کی طرح شہر کے آثار پہ رکتی ہے،
پھسلتی ہے نگہ
رنج افزائی کا موسم ہے
سوخو نبار تمنا کے سوا
شاخساروں پہ کوئی اور اشارہ ہی نہیں

کس طرف جائیں گے تعبیر کے مریل گھوڑے
شام کی سرد ہوا سر پہ لیے پھرتی ہے
تھرتھراتی ہوئی پلکوں کا معافی نامہ
جن نگاہوں سے ترے عکس سنبھالے نہ گئے
معنی الٹاتے سفیروں نے بہت بین کیا بھی ہو تو
اب تو پلٹا دیے جائیں گے ان آنکھوں کو وہ خواب
جن میں اتری ہوئی شاموں کو بہت دیکھ لیا
سینچ لیا گہری فراموشی کو جل دیتے ہوئے
کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے کوئی بات ہوئی بھی ہو تو
جو اچک لے گیا معنی کی تھرکتی لو کو
گہرے ابہام کا سانپ۔۔۔۔
اعتبار اٹھ گیا معنی کی گھنی چھاؤں سے
اب ان آنکھوں سے کوئی بات نہیں ہو سکتی
دل جو کہتا تھا اسے مات نہیں جو سکتی۔۔۔

Old Ravians Union launches a documentary film on GCU













The Turkish Ambassador to Pakistan visits GCU











Youm e Takbeer Lecture by Brig. Dr. Waheed uz Zaman Tariq

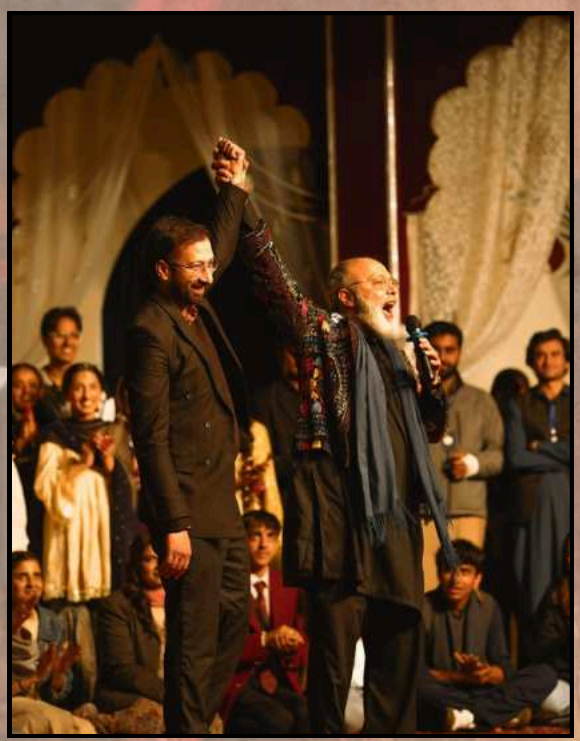








GCDC stages Annual Play Anarkali by Syed Imtiaz Ali Taj in January 2025

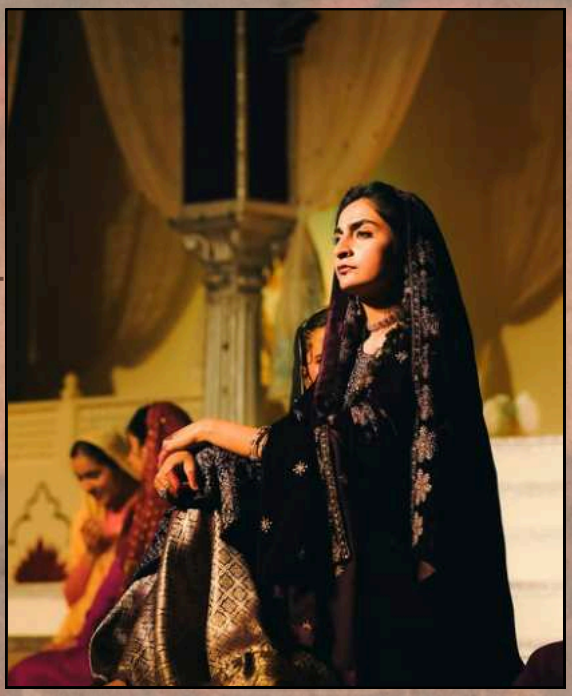








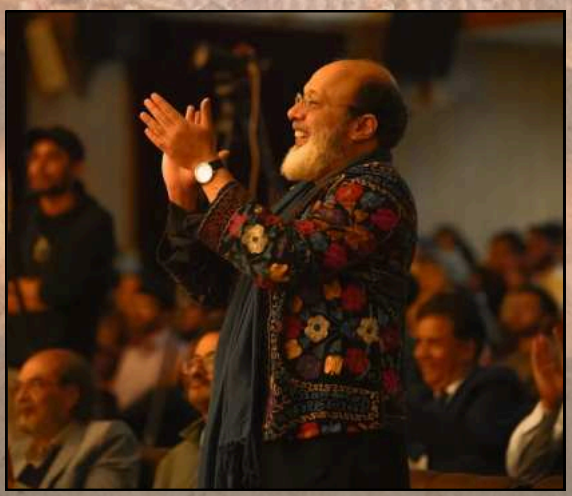






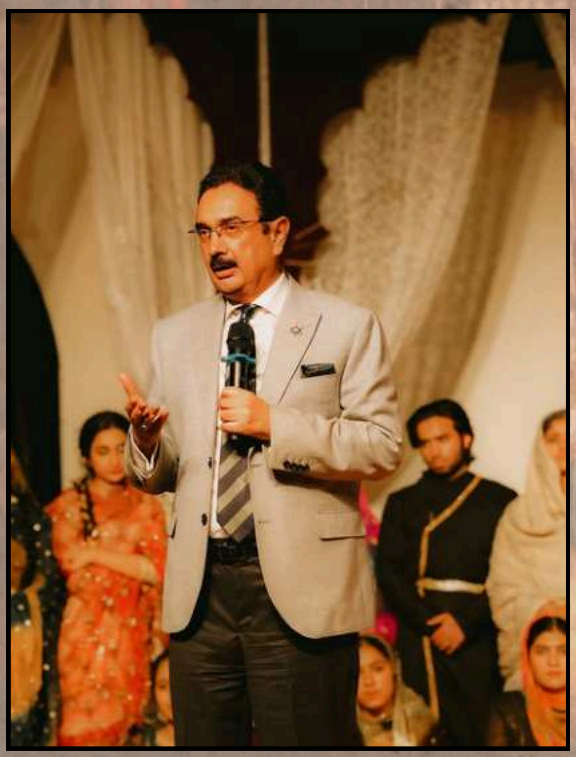














Prof. Basir Sultan Kazmi visited GCU to grace Nasir Kazmi Centennial Seminar







The Ravian academic distinction holders at BISE Lahore called on the Vice Chancellor



Orientation Seminars for the newly admitted Intermediate Students









29th GCU Parliamentary Style Debates - 2025





















Nazir Ahmad Music Society wins All Pakistan Music Conference 2025



NAMS wins the National Songs Contest in August 2025



Minister Education, Punjab addresses a seminar on the Bunyan Um Marsoos victory of the Armed Forces of Pakistan







The Chief Secretary of Punjab inaugurated the Art Exhibition jointly arranged by the Fine Arts Departments of GC University Lahore and GCU Faisalabad.







44th All Pakistan Allama Muhammad Iqbal Bilingual Declamation Contest - 2024












44th Allama Muhammad Iqbal Bilingual Declamation Contest 2023


44th Allama Muhammad Iqbal Bilingual Declamation Contest 2023







The CSA trainee officers visited GCU and engaged with the GCU faculty.

















Safdar Mir English Literary Circle






















OPEN
MIC





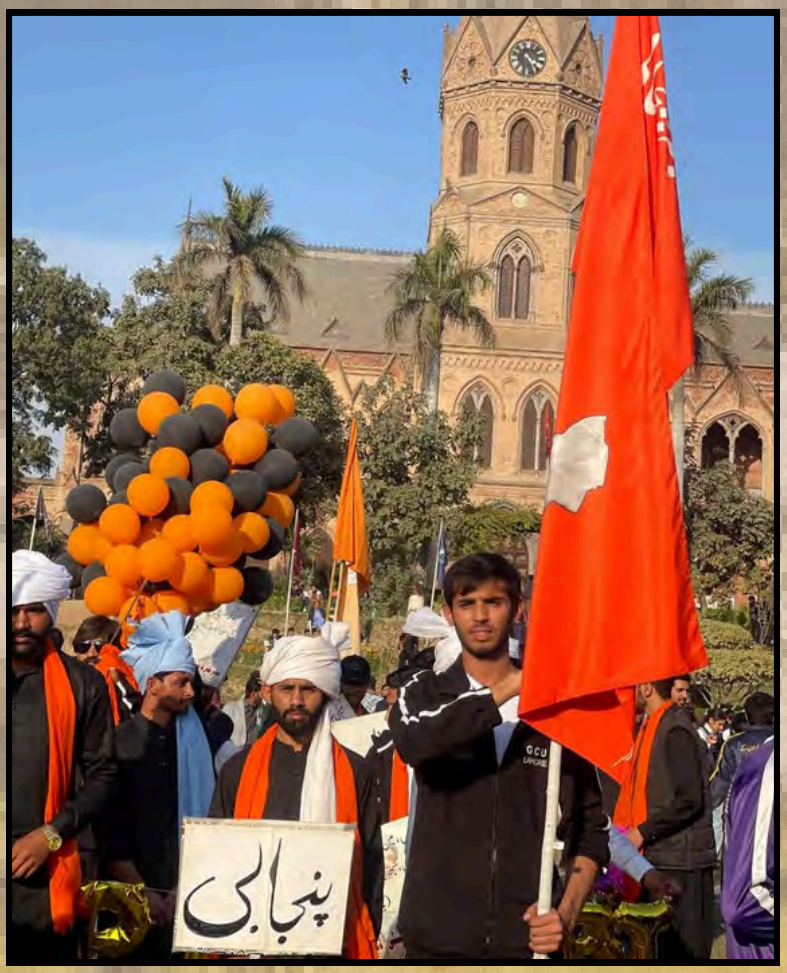



BRITISH COUNCIL
BL
EVENT MAG
Jubilee
EDGE
OOH Media Partner
kinetic





Punjabi Majlis Seminars






ممبر شپ ڈیسک "پنجابی مجلس" گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لہور
میں آں پنجابی پنجاب دے رہن والا
سدا خیر پنجابی دی منگدا آں
موتی کسے سہاگن دی نتھ داہاں
ٹکڑا کسے پنجابن دی ونگ دا آں
ست بسم اللہ
جی آیاں نوں
Session : 2024-2025
Main Events
Welcome party
Study Tours
Lohri Mela
Punjabi Mushaira
Weekly Adbi Baithak
Seminar
Kafi Night
Culture Festival
Annual Dinner
Prize Distribution Ceremony
تاریخ 09 دسمبر 2024ء | ویلا 09:30 وجے | تھاں پی جی بلاک، انٹر کیفے تے سائنس بلاک






محمد آصف خاں
یادگیری لیکچر


رائے محمد خان
پنجابی مجلس جی سی یونیو








آفتاب کھڑی داچاننن



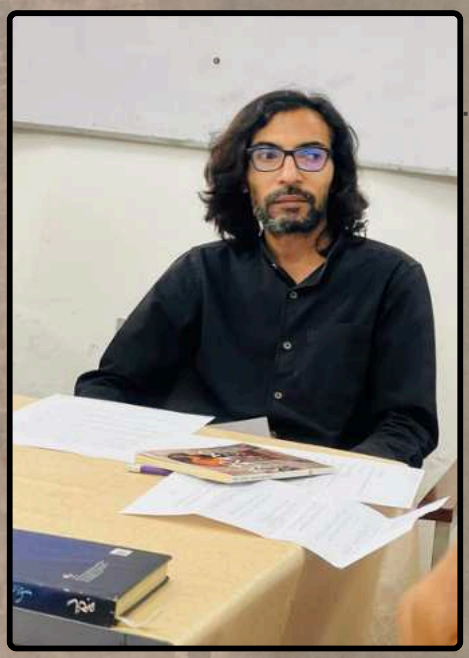




Literary Activities conducted by the Majlis e Iqbal










1.0
طرزِ نو


1.0
طرزِ نو














CERTIFICATE


LAHORE


کلام اقبال





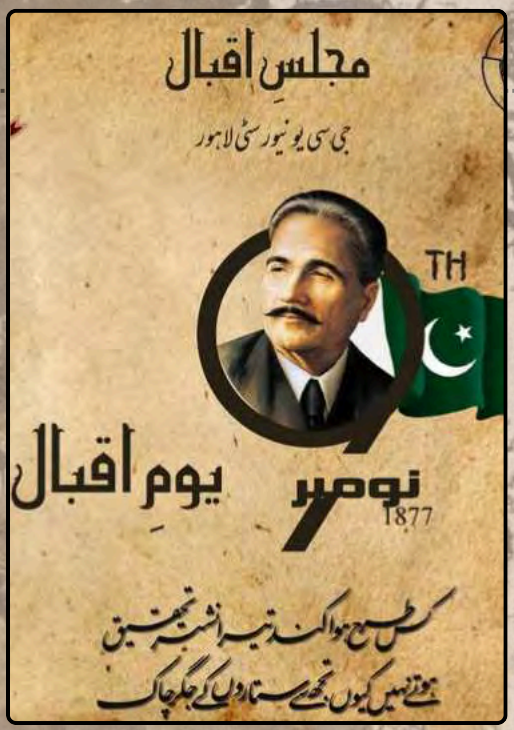







LUCE BELLA




مجلسِ اقبال
جی سی یونیورسٹی لاہور
TH
نومبر
یومِ اقبال
1877
کس طرح ہوا کند تیشۂ تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک






Thank You

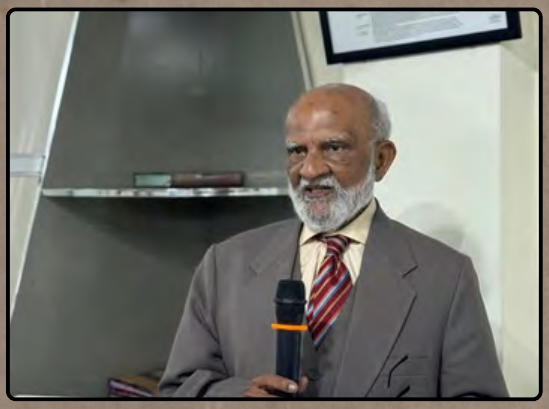



چہرہ بہ چہرہ روبہ رو
اہل قلم سے مکالماتی سلسلے کا تیسواں پروگرام
محمود شام
Mahmood Shaam
بمقام: پرائم منسٹر یوتھ ڈیولپمنٹ سنٹر جی سی یونیورسٹی لاہور
بوقت: 4 بجے سہ پہر
بتاریخ: 25 فروری 2025
مجلس اقبال و شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی لاہور
منتظمین: پروفیسر ڈاکٹر صائمہ ارم
(صدر شعبہ اردو)
ڈاکٹر سفیر حیدر
(نگران مجلس اقبال)
























Book
Orientatio














C-TIKA


طرزِ نو ۲
مجلس اقبال جی سی یونیورسٹی لاہور






INTRA UNIVERSITY LITERATURE COMPETITION 2025
طرزِ نو ۲






طرزِ نو ۲




INTRA UNIVERSITY LITERATURE COMPETITION 2025
طرزِ نو ۲






INTRA UNIVERSITY LITERATURE COMPETITION 2025








طرز نو۲




AVIATION MUSEUM












مجلس اقبال سی سی یونیورسٹی لاہور
تقسیدی اجلاس

Donors of GCUL







Convocation, January 2025





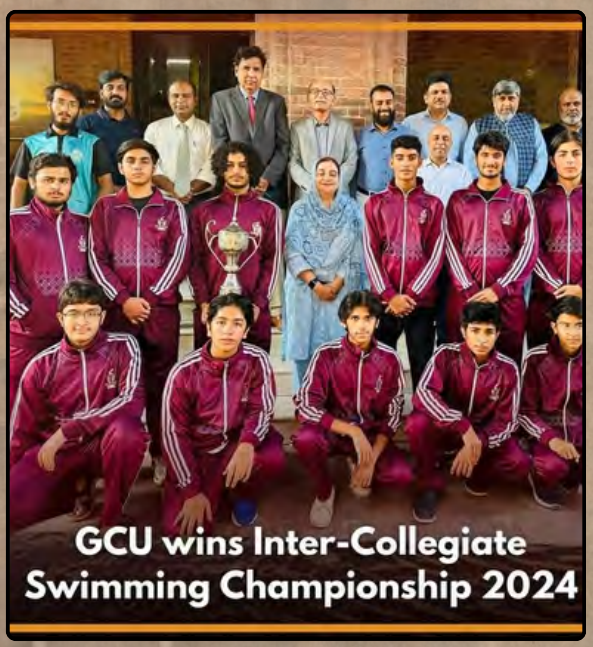








GCU Sports


GCU wins Inter-Collegiate Swimming Championship 2024







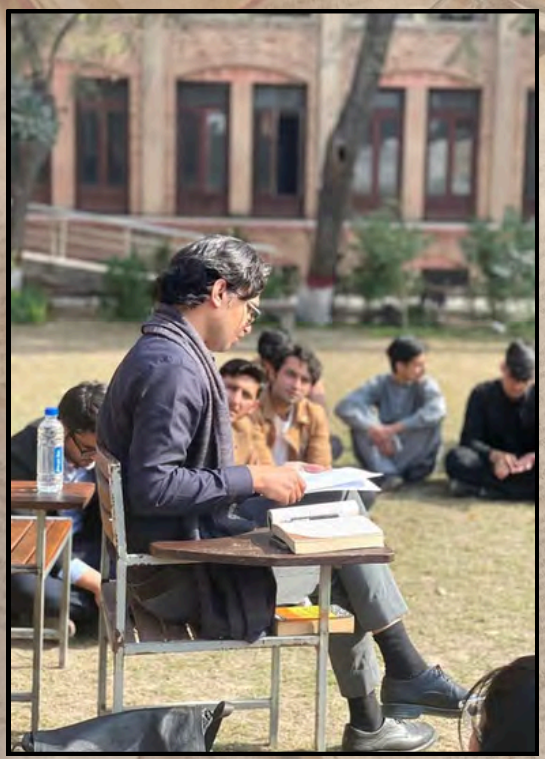


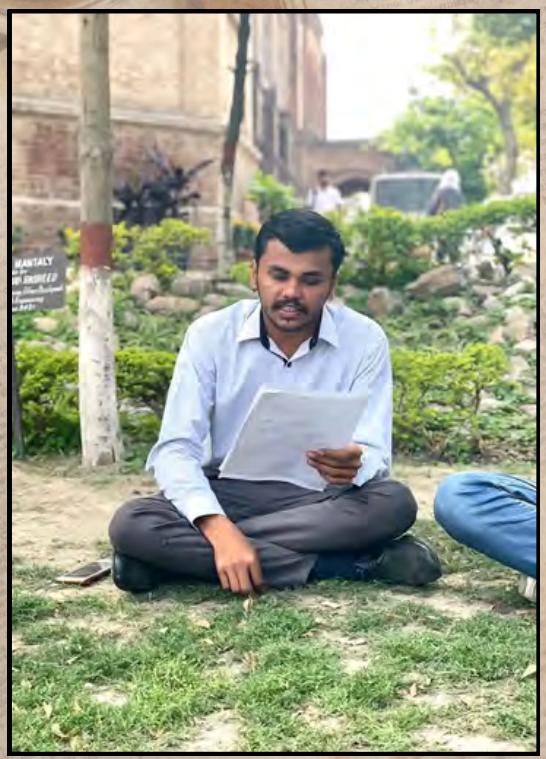
GCU Book Club organised ‘Meet the Author’ ceremonies, study circles and discourse sessions on important books.






























Dr. Faisal Bari
Economist, Educationist & Author
Member Higher Education Commission (HEC), Pakistan, 2018-2022
Looking forward to
[Advisor GIKI Book Club]
Conundrums of Pakistan
Dr. Faisal Bari
15th April, 2025
Youth Development Centre
11:30AM-1:00 PM

Majlis-e-Ameer Khusro
















GCU















GCU victories at the Model United Nations Conferences






TSMUN


LUMS DEBATING GALA


EXHIBITION
YLP



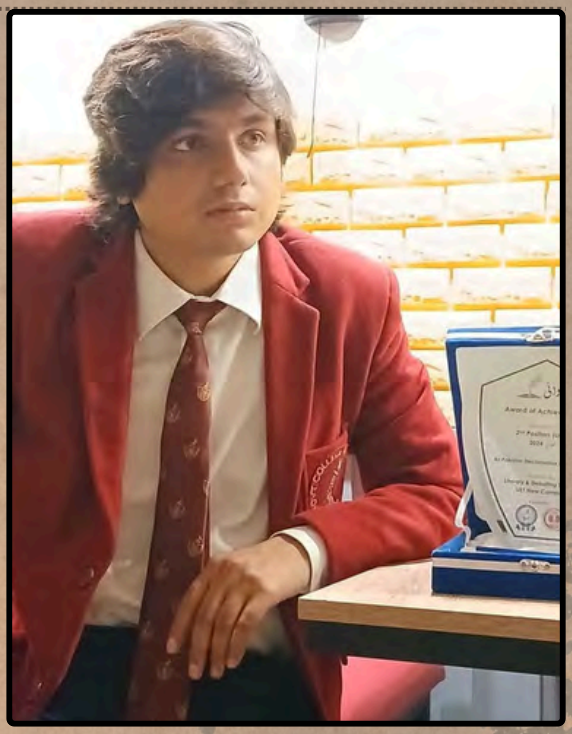






Ravians earn laurels from the length and breadth of Pakistan.



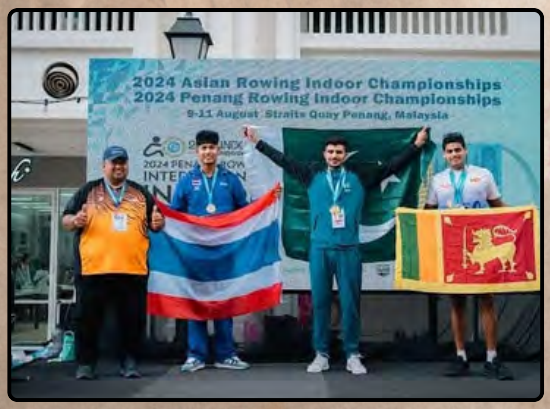











2024 Asian Rowing Indoor Championships
2024 Penang Rowing Indoor Championships
9-11 August, Straits Quay Penang, Malaysia
















FORMAN
CHRISTIAN
COLLEGE
(A CHARTERED UNIVERSITY)














BNOMUN V1


BOCOM '25
CERTIFICATE


2024






IVY




TSMUN


PUBLICATIONS




MUSHTAQ
SOCIA







Some snapshots, for those who carry GCU in their hearts.

























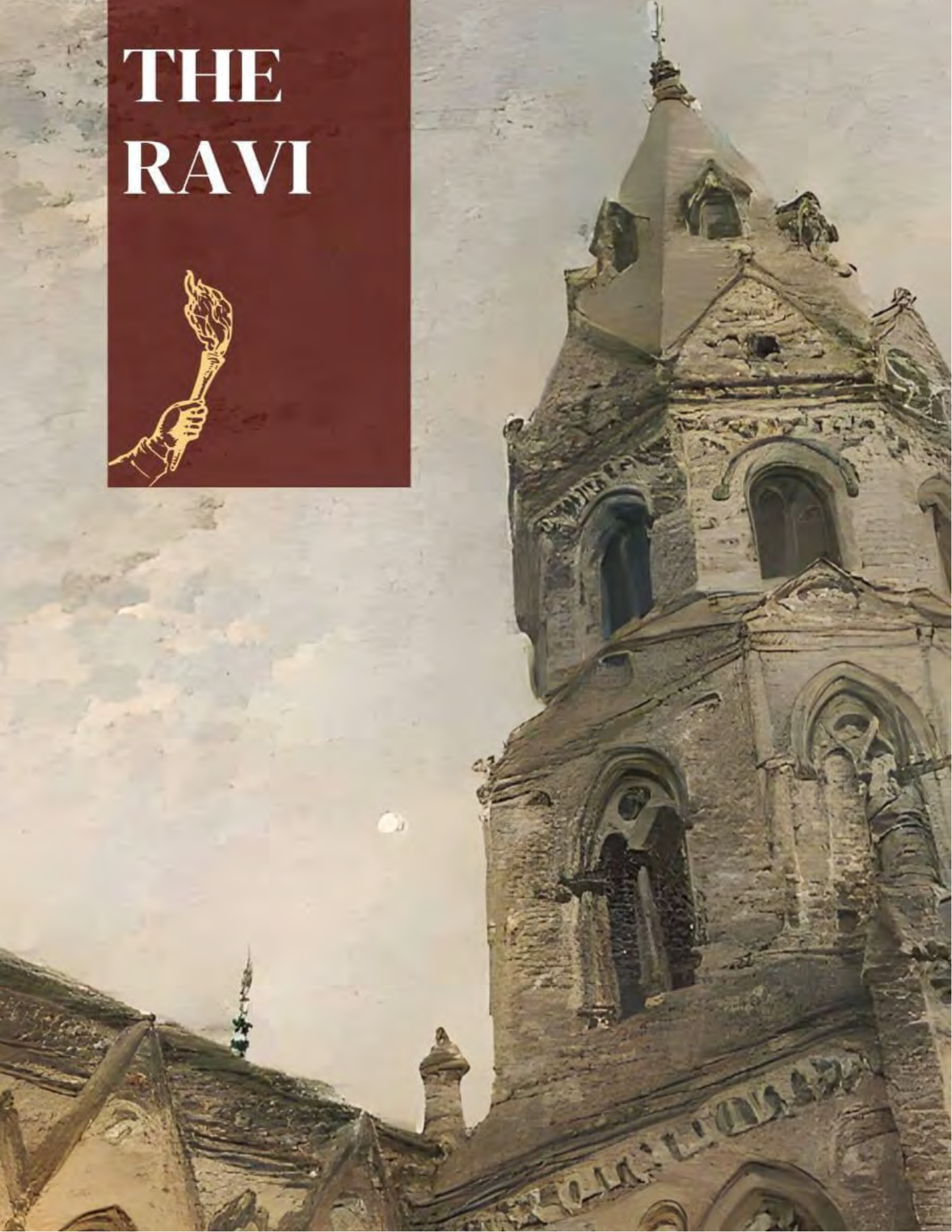








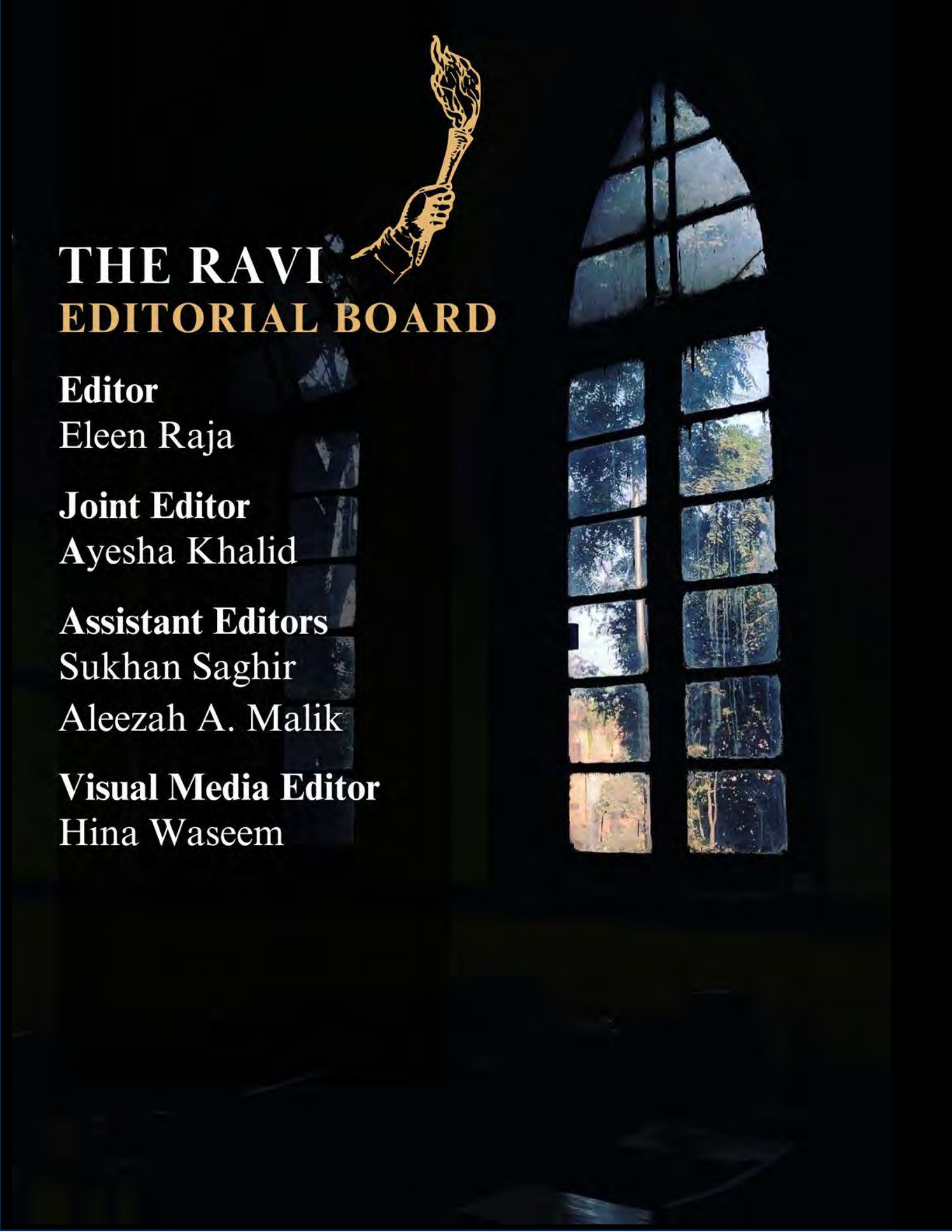
THE RAVI



Editors

1910-11	G D Sondhi	1911-12	Syed Zulfikar ud Din
1912-13	Sri Kishen Kapur	1913-14	Guru Dath Karwell
1915-16	Radha Krishna Khanna	1917	Tribhawan Nath
1918	Siraj-ud-din	1919-20	A S Bukhari
1921-22	H G Kathpalia	1922-23	Ghulam Ahmad Anwar
1923-24	Ugra Sen	1924-25	K M Sarkar
1925-26	N S Luthra	1926-27	I M Verma
1927-28	Siraj Din	1928-29	Ram Lal Manta
1929-30	N N Wanchoo	1930-31	A K Malik
1931-32	A K Nyazee	1932-33	P N Bhattia
1933-34	Srikrishab Bhalla	1934	Agha Abdul Hameed
1935-36	R N Madhok	1936-37	L J Johnson
1937-38	B R Nanda	1938-39	Bashir Ahmad
1939-40	H C Smith	1940-41	Afzal Iqbal
1941-42	P C Chatterji	1942-43	B B Vohra
1943-44	Shiv Sahai Kapur	1944-45	Gurbachan Singh
1945	Urmila Sondhi	1945-46	Abdus Salam
1946-47	R K Kaul	1947-48	Musleh Ud Din
1948-49	Manzar Bashir	1949-50	Ansar Hussain Khan
1950-51	Moeen A Quereshi	1951-52	Savak Katrak
1952-53	Promilla Thomas	1953-54	Mansur Ahmad
1954-55	Aslam Iqbal	1955	Muhammad Idrees
1956-57	Sakhi Sarwar Sultan	1957-58	Kamal Azfar
1958-59	Shahid Javed Burki	1959-60	Mujahid Hussain
1960-61	Parvez Masud	1961-62	Irshad Ullah Khan
1963-64	Abdul Basit Haqani	1964-65	Zainab Hashmi
1965-66	Agha Ghanzafar	1966-67	Nigar Ahmad

1967-68	Samina Hussain
1968-69	Tabussum Altaf
1970	Muhammad Abdul Rauf
1971-72	Anis Ahmad Dani
1972-73	M Athar Tahir
1975	Shahid Raheem Sheikh
1975-76	Samira Malik
1976-77	Tahir Saeed
1977-78	Amna Khan
1979-80	Zahra Hasan
1980-81	Babar Hashmi
1980-81	Khalid Malik
1983-84	Shehla Imdad
1984-85	Syed Muhammad Abbas Zaidi
1985-86	Amer Rashid Sheikh
1986-87	Ahmad Hafeez
1989	Sania Sehbai
1990	Hammad Shamimi
1991-92	Farha Zia
1992-93	Abdullah Khan Sumbal
1994	Usman Ghafoor
1995	Fatima Zia Dar
1996	Zunaira Ansari
1997	Ikram Ul Haq
1998	Muhammad Hyder Qayoom
1999	Nadia Butt
2000	Ali Shah
2001	Shumail Arif
2002	Jibran Riaz
2003	Saad Ahmad Dilshad
2004	Sara Kazmi
2005	Harris Bin Munawar
2006	Sameer Ahmed
2007	Sidra Sajid
2008	Sana Ahmad
2009	Muhammad Umer Khan
2010	Ummar Zia ud Din
2011	Isha Tariq
2012	Ali Zafar
2013	Hammad Sohail
2014	Azka Shahid
2015	Aitzaz Arif
2016	Hafsa Sohail Rathore
2017	Hassan Qadeer Butt
2018-19	Hassan Kamal Dahir
2020-21	Fizza Saeed
2022-23	Ayesha Asif Ali
2024-25	Eleen Raja



THE RAVI
EDITORIAL BOARD

Editor
Eleen Raja

Joint Editor
Ayesha Khalid

Assistant Editors
Sukhan Saghir
Aleezah A. Malik

Visual Media Editor
Hina Waseem

Table of Contents

Creative Non-Fiction **1**

Of Human Tapestries By Navid Shahzad 2

The Pakistani English Novel: Influence, Impact, Identity By Muneeza Shamsie 9

Erasing Legacies? Featuring a letter from Agha Ghazanfar By Salima Hashmi 14

Linguistic Hierarchies By Claire Chambers 17

'Sapere Aude': Courage to Know By Khaled Ahmed 18

Being Paid for a Hobby By Dr. Tariq Rehman 20

Pakistan's Structural Economic Problems in the Era of Financial Globalization By Dr. Fahd Rehman 28

Chequered Past, Uncertain Future: The History of Pakistan Tahir Kamran 30

In Conversation with the Bureau Chief of Dawn Newspaper, Nasir Jamal 35

The Need for a Canon By Dur e Aziz Amna 38

Where roses run blood By Ummar Ziauddin 40

Revisiting Abdullah Hussein's 'The Weary Generations': Politics, Poetics and Partition By Raza Naeem 51

Writing Pakistan: English Language, Representation, Style, and Perfectionism By Noor Rehman 56

Cultural & Societal Changes, and their Influence on the Teaching of English Literature in Pakistan over the Years By Farhan Aslam 60

An Interview with Syed Saleem Gardezi By Amama Bashir and Aman Irfan 63

Pakistani Prose By Amna Naeem 70

Linguistic Imperialism and English Departments: A Clear [Team Up/Tear Down] By Sana Raheel 75

The Trajectory of Academic Desire By Mustafa Bilal 78

Monologue of Despair and Hope By Noor Rehman 80

To Whom it May Concern By Zahhāk 83

My Very own *School of Resentment* By Eleen Raja 87

Dispelling the Death Instinct through Poetry By Ayesha Khalid 92

Social Mobility in the Context of the English Language in Pakistan By Ahmed Malik 95

"Certain books that are most necessary for all men to know" By Sukhan Saghir 98

Art's Unyielding Influence: A Philosophical Critique of Societal Constraints By Zeeshan Haider 100

Lahore by Zeest 102

Musings on Bilingualism: Navigating the Urdu-English Tightrope By Aleezah Ahmed Malik 104

What is the Name of Mr. Chips' Doctor? By Sofia S. Mirza 109

Poetry **112**

Flaking Smoked Fish By Ilona Yusuf 113

I Often Forgive You By Jasir Shahbaz 114

Hagiography By Abhiram Kuchibhotla 115

Untitled By Amna Naeem 116

To What Do We Owe [after Kamli by Sarmad Khoosat] By Mustafa Bilal 118

Too Brown; too Foreign By Khushbakht Imran 120

Limestone By Ilona Yusuf 121

Baseless Habits By Huzaifa Zeeshan 123

Quantum Physics By Noor Khalid 125

I am my Mother's First Born By Ayesha Saqib 127

Solitude By Ahmad Tajy 129

Rogue Dreams By Huzaifa Zeeshan 130

Forgotten forget-me-nots By Aima Arif 132

The Cold Wilder of Nights By Zunnoorain Fatima 134

Losing Ligament By Sajjar Shabbir 135

Nature on the Cross By Ahmad Tajy 137

Untitled By Aima Arif 138

Beauty of Art By Hira Mehar 140

On Palestine – The Dream of a Better Tomorrow By Shamama Madni 141

A Banyan Tree By Salman Tahir 142

Short Stories **143**

The Journey By Qaisra Shahraz 144

Insomnia By Aamer Hussein 162

King Street, Aberdeen By Shahbano Alvi 170

Zorro By Noor Khalid 177

Sedimentary Grief By Eleen Raja 181

Tender Moments By Muhammad Womik 182

Abysmal Impasse By Eza Qamar 184

Title Yet to be Decided By Ayesha Saqib 187

Cassette Dreams By Burhan Zahoor 190

A Bag of Coins By Musab Idrees 192

Paws By Rawhawn Ali 194

A Tale of Sweet Fragrances By Salman Tahir 197

Comic Section **199**

Flash Section **208**

Tomorrow will Come Anyways By Jasir Shahbaz 209

She Made Me Pray the Worst for Myself By Ayesha Khalid 210

Dead Prodigy By Timsal Fatima 211

An Orphan By Ashaad Karim 212

Whispers of Hope in the Dying Woods By Umamah Farooq 213

The Newspaper Boats By Ali Rasheed 214

Sham By Monochrome 215

The Storm of his Memory By Struggling Grey 216

An A-4 Size Poster By Ashaad Karim 217

Anecdotes **218**

Navid Shahzad 219

Moneeza Hashmi 220

Qaisra Shahraz 221

Manzar Sehbai 223

Shahid Nadeem 224

Sarmad Khoosat 225

Student Anecdotes **226**

Aiman Laeeq 226

Soofia Fatima 228

What my Father talks about when he talks about GC By Aleezah A. Malik 230

Muhammad Womik 232

Dur-e-Zahra 233

EDITORIAL

"Not that I want to be a god or a hero. Just to change into a tree, grow for ages, not hurt anyone."
- Longing by Czeslaw Milosz

In the realm of academia, legacies of pure excellence are not born overnight; they are nurtured and cultivated over a significant period of unparalleled devotion. This year, we celebrate a remarkable milestone that not only commemorates an unrivalled heritage of learning but also stands as a testament to the enduring legacy of our institute

Established in 1906, it has held the distinction of being the oldest college/university publication in Pakistan. Recognized as an esteemed platform for both creativity and insight, it has fostered a tradition of eminence harnessed by the most exceptional literary luminaries such as Patras Bokhari, Moeen Qureshi, Hanif Ramay, and many others. The Ravi has served as a crucible to a history of prolific and reformative discourse, reliant on a nexus of cultural preservation and postcolonial exploration. This year's special edition aims to underscore its rich tapestry and offer a tribute to the Department, its respective pedagogues and the evergreen potential of our student body. As you delve into these pages, you embark on an evocative journey through the annals of time, unravelling the undeniable mark that the English language and its subsequent literature has etched upon our culture, education, and society. In light of the occasion, I'd like to offer a few personal musings for young writers as we revel in this significant milestone.

I often begin things with poetry, even my article in our special edition this year is a testimony to this practice. I am, unfortunately, a prose writer; I am often poetic but not a poet. The aforementioned poem is titled *Longing* and is the product of a Nobel Prize winning poet of Polish-Lithuanian descent, the great Czeslaw Milosz. I believe literature in any form or language is inherently an attempt at immortality, a mortal attempt nonetheless. At my young age, the connotations I associate with literature are few; endurance, resistance and submission. The co- existence of the latter two appears contradictory but that is one of the most perplexing qualities of literature. At the crux of it are conflict, contradiction, and often defiance. Many authors tend to preach communality as a defining trait of literature which is not an inaccurate claim; the communities born from it are tied both spiritually and 'metaphorically.' However, literary camaraderie, especially the kind I have experienced, in our literary locale is so often represented through the act of negation. From a more corporal perspective, this characteristic of literature is interestingly akin to one of the fundamentals of Quantum Mechanics; that all quantum entities such as light possess both particle and wave-like properties. Despite their distinct natures they occur in simultaneity, quite similar to the co-existence of submission

and defiance in literature. Since our institute teaches both the sciences and the humanities, I wanted to offer an example pertinent to the students pursuing either. The fact that literature unconsciously mimics a universal phenomenon is a testimony to its immensity. To produce light or rather become it, us writers must engage in both acts equally and wherever necessary.

I never indulged in literature with the intent to be above it rather, quite similar to Milosz, to endure myself and this world without harm. Even as a writer, recognizing yourself as one does not come with courage or bravery, but it carries with it an irrefutable amount of hope. As the editor of the special edition of the Ravi this year, I wish to share this hope with you whether you are an amateur, or far above my rank in this extraordinary craft. The 150th anniversary of the Department of English Language and Literature is undoubtedly a monumental occasion and the contributions in this issue are representative of the glory of the Department and our overall institute. I am honoured to have read them and to have been a part of such a historic legacy; I humbly present to you the Ravi!

Eleen Raja

Editor

ARTICLES

ARTWORK BY SUKHAN SAGHIR



Of Human Tapestries

By Navid Shahzad

A lifelong preoccupation with the humanities has led one to discover the subterranean intricate patterns that seemingly bind fact and fiction together across time. The most exhilarating part of the journey has been the realization that the key tool for pursuing or deciphering such patterns requires neither the anthropologist's pick axe nor his careful brush. All that it does require for the treasure trove to be unearthed, however, is the imagination and human memory itself.

Just as the master weaves his priceless tapestries or rebellious roots escape from the earth to reach for the sky; so too does the human imagination – individual and communal, continuously renew itself in the dark rich loam of memory. Together, the two provide the skeins of silk threading diverse texts, images and performances together across time past and time present leading to the opening up of a new field of study.

Though a fairly recent addition to the pantheon of multidisciplinary studies, 'Heritage and Memory Studies' examines the social, cultural, cognitive, political and technological shifts affecting social groups. Focusing primarily on how, what and why individuals, groups and societies remember or forget, degree courses are being offered at various universities abroad which concern themselves with an examination of the phenomenon of individual memory and its links with broader dimensions of social memory. Both forms i.e. individual and social memory, working in tandem, subsequently focus on an examination of the politics of public remembering. The discipline therefore, cross pollinates across history, literature, anthropology, media studies, sociology, philosophy and psychology among others to offer an exciting and challenging area of study for historians as well as literature researchers which can prove immensely rewarding.

We know that the relationship between history and literature is particularly pervasive as can be seen from Pakistan's own checkered past. At present a sanitized history is taught just as literature continues to be dominated by western or oriental tropes carving a neat furrow between the two while the essence of academic excellence which lies in a comparative study of texts, continues to elude us. We are aware that while history is the collection of happenings or events; literature is the result of reflection upon or interpretation of human nature in its ever-shifting organic forms and that together the two sketch a portrait of humanity in which one without the other would be inconceivable. Tragically, in our own case, both have been given short shrift, as neither history nor literature has been allowed to seek or speak the truth whereas, the importance of inter-textual linkages is evidenced by the fact that just as the richness of Urdu literature cannot be gauged without reference to Persian, Arabic, Turkish or Sanskrit; English Literature also derives much of its richness from the Romance

languages. Despite English having been considered the ‘language of the center’ in a colonial world; the vast amount of translated literature being produced at present has enriched all languages further with its cross references to postcolonial narratives in native languages. To get a taste of what is possible, consider for example, how much more exciting and rewarding it would be to compare Fehmida Riaz or Kishwar Naheed’s poetry to that of Sylvia Plath or Stevie Smith!

Tracing the origin of linguistic forms, one need only glance over one’s shoulder to see that at the turn of the 19th century two new epistemological forms emerged: the first of these is what we now know as ‘history’ which defines an area of study meant specifically to create an awareness of the fact that events and our experience of those events occur in a particular time space. In this sense, history reinforces a peculiarly modern belief that a thing’s most fundamental truth may be revealed through a ‘post-mortem’ of the temporal processes by which it came to be. The second form christened ‘literature’, lends itself to what may be interpreted as a mode of language concerned with its own intransitive existence represented by the word in song, recitation, carved upon stone, inked on papyrus or skin, or as in contemporary times written on a sheet of white paper or flashing upon a digital screen.

The term ‘intertexuality’ as we understand it today, is the brainchild of the Bulgarian- French philosopher Julia Kristeva who coined it in the late 60’s to describe the constant and continuing exchange between diverse texts. Initially seen as yet another literary device, the term has acquired a far more complex character as it examines and builds linkages during the understanding and interpretation process of seemingly disparate products. As explained by Kristeva in her work *Desire in Language: A Semiotic Approach to Literature and Art*, a text is where “several utterances, taken from other texts intersect and neutralize one another”. Though recently defined, it is surprising to discover that the process of intertexual linkages pre-dates both history and literature as it traces its roots back to ancient times when the first human history and the discourses about texts began to be recorded. Simulating the master weaver and his use of multicolored skeins of thread to weave his silken tapestry; intertextuality as a literary device, replicates the master’s art as it examines and unravels the links and bridges which underlie diverse texts.

Historically, the processes’ origin can be traced to the ancient Greek discipline of mnemotechnics, which gave rise to the prolific tradition of representing and transmitting knowledge as writing in its mnemonic dimension concerned itself with both memory and the role that images played during the process of recollection. In turn, the word and the image (as in a hieroglyph) enabled the storing of knowledge as both stressed the need for the preservation of cultural experience either by a bearer (of memory) as witness, or as written text. To put it simply, intertextuality is a set of relations which a text may have with other texts or discourses belonging to various fields and cultural

domains through an active use of literary forms. That is to say, that whenever a new work of art is created it affects all the works of art which have preceded it. Very much like a mason building; a wall brick by brick changes the structure of what already exists, intertextuality identifies the enormous range of links that may exist between texts through the use of literary tools such as direct quotation, citation, allusion, echo, reference, imitation, collage, parody, pastiche, literary conventions, structural parallelism and translation among other methods which are either consciously used or unconsciously reflected upon. As a result, the porosity created between diverse disciplines opens up new vistas allowing for the mapping of new academic territory in courses such as 'reading film' instead of just 'viewing' it; or perceiving music, movies, buildings, paintings and sculpture also as 'texts.

While serving as a kind of springboard for the reader to discover subterranean associations, such interdisciplinary connections also identify another important detail which applies equally to the reader and text. Intertexuality not only concerns itself with identifying the artist or author's sources of borrowing, transforming, rewriting or absorption of preceding texts but just as critically, concerns itself with the reader's own knowledge and the readings that he has done! The inevitable and exciting conclusion this leads to is the realization that the multi-layered meanings of a text lie not only in the act of production but also in the act of reception!

It cannot be overemphasized therefore, that this places an enormous responsibility on the part of the recipient i.e. the reader/researcher, a premise which is lent greater weight by poststructuralist theory. With the publication of his essay, *The Death of the Author* (1967), Roland Barthes metaphorically announced the demise of the writer while simultaneously supporting the idea of 'the birth of the reader' as an authentic source of meaning for a given text. Barthes argued that any literary text may have multiple meanings and that the author cannot be seen as the prime source of the work's semantic content-instead, it is the reader who must be seen as the source of the proliferation of meanings in any text! It can be seen therefore, that the evolution of intertexuality took place within the perimeters of post-structuralism with its famed practitioners such as Derrida, Foucault and others. Interesting as the new theories were and are; it is the critical constant presence of 'memory' with its adjunct corollary known as 'time' that serves as the glue that holds everything together. Let us not forget that most of us perceive time in terms of linearity i.e., a movement from point A to point B in which the present, perhaps denoted by an X represents where we stand today. Appearing almost like a breathing space between the binary opposites of the past and the future; the position X implicitly suggests that we view the present as static – not unlike a period at the end of a sentence. Poet/critics such as T.S. Eliot would disagree vehemently as they believe that the past exists only in one's current sense of it, just as the same could be said of the future. While it must be appreciated that a 'text' itself

is not a linear entity as it may be a complex layered combination of texts which are culturally and topically fashioned over time and belong to a diversity of cultures; we cannot ignore the fact that all things – tangible or imagined, remembered or anticipated are fragments of a whole which may be recalled through the exercise of an active memory and/or imagination. It is a strong possibility therefore, that in time still more connections may be forged as the understanding of texts and their links continue to grow and facilitate the 'deconstruction' of socio-cultural tropes. It is important. therefore, to remember that among other mediums of expression, both history and literature employ writing – which in itself, is as much an act of memory as much as it offers a new interpretation of every new text being etched into memory space.

Writing history is as much an act of memory as is literature. Both fuse together to produce what we know as cultural memory which is the outcome of authors drawing upon other texts both ancient and contemporary, belonging to their own or another culture. During the process, writers allude, quote, paraphrase even as they incorporate references (consciously or subconsciously) from a wide variety of texts just as I have used Elizabethan and folklore tropes frequently in my book *Aslan's Roar: Turkish Television and the Rise of the Muslim Hero* (2019). This interchange and contact, formal and semantic between texts and cultures, literary or non-literary perceived in literary scholarship as 'intertextuality' received great attention in T.S. Eliot's pioneering essay *Tradition and the Individual Talent*, wherein he considers a work of literature, not as a closed network but as an open product containing the traces of other texts. "You cannot value him (the author) alone; you must set him, for contrast and comparison, among the dead," writes Eliot. Seen from this perspective, no author and no text can be unique - which is as close to a declaration of intertextuality as one can hope for.

Closer to home and the present, we can see that however much of Faiz's poetry may be seen as revolutionary in spirit, there are aesthetic and clearly Islamic dimensions to his poetry which have not received the attention that they deserve. While the myopia may be attributed to the effects of applying only western modes of postcolonial literary analysis; such a view distorts and reduces his poetry to a single fragmented dimension. Placing Faiz exclusively among the pantheon of postcolonial imaginations struggling with knotty issues surrounding nationhood and class divisions is to ignore the specific cultural historicity which informs the poet's work.

With its obvious references to the Quranic description of the Day of Judgement and the Prophet Muhammad's (PBUH) action of removing all pagan idols from the Kaa'ba's interior after his victorious entry into Mecca; the anthem/poem *Ham Dekhen Gay* is far more than merely a 20th century Marxist call to "watch and wait" or an example of a despairing, secular modernity waiting for a revolutionary turn of events. Given Faiz's educational background and his literary interests, it should

come as no surprise that his poetry, however 'modern' in tone it may be, remains rooted in a classical Indo-Persian tradition lent additional complexity by echoes of Sufi and Islamic practice. The result is that Faiz's poetry gains dimensions beyond that of mere postcolonial revolutionary fervor when seen in the light of intertexuality.

By this token and reinforcing the fact that ours is neither a peaceful age nor a critical one, a rhetoric of collective memory can be found in all literary genres which represent the past, from romance to gothic to crime thrillers while feature films work in a similar vein. Conversely, modes of remembering need not necessarily be established by verbal, literary, narrative or visual forms as non-fictional media such as historiography, journalism, painting and photography have developed their own 'rhetoric of collective memory.'

Furthermore, an examination of literature itself reveals that it usually allows its readers both a 'first' and a 'second-order' observation since it gives us the illusion of glimpsing the past (in an experiential, mythical, or antagonistic way) and is – often at the same time – a major medium of critical reflection upon these very processes of representation. It is memory itself, that encourages literature to become the bearer and transmitter of actual historical knowledge by construing intertextual bonds between literary and non-literary texts.

An illustration from classical western literature may serve to clarify this view further. Early in Homer's epic poem the *Iliad* about the legendary Trojan War, the reader comes across a famous digression known as 'the catalogue of ships' which names all the Greek leaders and contingents who came to fight at Troy. Before he commences with this impressive roll call, Homer makes a special, public appeal to the Muses to ensure he gets the facts right:

Tell me now, Muses, who have your homes on Olympus –
for you are goddesses, and ever-present, and know all things,
and we hear only rumour, nor do we know anything –

These verses reflect a central claim of epic poetry i.e., that through the inspiration of the Muses who are believed to be "Daughters of Memory", it can preserve the knowledge of people and the events of the past. The importance given to 'memory' therefore, not only invests it with a formidable power but also elevates its stature as a valuable asset in the non-literate, oral cultures during which the epic evolved. The *Iliad* believed to have been composed around 750-700 BC, actually traces its origins to at least some five centuries earlier, which places it deep in the Mycenaean Bronze Age. The Mycenaeans themselves knew of writing but appear to have used it only for bureaucratic bookkeeping in their palace states. When their kingdoms collapsed around 1200 BC, even this limited use was lost. Thus, from the end of the Mycenaean Age until the age of Homer, poets who performed and adapted

the epic orally kept the tradition alive and carried the memory of the Mycenaean world into new ages. We are fully aware of the fact that oral storytelling was a way of preserving memory and knowledge for centuries. Liturgical history reveals that the Muslim Quran was preserved scrupulously by the 'Qurra', and the 'Hafiz'; a unique class of scholars who memorized the holy book's verses exactly as the Prophet (PBUH) had uttered them until it was transcribed in manuscript form after his death.

The secular domain has also had its own moments as history tells us that the Russian poetess Anna Akhmatova's major poetic offering *Requiem*, was never written down during Stalin's lifetime and was preserved only through a process of exacting memorizing. The poet herself confesses how much she enjoys "the profound joy of recurrence" as "when I write, I remember, when I remember, I write," which validates Nietzsche's initially strange idea of eternal recurrence. The more we examine the concept, the more we realize that the unfolding logic in history appears to be one of unending repetition in which the past returns in unexpectedguises to dispel visions of a new world and the oft used casual adage about history repeating itself appears to be chillingly true.

In this respect, we can see that in the field of literature; the Iliad is keenly aware of its role as the keeper of memory, therefore credibility remains central to its storytelling. Though the epic is a work of fiction i.e. imagination, and relates to the events of a few weeks in the tenth and final year of the Trojan War fought between Greeks and Trojans over beautiful Helen, the epic works hard to be realistic. Similarly, Homer's characterization of the epic's main players is wholly and consistently believable which is achieved through the characters' own words and speeches.

And now to history! Seneca's wry comment: "God cannot change the past, only historians can" notwithstanding, it is comforting to know that history is not the exclusive domain of historians. While it is true that the Iliad is a work of fiction but the fact remains that the Trojan War did take place and according to Thucydides writing in the 5th century BC, resulted in the destabilization of Greek states at the end of the Dark Age.

The same process may be evidenced in other modes of writing such as the literature of the fantastic, especially with reference to romanticism. Like a swift undercurrent running below the mainstream, the fantastic operates as a mnemonic device that makes the forgotten or repressed reappear. Compensating for, supporting and nourishing suppressed traditions of knowledge lost as a result of cultural constraints and fascinated by the nature of arcane knowledge with their exclusive doctrines and practices such as the secrets of alchemy, mesmerism, the symbolic language of the 'kabbala' as well as by their ritualistic preservation and transmission; the authors of fantastic texts like Mary Shelley, E. T. A. Hoffmann, Nikolaj Gogol, Edgar Allan Poe, H. G. Wells, and others draw in a most obvious manner on other texts, giving rise to the tradition of the Gothic novel.

Here, one must stop to distinguish between two forms of memory: the natural and imagined, and secondly the trained and tangible. That memory can indeed be tangible and quantifiable we only need to reference Oliver Wendell Holmes's prediction made in 1859. Describing it as a "conquest over matter," Holmes believed that photography would alter the physics of perception and change the way people would see and understand the world around them since the image could be 'frozen' for all time. Two centuries later, we can see that the prophecy did not limit itself only to the still image. Surging ahead from the first photograph to the invention of the phonograph which captured sound, to the motion picture camera which captured both; all three technologies have extensively contributed towards the evolution of the present day image culture in which memory plays an important part.

The 21st century, among its other iconic milestones is marked by the phenomenal growth of the media in print and digital formats. As a result, both film and TV have emerged as powerful platforms which allow audiences the luxury of immediate escape from the anxieties of life; just as much as they create political battlegrounds for contested ideologies resultantly creating an enormous amount of accessible archival material. There can therefore, be no better reservoir of modern memory or example of intertextuality than the sound image captured by the camera.

For many of us, there comes a time in our lives when something extraordinary makes one do a rethink – in other words, get the opportunity to create new memories. We know that there can be no going back to change what has already been lived i.e. our beginning; and that we can only start from where we are at present in the hope that perhaps we can change the ending a little.

Poised between imprecision and razor-sharp clarity; suspended between a known past and an unforeseen future, believing that 'each venture is a new beginning' and that into each life some rain must fall, may one dare to hope that Government College University with its fine teachers and student body will take up the challenge of reading across texts in English, Urdu, Punjabi and many other languages in translation? After all, in the final analysis, human beings are the finest examples of intertextuality themselves, and one cannot help but be awed by the possibility of each individual bringing a unique treasury of memories, readings, experiences and songs to the center as we as a nation, struggle to weave new patterns into our individual and communal tapestries.

The Pakistani English Novel: Influence, Impact, Identity

By Muneeza Shamsie

Pakistani English literature has grown from a small, little-known genre to a leading star in World Anglophone literature. New, acclaimed writers continue to emerge every year. In Pakistan the audience is largely restricted to an Anglophone, or bi-lingual class.

In January 2019, Mohammed Hanif's award-winning novel *A Case of Exploding Mangoes* was translated into Urdu. Suddenly intelligence agents raided and threatened the publisher, confiscated the Urdu edition and wanted to know the author's whereabouts.

The English version, first published in 2008 had won the Commonwealth Writers Prize and is a brilliant political satire. In 2018, Hanif, a distinguished novelist, journalist and broadcaster, was decorated with high national honours.

The crux of the problem is that the novel also lampoons the military and General Zia and the Urdu version will reach a much larger readership. The fear of words and their power permeates Pakistan's history as does the persecution of writers.

In the newly independent Pakistan, Ahmed Ali was the only well-known, internationally acclaimed English language novelist. In 1964 his famous pre-Partition novel *Twilight in Delhi* (1940) challenging the British Raj, was translated into Urdu by his wife Bilquees Jahan and assumed a new life. Many said it had been 'restored' to its natural language. But the radio adaptation was banned from being broadcast by Radio Pakistan because the 1965 war with India broke out – and Delhi was now capital of the enemy country.

By then Pakistan was under martial law. 1967, Zulfikar Ghose emerged as the first major Anglophone contemporary novelist in the Pakistani diaspora. His novel *The Murder of Aziz Khan* (1967) was promptly banned in Pakistan for criticizing military rule. But in London the ex-patriat Ghose and his British publisher continued to work with impunity. In marked contrast, the Lahore-based publisher of Nasir Ahmad Farooki's badly written novel *Snakes and Ladders* (1968) lampooning the military-bureaucratic elite, was shut down and Farooki was driven into exile.

However, times change, as do the governments. The once-banned books *Twilight in Delhi* and *The Murder of Aziz Khan* were reprinted in Pakistan and remain important pioneering texts in the South Asian Literary canon.

For many decades in Pakistan, nationalistic critics refused to accept Ghose as 'Pakistani', because he lived in Britain, then the United States and his work was set in different continents particularly South America. His famous trilogy *The Incredible Brazilian* (1972/75/78) which was translated into twenty languages is hardly known in Pakistan, although critic Chelva Kanaganayakam

says it reworks *Aziz Khan* on a grander scale; Ghose expands the trilogy's dimensions further by engaging with the American novelist, Thomas Berger's *Little Big Man* (1964).

Sufi mystical themes permeate Ghose's fiction increasingly including his eleventh novel *The Triple Mirror of the Self* (1992) which unites all the continents in which he has lived – the Americas, Europe and South Asia – a significant trajectory in today's global world. By then, in the 1990's Ghose was still excluded from the then-fashionable discourses on English literature, defined by region and country: he didn't quite fit in with any, whether American or Commonwealth – and he came to deplore the geographical definition of writers: he declared that all that matters is good literature.

In Pakistan, these debates on identity and belonging revolving around Anglophone literature (not Diaspora writing in Urdu and other Pakistani languages) marginalized Adam Zameenzad too. He grew up in Pakistan, later settled in Britain and wrote about different countries including Africa. His first novel *The Thirteenth House* (1987) was set in Karachi during the late 1970's. He was the first Pakistani English novelist to win a major international prize – the David Higham Award - and to be long listed for the Booker prize was his fourth novel *Cyrus* (1990) which traversed India, East Pakistan, America and Britain.

In western academia and the Diaspora however, there was a growing interest in the literary production of post-war migrant communities which had started to assert themselves increasingly. The British-born Hanif Kureishi, son of a Pakistani father and British mother, gave British Asians a new voice and influenced countless others. His plays, screenplays and fiction asserted a strong British identity and a multi-cultural heritage, across class and ethnicity. His work, particularly his life writing, reveals clear links with Pakistan, through an intertextual engagement with his Anglophone paternal literary family in Pakistan particularly his uncle the journalist Omar Kureishi, his aunt, the poet Maki Kureishi – and the published and unpublished works of his father, Rafiushan Kureishi.

British academics tend to gloss over this Pakistani inheritance. While Pakistan's Anglophone readers belong mostly to an elite, educated in English medium school and colleges. They cannot relate to the working class Britain that Hanif portrays. They accuse him of pandering to western stereotypes. This criticism extends to the writings about factory workers by the British Pakistanis, Nadeem Aslam and Tariq Mahmood.

Interestingly in 2000, the distinguished Urdu writer Abdullah Hussein, having lived in Britain for forty years published his only English novel *Émigré Journeys* about illegal immigrants working in Birmingham and cramped into an overcrowded house. But in Pakistan this novel is seldom mentioned in discussions on Hussein's celebrated work. Is this an unspoken issue of language, or class, or both?

However, within Pakistan the birth of a new contemporary Anglophone fiction begins with Bapsi Sidhwa. She was the first Pakistan-resident writer to produce English fiction which reached out to both local and international audiences, since Ahmed Ali, with the British publication in 1980 of her self-published first novel, *The Crow Eaters* a comedy set in Lahore, featuring the British Raj and the Parsee community to which she belongs. Sidhwa went on from strength to strength, focusing on women's lives always, Parsee, Muslim, or Hindu. Her third novel *Ice-Candy-Man* (1988) was the first Pakistani English novel to focus on the Partition riots; it was developed into a highly praised film *Earth* by Deepa Mehta. Sidhwa migrated to America in the 1980's, but continued to frequent Pakistan. At the same time Pakistani women were given a voice in Anglophone literature through new novelists such as Farhana Sheikh and Rukhsana Ahmed in London and Nazneen Sheikh in Canada.

This era saw Pakistan's involvement in geo-politics: the Soviet engagement with Afghanistan, the collapse of the Soviet Union, rise of religious extremism, the war in Iraq, and 'the war on terror'. The ahistorical response to these by western leaders and the media led to Tariq Ali's sequence of historical novels: two on the *Fall of Communism* (1990/1998) and five in his *Islam Quintet* (1992 – 2010) on the relationship between Islam and Christianity across the ages in different lands.

By now, the Pakistani English novel starts assuming a global role, which coincided with the advent of the internet and the satellite media, the ease of travel, and the emergence of a new generation of talented writers, who had been educated in both Pakistan and the west – or lived between the two. As a result, divisions between resident and non-resident writers began to fade.

This new generation which emerged to great acclaim at the turn of the century included Nadeem Aslam, Mohsin Hamid, Uzma Aslam Khan and Kamila Shamsie. They are among the multi-award winning writers, who portray the brutalization of society against a backdrop of geopolitics and challenge many socio-political platitudes bandied around in the West – Mohsin Hamid's multi-layered *The Reluctant Fundamentalist* (2007) is now an international film.

In 2008, Mohammed Hanif wrote the first political satire in Pakistani English fiction *A Case of Exploding Mangoes* and went on to write more highly political novels. Musharraf Ali Farooqi, Moni Mohsin, Maha Khan Philips have brought their own unique voices to the traditions of social satire. Interestingly, Farooqi, who translated, the complex Urdu fable "Dastan-e-Amir Hamza" and continues to translate classics, draws on the traditions of the Urdu 'dastan/qissa' in two of his English novels *The Jinn Darazgosh* (2010) and *The Merman and The Book of Power: A Qissa* (2019).

Two septuagenarians marked new directions: Jamil Ahmed's *The Wandering Falcon* (2011) provided rare insights into Baluchistan's timeless tribal culture, while a decade earlier, the distinguished Urdu writer, Abdullah Hussein wrote his first and only English novel.

Pakistani English fiction became increasingly dynamic, drew larger World audiences and was avidly sought out by international publishers. New novelists emerged in the United States – Nafisa Haji, Soniah Kamal, Anis Shivani – and Ayad Akhtar, the Pulitzer winning playwright: his second novel *Homeland Elegies* (2020) described as auto-fiction employs the format of interconnected essays to negotiate identity and belonging across two generations of a Pakistani family in America.

There is a small but dynamic body of work emerging from Australia too, including the novels of Azhar Abidi, Sami Shah and Wayne Ashton, whose novel *Under a Tin Grey Saree* is set in East Pakistan before 1971.

A growing number of Pakistani English writers have tackled the seldom-discussed 1971 military action in East Pakistan including Kamila Shamsie, Sorayya Y. Khan, Shahbano Bilgrami and Shahryar Fazli while Roopa Farooki, brings to her fiction her dual inheritance as the daughter of a Bangladeshi mother and a West Pakistani father – the banned 1960's novelist Nasir Ahmad Farooki.

The different dimensions of prejudice, faith and geo-politics run through the novels of Nadeem Aslam, Fatima Bhutto, Osman Haneef, H.M. Naqvi, Kamila Shamsie and Taymour Soomro while an experience of America in the aftermath of 9/11 emerges in the novels by Hamid, Naqvi and Shamsie too. Then you have Aamer Hussein and Bina Shah engaging in the timeless history of Sindh, and Maha Khan Philips creates a thriller reconstructing the ancient city of Mohenjodaro; Sadia Abbas and Maniza Naqvi focus on ethnic-riven Karachi; Irshad Abdul Kadir and Haroon Khalid Akhtar portray the conflicts of hereditary women 'pirs'; Uzma Aslam Khan and Feryal Ali Gauhar tackle ecology; Faraz Talat explores a futuristic world of medical science battling pandemics; Osama Siddique's spans the subcontinents many civilizations across past, present and future.

Issues of gender are central to Pakistani English fiction including the first novels of young women writers such as Sabyn Javeri's political thriller *Nobody Killed Her* (2017). The many other feminist debuts include Saba Karim Khan's *Skyfall* (2020) which spans historic Lahore's red light area – The Shahi Mohalla – and New York City; Aamina Ahmad's *The Return of Faraz Ali* (2022), centering around Lahore's Shahi Mohalla too, incorporates World War II, the 1971 war and Pakistan's political turmoil; Sairish Hussain's multilayered *The Family Tree* (2020) tells of three generations of Pakistani Britons; *When We Were Sisters* by Fatimah Asghar (2022) and *American Fever* by Dur e Aziz Amna (2022) capture experiences of Pakistan-origin girls in America.

As the Pakistani English novel diversified into different genres, there has been much praise for the police thrillers of Omar Shahid Hamid, the medical thrillers of Saad Shafqat, the dystopian feminist novels of Bina Shah; the speculative fiction of Mohammed Hanif, Mohsin Hamid, Sami Shah, and Zain Saeed; the romantic fiction of Nadya A.R. and Taha Kehar.

This is a body of work which will continue to grow and develop, and the fact that it raises important questions on influence, impact and identity in Pakistan and beyond in today's interconnected world, adds to its significance.

Erasing Legacies?

Featuring a letter from Agha Ghazanfar By Salima Hashmi

Government College, long before the U was added to it, was just GC; the place I used to often spend Sunday afternoons as a child playing in the Principal's Lodge. The Principal was of course Patras Bokhari, known to our brood of cousins as Uncle Bokhari. A dear friend of my parents, he brought much joy to the kids by showing us around the rock garden with its little bridges and waterfalls.

I think back to later years when attending riveting debates and the GCDC offerings in the Hall were often the highlight of the 'season' in Lahore. One saw so many plays as both a teenager and student. Everyone was present from Zia Mohyeddin, to Salman Peerzada to Promilla Thomas, Khaled Ahmed, Tariq Ali, Shoaib Hashmi, and of course Abdul Qayyum JoJo. He was the Vice President of GCDC together with Shoaib, who by that time was the person that caught my interest. The Centennial celebrations included a visit from across the border by the great actor Balraj Sahni who was hosted by GCDC and Shoaib in particular. *Arsenic and Old Lace* was the play chosen for the Centennial and was a great hit. After we were married, JoJo became a constant visitor of our home. He taught English at GC but I think he taught the students so much more. He was a voracious reader and debonair in his manner.

Together with Shoaib he would sit around at the Tuck Shop and regale students with anecdotes from his seemingly eventful life. His father had left behind lands and assets which made him a wealthy man, but one would not have known it. As an only child, he was devoted to his mother, but was equally devoted to his students and GC and more than that the annual play. We didn't own a car, so JoJo's Volkswagen ferried us from our tiny flat in Mozang first to NCA to drop me off and then onwards to GC. In the evening we would go back to Safan Wala Chowk to our flat to order kebabs while he had his tipple. The flat soon became the 'adda' for a large group of friends from GC and from NCA; including writers like Kamal Ahmed Rizvi or film directors like Faridudin Ahmed. It was informal enough for the Head of Economics, Professor Rasheed (later principal) and Dr. Nazeer Ahmed (then principal) to drop by for a 'gupshup' session, and there would be shouts of laughter interspersed with serious discussions alongside a constant supply of kebabs.

The last play that I remember was Molnar's *The Swan*. It was directed by Shoaib and had a stellar cast perhaps that is why I remember it with such fondness. The 'stars' became actual stars in one way or the other. Farida Hasan was Princess Alexandra or 'the Swan', JoJo her pompous suitor Prince Albert, Najam Sethi was Dr. Agi the romantic tutor she falls for, Khalid Ahmed played the wise Father Hyacinth, and Navid Shehzad was the Swan's mother Princess Beatrice. Nigar Ahmad, Agha Ghazanfar, Rubina Rashid and Shelley Mahmood were in it too with Ali Akbar and Haroon Shah as

the two princes. I was given the walk-on part of a countess because I would usually come over after NCA and be there during the rehearsals. I helped with the costumes too and the design of the brochure. Even Shoaib was on the stage as one of the Hussars.

Many of our lifelong friendships originated from GCDC. JoJo was so full of the joy of living and knew everything and everyone there was to know, the length and breadth of Lahore, just an encyclopedic mine of information on so many things that came from the landed gentry. He was a free spirit and GC was his life where he knew everyone from the head gardener to the carpenter to the cleaner to the fruit seller. They were all aware of his compassion and the fact that he could be counted upon in a crisis. Everyone knew the name Abdul Qayyum 'Jojo' and I sometimes wonder how that name has faded from conversations. Even more tragic is how difficult it has been to find a photograph of JoJo. In my desperate search for a photograph of JoJo I approached friends far and wide including Agha Ghazanfar who was once editor of the Ravi, I received the following response:

Dear Salima,

This is deeply distressing, but not surprising, because it has happened to me all too often now. I am going to give you a (deliberately) long-winded answer, followed by a short one.

Back in 2005, Nigar discovered my name had been omitted, as a past editor of the Ravi, from a special edition of the college magazine to mark its (the magazine's) Centenary. Nigar had been my Joint Editor in 1965-1966 and succeeded me as Editor in 1966-1967. Tariq Siddiqi complained on our behalf to Khalid Aftab, whom I then went to see personally. He said that some records and photographs were missing, and to rectify it he needed proof! I was quite taken aback by this, but showed him a past copy of the magazine that contained a group photograph of the editorial board, including Dr. Imdad (Manager), myself (Editor), Nigar (Deputy Editor) and Imran Koreshi (Assistant Editor). The same issue carried GCDC photographs (of The Swan) that should have been on display in the Bokhari Auditorium – especially because they included Shoaib Hashmi and Abdul Qayyum. Khalid Aftab said that, if I provided him with photographs that I might have, he would not only display them but also set the record straight. I therefore turned to my (nay, our) closest friend: Nasim Akhtar.

With all his camera skills Nasim reproduced the Ravi photographs along with many other GCDC pictures in my personal possession in Lahore (they included Shoaib's, Jojo's, Basit's, Nivi's and Shahid Rahman's). He enlarged them; we handed them over to Khalid Aftab. He did nothing. I mentioned this sometime later to Shoaib – I think it was in 2007 or 2008 when both of us were teaching at the Lahore School of Economics – who used one of his characteristic quasi-expletives about him!

Many years passed – until Hasan Shah became Vice Chancellor. I went to the same office (of the Principal, now called VC) and met the same man (VC's Private Secretary), who recognized me of

course and told Hasan that he remembered that I had indeed handed over photographs to him, but it had transpired that a decision had been taken to reduce the size of these photos so that they'd fit the available space. I wish they had said that in the first place; in that case I wouldn't have given Nasim Akhtar the trouble of enlarging them! In any case, Hasan instantly got together a lot of staff (Librarian, the Ravi Manager, Urdu Deptt Head, etc. – very nice chaps really) who went along with me to the Auditorium, different corridors, the GCDC Room (it's not there anymore) in the Old Building and a small room next to the Sir Fazl-e-Hussain Theatre, which is called 'The Ravi Room,' that has a board bearing the names of all past editors of the college magazine. I was pained, and also amused, to notice that my name was missing from this list, even though this board had been erected recently. What pained me even more was that in the corridors of this theatre were names (and some photographs) of past Heads of the English Department. Most noticeable, by omission, was Dr. Imdad Husain!

Hasan, with all his good intentions, was able to rectify these wrongs of omission. Coming to the short answer. Yes, dear Salima, I do have pictures of JoJo and of all the others-- some deserving a place in the halls of fame, others only in the chambers of our hearts. Unfortunately, these pictures are not accessible to me at present, being in boxes and albums stored at my house in Lahore. I will of course fish them out for you, and would be only too happy to give you whatever else might be of interest to you, but it would have to wait until I come next to Lahore. It is my intention to come within the next few months, and I hope it is not too late for the publication of your memoirs. As a matter of fact, Nasim Akhtar and I had decided three years back to make a digital portal on which he would have put all these memorabilia. Towards the end we decided to meet up in Lahore in October 2021: he would come from Australia and I from Oxford. And we did in fact do that, but the timing was wrong. Nasim came, and then passed away. I still haven't quite recovered from his departure.

It has been so nice to hear from you Salima – particularly since no one calls me or writes to me nowadays. I used to go religiously every New Years Eve to hear and meet Zia Mohyeddin at the Ali Auditorium. I cannot do that anymore. I was there at his last rendition on 7th January, where I told Moneeza's son that I wanted to come over to Model Town to meet Moneeza and yourself. But then I had said the same thing to Yassir when I met him the previous year at Tahir Jahangir's. Between intentions and fruition lies the chasm.

None the less, I still hope to come and see you – and this time with pictorial memories from the past.
With love,
Agha Ghazanfar.

Linguistic Hierarchies

By Claire Chambers

Context: *The following text is an excerpt from Claire Chambers' column titled "Linguistic Hierarchies"[*] first published in Dawn in late June 2023. She is a distinguished author and academic hailing from the University of York, renowned for her profound contributions to the realm of postcolonial literature with a specialized focus on South Asian and Muslim diasporic literary landscapes. Her article accommodates a review of Pakistani author Ayesha Manazir Siddiqi's "The Centre" to discuss the presence, impact and consequences of pre-existing linguistic hierarchies within our South Asian locale. In order to assess a similar phenomenon within our society while commemorating the 150th anniversary of the Department of Language and Literature, we believe her perspective is crucial to understanding the influence of such power structures.*

"The novel invites readers to reflect on linguistic hierarchies and the dominance of certain languages over others. To pose a question Siddiqi asks in an essay, "What happens when you take on someone else's tongue?" Just as Siddiqi's characters wrestle with their own linguistic competency, her novel makes me think more self-critically about my journey into Urdu. My entitlement as a dominant language speaker is something I've wanted to be mindful of from the outset. However, the idea that everything must be accessible to me and other English-speakers is as ingrained as it is damaging. This tenacious idea is one that the novel tries to challenge through its explorations of the politics of language learning. Above all, Siddiqi encourages an interrogation of white privilege. When Anisa takes Adam to visit her family in Karachi, he delights in the city's "incredible hospitality." This irks Anisa, who knows that brown or black people wouldn't receive such treatment if they similarly tried out their Urdu on Karachites. "What Adam was witnessing," she remarks acidly, "were the remnants of a culture where once he was, by law, obeyed and pacified." The warm welcome he enjoys is "a legacy of his people's wrongdoing."

I, too, have benefited from this shameful legacy.

In an interview with me, Siddiqi alludes to the role of English in Pakistan itself. Imperial residue means it is esteemed above Urdu and seen as a status symbol. "It is undeniable," she says, "that some languages are preferred over others, that some have higher value and are even considered to be more 'sophisticated,' to be the carriers of more intellectual thought. This is not coincidental; it is constructed."

[*] https://www.dawn.com/news/1761440

‘Sapere Aude’: Courage to Know

By Khaled Ahmed

The motto of the Government College University – Courage to Know – is a translation of the Latin motto, ‘Sapere Aude’ that the philosopher Kant gave to the Age of Enlightenment.

Speaking in the debate celebrating 140 years of Government College Lahore (now University), ex-governor of Sindh and Old Ravian, Mr Kamal Azfar, informed the audience that the motto of GC – Courage to Know – was borrowed from the Roman poet Horace by the great German philosopher, Immanuel Kant (1724-1804), as the motto of the ‘Age of Enlightenment.’ Although the GC Vice-Chancellor Dr. Khalid Aftab had referred to Kant – for the first time – in the brochure issued on the occasion, I had not known it during my ten years at GC (1959-1969). My friend and great scholar Ikram Chughtai – who has compiled the works of the founder of GC, Prof Leitner – informs me that no mention is made of the motto in HLO Garret’s 1914 history of the Government College Lahore. The first reference to ‘Courage to Know’ appears in the 1964 history of GC by Prof Abdul Hamid. But the author doesn’t connect the motto to Kant. Chughtai says the motto cropped up suddenly after 1911. Who thought it up? It must be a good motto because an Old Ravian poet, Faiz Ahmad Faiz, ended up giving us the most apt translation of it in a poem title *Jur’at-e-Tehqeeq*. Did Faiz know about Kant? The truth is that he cut pretty close to what Kant had intended! And Faiz Ahmed Faiz (1911-1987) was in jail off and on for nearly half a decade! Was there a conspiracy behind hiding the origin of ‘Courage to Know’? Even as long ago as 1911, the Kantian concept of knowledge could have offended the Muslims. Kant believed in ‘autonomous’ knowledge – knowledge arrived at empirically and not taken on faith. Kant mentioned the motto – in Latin – in his essay *What is Enlightenment?* (1784) while explaining “courage to think without the direction of another: Sapere Aude!” Enlightenment became the motto of ‘non-judgmental’ education in Europe. Starting 18th century, Europe was obsessed with learning about alien cultures without a Christian gloss. That is why we got such positive assessment of Islam from men like Gibbon, Carlyle and, in our times, Toynbee. If you search for the Latin motto on the internet you will find that many schools in Manchester in the UK have it. My guess is that the subversive GC motto came from Jeremy Bentham (1748-1832) through Aligarh. Sir Syed Ahmed Khan (1817-1898) was greatly inspired by Bentham after he saw his body lying in the surgical sections at University College London, wedded to the theory of empirical knowledge. Did some professor, on transfer from Aligarh to GC, slip the motto in without saying where he got it from? It is quite possible. Kant was inspired by Locke, the founder-philosopher of secularism. Allama Iqbal was inspired in turn by Kant because of Kant’s concept of the noumenon as opposed to phenomenon. He called him Imam Ghazali of the West! Iqbal wrote in his lectures that the

Quranic discourse was inductive! That's the kind of knowledge Kant wanted! And Jinnah on 11 August 1947 rephrased John Locke (1632-1704) from his book on *Toleration* without realising it!

Thank God, Mr Kamal Azfar did not tell General Zia where 'Courage to Know' had come from. He would have banned it. In a TV interview on 9 March 2005, Chaudhry Nisar Ali Khan of Nawaz League called Enlightenment 'a dangerous concept'. And Dr. Israr writing in Nawa-e- Waqt on 18 March 2005 said it was ma'navi kufr (an act of apostasy). You could actually kill Musharraf for it through the Federal Shariat Court! These days you can get the Organisation of Islamic Conference (OIC) to convene a summit and condemn Enlightenment as a part of clash of civilisations. Mr Kamal Azfar, an idol of my youth, did a great 'disservice' to his alma mater by revealing the dark origin of 'Courage to Know!' He is still the hero he was for me.

Being Paid for a Hobby

By Dr. Tariq Rehman

This is a brief account of my hobby of research which I indulged fully because circumstances favoured me. What were these circumstances? Basically, they were money and leisure. The former came from academic life in Pakistan which I was lucky enough to join in 1985 and which I am enjoying even now. I call myself lucky since I had never thought of this profession at all. Everyone in my social circle joined the officer corps of the armed forces and I, following others, joined the army and got commission in the armoured corps. However, I resigned my commission being a conscientious objector to the 1971 war. Then, simply because someone else filled up the forms for me, I got a British council scholarship and got an MA and PhD in English literature from the University of Sheffield in the UK. The university, at least for me, was a place which gave me leisure i.e. a lot of free time and also a monthly salary. Hence, I just started to work on my salary – and for this I thank Peshawar University, AJK University and the Quaid-i-Azam University which kept paying me for a quarter century. Since 2011 the Beaconhouse National University, Lahore, has been giving me a salary though I am seventy-five years old now. Whether the salary was adequate or not is something which my wife can tell you about but for me, at least in public universities, it was enough for all purposes (I cared nothing about clothes and avoid shopping) but for research, which I did out of this salary, it was inadequate. However, I had to fit most of my research in this salary. Sometimes I was lucky enough to get a fellowship in a foreign university. I got a Fulbright, was sent by the government for the Pakistan chair at Berkeley and was invited for teaching in Spain and Denmark and I used all these flukes for collecting material for my next or ongoing book. From 2010 onwards, I have somehow landed fellowships at Oxford and Heidelberg but the fellowship gives only enough money to live and read sources and not so much that one should have savings to invest in future research projects. The good thing about both these famous universities was that they did not ask me what I was doing and I had no teaching load at all. Moreover, they asked for no reports or anything of the kind though I was requested to give a seminar which I enjoyed very much.

And now a word about leisure. In those days, in one of the universities I served, there was an annual system not a semester system. I do not know how it was for the students but for me it was a bonanza. All I had to do was deliver some lectures and that was that. I had to give no tests and even the final examination paper was made by some external examiners and also examined by people not known to me. Projects had not become fashionable so my responsibility ended after my lectures for which I honestly worked adequately. Later, I was in universities with a semester system and there my work of evaluation did increase. However, since I avoided all committees and meetings, never

consented to be a member of any other university's BOG or any other body, I did have enough time. In the beginning I examined a few theses and even supervised some PhD theses. Then I found that there was much pressure to pass sub-standard theses so I stopped doing so. I was made an HEC approved PhD examiner when I was at Berkeley at the behest of QAU but I got my name removed from that list. I have, therefore never examined a PhD or even a MPhil thesis since 1986. This too gave me time though my reason for not doing so was only because the work is sub-standard and people want it to be passed.

The reader will ask me why I do not apply for projects. After all, the HEC does pay for such kind of research as do other donors for the last many years. Well, only once, being encouraged by the then chairman of the HEC, Dr. Atta ur Rahman, I did apply for money to write my book *From Hindi to English* (2011). I spent my own money to go to England to begin with in 2006 and the money – not the 8 lacs I asked for but a little less than 5 lacs – came through a year and a half later. The process was very much against my self-respect as a scholar that I never applied for funding from the HEC again. I do not understand how people write proposals before they apply for grants. My research proposal is written about one year after the research has been going on since simply reading the books and articles one needs for the review of literature takes one year. The main reasons for not asking the HEC for funding is because HEC officials do not answer calls nor reply to emails. To be treated like this is against the dignity of a scholar or scientist. I consider it humiliating to ask officials and wait for approvals and so on. As for applying to foreign donors, I do not know how to do it. I also do not collaborate with anyone nor do I have any doctoral students so I have to work on my savings and without any assistance. Students sometimes offer help but it would be an exploitation of their time and labour so I never accept their offers.

I know nobody writes books like that even in the social sciences let alone in the natural sciences; I know big projects simply cannot be done with one's savings or without help and I know that people collaborate with people, have foreign linkages and so on but I do not. That is probably a failing in the 21st century so please do not follow me. I am not a role model. If you still you want to know how I wrote my books dealing with linguistic politics and history, please read the rest of this article otherwise this is where you can turn to people who are true role models.

The story I am about to tell you has been given in more detail in some parts of my autobiography which is being published by the Friday Times. Thus, the following is a gist of it. Moreover, this is not about all the books I wrote but only about books dealing with linguistic history and politics. In short I am leaving out my short stories (three collections) or poems in English (two slim collections) and my research-based books on Pakistani English, a history of Pakistani literature

in English, names and identity in Pakistan, interpretations of 'Jihad' in South Asia and the latest one on Pakistan's wars. Some of them are on sale even now.

So, let us begin with my most important book which is called *Language and Politics in Pakistan* (1996). I did my MPhil in linguistics after my PhD in English literature and one reason for going to Britain was to collect material for this book. However, I had to write an MPhil thesis on linguistics and this was when *Pakistani English* (1990) and reprinted by a European publisher Pluricentric Language Press, Graz and Berlin in 2022) was written. In those there was no special grant for research. My own university and the University Grants Commission declined to oblige me because my research project was, in their bureaucratic jargon, completely 'private'. So, steeling my heart, I invaded the family bank balance. It was not much of a balance, I discovered, and my depredations made it very unbalanced indeed. However, luckily, I got a course language and the mind financed by the British Council and off I went to Cambridge ostensibly to do a course but, in fact, to collect material on my book. In Cambridge I stayed at Downing College. By the time the course ended I found that I had filled my bag with so much photocopied material that I could hardly lift it. Thus loaded, I left Cambridge for Reading where my old Sheffield friend Dr. Balasabramanyam Chandramohan lived. Mohan was as friendly and considerate as ever and had settled over at Reading. I travelled miles away to the India Office Library (now the British Library has this collection) which used to be in the east end at that time. At last, the summer ended and I returned loaded with more books from England.

I read the material I had brought with me and interviewed as many people as possible. Now I had to venture out to Multan and Sindh and it was the end of 1992. I had been offered a place of stay in the Bahauddin Zakariya University in Multan so I went there first. But when I descended from the train in Multan I did not know where BZU was. Anyway, I found I passed the night at cantonment. The next day I thanked my host and set off on my odyssey. With my luggage in hand, I tried to look around for Shaukat Mughal Sahib, a lecturer at a college in Multan. I did not even know which college he was in and simply wandered from one end to the other till he was discovered at Bosan road. He was most helpful and gave me the address of Dr. Mehr Abdul Haq – the father of Siraiki!

"And please have lunch with me," he said by way of good-bye.

I was overwhelmed with gratitude. In Islamabad we have become so westernized and busy that we have to think twice before offering any hospitality. But here the old world with its generosity hospitality still existed. I took his address and went off in quest of Mehr Abdul Haq.

Multan had expanded in twenty years but the scooter rickshaws were still around. And on one of them I reached the house of Dr. Mehr Abdul Haq. They took me to his room where he lay in bed – a frail old man but still mentally alert.

"I was the first to write on the history of the Multan language," he told me.

Then began a long interview which gave me much information. I also took the addresses of the other people I would have to see in Multan. And full of ideas, still with my bag, I went for lunch to Shaukat Mughal's house.

I had no time for anyone in BZU as I ran around interviewing people and being a persistent nag. I talked to the office bearers of Taj Mohammad Langah's party, the Pakistan Siraiki Party, into fixing an interview with him which can only be described as a marathon session. It lasted well over four hours and my questions came in edgeways to be drowned under a chronological narrative in which there were many asides and alleys.

At last in the end of January I caught the fast train to Karachi. The aim was to visit Hyderabad. If only half of the tales of the dacoits were true, this was like going into a battlefield unarmed. This is where, admitting defeat, I turned to the army… but thereby hangs a tale. As it happened, I and Major General Saleem Malik had served together in a cavalry regiment when I was a captain and he was a major. He was very courteous and forthcoming and I needed his assistance since I could not travel in interior Sindh otherwise. He immediately gave me a date. On the set date I went to the general's office and his ADC put me in a car which took me to Hyderabad where I was lodged in the Desert Inn – a guest house of the army. The next day I went to the Institute of Sindhology at the University of Sindh, Jamshoro.

"I have come for research on the Sindhi language movement," I told the librarian.

"We have files and files on it. What exactly…?"

Like a greedy child who pounces upon a heap of sweets I pounced upon the files. The Sindhi sources were difficult to read but I managed to make a general sense of the passages. In the evening, while dining in the mess, I heard an explosion which shook the huge building.

"What was that?" asked an officer who was dining with me.

"An explosion in Latifabad, the Mohajir area," replied another. We returned to our meal but I was full of apprehension. All night the whine of alarms and the clanking of horns kept me awake. I tossed around restlessly in a fit of insomnia.

"I have to go to the Hyderabad Municipality," I told Panhwar, the young lecturer who was helping me.

"Do not, please. That is where the bomb went off," he said in a panic.

"But I must see the records to find out whether, and if so, when Urdu was made the official language of record of the Municipal Corporation."

"It was. We know it," he said.

"One needs proof for research," I said.

In the next few days I got an in-depth knowledge of the Urdu-Sindhi riots of January 1970 and July 1972.

General Saleem also asked the Commissioner of Karachi to help me locate material in the Clifton archives. I thanked General Saleem for his help for which I was genuinely grateful but I also told him why research was such a rare commodity in this country. The gist of what I told him was this, "In countries where research is easy, scholars have prestige and access to documents is a right. In this country it needs a general and a commissioner, the army and the bureaucracy, to provide access to archival records. It is enough to make anyone give up in despair."

Next, I had to visit Lahore to find out about the Punjabi Language Movement. I began with the idea that this would be an easy language movement to investigate. After all I did not speak Sindhi and did not even understand the text without the help of translators. But Punjabi I could understand and speak, and this, I thought, would be a great advantage. Those who look after the archives see to it that no scholar can somehow sneak in. In Karachi they hid them in Clifton but in Lahore they went one up – they put them within the Secretariat. Now if you have not dealt with the bureaucracy, especially the bureaucracy of Lahore, you would imagine that public servants are paid by the public to serve the citizens. Well, you will learn the lesson of your life if you start telling that to the chaps who look after the Punjab archives. First, the 'thanedars' boys at the gate, the 'police-walas', will not let you in. And the bureaucracy knew how to deny you the pleasure of actually looking at them. Thus, there was not much that I could benefit from in the Anarkali archives though I am told foreign scholars are given better treatment.

What happened to the Punjabi movement after the partition? For an answer I went to the Punjabi Adabi Board. The only thing I knew about it was that it was near the veterinary hospital i.e 'kora aspatal' (horse hospital). So this is what I told the rickshaw driver. The man was a proper Lahori. He thought up all kinds of abusive terms about poor horses when he lost his way. When reminded that our target was the Punjabi Adabi Board he was none too polite. He let the Punjabi have it too. But just when the Punjabi's mother and sister had been proved to be no better than they should, we found the place. It was a small house in a quiet lane – a very unlikely place for a language planning board. But the man I met there was remarkable. His name was Asif Khan and he was one of those motivated intellectuals who kept writing despite all odds. I did not know how much he had written then but his

humility and helpfulness impressed me. We talked in Punjabi though he must have guessed that it was not my mother tongue. But it is a language I enjoy speaking and so the interview went well.

In 1993 the book had advanced beyond the stage of ideas and drafts. The chapters on the Siraiki, Punjabi and Urdu-English controversies in Pakistan were ready in a rough form. But the Bengali language Movement was a non-starter as I had only secondary sources and that too in English on it. I did not know what to do so in sheer desperation I rang up the military attaché in the embassy of Bangladesh. As we talked it turned out that although the Brigadier did not know me he was in PMA at the same time though senior to me. He said he would arrange everything and tell his friend Brigadier Shareef to receive me at the Dhaka airport. And what a blessing it was that the friendly Brigadier was there since there was a strike and I would not have known how to leave the airport. Brigadier Shareef took me to his own flat and I rested in his son's room and we went to the university where somebody had promised me a room. Again, there was a strike and, being a Pakistani, Brig. Shareef said I should not risk chasing a room. So, I passed the night in his house and the next day we started hunting for a room again. Now I had been given only a ticket by the Hakeem Saeed Hamdard Foundation but no money to live in Dhaka. I had brought money out of our savings but that was not enough to find suitable accommodation in Dhaka. So, as we roamed around, I felt terribly exhausted and depressed. Research just did not look possible.

Back in Brig. Shareef's office I visited the toilet and found a large dressing room which was air-conditioned. When I came back, I announced to him:

"I will stay in your dressing room."

He was appalled and said that would hardly be hospitable but I was adamant and that is where I lived; an office which took on the appearance of a haunted house at night. And I hired students who translated documents for me and I sought people I could interview and read whatever I could on the Bhasha Ondolan of 1952. Then, just when there was a scare of plague in Calcutta jumping to Dhaka, I flew back to Islamabad with enough research material to burst the seams of my bags.

There were other trips too – London, Oxford, Chitral, Peshawar, Abbottabad, etc – but one cannot describe them for lack of space. At last, in 1995 January the book went to the Oxford University Press and was published in December 1996. It was an instant success. It was reprinted several times, picked up by India (Orient Longmans) and then in Europe (PCL Press, Graz and Berlin) and scholars refer to it though it is not available in shops in Pakistan.

My next book, a tome of nearly 700 pages called *Language, Ideology and Power*, on the history of language-learning of the Muslims of South Asia was born dead. I worked so hard at it and, like before, travelled to England living with Chandramohan and in Oxford's colleges. I had to survive

on an apple for lunch as the savings I used had to be stretched as much as possible. I even went to India and lived in the IIT at Delhi and in Jawaharlal University trying to collect material on Urdu in India. I found and put in so many original sources in it that the book became difficult to read. Perhaps that is why very few people had actually read it. The Oxford edition came out in 2002 and the Indian edition in 2008 but both fell on deaf ears. Meanwhile, out of the work I had done for the previous two books, I salvaged some chapters and undertook a new survey which became a study of the education system of Pakistan. This was published as *Denizens of Alien Worlds*. It was better received than the previous book and enjoyed two reprints though it was not anywhere near *Language, Ideology and Power* in scholarly quality.

Between 2002 and 2004 I spent time in scholarly wilderness which means I was not writing a book though I was writing chapters and articles and, of course, a weekly column in a newspaper. In that year I was appointed to the Pakistan Chair at the University of California, Berkeley and there I started thinking of writing an alternative history of Pakistan which is still unwritten and a social and political history of Urdu which has seen the light of day in 2011. This is the only book for which I got a grant, which was inadequate from the HEC. I began working on it with my savings as I visited the British library in 1996 while the middle-level bureaucracy of the HEC took two years in its cumbersome red-tapism. The grant came in 2007 when I was director of the National Institute of Pakistan Studies at QAU. It helped me in visiting India where I went to Hyderabad to see the archives of the Nizam and the Rampur Raza Library as well as Aligarh Muslim University. All of them contained excellent sources for my research of the social history of Urdu. But how was one to visit the British library and Oxford University's India Institute. This was not covered by my grant and my savings were not enough for such undertakings. I tried my luck – by now the research proposal was written – and got a fellowship in the Oxford Centre of Islamic Studies which was a recognized centre of the University of Oxford. That is where I got most of the dates on schools, printing, radio and other British policies regarding Urdu (also called Hindustani). Later, I also got a fellowship of one month through DAAD at the South Asia Centre at the University of Heidelberg. I also learned Persian in the 'Khana-e-Farhang' where I was the oldest student though not the worse of the lot. I make this point since, when I did a course on Arabic at Oxford University to write my book on the interpretations of 'Jihad', I was probably the worst student beaten only by the registrar of a certain centre who was just as bad as me. But coming back to this book, it required a knowledge of Devanagari to read the texts. I worked hard on this and polished my Devanagari script so the book came along well. In 2011 it was published first in India and then in Pakistan. It is doing reasonably well and is being reprinted as a

paperback. In 2011 it was published first in India and then in Pakistan. It is doing reasonably well and is being reprinted as a paperback.

Since 2011, I am at the Beaconhouse National University in Lahore where, because they give me an adequate salary and my colleagues leave me in peace being very efficient themselves, I have written four books: on names and identity in Pakistan, interpretations of 'Jihad' in South Asia and wars of Pakistan. A commentary on Ghalib in English is in the press. One thing I should clarify. While I did not apply for grants etc, before I wrote my books, they did bring me awards once they were published. The major ones were two awards (Patras Bukhari and Social Science) for language and politics, an award for lifetime work by the HEC, two awards for my 'Jihad' book being the best book of the year in 2020 and the greatest one in terms of prestige and money (Euro 60,000) called the Humboldt Research Award from Germany in 2012. Also, I got a higher doctorate (D. Litt) by examination from the University of Sheffield. So, I have no complaints.

I am not a 21st century man but BNU still keeps paying me. I am not on social media nor do I like industrial links, MOUs, collaborations with people, co-authoring, co-teaching and so on. I am essentially an early twentieth century scholar (pejoratively labeled ivory-tower academics). Given all these handicaps, I thank all those who have enabled me to write my books. I thank the Government College (Lahore) for entertaining my writings despite the fact that they are not motivating for students nor am I a role model of any kind. And yet they encourage me as, indeed, do many others.

Pakistan's Structural Economic Problems in the Era of Financial Globalization
By Dr. Fahd Rehman

Dr. Fahd Rehman's Pakistan's Structural Economic Problems in the Era of Financial Globalization evaluates the country's enduring economic issues within the context of global finance.

Author Background

Dr. Fahd Rehman remained as an academic at Suleman Dawood School of Business (SDSB), LUMS from 2014 to 2022. He completed his PhD in economics from the University of New South Wales, Australia, in 2014. Prior to that, he received a Master of Public Policy from the National Graduate Institute for Policy Studies in Japan in 2007. From 2004 to 2010, he worked at the Small and Medium Enterprises Development Authority (SMEDA) in Pakistan.

Book Overview

This publication, out of Aks Publications in 2024, includes an in-depth study of systemic obstacles to Pakistan's economic progress. It explains deep-rooted issues such as low domestic resource mobilization, a narrow tax base, and high fiscal deficits and their contribution to the country's chronic financial instability. The volume is 127 pages long.

Key Themes

1. **Fiscal and External Imbalances**

   Dr Rehman also outlines the political and socio-economic contexts that aggravate these problems, particularly instability and the burden of external debts.

2. **Impact of Financial Globalization**

   In this paper, the author examines the consequences of Pakistan's integration into the world financial system, the external shocks accompanying it, and how they influence the country's policies and economy.

3. **Policy Responses & Reform**

   Dr. Rehman points out that the prior policy did not work and calls for full-scale reforms toward sustainable economic development.

Critical Analysis

Dr. Rehman stands apart and provides empirical data and a historical perspective for work that digs so deeply into some glamorous (to some) economic issues. The perspectives of domestic policies and the relationship between global financial trends in South Asian economies are a few illuminating bits of knowledge for policymakers, economists, and scholars.

Dr. Fahd Rehman (2024), Pakistan's Structural Economic Problems of The Era of Financial Globalization, Aks Publications.

Conclusion

Dr. Rehman's Pakistan's Structural Economic Problems is the most important in-depth look at Pakistan's economic problems in the financial globalization era. This political economy book is an important read if you are trying to grasp the systemic failings that continue to hold back Pakistan's economic development.

Professor Dr. Rana Ejaz Ahmad
Chairman Department of Political Science,
University of the Punjab
Lahore

Chequered Past, Uncertain Future: The History of Pakistan

Tahir Kamran

Tahir Kamran's recently published book on post-colonial Pakistan is a valuable addition to the growing stream of scholarship on the field.[*] The serious scholarly inquiry into the area began with Hamza Alavi's works in the late 1950s and 1960s.[†] Later, since the 1980s, Louis D. Hayes, Mohammad Waseem, Saeed Shafqat, Ayesha Jalal, and Omar Noman further enriched it through their writings.[‡] More recently, Ilhan Niaz and Rasul Bakhsh Raees have added new dimensions to it.[§] One of the most distinctive aspects of Tahir Kamran's work is that it extends the narrative into 2022, adding new dimensions to it. The work highlights several diverse themes. Few deserve to be mentioned explicitly from the "Devolution Plan"[**] to "Cultural representation of Pakistani Identity after 9/11"[††], and from "The Emergence of Tehrik-e Taliban Pakistan" [‡‡]and the rise of "The Pashtun Tahafuz Movement"[§§]to the surfacing of the "Memogate Scandal".[***]

According to the author, Pakistan was conceived as a nation state for the Muslims of India, but it became " an ideological polity with religion as fundamental rationale for its existence".[†††] The bureaucratic-military elite that ruled the country used "uni-nationalism " and "religious extremism" to as unifying dough [fig.] to strengthen federalism, which proved counterproductive as it led to the alienation of the "smaller provinces" from the centre, turning out to be a continuous threat to the federal structure of the state.[‡‡‡]

---

[*] Tahir Kamran, *Chequered Past, Uncertain Future: The History of Pakistan* (London: Reaktion Books, 2024).

[†] A few among others of his important articles include: Hamza Alavi, 'Imperialism Old and New,' *Socialist Register* 1 (1964): 104--126; _____,"The Crisis of Nationalities and the State in Pakistan," *Journal of Contemporary Asia* 1, no. 3 (January 1971): 42–66, https://doi.org/10.1080/00472337185390031; _____, "The State in Post-Colonial Societies: Pakistan and Bangladesh," *New Left Review*, no. I/74 (August 1, 1972): 59–81, and "Chapter 3 Class and State in Pakistan," in *Pakistan: The Unstable State*, ed. Hassan Gardezi and Jamil Rashid (Lahore: Vanguard Books, 1983), 40--93 .

[‡] Louis D. Hayes, *The Struggle for Legitimacy in Pakistan* (Lahore: Vanguard Books, 1986).

[§] Ilhan Niaz, *An Inquiry into the Culture of Power of the Subcontinent* (Alhamra, 2006), and; Rasul Bakhsh Rais, *Imagining Pakistan: Modernism, State and the Politics of Islamic Revival* (Lanham, Maryland: Lexington Books, 2017).

[**] Kamran, *Chequered Past, Uncertain Future*, 354—357.

[††] Ibid., 371—376.

[‡‡] Ibid., 390—393.

[§§] Ibid., 404—407.

[***] Ibid., 399—402.

[†††] Ibid., 141.

[‡‡‡] Ibid.,136.

The author contends that the prevalent schema of the construction of Pakistan's history links it to the "Arabian Peninsula".* Instead, it should be conceptualized as a "plural polity" bringing within its ambit/ encompassing the "geographical regions", historical epochs and "socio-cultural plurality" based on "customs and tradition" that have evolved over the past five thousand years.† He emphatically asserts that the socio-cultural influences, such as " Indus Valley civilization and Baluchistan valley"; "Turcko--Persian influences"; "Colonial modernity", and "Muslim Nationalism" should serve as the " constitutive components" of the Pakistani nationalism.‡ The country's history should be constructed on this basis.§ The author analogizes them as " multifaceted socio-economic layers" in this narrative. That is the reason he suggests that Amir Khusrau should be included among the founding fathers of Pakistan, as he typifies or epitomizes "the essence of the nation's cultural heritage".** He firmly believes that Pakistan should aspire to embody "diversity and social inclusivity".††

This approach reminds me of a quote of a famous Pakistani regional Leftist leader, Khan Abdul Wali Khan, in the 1980s, while highlighting the multi-cultural and pluralistic basis of Pakistani identity construction, asserted that "I am Pushtun since the last five thousand years, Muslim since fourteen hundred years and Pakistani since the last forty years". Tahir Kamran, through this work, has produced a history that is conceived and constructed through these broader lenses [fig].

The book serves as a stark reminder of what the ruling elite failed to accomplish.‡‡ What was essentially needed, according to him, was "radical reorganization of administrative structure inherited from the colonial era"§§.(For which Hamza Alavi had coined the concept-cum-theory of " Over-developed State Structure"[ODSS]). Tahir Kamran construes this colonial legacy as the root cause of the "multifaceted predicament" which plagues Pakistan's politics, state and society.*** Before moving forward, I would like to make a purposeful digression from the summary; it is worth noting that the credit for introducing Hamza Alavi's major writings and Marxist mode of analysis to the broader Pakistani academic community, as well as to his colleagues and students, goes to Tahir Kamran. Besides

---

* Ibid., 13.
† Ibid., 45.
‡ Ibid., 13 and 14.
§ Ibid.
** Ibid.,36.
†† Ibid.
‡‡ Ibid.,104.
§§ Ibid.
*** Ibid.,133.

translating almost all of Alavi's major articles into two important books, he introduced Alavi to his colleagues and students[*].

This dominance of bureaucratic-military elite, according to the author, besides causing political de-institutionalization, also entailed disastrous consequences such as " diversion of critical resources and attention from the vital task " of "strengthening democratic institutions"[†]; the trampling of the " pluralistic and secular" ethos of "democracy"[‡]; the reinvention of the Ideology of Pakistan by thrusting up on "nationalistic ethos" made it "incompatible" with the realities of the newly independent country[§]; the Establishment's obsession with a "strong power center" at the "expense of provincial and regional actors", who have been relegated to the periphery of Pakistani politics, [**] as whose existence it began to construe as a threat to the very survival of the state.

The larger impact of the perpetual dominance of non-political forces, according to the author has been that the country, since its independence, has been unable to shed its colonial influences, and continues to hold its existence as a "neo-colonial state"; thus, it has failed to develop into a "post-colonial polity".[††]

Chapter "Twelve" of the work on the country's fourth parliamentary era reveals the author's increasing disillusionment with the two major political parties of the country—the Pakistan People's Party (PPP) and the Pakistan Muslim League (PML-N).[‡‡]This disenchantment leads him to pin his hopes on Imran Khan, a former cricketer turned politician, who leads the Pakistan Tehreek-e-Insaf (PTI).[§§]

After providing the summary, I will proceed to discuss the aspects of the work that I find particularly impressive. He is among the few scholars who dare to openly critique the interventionary role of the bureaucratic-military elite and forewarn about the disastrous implications of their prolonged involvement, which continues unabated. Another strength of the book is that it is the handiwork of a scholar who is among the most widely read on post-colonial Pakistan, possessing an impressive command of history, the philosophy of history, literature, post-colonial studies, and critical theory. And the knowledge of these diverse fields is amply reflected in different chapters of the work. As a student of history, what inspires me about this work is that it is among the few books authored by historians. For

---

[*] Hamza Alavi, *Pakistan Riasat Aur Aas Ka Buhran* (Lahore: Fiction House, 2002),and;_____, *Jigardari Aur Samraj*, trans. Tahir Kamran (Lahore: Fiction House, 2002).
[†] Kamran, *Chequered Past, Uncertain Future*, 135.
[‡] Ibid.
[§] Ibid., 144.
[**] Ibid.
[††] Ibid.,-483
[‡‡] Ibid., 377—419.
[§§] Ibid., 420—457.

instance, post-colonial Pakistan has largely remained a field dominated by political scientists, sociologists, anthropologists, political economists and scholars of public policy[*]. The works of historians have been scarce. Only historians such as Ayesha Jalal, Ian Talbot, Rafique Afzal, Ilhan Niaz, and Ali Usman Qasmi have produced authoritative works in the field. [†]This work is a valuable addition to the list. He has also interspersed the work with seven biographical sketches of Pakistani rulers, starting with Ayub Khan and ending with Pervaiz Musharraf. This approach makes the work more informative and engaging, adding further depth to it.

Another impressive quality of the work is that it tells us the way out or recourse to survival. While presenting this, he offers a number of suggestions, which, if followed and implemented in letter and spirit, could enable us to dismantle the structural basis of the dominance of bureaucratic-military elites. I consider the following quite instructive: (I) The dismantling of the ODSS; (II) The threats to Pakistan's "political and territorial integrity can only be addressed by counterbalancing them according the "pluralistic needs" of the country. This would require developing a "democratic system with a bottom up approach"[‡] ;(III) There is a " need" to create a sensible fusion "between the colonial legacies and the realities of the post-colonial Pakistan.[§] ; (IV) A broader "consensus" among politicians is required "to facilitate the reforms necessary to nurture democracy"[**]; (IV)The concept of the rule of law--- "a fundamental principle in any democratic society" should be fully upheld, implemented, and applied across the board[††]; (V) The discretionary control of one person "over the appointments of "top" military officials should be ended. The civilian say or "input" should be made "mandatory" in the "selection of the corps commanders and promotion beyond the ranks of brigadier"[‡‡]; (VI) There is also a need to bring "some degree of normalization" of India—Pakistan relations, which could go hand in hand with reset in civil military relations"[§§];(VII) The need to thoroughly revisit the "concept of national security",

[*] One can trace the evolution of the field since the 1960s with the publications of the works of Rush Brook Williams, Herbert Fieldman, and Lawrence Ziring. Later, Shaid Javed Burki, Mohammad Waseem, Ishaq Ahmed, Abdul Qadeer, Kamran Asdar Ali and Rasul Bakhsh Raees made valuable additions to this corpus of literature.

[†] Ayesha Jalal, *The State of Martial Rule: The Origins of Pakistan's Political Economy of Defence* (Cambridge and New York: Cambridge University Press, 1990); Ian Talbot, *Pakistan: A Modern History* (New York: St. Martin's Press, 1998); Later it was published under a slightly different title, *Pakistan: A New History* (London and New York: Oxford University Press, 2015); M. Rafique Afzal, *Pakistan: History and Politics 1947-1971* (Karachi: OUP Pakistan, 2001); Ilhan Niaz, *The Culture of Power and Governance of Pakistan, 1947-2008* (Karachi: Oxford University Press, 2011), and; Ali Usman Qasmi, *Qaum, Mulk, Sultanat: Citizenship and National Belonging in Pakistan* (Stanford, California: Stanford University Press, 2023).

[‡] Kamran, *Chequered Past, Uncertain Future*,134

[§] Ibid

[**] Ibid.

[††] Ibid., 489.

[‡‡] Ibid.,490.

[§§] Ibid., 11.

which was based on a "strategic-centric approach". A "human security" approach should replace it.[*] ; (VIII) The desirability of curtailing the "role of intelligence agencies"[†]; (IX) The conducting of " competitive exams" for the "selection" of judges" on a "rigorous" basis[‡], and; finally; (X) To democratize the structure of the political parties and to facilitate cadre building there is a need to "make internal party elections mandatory".[§] It can be asserted that, following Aqil Shah's work, *Army and Democracy*[**], this is the second book by a major scholar that contains such bold suggestions.

The strength of the narrative, as well as the richness of critique, are undoubtedly the major strengths of the work, which are sufficient to create its distinctive niche in the scholarly works on post-colonial Pakistan.

While narrating the second-to-last chapter, the author tends to become quite partisan towards the PTI, which in certain ways blurs his lens on viewing the fourth era of democratic transition (2008 to the present) on its terms. Had the work ended before the onset of the PTI's government and the author in the concluding chapter would have cursorily viewed the developments post-2018 until the unceremonious exit of the PTI's government in 2022, it would have allowed him to reach broader inferences retrospectively and draw critical conclusions (which he has done very persuasively), however, given the depth and diversity of the work as well as its major strengths, such minor criticisms and disagreements pale into insignificance.

Reviewed by Irfan Waheed Usmani,

Assistant Professor,

Institute of Global Studies and History,

Government College University.

[*] Ibid.
[†] Ibid., 490.
[‡] Ibid.
[§] Ibid.
[**] Aqil Shah, *The Army and Democracy: Military Politics in Pakistan*, 1 edition (Cambridge, Massachusetts: Harvard University Press, 2014).

In Conversation with the Bureau Chief of Dawn Newspaper, Nasir Jamal

Nasir Jamal: *Nasir Jamal, a seasoned journalist specializing in business and economy, is the Bureau Chief at Dawn Newspapers. Boasting a proven history within the newspaper industry, his expertise spans a wide array of skills, including journalism, media relations, newspapers, social media, research, and news writing. With a solid foundation in the field, he has honed strong communication skills through years of professional experience. He is an alumnus of Government College University, Lahore, showcasing a commitment to academic excellence. Currently, he holds the esteemed position of "Bureau Chief" at Dawn newspapers in Lahore, where he continues to make impactful contributions to the world of journalism.*

The Ravi: Greetings Sir! Thank you for agreeing to meet with us today. Considering your vast experience and your time spent in the field of journalism we would appreciate your insights regarding some questions we have about the state of journalism in Pakistan. So, are you ready tostart?

Nasir Jamal: It's no trouble at all. Yes, I am ready to start but I don't know how much I can beof assistance to you young ladies.

The Ravi: That's perfectly alright sir, you obliging to meet with us is already a big help. So, to begin with, how does the change of medium and the diversity in form affect journalism and especially the ethics of journalism? Currently there are many private media channels as compared to previously there being only PTV. Do you think the overall ethics of journalism can be maintained despite the change?

Nasir Jamal: If we talk about ethics, they remain unchanged. Change is only in the medium of journalism. If we talk about the time when I entered this field, in the late 1980s, there were only newspapers and of course the state-controlled PTV. If you wanted to become a journalist these were the only two options. In America and Europe, they had TV news channels long before us. In Musharraf's era, licenses were being given to private news channels as well as entertainment channels. Before that, in the 90s, we saw many newspapers coming out. After Musharraf, TV news channels thrived and their growth impacted print media as well. The news on ourtelevisions is only focused on the present, on what is happening right now. If you want to do truejournalism on TV you have to spend a lot of money on making documentaries, etc. You must have seen BBC and CNN. If they want to make a documentary on, for example, climate change,they would send a team of people to the affected regions. For preparing a one-hour documentarythey would spend thousands of dollars. Our Pakistani news channel owners didn't have or didn'twant to spend this kind of money. So, they focused on the 7 and 8 pm talk shows more. You don't have to spend a lot of money on that. There is only the cost of

set and production. That one-hour talk-show runs thrice in 24 hours. So, if you have just one-hour talk shows, you get 12 hours of screen time. This way little money is spent and their journalism goes on. They play thesame thing over and over again.

The Ravi: So, there is not a lot of focus on the quality of content?

Nasir Jamal: Exactly. Now the medium is changing to digital. Most people now read or watch the news on their mobile phones. This change has occurred all over the world and there is nothingwrong with it. Before the printing press was invented, the newspapers used to be handwritten. So, change and innovation are both wonderful things. In Pakistan, the problem is not that the medium is changing, but that the habit of reading the news is dying. The purpose of the newspaper is to give you facts as well as the different perspectives surrounding them so that youcan form your own opinion. Its goal is to make the reader well-informed. In America, they havetransitioned successfully from print to digital. The medium does not matter much. The quality ofjournalism matters. Now there is a decline in people's interest regarding the news.

The Ravi: Considering that western influence goes beyond solely digitization and also influences opinions and perspectives, do you believe that there are certain qualities Pakistani journalists should be consistent in that are compatible with their locale to maintain a certain standard of integrity in their work?

Nasir Jamal: I think whatever ethics and values of journalism we have in Pakistan; they were developed in the west because they have always been far ahead of us. They have a much older tradition of journalism. We have not really contributed to it. The qualities and values to be maintained in journalism are therefore the same as in America or Pakistan or China or India. They are global rather than local.

The Ravi: They are then more related to our basic human values which are similar for all humanbeings. Nowadays we do see news channels crossing certain boundaries and displaying the sortof content that shouldn't be publicized.

Nasir Jamal: Yes, journalistic values are human values. For example, we don't and shouldn't print pictures of any dead bodies. Gory details also shouldn't be included within reporting. We don't print pictures or names of victims of sexual assault or the suspects even. Sometimes the families involved and in distress are interviewed. That shouldn't be done. Everyone has a right to their privacy. These are the boundaries and they should be respected.

The Ravi: Sir this has been a really insightful discussion for us. Just to conclude, could you offerany advice to literature students with an interest in journalism?

Nasir Jamal: My friends and I joined journalism because of our interest in the field. This profession is not for people who want to make money. Quite simply. It is a very low-paying andchallenging job so as long as you don't have a keen interest or a strong passion you shouldn't join. On the other hand, you get to learn a lot of things and meet a lot of great individuals whilehaving many amazing experiences.

The Ravi: We'd also like to inform you Sir that we are having Ravi as an online publication forthe first time this year so stay tuned for that. In the meantime, we are grateful for your time andyour shared expertise. It has been a wonderful and delightful experience getting to know you.

The Need for a Canon

By Dur e Aziz Amna

Among the many ways my childhood was different from my parents' – rural vs urban, public vs private schooling, and so on – is the gap between what we read. My mother recalls the thrill of the Imran series, each new book passed from one eager sibling to another like contraband. In college, my father made his hungry, determined way through library shelves, acquainting himself with the classics of Urdu literature – Saadat Manto, Ashfaq Ahmed, Bano Qudsia, Ahmad Nadeem Qasmi, and more. By the time I was in middle school, however, I was perusing an entirely different shelf, one that consisted of the Victorians, Enid Blyton and American effluvium such as Archie Comics and the Sweet Valley series.

The clearest reason for this difference is class ascendancy. There is also the undeniable, irrepressible encroachment of English as it takes up oxygen in every room it enters, leaving literatures in other languages gasping for breath. As I began high school, however, something shifted in my reading. I began to read Pakistani prose writers for the first time in my life. They were part of a movement, within Pakistani literature, of a globalized fiction that aimed to reach out to the world, of a literature that was self-consciously Pakistani in its settings and idioms. Significantly, they were all writing in English. I gravitated towards them because of how much I could relate to their settings and how refreshing it was to see the worlds I knew reflected in fiction. I have since come to realize that this is a shallow understanding of what fiction can and should do, but in any case, some of my most formative years as a reader – the last three years of high school – were spent devouring the works of writers such as Kamila Shamsie, Mohsin Hamid, and Daniyal Mueenuddin.

Today, Pakistani literature in English is a well-populated, blooming landscape, full of both veterans and young writers bringing incredibly complex understandings of their worlds to the language. This is unequivocally a good thing. Yet, what troubles me is the discreteness between the categories of English writing and literatures in local languages. In literature festivals, authors are frequently separated by the language they write in. Creative writing magazines are often monolingual. Shamefully, most English writers writing today are ill-versed in the canonical literature of the country, most of which is not in English. At the same time, it is impossible to talk about books in Pakistan today without bringing up literature in English – one cannot wish the language and its impact away by fawning over a bygone era. We are missing a sense of continuity, a thread that connects our major writers within a tradition. Like other facets of our identity, our literary history shows fractures, fault lines that manufacture divisions between various literary traditions. This ahistoricity is a curse that will need to be lifted if we are to produce great literature. We need a canon.

Does that sound parochial? Isn't the idea 'du jour' that one should read as freely and widely as possible, without being tied down to a nation or language? I am a traditionalist enough to believe that a writer cannot fully come into their own until they are well-versed in their national literary tradition. In 1969, Erich Auerbach wrote that "the most priceless and indispensable part of a philologist's heritage is still his own nation's culture and language." Auerbach's argument was not for sectarianism; in fact, his larger point is that literature should seek to "designate man's place in the universe," and not only in his own nation. But to transcend one's literary heritage, it is important to be well-versed in it. Let us connect the dots and see lineages in our literature, inheritances that span far more language than one.

Where roses run blood

By Ummar Ziauddin

Where roses run blood I

Kashmir is a saga of unspeakable horrors. In a tale that has metamorphosed for over centuries and climaxed each time into a tragedy, there are only victims. But if one were to identify a villain – of all the invaders, usurpers and colonial megalomaniacs, Nehru stands out. He emerges as the Machiavellian prince whose double-speak throughout forties, fifties and sixties magnified this human catastrophe – we call Kashmir.

Nehru had ruled out plebiscite as early as in 1948 despite public posturing to the contrary. His decision to back out from extending the right of self-determination to the people of Jammu & Kashmir unfolded in four stages. First, UN's proposals for peaceful solutions were rejected privately. Then the plebiscite was publicly deferred indefinitely to such a time when peace and order would return. Then mediations and third party interventions were spurned. And in the last stage, even bi-lateral talks were dismissed. All this allowed India, the occupier, space to consolidate the status-quo in Kashmir.

Since partition, only Pakistan was keen on revising the status-quo. And it was in India's interest to palm on chaos in the state of Jammu & Kashmir. Even when disorder was at its lowest ebb, no effort was made by Delhi to reach out to Srinagar or Islamabad for a lasting peace in the region. Generations of Kashmiris have sought for the right of self-determination. Denied, Kashmiris in the Indian occupied Kashmir have over the years gradually drifted away from the center. They resent the broken pledges – and now with the special status of the state of Jammu & Kashmir withdrawn, the public felt that they didn't have a place in the Union of India any longer–such sentiments were voiced by those who could in the mainstream India media before even their expression of dissent was stifled. And of many others since the lockdown.

Today in India, Kashmiris are viewed with suspicion. Each Kashmiri is a militant. Each Kashmiri is a separatist. Each Kashmiri is a terrorist. Like the mass unmarked graves in the valley; a Kashmiri is merely a stat that can be purged by Delhi at whim.

The events of last year, also termed as the final solution for Kashmir, when Delhi unilaterally acted to exterminate Kashmir's identity and soul, without concurrence of the people of state of Jammu & Kashmir, are a direct product of Nehruvian politics. Kashmir's forced merged into the Union of India will never be accepted as the settlement of this dispute by the people of Kashmir–and nor by Pakistan.

It is also naively odd to argue, which our foreign office did, that in the wake of the assault on Kashmir's special status; unilateral action has internationalized Kashmir's issue. Incorrect. It was

always an international issue. Nehru recognized it. His speech in parliament on 7th August, 1952 "It is an international problem. It would be an international problem anyhow if it concerned any other nation besides India and it does. It became further an international problem because large number of other countries also took interest and gave advice…"

Indian leaders and their mouthpieces making statements today have come a long way from what Nehru had publically promised in his address to Lok Sabha on 26th June, 1952:

> "We have not got a clean slate to write upon, we are limited inhibited by our commitments to the United Nations by this, by that. But, nevertheless, the basic fact remains that we have declared and even if we had not declared the fact would remain – that it is the people of Kashmir who must decide. And I say with all respect to our Constitution that it just does not matter what your Constitution says, if the people of Kashmir do not want it, it will not go there…. Let us suppose there was a proper plebiscite there – and the people of Kashmir said, 'We don't want to be with India,' well we are committed to it, we would accept it…."

What do the people of Kashmir want? Yes, there is a school of thought that has always romanticized the idea of an independent Kashmir. This idea stems from the unique history of Kashmir and is an integral theme of Kashmir's folklore dating back to the era of Sultan Zain- ul-Abidin Bud Shah (1421-1472). For Kashmiris, unlike the rest of India, he is greater than even the mighty Akbar in their reading of history. His forty-two years of rule is widely accepted as the most progressive and prosperous period in the history of Kashmir. At the time of partition this idea of an independent Kashmir was even encouraged by Jinnah–briefly. Therefore, the long imagined independence of the Kashmiris is unlikely to be buried under any statutory instrument.

Regardless, far too many lives have been laid to waste without the people of Kashmir not getting an opportunity to have a say on self-determination. Elections in Kashmir now, least of all rigged, are no more a solution to the issue of Indian occupied Kashmir. It is quite likely that another wave of indigenous armed struggle for independence will commence again. Roses, in the valley and beyond, will run blood again.

Where roses run blood II

Kashmir's status of a Muslim majority state has always been a cause of concern for Delhi. In May of 1947, well before the 3rd June Partition Plan was announced, Nehru had sent a telegram to Mountbatten on the issue of Kashmir that recorded the population figures of the state at the time; Jammu: Muslims 61%, Hindus 39%, Kashmir: Muslims 92%, Hindus 7.8%. So in a total of 3.6 million people residing in the state, 77% were Muslims. Both Mountbatten and Nehru knew, it was a foregone

conclusion at the time that if the Kashmiris were allowed to decide their own fate; they would choose Pakistan.

Kashmir even today is the only Muslim majority state in India–for now. As per the figures of the last census held in 2011, Muslim population in the Indian occupied Kashmir was over 68%. It is evident that the government in Delhi only wants to count Kashmiris now after the demographics have been materially altered.

Demographics aside, the real question is, can we continue to determine the fate of over thirteen million people on the basis of a 'deed of sale', as Gandhi called it, to an oppressive tyrant for a mere sum of seventy-five lac rupees? The fact remains that the people of Kashmir have been denied an opportunity to express their will ever since.

As the Kashmiris brace themselves for a new round of struggle for independence, they would argue that their independence was snatched when Akbar's armies successfully marched into Kashmir on 28th June, 1586. From the Mughals by Afghans in 1752 and then by Ranjit Singh's Sikh empire, who had captured Kashmir in 1819 after the decisive battle of Shopian. Gulab Singh who rose through the ranks of Ranjit Singh's army later conquered Ladakh in 1834.

Ranjit Singh's death on 27th June, 1839 made the Sikh empire vulnerable to the hostile British colonizers who had long coveted Punjab. When on 13th December, 1845 Governor General Sir Henry Hardinge declared war on the Sikhs, Gulab Singh betrayed his former Sikh masters and allied himself with the British. The Treaty of Lahore (1846) made the Sikh State a tributary of the British and an indemnity of rupees 1.5 crore was enforced on it which the state could not pay–of course. So it had to cede its territories between the Beas and Indus rivers, which included Kashmir and Hazara, to the British. Article XII of the Treaty of Lahore, acknowledged Gulab Singh's role:

> "In consideration of the services rendered by Rajah Gulab Singh of Jummoo to the Lahore State … the Maharaja hereby agrees to recognize the Independent Sovereignty of Rajah Gulab Singh, in such territories and districts in the hills as may be made over to the said Rajah Gulab Singh by separate Agreement between himself and the British Government."

East India Company, then as a favor, transferred the territories of Jammu & Kashmir to Gulab Singh for Rs. 1 crore. This amount was then renegotiated and reduced a week later to Rs. 75 lacs through the infamous Treaty of Amritsar on 16th March, 1846. Article III of the Treaty read:

> "In consideration of the transfer made to him and his heirs …. Maharaja Gulab Singh will pay to the British Government the sum of seventy-five lakhs of rupees (Nanukshahee), fifty lakhs to be paid on ratification of this treaty and twenty- five lakhs on or before the 1 October of the current year AD 1846."

Hafeez Jalandari called it *Pachattar lakh ka Sauda*!

The Treaty was later enforced through British intervention as well. Sheikh Imamuddin, the Governor of the State at the time had refused to honor the Treaty; better yet, he had defeated the forces of Gulab Singh. British troops had to be sent to install Gulab Singh as the ruler of the State. Thus he owed, not just his title to Kashmir, but his actual possession of it, wholly to the support of the British.

Save for one last treacherous Redcliff Award, that gave India two Muslim majority tehsils of Gurdaspur and Batala, it was by and large, for the dominions of India and Pakistan to determine the fate of Kashmiris in history. Both states adopted an inconsistent approach on the issues of Instrument of Accession, plebiscite, territorial integrity and religious factors. Kashmiris on the sidelines watched on as their special place in the Union of India gradually erode, until it was completely appropriated.

Perhaps Nehru was conscious of the history of Kashmir which is why he said in Lok Sabha on 31st March, 1955

> "…we must always remember Kashmir is not a thing to be bandied about between India-Pakistan. It has a soul of its own; it has individuality of its own. We cannot, certainly much less can Pakistan, play with it as if it were something in the political game between the two countries. Nothing can be done without the goodwill of the people of Kashmir."

India much like the Mughals, Afghans, Sikhs and the British before – is an occupier and will remain so.

here roses run blood III

Kashmir today is damning indictment of secular India. How Kashmiris have been treated since independence also shows complete lack of respect for the letter of law on part of Indian administrations. If there was ever a test case for the tyranny of the majority; it is Muslim Kashmir's treatment by the Hindu Delhi.

After Article 7(1)(b) of the Indian Independence Act, 1947 released all the 562 Indian States under the suzerainty of the British Crown, with Jammu & Kashmir being one of them, of their obligations; what was to follow was the question of accession to any one of the dominions. The next step by the states was going to be taken through Instrument of Accession coupled with the Standstill Agreement; which was a temporary arrangement for matters of common concern.

The Instrument of Accession (26th October, 1947) of the state of Jammu & Kashmir, even if valid and legal, was both provisional and conditional. This is amplified by the letter Maharaja wrote to the then Governor General and multiple communiqué released from the Government of India at the time. The Maharaja alluded to the riots that took place in the valley despite the Standstill Agreement

concerning the state of Jammu & Kashmir. And it was on this backdrop, the Maharaja sent his Instrument of Accession to the Governor General.

The Governor General, responded on 27th October, 1947 stating, "… it is my Government's wish that as soon as law and order have been restored in Kashmir and her soil cleared of the invader, the question of the State's accession should be settled by a reference to the people". Ergo, the matter of accession was never settled – but conditionally accepted. In a telegram dated 28th October, 1947, Nehru wrote to Liaqat Ali Khan, "In regard to accession also it has been made clear that this is subject to reference to people of the State and their decision. Government of India has no desire to impose any decision and will abide by people's wishes but these cannot be ascertained until peace and order prevail."

May I again remind the readers; accession was not provisional against afflux of time giving India a right to merge the territories unilaterally; it was provisional until the issue of accession was settled with reference to the people. That reference is yet to be made.

The Instrument of Accession along with the Standstill Agreement were signed under the Government of India Act, 1935. Clause 5 of the Instrument of Accession read

> "The term of this my [sic] Instrument of Accession shall not be varied by any amendment of the Act or of the Indian Independence Act, 1947 unless such amendment is accepted by me by an Instrument supplementary to this Instrument."
>
> Moreover, Clause 7 read:
>
> "Nothing in this Instrument shall be deemed to commit me in any way to acceptance of any future constitution of India or to fetter my discretion to enter into arrangements with the Government of India under any such future constitution."

The Instrument of Accession, therefore, retained the sovereign power of the Maharaja, and his legal capacity to settle all disputes, including one of accession, with reference to the people, under the Constitution of India.

There is another dimension to the accession. The local politics. Sheikh Abdullah had his own ambitions to achieve and he envisioned an independent Jammu & Kashmir – at least in his formative years as a politician post-partition. He knew, as a politician, that it could only be achieved, when the people were allowed to express their choice. Soon after release from jail in 1947 he said, "If forty lakhs of people living in Jammu & Kashmir are bypassed and the State declares accession to India or Pakistan, I shall raise the banner of revolt and we face a struggle."

With the Muslim majority in Kashmir apprehending succession to India from the Maharaja and tribesman entering from neighboring Pakistan, the famous Poonch revolt started that was going

to engulf the entire valley. In these circumstances, on 24th October, 1947, the Maharaja appealed to the British Government to intervene betraying his own people. After the meetings took place on the next two days, the Governor General accepted the Maharaja's accession to India.

Although, Indian Constitution could not supersede the provisional accession of the State of Jammu & Kashmir, it nevertheless retained accession as a temporary arrangement. Again temporary, as the people of Kashmir had to decide their own fate.

The Instrument of Accession was signed and accepted, without recourse to the people, amid the events surrounding it, in a matter of two days, two days! The Poonch revolt certainly helped legislate it. Those two days of the fateful October of 1947 made Kashmir an unfinished business of partition–and generations of Kashmiris hostage to history!

Where roses run blood IV

The impression that the UN itself offered to intervene to settle the dispute of Jammu & Kashmir or that Pakistan took the matter to the UN is erroneous and historically incorrect. India took the matter to the UN! Mountbatten, at the time, having observed that both Patel and Gandhi favored a third party intervention, had pushed the idea that the UN should fill that role and Liaqat Ali Khan welcomed it. The text of the Indian complaint to the UN on 31st December, 1947 is instructive:

> "In order to avoid any possible suggestion that India had taken advantage of the State's immediate peril for her own political advantage, the Dominion Government made it clear that once the soil of the State had been cleared of the invader and normal conditions restored, the people would be free to decide their future by the recognized democratic method of plebiscite or referendum which, in order to ensure complete impartiality, may be held under international auspices."

India, before the UN, through various resolutions conceded that the State of Jammu & Kashmir is an international dispute and undertook to resolve it through peaceful means by reference to the people.

There is a grand total of 16 UNSC resolutions that record or refer to the right of self-determination for the people of Jammu & Kashmir. The earliest of the lot, the UNSC resolution [39] passed on 20th January, 1948 adopted at the 230th meeting and UNSC resolution [47] passed on 21st April, 1948 adopted at the 287th meeting appointed the Commission with a membership of three which was later expanded to five, to investigate the facts and exercise mediatory influence, observed with satisfaction; "that both India and Pakistan desire that the accession of Jammu & Kashmir to Pakistan or India should be decided by the democratic method of a free and impartial plebiscite."

The Commission itself came to the subcontinent and adopted a resolution on 13th August, 1948. This resolution, and another one of 5th January, 1949, is admittedly binding on both nations. The resolution of 13th August, 1948 has three parts providing for a ceasefire and its consolidation; a truce agreement between the two countries and its Part 3 read:

> "The Government of India and the Government of Pakistan reaffirm their wish that the further status of the State of Jammu & Kashmir shall be determined in accordance with the will of the people and to that end, upon acceptance of the Truce Agreement, both Governments agree to enter consultations with the Commission to determine fair and equitable conditions whereby such expression will be assured."

While the Government of India unequivocally accepted the resolution, Pakistan on the other hand, wished to introduced a caveat to Part 3 that only "the Government of India accept the conditions laid down in Part B (paragraphs 6 to 15 inclusive) of the Security Council Resolution 21 April, 1948, as explained by the sponsors, for a free and impartial plebiscite to decide whether the State of Jammu & Kashmir is to accede to India or Pakistan." The Commission subsequently approached the representatives of the two governments and on 11th December, 1948 submitted its proposal to both parties to serve as the basis for a plebiscite. Both the governments on 23rd December, 1948 and 25th December, 1948 communicated their acceptance to the proposal–which is embodied in the UNSC resolution of 5th January, 1949. Subsequently, in the UNSC resolution of 10th November, 1951 adopted at the 566th meeting noted an agreement of both the states on a free and impartial plebiscite for the people of Kashmir.

The UNSC resolution of 24th January, 1957 adopted at the 765th meeting endorsed the principle of a free and impartial plebiscite under UN auspices and also observed that any action the Constituent Assembly may have taken or might attempt to take to determine the future shape and affiliation of the entire state and any part thereof, or any action by the parties concerned in support of any such action by the Assembly would not constitute a disposition of the state in accordance of the above principle. The UNSC resolution of 21st February, 1957 adopted at the 774th meeting, for instance, had also recorded that the President of the Security Council (Sweden at the time) to examine with the Government of India and Pakistan any proposals which in his opinion are likely to contribute to the settlement of the dispute with regards to the previous resolutions.

History cannot be erased merely through political rhetoric by India. Delhi cannot legislate for people who now hold out Delhi as an occupier. Laws serve no probative value if the people do not voluntarily submit to them. Enforce a submission and you invite civil unrest. Kashmir will be no different. And it is criminal for the world to stand as a silent spectator as the Hindu majority India

executes its plan to purge the Muslim population. If the UNSC is so much as perceived to protect some and not intervene for others, it will lose all its legitimacy– and that trend has already started. If the UNSC does not act now and enforce its own institutional framework; it will go down the same road as the League of Nations.

Where roses run blood V

The Simla Agreement dated 2nd July, 1972 (it was not signed on the date it bears) pursuant to its clause (I) provided "That the principles and purposes of the Charter of the United Nations shall govern the relations between the countries." There are a total of sixteen UNSC resolutions governing the terms of bilateral relations between the two nuclear armed countries on the issue of Kashmir. In addition, the Simla Agreement also provides, "That the two countries are resolved to settle their differences by peaceful means through bilateral negotiations or by any other peaceful means mutually agreed upon between them…" Ergo, the countries have already agreed to the form of dispute resolution which is bilateral negotiations– and a lot of ground was covered during Musharraf's regime on finding a peaceful solution baring consensus on a few modalities.

Moreover, the text of the Simla Agreement, gives the two countries a flexibility to have the issue resolved 'by any other peaceful means mutually agreed between them'. This is where Trump's offer today of acting as an arbitrator is not out of line with what the parties had agreed upon. President Truman of the US and Prime Minister Atlee of the UK in the past have made similar offers to India to accept arbitration proposals–which were spurned by India.

What follows in the text of the Simla Agreement in its clause (II) is also pertinent:

> "Pending the final settlement of any of the problems between the two countries, neither side shall unilaterally alter the situation and both shall prevent the organization, assistance or encouragement of any acts detrimental to the maintenance of peaceful and harmonious relations."

The settlement here is a reference to the long outstanding and sole dispute of Kashmir which was–correction is, to be settled by reference to the people of Kashmir. The most important clause 4(ii) reads:

> "In Jammu and Kashmir, the line of control resulting from the cease-fire of December 17, 1971 shall be respected by both sides without prejudice to the recognised position of either side. Neither side shall seek to alter it unilaterally, irrespective of mutual differences and legal interpretations. Both sides further undertake to refrain from the threat or the use of force in violation of this Line."

By promulgating The Constitution (Application of Jammu & Kashmir) Order, 2019 withdrawing special status of Kashmir and extending the Indian Constitution to the state of Jammu & Kashmir; by enacting the Jammu & Kashmir Reorganization Act, 2019 carving out a new Union territory of Ladakh comprising Kargil and Leh districts; and by introducing Jammu and Kashmir Reorganization (adaptation of state laws) Order, 2020 aimed at altering the demographics of the Jammu & Kashmir; the state of India has acted as an aggressor unilaterally altering the situation in Jammu & Kashmir which is detrimental to a long term peace between the two nuclear armed countries, in gross violation of the Simla Agreement. Clause 6 of the Simla Agreement stated:

> "Both Governments agree that the respective Heads will meet again at a mutually convenient time in the future and that, in the meanwhile, the representatives of the two sides will meet to discuss further the modalities and arrangements for the establishment of durable peace and normalization of relations, including the questions of repatriation of prisoners of war and civilians internees, a final settlement of Jammu and Kashmir and the resumption of diplomatic relations."

Despite India's long standing position that Jammu & Kashmir is a bilateral dispute– India never invoked Simla Agreement (this position of India has changed; it now claims Kashmir is an internal matter).

Pakistan, on the other hand, which ought to have been an interested party in resolving the dispute, invoked Simla Agreement only once and for the first time on 14th July, 1992 when Prime Minister Nawaz Shareef wrote a letter to PV Narasimha Rao–twenty years after the accord and three years after armed struggle had erupted in Kashmir. There was no meaningful follow up.

Throughout the nineties several exchanges took place at the level of foreign secretaries– sometimes with political oversight but apart from working out on arrangements in addressing outstanding issues (including eight issues identified in the Islamabad Declaration of 23rd June, 1997), no substantial progress was made. In fact, India had even tried to walk away from treating Kashmir as an outstanding dispute. But the Lahore Declaration of 21st February, 1999 revitalized it. The much hyped Agra Summit of 16th July, 2001 also did not seek to settle the Kashmir dispute. It only sought to evolve a procedure towards the solution in line with earlier efforts. As such, Simla Agreement remains the summit of engagement between the countries in resolving the enduring dispute between the two countries.

Pakistan must, with demonstrable political will, highlight the terms of the Simla Agreement, with emphasis on the already agreed mechanism between the two states in resolving the dispute.

Pakistan must invoke the Simla Agreement again, with Kashmiris on board. Remember, the people of Jammu & Kashmir were not privy to Simla Agreement.

Where roses run blood VI

The debate in the Indian Constituent Assembly when Article 370 was being introduced is of paramount importance as it explains the need to give Jammu & Kashmir a special status as a temporary arrangement. Article 370 was introduced as Article 306A of the Indian Constitution. The special treatment to Kashmir, when the Article was being moved, was justified by N. Gopalaswami Ayyangar, member of the Drafting Committee of the Constitution, on 17th October, 1949 in these words:

> "In the first place there has been a war going on within the limits of Jammu & Kashmir. There was a cease-fire agreed to at the beginning of this year and that cease-fire is still on. But the conditions in the State are still abnormal.it is, therefore, necessary that administration of the State should be geared to these unusual conditions until normal life is restored…. We are still entangled with the United Nations in regard to Jammu & Kashmir and it is not possible to say now when we shall be free from this entanglement. That can only take place when the Kashmir problem is satisfactorily settled…. We are also committed to ascertaining the will of the people by means of a plebiscite provided that peaceful and normal conditions are restored…"

Article 370 of the Indian Constitution, provided 'Temporary provisions with respect to the state of Jammu and Kashmir'. It laid out six special provisions providing the region autonomy to make its own laws in all matters except finance, defence, foreign affairs and communications, a separate flag and denied property rights in the region to outsiders. Article 370(3) empowered the president to make an order abrogating or amending it. But for this 'the recommendation' of the constituent assembly was 'necessary before the president issues such a notification'. The question, then is, after the dissolution of the Constituent Assembly in 1956, didn't the power of abrogation of Article 370 also cease?

While the framers behind the Indian Constitution were uncomfortable with being 'entangled' with the Kashmir dispute, they acknowledged that the dispute, until such a time that it was conclusively settled by reference to the people, must be accorded a special status as a temporary measure, given the conditions in the state were 'abnormal'.

Article 35A [now scrapped] of the Indian Constitution empowered the state of Jammu and Kashmir to define 'permanent residents' of the state and provide special rights and privileges to those permanent residents. This was added to the Indian Constitution through The Constitution (Application to Jammu and Kashmir) Order, 1954.

On 5th August, 2019, the state of India through The Constitution (Application of Jammu & Kashmir) Order, 2019 superseded the Constitution (Application to Jammu and Kashmir) Order, 1954 as amended from time to time, withdrawing the special status of Kashmir and extending the Indian Constitution to the state of Jammu & Kashmir.

Article 370 was introduced, as can be seen, from the debates in the assembly as s special measure given the historical development of the region and in order to preserve its unique identity. The Delhi Agreement of 24th July, 1952, between the state of Jammu & Kashmir and India, is a testament to India's unequivocal admission to such arrangement–and that arrangement could not be annulled without express authorization of the people of Jammu & Kashmir.

The circumstances in which the special status of Kashmir was usurped also merit discussion here. Mehbooba Mufti's coalition government was dissolved by the Governor Satyapal Malik on 21st November, 2018 by exercising powers under section 53 of the Constitution of the state of Jammu & Kashmir. There was no representative government–had been none since June of 2018; so when The Constitution (Application of Jammu & Kashmir) Order, 2019 was passed no prior concurrence was sought from the government of the state of Jammu and Kashmir manifesting the will of the people.

Governor to the state is appointed by the president at the center and his consent or concurrence cannot be equated with that of the manifested will of the people of Jammu & Kashmir. This is a textbook case of commandeering and undermining the concept of the Union of Bharat comprising the center and the union territories as enshrined in the Indian Constitution. Would these arguments prevail over the Supreme Court of India? The readers of this column know better. The Indian Supreme Court–among other institutions seems to have long raised a white flag and surrendered to the Indian far right.

Be that as it may, the constitutionality of The Constitution (Application of Jammu & Kashmir) Order, 2019 is for Indian lawyers to spin and their courts to adjudicate upon. What the state of India in Delhi has done, does not alter the status of Jammu & Kashmir, for the people residing there and nor for the people of Pakistan. Jammu & Kashmir remains an unfinished agenda of partition.

Political pragmatism demands that the line of control resulting from the cease-fire of 17th December, 1971 is accepted as an International border–and perhaps that is where we are headed. But is the partition of Kashmir acceptable to the people of Kashmir? Unless the whole of Kashmir on either side of the line of control expresses her will to that effect–there will be no everlasting peace in the region–regardless of how India and Pakistan position themselves. Many, like the writer of this column, yearn for a united Kashmir. One day!

Revisiting Abdullah Hussein's 'The Weary Generations': Politics, Poetics and Partition

By Raza Naeem

It is rare for a translated work to survive the legacy and celebration of the original work. Yet in terms of the twentieth century Indian subcontinent, such is the case with two celebrated novels; namely Qurratulain Hyder's *Aag ka Darya* and Abdullah Hussein's *Udas Naslein*, published in 1959 and 1963 respectively. Both novels, perhaps for reasons of enhancing the international reputation of their authors, were self-translated into English, in 1998 and 1999 respectively.

It is the latter work which concerns us here, on the twin occasions of Pakistan's 76th independence anniversary and Hussein's 92nd birthday this year, incidentally both falling on August 14. The original novel in Urdu, *Udas Naslein* was recognized as a path-breaking, albeit 'Pakistani' intervention both on account of its scope, as well as the innovation in language. The English version, translated by the writer himself, thirty-three years later can and should be treated as an independent work of fiction in English; and if indeed this treatment is successful then The Weary Generations arguably becomes the most significant Pakistani work in English in the immediate post-partition period since the publication of Zulfikar Ghose's *The Murder of Aziz Khan* in 1967. The title of the novel, which has now attained the status of an aphorism in 21st century Pakistan can be traced to the fact that Hussein never looked at life in a small way rather he viewed the big picture, putting everything in context. This meant that he was not the one to focus merely on individual issues like caste, 'biradari', etc. but was divorced from his immediate surroundings; the big picture in this case being the division of Pakistan in terms of generations. Viewed in this way the word 'Udaas' is very romantic. Hussein tried for two years to find the correct word for 'Udaas', but couldn't find a better word to describe the tiredness of the generations that had stopped struggling following the 'easy' achievement of an independent Pakistan.

The 'research' for this monumental novel had been years in the making, in which Hussein was historically very aware about politics from an early age. His father was a government officer who would pass on all kinds of information to young Abdullah. The latter was also allowed to sit at his grandfather's discussions with his father, from where he absorbed a lot. His own curiosity and wide reading did the rest. More directly, while convalescing from an illness and working in the dreary confines of a cement factory at Daud Khel, Hussein became interested in the story of a war veteran who lay next to him in the hospital; and even after getting better, followed the veteran via train and Tonga to the latter's village to get the rest of his story.

The novel may be read on three levels: as an account of events revolving around the partition of India in 1947; as a description of the politics and sociology of an undivided Punjab, with its attendant system of feudalism and patriarchy; and a love story which begins, thrives and eventually falls with the fate of British colonialism in India itself.

Hussein has divided the novel into three major parts, locating one in colonial India and two in 'Hindustan'. The novel begins with a rather striking event, 'A man on horseback, holding aloft a leaking jar of honey in his hand, had staked out a large tract of land and laid claim to it.' That man later on not only helps to find a village after his own name, Roshan Pur but also one of the two dynasties we will encounter in the novel itself; the Khans. Closely related to the Khans are the Beg family, descendants of the Mughals, India's erstwhile rulers. Both families provide the two major protagonists of the novel, namely Azra and Naim.

In the opening scene of the novel, we are witness to a 'dastar-bandi' (transferring of a title) ceremony of the Khan clan in Delhi, and are introduced to the main characters Naim and Azra, as well as cameos from some important personalities of the Indian independence movement, like Gopal Krishna Gokhale and Annie Besant. Young Naim comes off, and makes an impression at the party, as politically precocious, introduced in the following words, his admiration for the jailed leader Bal Gangadhar Tilak, 'Is that why less educated people are put in gaols? What about Tilak? He is in confinement.' This admiration sets the scene for both Hussein's depiction of the rigidly class-conscious milieu of the Muslim 'Ashraf' upper-class in colonial India and Naim's own solidarity with the oppressed and underprivileged much later.

While returning to his ancestral village, Naim gets a first taste of colonial India's class hierarchy when he witnesses a white passenger murdering a hapless peasant who merely wanted to join his wife on a train to see her off. This was one of a number of occasions witnessed by Naim which would forge his hatred and activism against British imperialism and feudalism throughout the novel.

Though often accused by myopic and self-serving critics of ignoring Punjab and the Punjabi language in his work, *The Weary Generations* could be called Hussein's 'Great Punjabi novel'. It is peppered with minute details of the customs and traditions of an undivided Punjab like the 'turban-mounting' ceremony organized in honour of the brother of Naim's childhood friend, Mahinder, who successfully lifted the animal of a rival; bullock-racing competitions; boar-hunting; and ceremonies associated with sowing, harvesting and cutting wheat. As I read these copious details, I remembered similar descriptions of the Punjabi milieu in the work of great masters of the Urdu short-story like Munshi Premchand, Ahmad Nadeem Qasmi and Rajinder Singh Bedi, especially his masterpiece *Aik Chader Maili Si*.

Hussein's Punjab is also the land where there is a jealous guarding of privileges by the peasant and landlord alike, and for those who cross the line, retribution is swift, as in the scene where Mahinder and his brothers hack a rival clan to death for murdering the former's relative over the use of water.

World War II was raging in the background and Naim enthusiastically recruits in the British army, seeing action in Europe and later Africa. This part of the novel has some of the most affecting scenes from the war, and Hussein is unique among his novelist contemporaries for the depiction. Snubbed by Naim's superior for being too inquisitive about the still-distant war, there is a memorable passage among these scenes, a dialogue between Naim and his childhood friend and fellow recruit, Mahinder:

> *'That was different,' he said after a few long minutes. 'To avenge the blood of one of your own, even a rat can kill. Here we don't even know the people. It is like killing a pig, or a jackal in the jungle.'*
>
> *'Well,' Naim said, 'that is what war is.'*
>
> *Although supporting his weight on hands placed on either side of him on the stone, Mahinder Singh looked slumped, his back in the shape of a bow, his shoulders fallen, as if his body had taken on a different form.*
>
> *'Tell me,' Mahinder Singh asked suddenly, 'why are we here?' 'Because of the war,' Naim said.*
> *'The enemy has attacked.' 'What, attacked our village?'*
> *'Attacked the British sarkar and their friends.' 'What is it to us?'*
> *'They are our masters.'*
> *'Our master is Roshan Agha,' Mahinder Singh said simply.*
> *'Yes, and the English sarkar is Roshan Agha's masters.'*
>
> *A brief hollow sound emerged from Mahinder Singh's mouth. 'How many masters do we have?'*
>
> *Naim laughed. 'Well, it's just the way it is.'*
>
> *Mahinder Singh got up ponderously, as if making an effort to carry the weight of his clothes. 'I like this place,' he said, gesturing towards the graves. 'Here good people are buried. With names.'*

Naim loses his left arm while fighting for the British in Africa and is awarded with land, pension, title, a distinguished service medal for his services; and also the hand of Azra in marriage, despite the stiff opposition of her crusty feudal family. Returning to Roshan Pur, he becomes more determined to challenge the depredations of the Khan landlords after witnessing the humiliation of

Ahmed Din, the oldest resident of the village who having lost his son in the Great War, refused to pay the exorbitant 'motorana' (motor tax) levied by the Khans. One such attempt to organize the peasants of Jat Nagar ended in Naim being jailed. Later, when sent on 'training' to organize oppressed peasants and workers, Naim also disagrees with violence for the sake of violence employed by the group he is asked to join and eventually leaves that group.

Two final historical events signify Naim's revulsion with the British colonial system and its local appendages, leading to another stint in jail and a swift weariness with all forms of struggle, an informal break with Azra and a gradual acceptance of the prevailing situation. One was the massacre at Jallianwala Bagh in Amritsar in April 1919 where thousands of unarmed protesters and spring revelers were gunned down by the British. The brief six-page description of the massacre and the violence which followed it are among the best, to be compared with depictions of the same event in short stories by Saadat Hasan Manto, Krishan Chander and Ghulam Abbas.* The other was another infamous April massacre in Peshawar's famous Qissa Khawani Bazaar in 1930 where dozens (by some accounts thousands) of unarmed protesters were killed by the armed might of the British colonial state. Hussein pithily sums up Naim's dilemma at this juncture:

> "Until now, Naim's life seemed to have led him by its circumstances not from the front but from behind, like a man being pushed along in a storm by gusts of strong wind, limiting his own movements to the resistance of his limbs. Now, in a life circumscribed by necessity, he had entered a different world – the unfamiliar territory of the mind. He could do no more than read and think."

The dissolution of Naim's internal dynamic of resistance is played against national opposition to British attempts to pacify local Muslim and Hindu leaders with reforms such as the dispatch of the Simon Commission to India, as well as internal division among the Muslim leadership (in the novel it is the Aga Khan versus Maulana Muhammad Ali Jauhar) over the issue of joint electorates and the increasingly inevitable push towards the division of the Indian subcontinent and the creation of Pakistan.

As the mad rush to Pakistan sets in, both for the privileged (via aircraft) and the underprivileged (on foot), notwithstanding the 'fatal threat on the other side from (their) names and genitals', a view of the opportunism of the weary generations inherent in the future, self- preservation and the rush for evacuee property and plum bureaucratic jobs in the new country called Pakistan is given in the following manner:

---

* These stories are 'Tamasha', 'Deevana Shayir', 'Swaraj ke Liye' and '1919 ki Aik Baat' (Manto), 'Amritsar: Azadi say Pehlay' (Chander) and 'Reenganay Walay' (Abbas)

> *This was a class that was rich, fairly rich and very rich, educated, calling itself liberal, indulging in anything between idle talk and lip-service, with the chief objective of having a good time together, which gave it a sense of solidarity, besides the satisfaction of taking an 'active' part in the historical development of their country. This was a class of people that was to remain, despite 'reforms', largely intact and in command for many years– until the day of judgement was to arrive...as their destination came nearer, hopes of survival grew, and acquiring money finally took priority over everything else.*

A word must also be said about the women in *The Weary Generations*. Unlike the strong, memorable and likeable female protagonists in Hussein's other novels like *Qaid*, *Baagh* and *Naadar Log*, the novel under review lacks strong women characters. Naim's father had two wives, who never could break out of the vicious circle of patriarchy and jealousy for each other, and patriarchs from earlier generations of the Khans and the Mughals have been shown in the novel to have fallen from family grace due to having married lesser women either the first or the second time. A minor character in the novel, who becomes intimate with our hero Naim, observes pithily, 'If you don't grow up with women, you never grow up.' Yet this reality is utterly lost on Naim, who though loves and eventually marries Azra, can never really deepen his relationship with her owing to their different class solidarities. Azra for her part, rebels against her own kind by falling in love with, and eventually marrying Naim, but despite being sympathetic to Naim's concerns and being politically motivated enough to accompany Naim on a fact-finding mission to investigate the Jallianwala Bagh massacre, and being present at the protest against the arrival of the Simon Commission in Lucknow, cannot bring herself to act decisively on other occasions such as at the scene of arrival in Calcutta of the Prince of Wales, who for her is a 'beautiful man…and looks so nice in photographs', and the All-India Muslim Conference, presided over by the Aga Khan, who speaks 'beautiful English, with a slight accent.' Eventually she fails to gain her husband's respect through her ambivalent stand to 'his' politics, politics in general, and in this respect can be unfavourably compared to Rano, the heroine of Bedi's aforementioned novel, who making do with a Punjabi patriarchal milieu, manages to successfully negotiate the thin line between an uneasy docility and outright rebellion with finesse. So we are left to mourn the lack of a memorable female character in *The Weary Generations*; the women try to break out of the feudal-patriarchal cycle but are eventually brought back to the familiar routines of the city and country (side).

Writing Pakistan: English Language, Representation, Style, and Perfectionism

By Noor Rehman

A few months ago, our department held a writing competition for the undergrad students. I had to read and sift through a list of fifteen entries and choose the top three out of them. While reading those entries, I noticed that most of the main characters had American names and the places in which the stories played out didn't look like Lahore or Pakistan but resembled unidentified urban cities that could be anywhere in the world. The phenomenon I witnessed among these stories reminded me my own troubles and hesitations in the beginning before I began my novel and located it in Wana, South Waziristan. In those days, I used to remind myself: Imagine the world is a stage and the limelight is falling on the fictional village Kashmala in which my characters live and interact. I had to consciously push the globe and make the fictional village of my characters in Wana its center, so that I wouldn't treat it as a derivative or a copy of someone else's fictional world. I also experienced how difficult it was to write about a place about which no one had written from within and do that in a foreign language.

So, if you are struggling with writing about a rural town or an urban city in Pakistan but feel a certain dissonance when your characters speak to each other in English, you are not alone. You might experience the same inner conflict when you write about your desi characters and somehow can't continue your story unimpeded. Given the history of this country and the region, we don't live in and through one but three, four languages at the same time. And when you try to reduce all those lived experiences into one language, especially English, the dissonance begins to bother you. Apart from that, many Desi readers spend years reading Western literature and consume foreign cinema. As a consequence, they develop an unconscious habit that stories, dramas, occur elsewhere but not in our own backyard, whether that be Anarkali, Peshawar or Wana. To remedy that, one could try and consciously limit oneself to South Asian writers for a few months, so that one's intellectual/creative self can firmly root itself back in its own backyard. Also, if you read South Asian writers, they would provide good models for imitation and disrupt the unconscious presumption that stories happen in the West only but not in one's own backyard. Besides, it is very important to read both good and okay writers from our region, so that you can deescalate your own expectations and save yourself from relentless agony.

Another thing that I realized quite early on was that when I wrote about Wana, I didn't know what I was doing. Gradually, it got clear that my work was a kind of translation, where the original work and the translation happened simultaneously within my mind. I saw that I wasn't writing an original story in English directly but translating it from Pashtu. As opposed to the usual translations,

the primary text from which I was translating existed within me. And this wasn't a new thing. After all, I learnt English the same way and spent years translating it in my mind from Pashtu to Urdu and then to English. This approach also liberated me from worrying about how much got lost in the process of translation to English and encouraged me to focus on what I could contain and retain in English.

In my workshop, some of the participants worry about representation. If I come from a certain economical class, adhere to a certain sect, belong to a certain ethnicity, speak a certain language in my family, have certain talents/eccentricities, and identify myself with a particular set of values, how can I write a story which can represent everyone in my city and country? I cannot and neither can you. And you are not supposed to. If we set out to write stories that help represent everyone, we won't have any critics and we won't have any stories either. One needs to keep in mind that a certain story is born out of a particular space/time context and through its particular dynamics; it tries to appeal to universal values/ideas/identities. My own approach, given my young and naïvette, is to write close to my own experiences, observations, and values. I am certain that many people in my family would object to what I write and what I find worth writing. But one thing I don't worry about is representation. I don't feel obliged to represent the thousands of realities that dwell and thrive in this country. And if you think that you can write in a way that no tweep will criticize you, raise objections to your writing, you need to wake up because that's impossible. Given how volatile and polarized this country is, it is not possible to find a pure, halal story that would be accepted by everyone. And that holds true for this planet too. Creative fiction lives very close to reality and it embodies all the contradictions, conflicts, and hypocrisies of our reality/realities. Instead of getting rid of these contradictions, conflicts, we should try and assimilate them into our writing.

Another question that boggled my mind for years was about style. And whenever I meet a young writer or talk to one online, they worry about having a unique style. Again, secretly all of us want to become famous and feel loved all over the world and somehow, we assume that having a unique style will get us there and fulfill all of our halal and perverse fantasies. I don't think that's a realistic expectation. If I could talk to my younger self, I would have told him, "Dear, you have not written ten stories yet but you worry about style". And I would say this to anyone. I believe that as a young writer, you need not worry too much about style and focus on writing stories/poems. As you keep improving and learn to practice the basic elements of craft, you would discover your style and area of interest. I think that your sense of style doesn't reveal to you all at once but appears little by little across months and years until you realize that there are elements, eccentricities that appear over and over in your writing and you call that your style. And by the way, there are some amazing writers out there who are writing enthralling stories but their style doesn't smack you across the face when

you open their books. I believe that writing stories and learning from the process of writing and rewriting is more important than 'finding your style' or 'what's my style?', and 'if I don't have a unique style, I won't write and instead become a carpenter or something'. Sure, go ahead and learn carpentry too but don't give up on writing yet.

A friend of mine told me that she wanted to write but the moment she sat down to begin, the expectations of perfect sentences and stories, the ideals she had looked up to hinder her and she couldn't allow herself to write a phrase, a sentence; however, when she wrote her personal diaries and didn't labor under the pressure of the cruel god of perfection standing right behind her, she could write easily and as much as she wanted. In my view, the demand of perfectionism is less a literary issue and more a psychological issue. In football, players begin to train and practice from a young age of 5 or 7 and play for a decade before they can lead themselves to an elite academy and if they play consistently at the same level for a few more years, they end up playing for one of the top European football clubs. That makes sense. However, I don't understand how can you expect yourself to write a very good story before you have worked on your craft for 8, 10 years and have written at least 15 or 25 bad, messed up stories? I have done this to myself and I see it now that I was cruel to the point where I discouraged myself against writing because I paid attention to my insane ambitions and not my meager preparation. I often tell my workshop participants, when you write stories/poems, do you treat yourself like a child who deserves to make mistakes so that she can learn from the process or do you treat yourself like a fascist warlord who expects nothing short of his cruel demands and if you fail to deliver those, you curse yourself, hurt yourself, and tell yourself that you don't have a talent/genius and you can't do this? I believe that we create art out of the softest, most tender parts of our soul and if you mistreat that part, bully her, look down upon her over making mistakes; you are being cruel to yourself and your learning process. What's the solution? Allow yourself to write badly but write as much as you can and make sure that you revise your bad short stories because seeing your own bad writing makes you realistic and helps you bring your expectations down. And then across the years you would see that you have improved and can write good enough stories.

To conclude this meandering essay, I want to address the question: Where do stories come from? My answer might not be as good as those of amazing published writers but hear me out. In the early 2000s, if you wanted to view TV channels from a certain region, you had to tilt the dish antenna at a very specific angle in order to receive signals from satellites out there in space and thus, get the channels with clear sound and moving images on your TV. As a writer, I think the same about my mind/body. I am the device, the dish antenna through which the world gets filtered, transformed and then turned into stories and poems. It is important for me to trust my own device, my own heart when

I write instead of what others expect me to write or want me to write. It helps to show your stories to others, publish your writings, discuss your questions with people, but at the end of the day, you are your own writer and you need to trust your own intuition, your own preferences. As much as it is important to learn from others, it is more important to fashion your own self and empower it to the point where it can see and feel things through its own eyes rather than through borrowed perspectives. In other words, whatever you learn, whatever you borrow, and whatever you experience/experienced, make them all truly your own. And owning your own past, your own self, and your own experiences is a difficult task that demands mettle and courage.

Cultural & Societal Changes, and their Influence on the Teaching of English Literature in Pakistan over the Years

By Farhan Aslam

It should not be deemed unfair to put more emphasis on the earliest breeding grounds for the oriental subject in discussion; that is the gothic architecture, built almost completely dissimilar from the cultural and native buildings erected all over the majestic city of Lahore, across the famous Gol Bagh. That unconventional building is none other than that of GC and the Scholars' Garden (now known as Shahab Garden) is its breeding ground, with the English Department surrounding it. Therefore, to truly delve into the subject of dialectical changes and its effects on the teaching of the subject in consideration, the aforementioned breeding ground shall be focused upon much. This emphasis in no manner equates to unequal prioritization, and I shall attempt to cover the entirety of its teachings.

It is no wonder that the earliest origins of English Literature as a subject in a land of conflict was made possible. Nor is it a wonder that the subject had strong connections with aristocracy and bureaucracy, and every other 'cracy' that subjects to the elite class. It could be argued that the breeding ground for the colonial language was in fact the breeding ground for 'babu' and 'sahibs', bred for the purposes of serving their masters and oppressing their own kind. It is therefore made clear that the ideal purposes of the newfound language and its teaching was political, rather than academic, and the subject was taught by the Queen with a stick in her hand for a beating. It could be said that longdistance learning was a concept practiced by the crown, long before the advent of such technology which we have now. The pandemic back then however, was called 'colonialism'.

The first instances of social and cultural changes and its influence were witnessed around the time of partition. Urmilla Sondhi, daughter of the Principal of Government College, was appointed chief editor of the college magazine, being the first female student to occupy this office. The editor of the Ravi castigated 'perverted minds' who had started a campaign for the exclusion of Keats' Last Sonnet from a prescribed text-book (edited by a professor of the college) on the ground of its obscenity. The editor then expounded the ethics and psychology of obscenity and advanced the astounding proposition that if the sonnet in question was obscene, there was little else in English literature that could not be called obscene. This instance was merely a foreshadowing of what was to come.

However, prior to the discussion, a link between how a subject is taught and understood, and its relevance to the environment where it is taught is to be underscored. Before the link is made, it is important to highlight how subjects vary. There are subjects which could be easily and widely taught, let's call them 'Universal Subjects' for the purpose of this argument. STEM subjects, and a majority

of the humanities such as ‘Psychology’ and ‘History’ fall into this category. The aforementioned subjects are definite, and no such cultural nor societal relevance is needed to understand and connect with them in a better manner. English literature, however, is not a universal subject. It primarily focuses on the atmosphere of our colonial masters, which is quite different from what our environment offers. It could be argued that literature is universal, and that human emotions are empirical. This claim however, does not reach its depth and is incorrect.

Although Pakistani students might relate to human emotions within the subject, still, the ignition of the emotions in the manuscripts of English authors is different from the ones present here. It is difficult to compare or relate with Frost’s snowy crossroads or Keats’ imagery of a landscape where summer reigns as a dominant monarch. It reminds me of the time G.D. Sondhi wrote the shortest entry for the Ravi; “tired of Lahore’s heat.” The cultural and societal paradoxes of Pakistan are no less of a pain to deal, the variety of culture present here makes it very difficult to understand the subject in discussion.

The lack of resonance with the teachings of literature has prompted educators to rather attempt at giving birth to new methods of relevance, which is dependent of the socio-cultural environment of where it is taught; that environment in discussion is of Pakistan. We must consider that the effects of the environment outside the premises did in fact have an impact on the inside. From Tariq Ali’s campaign against Ayub during the times of Dr. Nazir Ahmed, to the echoes of drums on Scholars’ Garden during the governance of Dr. Hassan Amir Shah; the trickling down effect, starting at the government’s stance, and ending at its impact on the grounds of campuses does have its influence on the teachings of institutes. Is it an overreach? I would deny so. One could deny such influences on subjects where discourses and intellectual discussions cease to exist, or are present in undertones, ‘Universal Subjects’, as we named them previously. I could only imagine teachers preaching existentialism whilst teaching mathematics (however, exceptionally, the number zero has been existentially discussed) or that physics teachers discussing the paradoxes of time travel, and the existence of other beings as us in other parallel universes. To conclude, this is a rarity. In the subjects of Humanities, however, the room for such discussions is greater than the former ones. Therefore, a subject that relies not on a mere theoretical framework, rather an analytical one, is more prone to outside forces. These very ‘outside forces’ in discussion are unfortunately ever-changing ones. Defining culture and society where we live is not an easy task, nor can it ever be put into objective words. It is in a simultaneous cycle of evolution and devolution whichever appropriate during a certain period. The question then arises, whether academia and outer forces are meant to be independent of each other or not. The answer to which, is not a simple one. Ethically, it is true that academia should

not be intervened by whichever societal and cultural forces are present, but then does an academically imperial subject should or should not be separated with contexts such as the aforementioned ones or not. But then arises the instinctive tendencies whilst teaching, ones which deter any means of the interference of outer forces into one's teachings. The reason being these very forces are too much to be ignored as they involve themselves into the methods. This essay seems to be going nowhere, circling itself, perhaps due to the cultural and societal paradoxes that exist, or call it my incompetence simply. Whilst literature with intimate overtones or irreverent content is difficult to find in the curriculum and teachings of literature in Pakistan, the macabre genre is explored on the contrary with little to no hesitance. What makes death less easy to discuss in class than intimacy is unclear to me. What I could attempt to conclude, is that even if the subject is or is not influenced by the ones teaching it, it surely is by the curriculum that limits what the subject holds for them. Perhaps during a left-leaning government, Chekov would be included and preferred to be taught, and the other way around. Until the vastness of the subject is explored without meaningless (modern-slash postmodern debate aside) limitations, students would prefer to study at a university on the mall offering a four-year training with a degree as a bonus for aspirants, rather than the famous CSS academy on the same road.

An Interview with Syed Saleem Gardezi

By Amama Bashir and Aman Irfan

Syed Saleem Gardezi: *Mr. Syed Saleem Gardezi is a seasoned traveler, dedicated researcher, and prolific author whose life's work has been characterized by a passionate pursuit of knowledge and cultural preservation. With a notable collection of authored works, including "Garam Paniyon ki Talash Mein," "Siahat e Kashmir," and "Mene Kashmir Jaltay Dekha," Mr. Gardezi has left an indelible mark in the world of literature and historical documentation. He is not only a devoted writer but also a loving father to two delightful daughters, who have inherited his deep affection for both literature and the enchanting region of Kashmir. Presently, Mr. Gardezi serves in a prominent capacity within the AJK government and resides in Muzaffarabad, Azad Kashmir. (Please note that this interview was conducted in the year 2020.)*

The Interviewers: Thank you for meeting us today Sir! Could you start us off by telling us about your present journey as a Kashmiri writer compared to the past that generations of your family witnessed?

Syed Saleem Gardezi: The state of Jammu and Kashmir, has a long history, going back thousands of years. It assumed its present form after the Treaty of Amritsar. In the Treaty of Amritsar, the British sold this land to Dogra Raja Gulab Singh, who acquired the land and made it his property. For nearly a hundred years, his family controlled Kashmir. In 1947, when the whole subcontinent was divided; India and Pakistan came into being as two independent states on the principle that the Muslim-majority areas would join the state of Pakistan, and the non- Muslim majority areas would go to Hindustan or India. On this principle alone, Kashmir should have become a part of Pakistan as 85% of the population was Muslim. It made sense geographically: all its rivers were faced towards Pakistan. It shared languages with nearby Pakistani areas. Historically, culturally, religiously, and racially– in nearly every way, Kashmir was linked with Pakistan. But Hindustan deployed its armed forces and occupied the state of Kashmir. That's how the situation began. The people of Kashmir retaliated against the Indian army by starting the struggle for their independence. When faced with defeat and resistance, India themselves took the issue to the United Nations. In the UN, resolutions were agreed upon and the war ended on the assumption that the question of Kashmir's future would soon be decided. It was to be determined through a free referendum whether Kashmir would join Pakistan or India. The war ended on this agreement and the people of Kashmir anticipated that they would get a chance to determine their future, as promised in the resolution by the UN which was witnessed by all the countries of the world. The people of Kashmir have still not been granted that opportunity. This is why the people of Kashmir have been engaged in a constant struggle since 1947. People have

participated in peaceful protests, and they have taken up armed resistance. It has been a long struggle. Pakistan and India have fought three wars over this issue. But it still has not been resolved. In the past 30 years, people have been engaged in an armed struggle–they have had to make sacrifices, as martyrs. 100,000 people have been martyred in 1947-48, and adding the martyrs of 1947, more than 500,000 people have been killed. Countless people have been made to disappear, thousands have been sent to Indian jails to rot, and Kashmir has been a site of cruelty and inhumanity. On 5th August, the special status given to Kashmir in the Indian Constitution was revoked. Kashmir has been in a state of curfew ever since. 900,000 Indian soldiers have been deployed, near every home. No one is allowed outside. No one can raise their voice. The markets are shut down; schools and educational institutes have been closed and patients have been kept from hospitals. We would be able to correctly assess the violence done to the citizens only when the curfew has been lifted–and learn how many citizens have been the targets of the army's weapons; how many have been arrested; how many have died struggling because of no medicines, because they couldn't access the hospitals; how many have died because they could not acquire proper sustenance. All this will become clear to the whole world when the curfew is lifted. Then, the world will realize the reality of the situation. At the moment, there is regulation on social media and newspapers, and news channels from around the world have no access to Kashmir. The whole of Kashmir has been converted into a jail. This is the state of the affairs of Kashmir presently.

The Interviewers: We are given to understand that you were in Indian-administered Kashmir post partition, studying and researching about the life lived in that area. This reflects in your writing too. Can you please talk about this notion from your own perspective and how it connects to your writing today?

Syed Saleem Gardezi: In 1987, the leadership who was in favor of freedom for Kashmir, formed the Muslim United Front, as a political platform for aiding in the fight for freedom. From this platform, they started their fight for freedom. Since India posed as a democratic state and power to the world, they thought that employing the resources of assembly, parliament and democratic means, they could demand the Indian forces to retreat and to recognize their right to live freely. They thought, in that case, India would be forced to recognize that the people's right to vote, the nation's Kashmiri Activist right to vote has always been sacred and instrumental in civilized societies. The people of Kashmir thought that if we progress our movement in a peaceful and democratic manner, then India and the world might accept our right to freedom.

In the state elections of 1987, they participated through the platform of the Muslim United Front under the leadership of Syed Ali Geelani. Syed Ali Geelani was a prominent political personality

and had been active as a part of the assembly and as an opposition leader numerous time. Under his leadership, the political struggle started and this campaign was met with a warm welcome from the public. Large gatherings indicated that the MUF had the popular support of the people. It was obvious who was going to win. Seeing this support, the Indian army and establishment rigged the elections to keep the MUF from winning. Only five candidates, including Syed Ali Geelani, from the MUF, were successful in securing seats and the rest were declared unsuccessful. The supreme commander of the mujahideen is Yousef Shah, more commonly known as Silahuddin. He was the candidate from the areas near Srinagar and was also a politician engaged in the political resistance. Like him, many people taking part in the elections through the platform of the MUF were politicians who then initiated the military movement. After stealing their voices and rigging the elections, the MUF's win was forcefully turned into a defeat. When the leaders of the MUF were arrested and silenced, it was a huge disappointment for the young workers of the MUF who had hoped that freedom could be attained through a vote. They were forced to confront the fact that India would never cede Kashmir through peaceful and democratic means. So, they picked up arms and started the armed and martial movement.

That movement, which started in 1988, continues till today. The people of Kashmir have been resisting and making sacrifices ever since. People from every walk of life are part of this struggle: the leadership, the mujahideen, intellectuals, scholars, journalists, social media activists; all are performing in their capacity. Young students also play a leading role in the struggle. School children also stand up against the Indian armed forces as well. They throw rocks at the Indian army and organize student riots. This makes them the target of the Indian forces' violence, but they persist. They do not abandon the fight for freedom, no matter what the personal costs. Kashmiri women also play a vital and leading role in the struggle. They raise their voices against the Indian forces. Asiya Andrabi is a female leader, who leads the Kashmiri women and has founded the 'Dukhtaran-e-Millat'. She has spent most of her life in jail but has not given up the struggle. So, the women of Kashmir are also playing a significant role in the freedom movement. People from every profession and every class are instrumental in the struggle for freedom. This is not the movement of a few armed youths; it is the movement of a whole nation. Every person of that nation, of every class and rank, is engaged in the resistance against Indian occupation. India governs Kashmir only through the force of its arms and its armed forces. But the hearts of the people are not with India; they are with Pakistan and for freedom. In funerals, the bodies of the martyrs are wrapped in Pakistani flags: this expresses their love for Pakistan. This is the current status of the Kashmiri freedom movement. I have reviewed the situation in Kashmir since 5th August. Insha-Allah, this movement will continue until Kashmir gains independence. The freedom movement for Kashmir is not just the movement for occupied Kashmir.

It is the movement for the self-determination of the state of Jammu & Kashmir. The citizens of the whole state must determine the future of Kashmir. It includes the people of Azad Kashmir, the people of occupied Kashmir, and a large number of immigrant residents in Pakistan. This issue concerns the rights of all these people. Everyone must use their right to an opinion. Every citizen is a part of the independence movement. They are a soldier in this movement and are thus responsible to act. Some people are fulfilling their responsibility to Kashmir, and the rest will realize, with time, the role they are to play in the movement. Pakistan can also not stay unallied with this movement. After all, this is the movement for the formation of Pakistan. This is the movement for the independence of J&K and for joining it to Pakistan. From the very start, these have been the objectives of the movement. Pakistan cannot be complete without a union with Kashmir. Even in the word 'Pakistan'; 'kaaf' represents Kashmir, 'pe' is for Punjab, 'alif' is for Afghanistan, or the province of KPK, 'seene' for Sindh, and 'tan' for Balochistan; thus Pakistan will not be complete until Kashmir is a part of it. This is the issue of the 'Two Nation theory' and Pakistan's formation and freedom. The people of Pakistan cannot stay disinterested in this and they do not. The people of Pakistan have sacrificed much in the freedom movement. The movement includes the blood of many Pakistanis. The people of Pakistan have been fighting for and aiding their Kashmiri brothers and sisters, and they continue to do so. So be it Pakistan or Azad Kashmir, they cannot stay unallied and disconnected with the movement. It would be like shooting your own foot, as if you are being deprived of a part of your own body. So we cannot stay distanced from the movement. This movement will, IA, be successful: Pakistan will be completed, independence will be attained, the land of Kashmir will be blessed by freedom. That time will most certainly come.

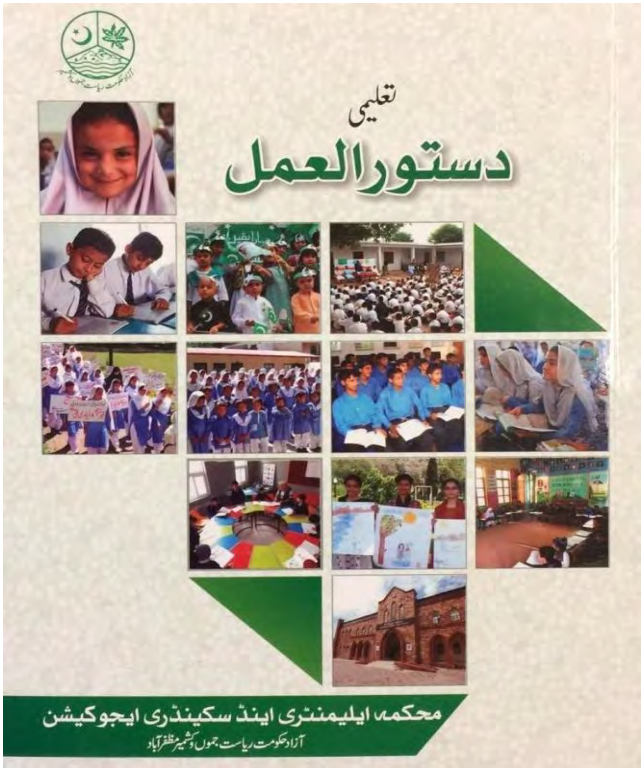
The Interviewers: Could you tell us a bit about your current work at Muzafarabad?

Syed Saleem Gardezi: At the moment, I am an additional secretary in the Department of Education in Azad Kashmir. I look over the standard of school education in Azad Kashmir and its concerns are my responsibility.

The Interviewers: You've contributed many insightful publications throughout your career, could you highlight your work in the field of education and the overall situation of education in Azad Kashmir?

Syed Saleem Gardezi: I have taken many steps regarding education. A book, named *Dastur-ul- Amal*, is a code of conduct and a guide written for the educational institutes in Azad Kashmir. Other than that, I have worked on the improvement of the curriculum. I have also worked on upholding merit and improving the standard of education in the education system. Through NTS, we have started the

process of hiring teachers based on their merit, and thousands of students are admitted without any intervention or reference. Teachers are hired only on merit, which has greatly improved the educational standard. This whole process is still ongoing. We have also tried to improve the curriculum and focus on the training of teachers, which is in progress. Teachers are being educated and trained. A biometric attendance system has been introduced. Through a biometric attendance of the staff, we have tried to reduce absences and improve the quality of education. Other steps have also been taken, and this process is continuing at present. Insha Allah, the education system will continue to get better.

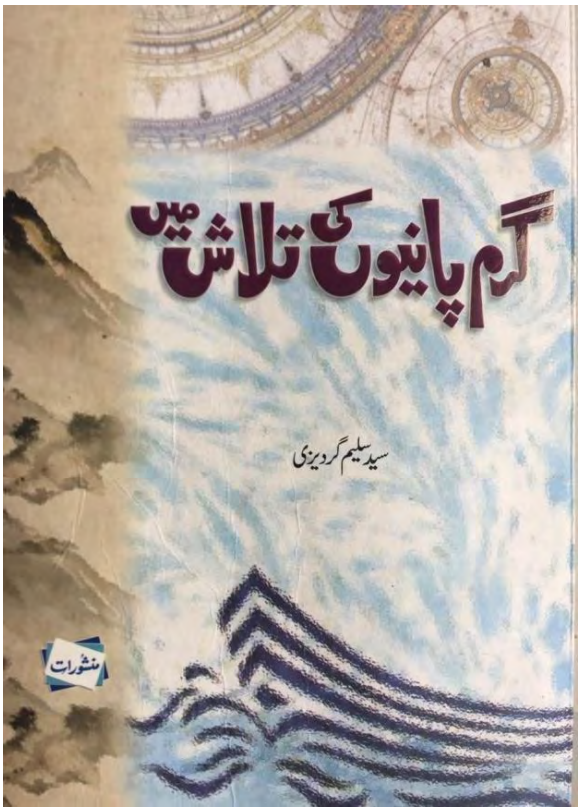


You mentioned the overall situation of Azad Kashmir. Azad Kashmir is a piece of land that consists of 10 districts in total. It is a part of the state of J&K but is on its periphery or in the outskirts. Before 1947, it was not a developed area at all. There were no roads. There were no educational facilities. Before 1947, there were no health services or any infrastructure. It was a neglected area. But after independence, there has been considerable progress. Today, roads are connected to each of our villages. Every town has electricity. Educational institutes can be found in every street. Every village has access to health facilities. We have all the facilities that a citizen must enjoy in every society. In literacy, we are far ahead than any other region in Pakistan. It is 87% and it is the best literacy rate in Pakistan. And this achievement was reached after 1947. Before 1947, there was no record of our literacy rates and we did not even have the concept of literacy. Similarly, now there are educational

facilities. There is the issue of quality education but we have been trying to improve on this front as well. Azad Kashmir is a peaceful region. You know that the whole of Pakistan went through the tumult of terrorism. There were bomb blasts and suicide bombers. But Azad Kashmir was free from that. The people of Azad Kashmir are peaceful, and so there was no terrorism, no sectarian violence. There are no hateful or discriminatory undercurrents. People live in harmony. They are pro-education; even the poorest do not neglect the education of their children. It is a cultured and urbane society.

The Interviewers: What compelled you to pursue the craft of writing?

Syed Saleem Gardezi: I started writing in my school days. My essays used to be published in newspapers and magazines, perhaps from the time of school. I have been writing in my school years, college years, and my student years. I have written in newspapers and many different magazines from that time. I have done an editorship for them as well. After finishing my education, I started writing properly when I started working on books. My first book is a travelogue about J&K. It was widely published. After that, my second book is an exploration of the ancient travelogues about J&K. It is a research book, called *Ghair mulki seyaho ki ziarat-e- Kashmir*. It is available in the market. My third book is an investigation on the Afghan Mujahideen and the Afghan resistance against Russia. I try to keep on writing like this. These are my three books which have been published. Similarly, I frequently have essays published in the newspapers. I write on these topics, and specifically on the freedom movement in Kashmir.



The Interviewers: This has been a very productive opportunity for us Sir, we are grateful for your time. Could you conclude with any advice you might have for the students of our generation?

Syed Saleem Gardezi: Students are our future and our wealth–they might be from GCU or any other educational institute. Young generations are the wealth of nations. My message to these young people would be to acquire education and get the best quality of knowledge; get both religious and worldly knowledge; acquire education regarding science and technology too. But, at the same time, do not neglect to align yourself with the idea that is the basis of the creation of Pakistan, and the ideology of Islam, that is our foundation. Become good Muslims, good Pakistanis, good scientists, good doctors, and good engineers. Make your country proud. We need role models. So, whichever field you choose, excel yourself and be successful – become good role models for the nation. Become useful and worthy citizens. These are our expectations.

Pakistani Prose

By Amna Naeem

Faiz Ahmed Faiz's "*Writers, Where Do You Stand?*" left prose writers in intellectual debt – a sort of responsibility that Faiz consigns to writers of Pakistan so that they can make sure the sovereignty of truth prevails, even if it is as bitter as death. Faiz artfully crafted his short stories and novels in an expository manner to snake into the hidden, sinister allies of Pakistani society to carve out honest social, political, and historical narratives. Just because reality is offensive doesn't mean its non-existent; we need to know where the trapdoors are and who is giving away secrets to enemies. The textbooks we grew up studying have either lied to us or have never allowed us to contemplate or dissect the truth or to question and critique what we are being told. That information, a sort of hand-me-down, is like an artificial decoration piece that we only observe or merely see, as if some visitor in a museum, we lack a palpability which is so important to weigh the odds. Prose allows us to have those uncomfortable, neglected conversations, a "we need to talk" assignment that is circulated in society so that people are not just at the receiving end but at the processing end.

The prose is set apart from other genres of literature for its argumentative, persuasive, and close-to-life narration and foretelling of events. Where non-fiction prose in the form of biographies, autobiographies, essays, and articles is aimed at deliberation from an apparent standpoint, fiction prose (novels, short stories, historical and realistic fiction) urges the readers to participate and contribute to understanding the various themes. Everything that we read, who is it being targeted to, or who is being 'educated?' It's us - common people like you and me who grow up trusting a 'fact' and later navigate new streams of substantive truth-seeking. Prose urges us to take that path, not settle for half-baked truths or spoon-fed accounts, and to grow more conscious of what really goes around in our society. The power of prose can be well established by the backlash received by influential and rather controversial writers of Pakistan, such as Saadat Hussan Manto, Intizar Hussain, Ayesha Jalal, Ahmed Ali, Sajjad Zaheer, Faiz Ahmed Faiz, Asma Jahangir, Ashfaq Ahmed, and so many others. Many contemporary writers have taken up the responsibility to write novels, articles, and short stories in the pursuit of moral reformation and social and political revolution.

Bapsi Sidhwa's *Ice-Candy Man* allows us to account for violence against women during the time of Partition, a narrative buried deep in history, lost in the cacophony of Independence. The Hindu Ayah of the Parsee household in the novel is representative of all those women, the bodies of whom were treated like commodities, whose honor was a trigger for men, and whose individuality somehow scattered in the breeze of collective remorse. By building a female character who is abducted, raped, prostituted, and forcefully married, Sidhwa wants us to voice out similar stories from the silence of

the women first wronged and then erased. The tribal and communal disputes in so many countries such as Bangladesh, Kashmir, Colombia, Peru, Rwanda, Liberia, the Balkans, Uganda, etc., show how weapons of war are created out of women when, upon despoiling, the conquered group ascertains a disturbing dominance. Women, therefore, become the setting stage for winners and losers to exercise their anger, perform feuds, and commemorate triumphs. For the traumas of the Partition females, too, there exists no representation, no accountability, no testimonial, and no validation.

Tehmina Durrani's *My Feudal Lord* was a brave and rather heroic endeavor to expose her abusive marriage with Ghulam Mustafa Khar, a famous politician. In a conservative society, where the most important issues are brushed under the carpet due to idealized 'honor' and 'prestige' – the fragile 'izzat' and the even more demonic 'log kya kaheingy' mentality – having a discourse on domestic abuse is quite a milestone Tehmina's novel helped to achieve. In the patriarchal Pakistani society, knowing, believing, and realizing your rights as a woman – not as the roles of daughter and wife, but as human beings – is quite a privilege. It is a very crucial step to do away with the shackles of sham expectations that had women forever in a loop of pleasing, obeying, listening, and doing everything that they are told to do, the boundaries that have always been drawn by men who have no right over the physical or mental agency of females. Writing about female oppression and gender-based violence has allowed women to come out of their shells, confront their perpetrators and harassers, and reclaim their space in society as equal citizens worthy of respect.

Asma Jahangir's narrative on the rise of extremist religiosity in Pakistan, the evil of child labor, bonded labor and slavery, the status of women as wives and the future of feminism, misuse of religion for violent motives, misuse of blasphemy laws against minorities, human rights violations and the Independence of judiciary and lawyers in Pakistan are some of the most controversial works to exist today. Her book *Divine Sanction? The Hadood Ordinance 1988, Child Prisoners of Pakistan*, and numerous valuable papers allow us to gauge the severity of issues through the lens of a woman who made strong men squirm in their chairs due to her dynamic, powerful confrontations. There is this bloody, raw lesson to be sopped up from the topics that are forbidden to be touched because writers like her put themselves in danger when they stand up against a plethora of journalists, critics, politicians, right-wing extremists, and traditionalists – the least we can do is read and listen close. The nation, as a whole, has been wronged and lied to so many times in history and even now, which is why these writers are pivotal to getting the country out of the struggle and rut. Since our birth, we've heard the phrase: 'mulk nazuk soorat-e-haal sey guzar raha hai.' But when is it to stop? It has been in commotion since 1947; decades later, it is the same story. Writers can help us question this system of

redundancy, which seems almost unhealthily obsessed with orthodoxy and repression, stubborn and unwilling to mutilate agencies that only hush and shush.

Muhammad Hanif's *A Case of Exploding Mangoes* is a dangerous attempt at exposing inept generals, Zia's assassination conspiracy, and homosexuality within a culture that asserts censorship and stifles freedom of speech and expression. In Our Lady of Alice Bhatti, Hanif gives the sentiments of the Christian minority in Pakistan a breathable chimney to account for the discrimination and aloofness in which they have burned for decades. Skillful use of satire has allowed many writers to break the ice with the audience and narrate to them a history of systematic exploitation of values, morals, and religions for parish politics. Mohsin Hamid's *Moth Smoke* addresses the cultures at war as nouveau-riche, orthodox elites, and shabby criminals fight for dominance – an underlying story of espionage, sex, drugs, easy money, and power. Hamid penetrates the geographical boundaries in *The Reluctant Fundamentalist* to recount racism, nationalism, American imperialism, identity crisis, and Islamic radicalism in the post-9/11 United States, which have time and again pruned human rights.

Jamil Ahmad's *The Wandering Falcon* is a cultural hitchhike across Pakistan, into the nooks and crannies of the remote tribal areas, all the way to the Afghan border. Ahmad gives a positive narrative to the rather misinterpreted, ostracized, and geopolitically demonized Federally Administered Tribal Areas. Besieged by politicized intentions, conspiracies, drone attacks, and disputes, these remote areas get their due recognition through Ahmad's literary vagabonding into the respectable, intriguing, and human-friendly culture of these areas, opulent with values fundamentally distinct from the cities. Daniyal Mueenuddin's *In Other Rooms, Other Wonders* is a collection of short stories in which the power-play of class and culture as the perpetrators of economic inequality leading to the gap between the poor and the rich has been explained. *Season of the Rainbirds* by Nadeem Aslam speculates high culture and low culture through the discrepancy in the type of art associated with either of the two cultures and the consequent class difference. There is an accountability long overdue where poverty and hunger have been up against the exorbitant, luxurious lifestyle of the elites, the posh. Nadeem Aslam's *The Blind Man's Garden* explores the rebellion of the modern female liberal, who has to make a choice between her individuality and society's notion of a woman, by representing Naheed as a round character, solidifying under the strenuous expectations and deteriorating circumstances in post-9/11 Afghanistan and Pakistan.

Khalid Muhammad's *Agency Rules* is a commentary on Pakistani politics and military operations that encourages readers to question the local news, the headlines, and the media as the country sustains violence, especially after the Afghan war. Salman Rushdie's *Midnight's Children* encompasses themes of British colonialism and imperialism, gender-based discrimination, and

pluralistic religious context, which allow us to develop stronger imagery of Pakistan then and now. Moni Mohsin's social satire *Duty Free* allows a deeper probing into the high society of Lahore, corrupted by vices spoken in audible disappointment. Zulfikar Ghose's autobiography *Confessions of a Native Alien* gives representation to all those individuals who underwent an identity crisis after Partition due to the communal conflicts in India and Pakistan. It resulted in a native alien identity, putting in exile all those who did not conform to the ideal patriotic standards bound by geography and culture. Mohsin Hamid's article *In The 21st Century, We Are All Migrants* allows a creative reimagining of our identity as Pakistanis to better understand Partition as a means to achieve social security. This is important to understand why the conflicts that raged hostility between Hindus and Muslims were, in retrospect, attempts to seek a better, equal livelihood. Hamid views migration as a survival tool employed to tackle "environmental stresses and physical dangers and the small-mindedness of" the Hindu community that threatened Muslim national life and liberty. The grave contentions between India and Pakistan should be seen as an inevitable outgrowth; the co-existence of two dynamically different communities was impossible. The painful Partition was the only viable solution to fully practice our lives as Pakistanis, a necessary evil or perhaps a blessing in disguise.

Ghose advocates the account of the 'native alien' who deliberately chooses a multicultural identity in order to secure affinity with all related cultures. He spent his childhood in Sialkot, Pakistan, and then lived in Bombay, India, before shifting to England due to the intolerance towards his Muslim identity in a Hindu-majority area. The painstaking separations from both Pakistan and India have led him to simultaneously have all but keep none. Culture is not geographical property. Anglophone writers like Ghose are just as Pakistani as those based in Pakistan. Being physically away from Pakistan does not mean that people living outside its periphery do not have any emotional connection or right to belongingness/identity. Diasporic Pakistani writers who chose to pursue their lives abroad tend to face criticism for not being Pakistani enough in their works. They are expected to limit themselves to a crude Pakistani identity within the concrete walls of geography, pure and faithful to one. Kamila Shamsie expresses how she consumes the landscape of Karachi, an intimacy recorded in her consciousness that plays when the medium English language frames her Pakistani narrative. It makes one think that there is a plethora of sub-identities under this "Pakistani" identity – one may be a minority in language, religion, culture, status, etc. – which are always evolving under personal and ancestral influences. Mohsin Hamid's article "In the land of the pure, no one is pure enough" reinforces a similar concept.

Ghose mentions an identity crisis where he can neither call himself an Indian nor a Pakistani, as picking either side would be a betrayal to the other. However, this penetration into dual boundaries

based on his circumstances allows him to rightfully deny the common insistence upon the significance of ‘a sense of place’. The shift towards multiculturalism and trans- geographical pan-geography validates the Anglophone Pakistani writers who have since long faced a bias towards their work based on their geographical disproportion. The palpable yearning of writers in the form of their works goes unaccountable to register their fondness towards Pakistan. He refers to the “sharp pull of those invisible strings” when he stayed in Bombay while working as a cricket correspondent for The Observer, which is unfair to his individuality. The overwhelming, questionable nativity chokes him whenever he is in Bombay or Lahore, regardless of his roots in both places. When he says that he is a native everywhere and everywhere an alien, he seems to advocate for all those delineated identities with blurred boundaries.

The status of Internally Displaced Persons (IDPs) from Swat, Balochistan, and Waziristan, Afghan refugees, the Mahajirs in Karachi, and those who move from one city of Pakistan to the other, from one town to another within the same city and from rural to urban areas can be understood through the narrative of multiculturalism. All of these people want the bare minimum: an identity, sustenance, and a life. Yet, despite their unfavorable circumstances, there is a general distrust and unacceptance towards them. Ghose and Hamid allow us to use our privilege as proclaimed Pakistanis to understand variety within identities, flexibilities in representation, and acceptance as a necessary tool for communal palpability that multicultural people so often crave.

I have regretfully left out many other established prose writers whose writings command one to listen, rethink, reevaluate, and reform. Yet there are numerous with budding enthusiasm, brimming with potential to take up the challenge of reshaping prose writing in Pakistan. In an interview of Atif Aslam with Sameena Peerzada, the cosmopolitan singer remarks how, in this country, one must die to be a legend. I believe it is a crime to rob our prose writers of the cachet and majesty they deserve because it discourages the culture of political and societal storytelling for an autonomous opinion on a system that has repeatedly failed us. It is unsettling how our education system is so occidental that the English curriculum involves English or American writers – Anglophone Pakistani literature has no rendition, almost as if completely irrelevant. Yet, the purpose of my discussion was to establish that English writers, too, have grounded themselves in fundamentally Pakistan-oriented themes. To deny them a niche in our lives is to banish ideologies centered around nation-building, social and political rectification, and collective reformation.

Linguistic Imperialism and English Departments: A Clear [Team Up/Tear Down]

By Sana Raheel

Burger noun

1. "meat or other food made into a round, fairly flat shape, fried and usually eaten between two halves of a bread roll" (source: Oxford Dictionary)
2. "Wannabe angraiz with extreme gora complex" (source: anz3e on Reddit)

Burger. You hear the signifier; you picture the signified. Based on your field of experience, you either pictured a snack or a snob. The story behind how the word 'burger' came to signify an American food and a social group in Pakistan is fascinating, and it involves the legendary Mr. Burger single-handedly introducing a new cuisine in Pakistan and defeating the fast-food giants who claimed that Pakistan was not ready for foreign food. Mr. Burger's customers hold the unique honour of causing a semantic expansion of the word 'burger,' as that was the term comedian Umer Shareef used to mock a specific social class's accents and mannerisms. The cultural impact of Shareef's two-minute segment is undeniable: even today, users like anz3e on Reddit insult the burgers and call them victims of a 'gora complex.'

This persecution and ridicule are not new. From the very beginning, those of us who are fluent in English have faced unnecessarily mean comments. This meanness does not stem from our Pakistani brethren alone: Ngũgĩ wa Thiong'o, a Kenyan writer, academic, and critic, has written extensively on colonization to speak against us. In *Decolonizing the Mind*, wa Thiong'o argues that using the colonizer's language helped dominate the minds of the colonized; so, they maintain, in a postcolonial reality, the use of the imperial language should be limited, and the use of regional languages should be promoted. Wa Thiong'o's hate for our culture does not end here: he comments particularly on the role of English and the English departments in his essay *On the Abolition of the English Department* and contends that English departments enforce the primacy of the English language and English culture. After some paragraphs, wa Thiong'o concludes their argument by calling for the abolition of English Departments in Africa and replacing them with a Department of African Languages and Literatures. Well. Dictionaries should be edited, and the definition of 'wrong' should simply be 'Ngũgĩ wa Thiong'o' because English departments are actually tearing down the very foundation linguistic imperialism rests upon.

Firstly, no burger wants to enforce the primacy of the English language, especially at the cost of local languages. If everyone adopted the English language, an important social distinction that contributes to Pakistan's cultural diversity would disappear. Secondly, wa Thiong'o wants to remove

English from the very fabric of Pakistani society – or the society of any former colony – to revert to a 'purer' pre-colonial form of an area's culture. This might lead to the prescription or sanitization of a culture, which can target persecuted non-dominant minorities (like us). Thirdly, when discussing the role of English departments, I believe that a distinction should be drawn between studying the English language and English literature. English language is a compulsory subject in Pakistani schools. In my experience as an English lecturer, many from the English department are against teaching English. We certainly don't want to enforce the English language on them; that would mean that we are teaming up with linguistic imperialism! So, we encourage our students to buy guidebooks and memorize answers from them. After all, if they cannot be independent users of the English language, the English language will not replace their regional language. Some rightfully argue that making English a compulsory subject is problematic. That is a systemic issue, which can only be resolved by government structures and education departments. But rest assured, our educationists foreground that they are doing their best to combat the issue by telling students of English that improving language skills is not an easy feat. With great pride, I can tell you that only five students are enrolled in my English Elective-Part II class, and of these five, only two are semi-regular attendees.

In today's day and time, I do not believe that English departments can be blamed for linguistic imperialism. The idea that English is the language of success does not originate from English departments: it is taught at schools and reinforced by parents, media, and soft and hard power structures in society. English departments do not participate in this repulsive discourse. The casual remarks that a student's weak language skills reveal their weak cognitive skills are casually intended and have no real effect. In addition to promoting the use of guidebooks (a selfless move to help publishing houses in these trying times) and telling students that they are incapable of improvement, Pakistani English literature programs at B.A. level and above cover postcolonial theory in Literary Theory courses. If culture teaches people that knowing English makes the speaker a superior being, then awareness of colonization and post-colonialism can counter that idea. In other words, teaching postcolonial theory can create space in social circles to challenge the idea that fluency in English is important, or that it signifies innate intelligence in the speaker. Perhaps wa Thiong'o will be happy to hear that. Similarly, linguistics courses – often taught in conjunction with literature courses – introduce learners to the structure of language and emphasize the fact that all languages (verbal and nonverbal) evolve according to their social and geographical environment. Learners of linguistics are taught that different languages possess different semantic, phonetic, syntactic, and morphological features, but all languages are complex, and no language has any objective superiority over the other. Again, these courses from English departments can push against the dominant class's idea that a person fluent in

Urdu is inferior to a person fluent in English. However, some universities felt that students were interpreting this information in the wrong way; therefore, to pre-emptively prepare for its 150th year of existence, the Department of English at GCU stopped offering linguistics courses to its B.A. (Hons.) students.

English Departments are, perhaps, doing the most to fight against linguistic imperialism. Unfortunately, the dominant class has started a smear campaign against English departments, and we now face unwarranted criticism. After Edward Saeed's *Orientalism* gave form to the experiences of the colonized, English Departments radicalized and introduced postcolonial critics and local writers to eradicate the aftereffects of colonization. The Department of English at GCU Lahore has also tried to play its parts in this decolonization and radicalization by offering similar courses to B.A. (Hons.) students. Despite this hard labour, English lecturers everywhere have no space to make harmless jokes. Once, an English Lecturer exemplified their superior intellect by saying that they were an 'English' lecturer, not an 'Urdu' lecturer. This innocent remark was not indicative of their ideas; after all, their degrees and research signify their real beliefs. However, intolerance reigns supreme and the light remark was challenged by other faculty members until the English lecturer was pressurized into apologizing and retracting their joke. Such is society. Despite the English department's relentless endeavours to topple linguistic imperialism, critics miss the forest of our efforts for the trees of our jokes. Honestly, at this point, anyone accusing English departments of teaming up with linguistic imperialism should check their eyes – an enthusiastic teardown is taking place, and the dust might be impairing their vision.

The Trajectory of Academic Desire

By Mustafa Bilal

I made a list of all my losses. MBBS was out of the question. My sister saw our neighbor's house lit with gold hangings in her dream. I still refused to do it. For English, she saw nothing - only darkness. I still wanted to do it. My father had hope soaked in blood. He inherited his career from his uncle, and I was to inherit it from my own. I was to do a B.A. from Edwardes College, an M.A. from Quaid-e-Azam University in Islamabad, and attempt CSS to redeem myself. My father said, “He can alchemize gold out of anything he puts his hand to, provided that he works hard for it.” Today, I have two medals for my eyes, but I can only see darkness.

At Edwardes College, I flourished and gave. I had dreams and desires. I was pulled two ways constantly - the freedom of cut-throat analysis and the guilt pulling me to do MBBS. Each year, I would tell myself it was too late until I made sure that it was too late. In the two years that I spent at Edwardes College, I spread myself thin with theater, books, events, book clubs, etc. I learned how to destroy a story by dissecting it, how to break a poem into possibilities and speculations, and how to stop writing when you dive into the sea without thinking it through. I do not care now. When I look back, I remember the good teachers, the heavy influence of Psychoanalysis amongst the English ones, the smell of jasmine during spring near the staffroom, the football I sucked at, my friend who had visual complications, which I was not very kind to, the drama during the drama production, etcetera. It’s all a collage of memories. I remember myself as someone who was lost but very eager. I was filled with wonder, a state I would learn to cherish only when I had lost it. Sometimes, I think fondly of it all - the naivety, the innocence, the ambition, and the audacity of it all.

I went to Government College University, Lahore, for an M.A. The trajectory charted for me was slowly breaking apart by desire. I have never been more lost in a place than I was at GCU during my M.A., especially the first and second semesters. I slowly built the ground under my feet because I was drowning at a rate where it was becoming very difficult for me to save myself. In the last two semesters, I gave my life away to two societies as President and also took the Dramatics Society theatre workshops. I was making up for lost time. GCU carries a heavy weight of brilliance that I was unprepared for. It swept me away, made me humble, and made me know the difference between what I am capable of and what I am not. The teachers were good, and the courses were fine. Yet, there was always something missing. I broke under GCU's expectations, and GCU broke under mine. It was a delusional and cruel back-and-forth I played in my head, and I knew I had to get away from this place.

The first semester at FCCU was perhaps one of the most healing times of my time in Lahore. I was thrown into the world of Fulbright Scholars, and the courses were very interesting. I made good

friends. The class was brilliant - each student was comfortable in their own individuality. I came into my own. I was once again sure that academia was what I wanted. I had so many interesting research ideas. It was a limitless world where I had all the tools to explore my potential. The disintegration was slow. It started when the very kind and respected Head of Department died due to COVID. Then, one of his friends left because the place had become too heavy with absence. Gradually, the other teachers started to leave for one reason and another until only a few were left. Something left me as well, as if their leaving had something to do with my own. Gone was my passion for ideas; gone was my freedom to explore spaces around me and get out of the text; gone was any desire to be subversive. My pending thesis, an overly complicated mess of conflicting ideas, has been the last straw. I stand alone in darkness as the world passes me by, and with each moment, I am hammered to the spot ever further, ever tighter.

I play this little game with myself quite often where I ask myself, “What would I have been if I was not what I am?” I have come to a very interesting and peaceful conclusion – not very different from what I am now. People think they would make different choices if they had to live life again. In my opinion, people think very highly of themselves when they say that. We would make the same choices no matter how many times we are given the chance to live this life again. What stays in the bone stays in the bone. I do not know what the future holds for me, nor do I have any expectations from it. All I would want for now is something that can sustain me for a bit longer before I collapse. My sister, now a doctor, diagnosed me with a condition that can only bring ennui and stagnancy - perhaps a symptom of the long years of burnout. I feel my father’s eyes watching me helplessly. There is nothing I can do. There is no end in sight in the footsteps of failure and humiliation. All I have is my feet with which I run and a few breaths saved for the last round.

Monologue of Despair and Hope

By Noor Rehman

How most of us are lost? Is it youth that drives us delirious or is it the destiny of being an adult human? How many questions we have and how many answers deceive us? Why do we desire that 'something uncertain' which we misconstrue in different forms… sometimes in claims of love, other times in high aspirations… and still other times in pain and misery itself? What is "it" that we lack? Could we ever find 'it'? How difficult are the problems and how tedious to assume patience? How brutal the times are and how sensitive our souls?

Is it all a farce that we keep trying to glorify or a tragedy that we decorate with romantic colours or a limitation for which we blame the world? Is it language itself that cheats on us or books and saints where we look for prescriptions? Is it fear that count our ways or death itself steers our boats? How cruel we become sometimes to ourselves when we fail to fulfil the demands time make on us? How we prick our own thoughts and let blood freeze in our limbs because we didn't perform as highly as we were expected to? In sheer anger, we pull catapults against our own eyes and suffer with a vicious grin while telling ourselves that we deserve the pain several folds more.

All of us, who were not born perfect and genius, who have engendered cracks and fears across years, who have strangled their own precious moments, do not we carry within ourselves the scarecrows which propagate all fearful winds through our souls? Aren't we confused by the never-ending mishaps which threaten our composure every hour? Do not we carry grotesque paintings of our own mutilated emotions within our hearts as if horror alone could have mothered us? No matter where the fault lies, suffer we must and alone as if we were damned by the infernal lord himself?

Isn't it dread that we breathe and exhale for it alone keeps alive within us the whole carnival of despair in full swing? Do not we resemble a young child who is lost within a decrepit old house and turns into a monster as mousy fears and steel-made loneliness feed it? How far we stand from the warm understanding hand who, deluded itself, pretends that it can rescue us from the mess we have turned ourselves into? Though benumbed and sentimental we might be and responsible we must appear for others, this havoc revels within us and yet no one knows that our blinkered eyes fail to see?

All these claims of care and bindings in which blood relations trap us, how suffocating they become for we tremble at the menacing silence and corruption enacting brutality within us? Appearances, names, achievements, and activities: the whole living world seems a mockery which some clever trickster plays to infuriate us further? How futile becomes advices and help because the so -called survival instinct deceives us while we play blind man's bluff with suicidal thoughts and self-

hatred? One wonders and questions often, who gave us this burning gift of guilt which appears like nails out of ground every path we try to run away on?

Parents with their exaggerated love, which often becomes our weakness when we venture in new directions and not strength (who will make them understand), and they expect us to obey their whims only? Society which has annals of morals chosen arbitrarily and quite rootless in their authenticity? What is bleak in this whole drama is the awareness that nobody can understand us, not even the quacks who read few books on psychology, and nobody can save us, no matter how much love they send in bundles through the threshold?

Pathetic we are because we hunger after self-pity while knowing no cure can come from its impotent potions. Isn't it past which abducts us as its favourite victims? Few traumas, some horrendous memories, pain inflicted by close relations and us locked together like a rabbit within a cage of jackals? And there comes those who tell us we are lazy and narcissistic? Could one walk with red bricks in one's bag? And after bearing all violence with cold eyes when pain becomes a habitual beverage which one gulps down everyday in confusion, there comes on the gate a knocking question. Who am I?

The pervert with fantasies which breach all confines of refined culture? The victim who suffers diligently as if it is a paid clerk in the whole traumatic enterprise? The child which yells and cries while we put our hands on its month to hide vulnerability? The dying homosapien who wilts due to the incessant blows of self-created suffering? The hollow masked body which engages with the world like a wax statue bought in a fair? Or the amalgam of all these? Perhaps, all.

How else could we say again and again that we are living hells ourselves for that's the extreme of misery imaginable to our tender hearts? What will happen for years have passed but we wander through the same wilderness which grows within us perpetually? Would it last forever until our death?

Would we continue to hate everybody except the few forever? What about the building where we are confined while all the doors are locked from outside? Can we forgive ourselves? Can we forgive ourselves our past, our traumas, and regrets? Can we forgive ourselves without any reason and stop looking at ourselves through borrowed eyes? Can we convince ourselves that we do not deserve this suffocating pain anymore? Can we stop hating ourselves for the bodies which we didn't ask for? Can we refuse to kick ourselves for the faces which were given to us arbitrarily? Do we have the courage to live with our imperfections going with us everywhere?

How it would be when we wouldn’t suffer? Will we be given another life another turns to live as we would have wished to? Or this is the only one we are failing ourselves in? What plans will we make when violence will not rage within us? Is love possible too? Or dreams to do and create something, at least? Can loneliness become a sanctuary for practicing some craft and learning about

the world rather than a garbage dump where so far, we have counted our broken limbs and hopes only? Can we grow out like trees with green leaves out of the sewer like hearts that time has cursed us into and may be learn to walk and fly too?

Do we have the capacity to say NO to the pain which is inflicted upon us and resist it because we do not deserve it without any reason? Is it possible that we choose a meaningful work for ourselves and pursue it rather than comply with the demands of those who will never bear our pain for us? Can we fashion ourselves ethics which satisfy us rather than serve the morality of those who are frightened of our learning to walk freely? Can we claim ourselves with all the wormy regrets and fears and uphold ourselves without trying to be ideal children? Can we stop poking our own eyes with burning match-sticks and come out with all raw feelings to stand alone and strong and confront all our loss? Is it possible that everything will start to matter, even our pain too and the tiny moments which we forgot to see passing through us? Can we learn to live in this gruesome world because we have nothing to lose?

To Whom it May Concern

By Zahhāk

“Heavy is the head that wears the crown.” Thankfully, that head is not mine, for I despise that statement anyway (are the grapes sour? perhaps a little), but what I am in the position to do is let a few heads roll. Now, that's more my pace. A little beheading has never hurt anybody; although many French aristocrats of the distant past might disagree with my ignorant remarks, I frankly couldn't care less (guess whose head is still attached firmly to their shoulders? exactly). Now, before I stray too far from the matter at hand, and what a grave matter it is indeed, let me guide my little miscreant thoughts back to the increasingly worrying state of some individuals I have encountered during my brief yet ultimately ‘enlightening’ stay at the grand Government College University.

This edition of the Ravi is, as you might've noticed, a little different from the innumerable editions that precede it. The theme is to celebrate 150 years of the University's most prestigious, talented, and decorated English department, and as someone who belongs to that very center of excellence, I feel it is my civil duty to disillusion and subsequently enlighten my fellow Ravians to any misconceptions they might hold about our young, argumentative and abrasive literary minds. I am nothing if not kind.

Under the watch of the gothic lady, neighboring the amphitheater, home to the dramatics (literary and literally), across the pleasantly disruptive chirping of the birds and humans in Shahab, lies the English department in all its glory. It holds within its gargoyle-lacking walls more than a century of history. The halls where minds like Patras, Iqbal (yeah, that old fellow), Bano, and Faiz once roamed are now infested with Dostoyevsky wannabes, neo-Nazi holocaust deniers (“It was all a ploy!”), Nietzsche fans who make him their entire personality while having the comprehension skills of a toddler reciting religious dogma, people who grossly misuse psychological terminology and deem every miniscule interaction a ‘trauma response’ (oh, for heaven’s sake), Marxists who praise *The Communist Manifesto* religiously (did I mention they belong to the established upper class? must've skipped my feeble mind), intellectual bullies who will engage in every debate ever only to satisfy their inner lonely and unloved child, aspiring poets who take after Rupi Kaur and then there are those, like yours truly, who delude themselves into thinking that they're above it all. Was that too much? Let’s take it down a few notches (I say, as I cleverly set up to turn it up a few).

Remember the Dostoyevsky wannabes I mentioned? Well, I feel particularly strongly about them, so let’s open that can of ‘chervil’ first. To start off, there is one infesting every classroom, and, if you're lucky enough, several. Beware, they read “The Brothers Karamazov” in ninth grade, and now

everyone shall suffer the consequences. Now, they mustn't be confused with the actual Dostoyevsky fans who are gentle in their ways despite the world being a hell hole, are undergoing the entire myriad of human emotions every second of their existence so deeply that it's positively concerning, have a skewed relationship with their family and seek comfort in platonic friendships, have hysterics that are usually limited to projecting every bit of kindness they've been denied onto the ones they love and are benchmarked as having strong opinions about capital punishment. Those mild fellows usually ponder about the meaning of existence. But the Dostoyevsky wannabes? 'They' take it a step further and make their existence a cause for pondering. "How can such a specimen exist?" one is forced to wonder. You ask them who they are, and lo and behold! Before your very eyes, they will transform into a lanky lad from late 1800s Russia who smokes two packs of cigarettes for breakfast and will start spouting, with unfocused eyes, a quote from *Underground Man* that has been perfectly engraved in their memories practically since they were still dependent on that pesky umbilical cord. How do they do it? It's very astonishing. They carry messenger bags that hold their huge egos comfortably and only engage in slightly controversial, 'intellectual' dialogue (make it a point to remember, dear reader, it's always a 'dialogue or debate' with them, never a conversation). These fellows run solely on black and white aesthetically pleasing yet depressing quotes from French cinema and cheap cigarettes.

Then there are those hot on their trails, recognized far and wide as "The Instigators". These philosophical fellows love to play the devil's advocate and possess great talent for the needless art of method acting with the way they channel the actual devil to possess their mortal vessel and argue just for the sake of argument. Talking to them is like boarding a bus on the highway to hell because you're going nowhere good. There are two types of instigators to watch out for. The first and relatively milder version will stir up trouble indirectly and never show their true intentions; they usually couldn't care less for what they're advocating as far as they can frustrate a group of more than ten people simultaneously to the point of blood lust (I have a conspiracy theory that every time a person sighs when they open their mouth, they grow stronger). The second kind, though, they are truly a menace to society.

These "demony v maskirovka" (as our good friend Anton Chekhov might've said) go by the law that states "misery loves company". They have an undeniable knack for wreaking havoc and, like an unwanted, unneeded, and certainly unappreciated storm, they take away what little will to live you possess (or if you're into the business of watching the drama unfold like I am, they're a good source of entertainment). They're experts at the art of enraging innocent bystanders; the word is that if you listen to them talk for more than five minutes, Virgil himself will escort you to the fifth circle of hell.

Finally, to join the race for “Who can be the most insufferable person in existence?” There are pseudo-intellectuals aplenty. They believe that they possess the elixir of knowledge and that wisdom bows before them. Who would win, a professor with twenty-six years of experience in a field or a guy who ‘read it in a book once?’ Now, I'm not saying that age, rank, and profession amount to one's knowledge (I’ve read approximately thirteen books of English grammar in my meager years, and I would think twice before telling you what a participle was) because that's definitely not how it works, but these so-called intellectuals who crave validation from their like-minded male peers and talk down on feminist literature in class and call for ‘freedom of speech’ every time one of their absolutely dense theories is shot down surely believe that every word they say is gold. When asked for a quote, they will say something that came to them in a dream (some claim Iqbal came to them in a dream, true story!), and to top it all off, what they lack in substance, they make up for in sheer egotistical narcissism.

The trials and tribulations of a student in the English department are many. If you are somehow one of the few reasonably sane people who float around its halls, you're sure to have witnessed one other-worldly being (a Ravian from another department) act absolutely vindictive towards you due to the simple fact that you chose to pursue literature in the language of the colonizers (I’m about forty percent sure that's not the reason). I conducted mass research that included my listening in on conversations undetected, which led me to come to the conclusion that while one reason for this vindication might be the internalized insecurity many Pakistanis hold towards the English language, for good reason as it's somehow come to be known as synonymous to being educated, the other more niche issue that occurs is a mass miscommunication (see what I did there?) Our fellow Ravians consider us to be snobs (rethinking whether that would be classed as miscommunication, because well, there is some truth to it) because of the way some of us, – ahem, the pseudo-intellectuals, ahem, – behave. What they don't see is that most of us are as lost as they are when one of the intellectuals opens their mouth and goes on a tirade about why classics written by white men are the best form of literature.

Heading into a literature class thinking you're well-read is the grossest miscalculation one can make. You read, but there will always be someone who knows more. You speak, but there are others who are better at articulating their thoughts. You write, but one of your classmates is Albert Camus wearing a trench coat going “Je serai toujours meilleur,” (I'll always be better) and you wonder if you're in the wrong place and whether this was a good decision. Then you try to tell yourself that being among these talented people must mean you have some sort of substance, yes? Next thing you know, one of those extremely talented people is on the verge of a breakdown because of an assignment,

and you think to yourself, “Well. I'm done for.” But! You're not. Every semester, you bounce back, and there's another six (realistically, more like three) months of torture worse than Tartarus could produce.

But, at the end of the day, it’s all fun, and you keep saying, “Well, it can't be worse than almost everything I’ve already been through,” and that's how you know they have you, and now you’re about to grow irrevocably attached to the hallways and corridors. Sitting in Shahab revising for a midterm, after which you’re about to need a heavy dosage of sugar, doesn't seem daunting anymore, and you're laughing over something humorous a professor said, and you see your seniors put flowers in each other’s hair like the world isn’t crashing and burning around them (when in reality it’s not only crashing and burning but also taking you down with it). You will remember that the English department has a hundred and fifty years of history, and while you are here at a time when the greats have all been laid to rest, you are here being a part of history in your own way.

My Very own *School of Resentment*

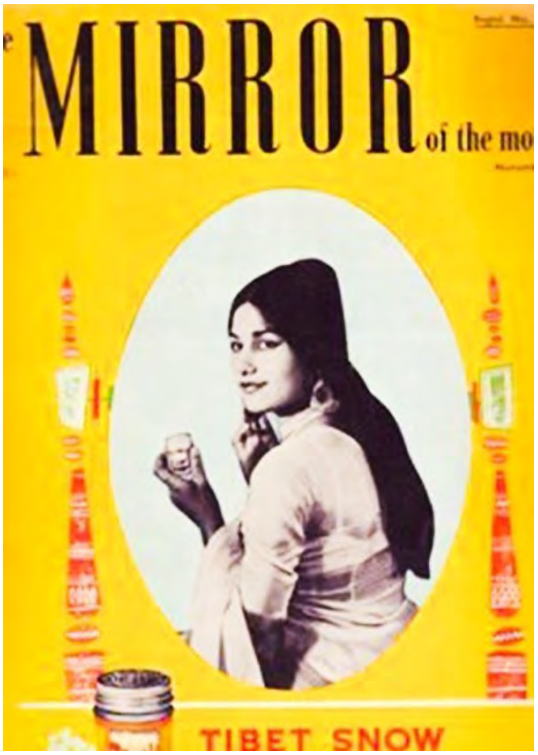
By Eleen Raja

Foam of the sea, dissolving, remarking!
(Youth O my youth, whither art thou flown?)
For have they winged the white birds of my dreaming,
Ceaselessly ageing and endlessly new,
Tenderness and warmth of the sea to the shore!
The white birds have perished and dead is their singing:
To me they will come back no more. (Shahid Suhrawardy)

"Foam of the Sea" is one of the many enthralling contributions of Professor Hasan Shahid Suhrawardy, a Bengali diplomat and one of the founding Fathers of Pakistan. As a personal favourite, it evokes an unconscious retention contrary to the fleeting nature of sea foam; a detail I find extraordinary. Suhrawardy's further collections *Faded Leaves* (1910) and *Essays in Verse* (1937) are among the earliest works of Indian-English poetry. However, his efforts remain anonymous to a majority of our youth, even as a reference for tracing the origin of English literature in Pakistan. Initially, I planned to centre this article on the future of our local English departments but in the midst of pursuing that intention, I identified a strain of deficiencies within our present pedagogues. I was inclined to shift toward a historical revaluation. The orthodox prioritisation of the Western canon in our national literary curriculum is appalling. Shakespearean and Chaucerian inclusions within the syllabi of our semesters often overwhelm the average student. With varying translations, the linguistic complexities of comprehending Old/Middle English, and the redundancy of numerous texts including antisemitic, racist, or misogynist overtones, we continue to revel in the past. These are only a few of the obvious yet equally perplexing issues as the ones hidden between the lines, quite literally if we consider the deeper subtexts unreached within the works of the former pioneers. Contemporarily, their utility has become scarce; an appraisal of Chaucer's *'feminist'* portrayals bears no fruit of progress for any student writer of the present era. His radical description of the Prioress, who had uncovered the secret to a content life by preferring the companionship of dogs over people, is elusive to any actual feminist reform. While exploring the Western canon is significant for any individual pursuing English literature, so is recognising the contributions from their literary locale in the field of literature.

Apart from the defining works of Shahid Suhrawardy, literary figures such as Zaib-un-Nissa Hamidullah remain overshadowed by our fixation on a canon that is isolated from our culture and literary atmosphere. As the first female columnist and editor of the discontinued publication, the *Mirror* (1951-1972), she pioneered the introduction of English into Pakistani Literature and

journalism. The ‘Mirror’ or the ‘Mirror of the Month’ was Pakistan's first social graphic, and her vision was to ‘foster feelings of unity and amity throughout the country.’ Her contributions to the field of journalism are indispensable.



One name that has been especially vital to the progress of literary criticism and the preservation of a Western canon has been the American critic Harold Bloom. His name is imperative to the discussion at hand and is often overlooked as solely a prolific critic. The titular term of a “school of resentment" is taken from one of his more controversial works, *The Western Canon: The Books and School of the Ages*. He describes it as a ‘sort of mélange of latest-model feminists, Lacanians that whole semiotic cackle, latest-model pseudo-Marxists, so-called New Historicists’ birthed within younger generations who disregard the aesthetics of Literature. Labelling himself as a true aesthete, Bloom harbours his own resentment against those who impose a social or political responsibility upon literature as a compulsion. A few months back, I would have agreed with his perspective, considering the number of redundant pieces that have presented themselves in the last decade under the pretension of a ‘bestseller.’ An overwhelming number of publications have centred themselves on appearing representative of the author's personal and political beliefs. While the craft of Literature encourages personal expression, and I for one am not here to condone this tradition, it is highly counterproductive to value narratives that serve solely as a testimony of one's ethics. Previously, I appreciated the logical apprehensions within Bloom’s critique of those advocating for the reformation of the Western canon

by including works on the grounds of a literary moral absolutism. However, when you delve into his exploration of the aesthetic values within the Western canon, you tend to disagree with the American critic. He believes in an “Agon” (conflict) amid the eccentricities of individualism and orthodox conventions as a defining trait of those worthy of the Western canon. His interpretation can be exemplified through the works of Joyce, Dante, and Whitman; figures that have authentically engaged in a retaliation against the norms of their literary eras. Dante's *Inferno* incorporated his reinvention of the biblical concept of 'Contrapasso' which centres on a balance between the severity of a sin and the allocated punishment. The Italian poet's notion of divine retribution rests on God's view of the offense rather than the suffering of those adversely affected. Similarly, Whitman's commitment to creating a new American epic was not deterred by the critics of his time denoting his work as perversely sensual. Their craft thrives on courage, which to Bloom particularly is quite crucial for a writer to be considered for the canon. Even if we proceed from a Bloomian foundation of inclusion, the allocation of South Asian texts to the canon remains somewhat of a pipedream.

Bloom's polemic comprehension of the aesthetics of the canon is highly exclusive to any author residing outside an anglophonic social context. Even his consideration for the Portuguese modernist Fernando Pessoa is redundant to the writer's ingenious contributions as he reduces him to a mere ‘Whitman reincarnation.’ The scholars enrolled within Bloom's opposing school of resentment recognize these faults within the critic's attempts at preserving a canon, namely the Western canon. Their affiliation does not ostracize the significance of these aesthetic values amplified by Bloom himself. The rivalry between the two does not necessarily call for a victor to emerge but rather an intensive assessment of their claims about the canon. Bloom's preferential aesthetics and the school's multicultural inclusion both assert a need for renewal. The canon is not simply a superior literary entity; it is a comprehensive guide for future generations of writers, translators, journalists, etc. If a massive population of students cannot resonate with the canon and the syllabi it administers, it stunts their progression within the field. The constant ingestion of a Western canon can be stifling for those engaging in a literary environment far different from what is dominantly represented. Writers can become numb to the sublimity of their surroundings and they begin to foster resentment toward their identity, community, and the institution they find themselves in. This can also be regarded as one of the underlying reasons for our avid interest in the genre of the diaspora. Authors such as Intizar Husain, Mohsin Hamid, Kamila Shamsie, and Mohammad Hanif have been shortlisted for the Man Booker for their works pertaining to the diasporic. Our fluency in the navigation of a bifurcated identity and a sense of inherent inferiority should be alarming. This discomfort is more than often attributed to post-colonial South Asian writers in a way that shackles them to this sentiment. Any genre beyond it

seems like an overreach of any Asian writer's capacities. Bapsi Sidhwa and Jamil Ahmad are two South Asian writers whose works are included in our national curriculum. However, these contributions appear as a critique of our society in a manner that controversially interrogates rural values and ideologies. This is not to say that their narratives are absurdly inauthentic or unbeneficial; however, considering the dominant backgrounds of a student body, I have noticed how their perspectives have been comprehended as an unnecessarily harsh commentary upon tribal life. Many students hail from territories similar to the one described by Sidhwa and there has been an overwhelming discourse on her depiction of such populations as brutally carnal. I took the liberty of mentioning this detail because it was one of the rare occurrences where even the silent minority of the class participated after two years of dormancy. An expansion of the Western canon is mandatory to accommodate these sentiments which are vital to the overall craft of Literature. The canon tends to focus on figures and works that have transcended the test of time as the sole justification for their inclusion. This is highly insufficient considering the inevitable generational transmutations of all forms of Literature not simply English.

I had the opportunity to attend an international writing workshop held at the University of Iowa in July of 2022. One thing about those workshops that had me amazed yet gutted was the presence of a supportive community for amateur writers; a feature crucial to those who are beginning their literary journey in a more professional setting. The basic act of reading each other's contributions and offering constructive criticism for the betterment of the work and the writer is a practice that is not particularly popular. Instead, we have overpriced workshops from senior writers that a student in their early years cannot afford. For many, change is endurance rather than a universal instinct. The current challenges of comprehension and inclusivity often come with hereditary pressures. An environment in which you are constantly confronted by a past foreign to you and a present that disregards your individuality can be academically suffocating. We are advised to mimic the legacies of past figures without acknowledging our contemporaries. Most writers within our current literary locale are quite ironically ridiculed as profit mongers and elite Shakespeareans when attempting to establish themselves in a way that comes off as an orientalist ploy.

I believe every South Asian centre for English literature houses its own school of resentment within the student body. As you traverse through this special edition that commemorates 150 years of the English department, you'll find both established authors and the average student harbouring resentment against an imperial canon and the illusion of an elite readership that allows it to persist. If I were to comment upon the future with the assumption that things will remain as they are then this bleak assessment goes against my own ideals. I believe we can do better and I know many respected

individuals within our faculty who are doing so. A student in the company of such individuals can feel understood, recognized, and even proud in their abilities. The future doesn't have to be bright for us, it has to be considerate. A passion for literature is not simply for intellectual Platonists and catharsis addicts; it's for those who believe making a difference for even one unknown reader is enough. I'd like to leave all those readers who have stayed with me till now with a short poem by one of my favourite American poets, a poem titled “Why Bother?”; a prophetic poem for writers:

Because right now, there is someone
Out there with
a wound in the exact shape
of your words.
(Sean Thomas Dougherty from The Second O of Sorrow.)

Dispelling the Death Instinct through Poetry

By Ayesha Khalid

Years ago, Mathew Arnold said, “More and more mankind will discover that we have to turn to poetry to interpret life for us, to console us, to sustain us.” It stands true because whenever larger structures operating in the background of the world have failed humanity, poetry has tried to make sense of the world. This is also true for the young poets of Pakistan, who experienced a major war almost 18 years after the inception of the country. In commemoration of the 150th anniversary of the Department of English Language and Literature, I decided to write an essay aiming to explore how poetry published in *The Ravi* from 1964 to 1966 deals with the concept of death, a theme prevalent in post-modern writings. It's important to understand that Freud recorded that humans are guided by instincts, and these instincts are divided into two categories: life instincts and death instincts. The application of Freud's idea shows that those people who encountered the nation-wide instability, i.e., war and death around them, tried to overcome their death instinct, i.e., Thanatos, a psychological need for aggression, destruction, and a return to an inorganic condition, by writing poetry that is heavily laced with the imagery, theme, and manifestation of death. Here, poetry helps people sustain themselves because it provides them with an avenue to release or discharge their negative emotions.

According to Duane Schultz, “Instincts are the basic elements of the personality, the motivating forces that drive behavior and determine its direction. Instincts are a form of energy – transformed physiological energy – that connects the needs of the body with the wishes of the mind.”[*] Freud claims that people may follow different paths to fulfill their needs, where their energy could be diverted to serve as substitutes for actual objects. He also says that this divergence is crucial in creating a person’s personality.[†] Moreover, in an atmosphere where death and destruction are all around, people have an unconscious wish to die. It is because the destructive or death instincts act as the opposite of the life instincts. A look at biology shows the simple point that all living things degrade and die, returning to their initial inanimate state. So, according to Freud, individuals have an irrational desire to pass away. The aggressive drive, which he defines as the desire to die directed towards things other than oneself, is one of the death instincts. We are compelled to kill, conquer, and destroy by the aggressive urge. The aforementioned argument, thus, can be elaborated in this sense that the poetry published from 1964 to 1966 in *The Ravi* shows the underlying death instinct of the poets and their coping mechanism, i.e., to write poetry and dispel those negative thoughts.

---

[*] Schultz, Duane P., and Sydney Ellen Schultz. Theories of Personality. 11th ed., Cengage Learning Asia Pte Ltd, 2017.
[†] See Theories of Personality by D. P. Schultz and S. E. Schultz, page no. 43

First of all, for instance, the poem *The Tolling of the Bell* by J. H. Zuberi opens with the line, "Lost in the artifice of decaying cells," which very simply points to the fact that life in itself is a binary, where decaying cells refer to the idea that those cells responsible for the proper functioning of the human body will eventually decay resulting in the death of a human being. This means that when one is born, every day is a day near death. Freud refers to death as the 'conclusion of individual development.' Moreover, the speaker also talks about his burial, where the only attendant is 'death.' He says, "But there is no illustration of gathering shadows / A cloud of sadness and overshadowing of Death / Covering life as Earth the seed." This insinuates even when people are not attending anyone's funeral and burial, death will always be there. In addition to this, the speaker is conscious of the fact that death is the ultimate end that no one can escape, as he says, "There is no renewal here; the bell is tolling." Thus, this poem serves as a means of understanding life and coming to terms with the reality of death.

Secondly, in his essay *Beyond the Pleasure Principle*, Freud states:

> "Dreams are a form of wish-fulfillment. Fear-based dreams do not constitute such an exception, as I have repeatedly and exhaustively demonstrated, and nor do 'punishment dreams,' for these simply replace the forbidden wish-fulfillment with the punishment appropriate to it and thus represent the wish-fulfillment of the individual's guilty conscience in its reaction to the drive that has been rejected."[*]

This shows that dreams are often translations of the conscious and subconscious wishes of human beings. As death or the death instinct is considered a wish, it is probable that people dream about death or ways to die or life after death. For instance, the poem *The Patient* by Irshad Ullah Khan follows a dream sequence[†] of a patient who hears a knock on his door and is first taken to hell, followed by him visiting the church with his beloved and then finally waking up to realize that he has been in the hospital for over a year. Both these places show the wishes he wants to be fulfilled. The life instinct in him propels him towards the dream where he is renewing his vows to his beloved[‡], and the opposite force, i.e., the death instinct, takes him to hell by "the red demons" who "lead him towards a huge circle." Moreover, sleeping is also referred to as losing oneself to darkness, which means that the dark wishes take over man once he falls asleep as the speaker says, "Sleep, sleep, sleep, is what I need, / He incants, till darkness descends / And seizes his awakened mind." Therefore, as Freud extrapolates, "the purpose and intention of life are answered in dualistic terms" through the help of

[*] Freud, Sigmund, et al. Beyond the Pleasure Principle and Other Writings. Penguin Books, 2003.
[†] "A man walking in a dream,"
[‡] "To solemnize their vows,"

poetry, which becomes the medium of exploring one's deep wishes through the dream sequence and coming to terms with one's deep-rooted desires and fears.

Thirdly, human behavior is solely driven by instincts; the energy that results from this behavior can be used for a multitude of purposes. This explains the variety of human behavior that we observe. Freud feels that all of the interests, preferences, and behaviors humans exhibit as adults are simply energy shifts away from the original objects that provided for their primal needs.* This means that our instincts play an important role in our actions. In addition to this, the death drive manifests as a destructive desire targeted toward the outside world and other living things, albeit this is most likely only partially true. The poem *Viet Nam* by Ishrat Ahmed Insari explores this destructive drive against the external world, which manifests itself in the war waged by a few megalomaniacs. The poetic persona takes a walk and records the destruction caused by war against Nature and human beings. He "gazes at the innocence harmed" and sees how an infant is crying for his/her mother, but the dead mother is unable to help her child and provide sustenance to him/her. The speaker asks himself if he should stick around to see this devastation caused by the Vietnam War, which at that time had been going on for over ten years. He says, "Must I wait and see? / Thees ees treachree keeling hotl / these ees daylight murda homicide" where he refers to the idea that the infant will die without his/her mother and this is not a natural death but a murder, however, in this way, Vietnam has now become "Nature's grave" where everyone is dying one way or the other. In the end, he carries on his journey walking alone, showing that everyone is on their own in this war-ridden world.

To conclude, in the words of Freud, "The emergence of life is, therefore, the cause of both of the urge to carry on living and, simultaneously, of the urge for death, while life itself is a battle and constant compromise between these two urges." There is an underlying death instinct in humans, which is dispelled through poetry. Poetry allows the emotions to flow in such a way that negative emotions are discharged; they find meaning and restore the life instincts in humans.

* See Theories of Personality by D. P. Schultz and S. E. Schultz, page no. 43

Social Mobility in the Context of the English Language in Pakistan

By Ahmed Malik

I have had the privilege of attending a private school from an early age. Here the environment provided me with a firm grasp of the English Language in compliance with the standard of the Cambridge International Examination (where even Islamiat and Pakistan Studies are taught in English whereas in public schools they are taught mostly in Urdu) which allowed me to pass my IGCSE exams with flying colours. Afterwards, due to the COVID-19 pandemic, I was unable to pursue A Levels for higher education and was forced to do FSc (pre-med) at a local college. Here I found the curriculum significantly easier, primarily, due to the simple English medium of instruction and the extensive knowledge IGCSE had instilled in me. Many of my classmates, who lacked my proficiency struggled considerably and were reduced to hours of rote memorisation of the course material without any concrete understanding of the concepts being taught. This was the first prominent instance that highlighted for me the privilege of private education, especially concerning fluency in English. The fluency which, nurtured by private schooling, has opened uncountable doors including allowing me to land a spot in Pakistan's most prestigious English department.

There exists, in the mind of the public, a persistent notion that knowing English is the cornerstone of civility and progress (it is not, this thought is a remnant of colonial conditioning). This has resulted in the view that those who know it are automatically somehow 'superior' and 'intellectually grounded.' There is no doubt that the English language is a key proponent to attaining any fruitful and prosperous station in today's world; whether that station be financial in the form of the job opportunities afforded to you or social in the form of the kind of people you attain access to. This, certainly, is a by-product of the British colonial legacy that looms over developing nations like a bogeyman. The human mind is trained for survival and survival in a British colony meant learning the white man's language; those who did, not only survive but thrived once they ascertained the approval of their masters.

Like several nations once a member of the British colonies, Pakistan is a multicultural and ethno-linguistically diverse country. Linguistic tensions have been a problem for the country since its inception. Jinnah was a strong advocate for declaring Urdu the national language of Pakistan – on the assertion that it is a 'lingua franca' (despite the fact that it was only spoken by a small fraction of the population) – thus effectively relegating all the other languages spoken to the status of provincial languages. This created contentions not only between various ethnicities who felt overshadowed but also contributed to the creation of Bangladesh in 1971. English was touted here, as a compromise candidate for the official language of Pakistan and subsequently, under leaders such as Ayub Khan

and Benazir Bhutto, as the language of instruction in all elite schools. For the common folk, Urdu-medium schools and institutions were created to provide the elite and affluent middle class with an underclass of clerks, munshis, and literate servants.[*]

With an increasing insistence on the use of English as the standard for communication, life for the everyday Pakistani is growing increasingly difficult as the world to navigate; from TV programs to road signs, despite the fact that barely 2% of the population[†] speaks the language. This hyper-fixation of English is also progressively pushing the vast population outside the scope of legislative procedures and decisions as they are unable to understand what is being said and how it affects them. This allows for the small minority of speakers who do understand the language to protect their interests at the cost of wider public detriment.

Introducing English as a compulsory subject, and as a medium of instruction at lower levels in more linguistically uniform and isolated areas is only a band-aid solution as it does not make up for the lack of quality teachers and only serves as a greater hindrance to the education of children. The parents of the aforementioned children are not able to provide accurate guidance with regard to the studied course material due to a lack of understanding of what is being said. They more likely would have been able to otherwise had the medium of instruction been in their local language. Furthermore, this insistence on English as the end all be all of progress negates the fact that a considerable treasure trove of knowledge is being lost as people scramble to assimilate English as their first language at the cost of their native one.

Government College University is home to one of the oldest and most prestigious English departments in Pakistan, with nearly a thousand students vying for the thirty open merit seats. The strict admissions criteria are a prime example of the premise that being proficient in English is the only way to secure one's future. The grooming and refinement afforded by the faculty and environment have produced a long list of notable alumni in affluent posts and positions that would perhaps be harder to gain otherwise. Government College's standard for its student body especially that of the English Department has produced some of British India's and later Pakistan's brightest and most influential minds in literature and the arts. It has played an important role in nurturing the talents and skills of esteemed poets and writers such as Iqbal, Faiz, Wasif Ali Wasif, Ashfaq Ahmed, Bano Qudsia, and Safdar Mir. Additionally, the English department has produced the likes of entertainment

[*] Khalique, Harris. The Urdu-English Relationship and Its Impact on Pakistan's Social Development. Annual of Urdu Studies vol. 22 (2007)

[†] Khalique, Harris. The Urdu-English Relationship and Its Impact on Pakistan's Social Development. Annual of Urdu Studies vol. 22 (2007)

personalities such as Usman Pirzada, Zia Mohyeddin, Chetan Anand and his brother Dev Anand as well as scholars Javed Ahmed Ghamidi and Arfa Zahra.

The institute also served as a launch pad for notable names in bureaucracy, the military and the judiciary. Fazl-i-Hussain (who subsequently has a reading room in his name), Qudrat Ullah Shahab (after whom Shahab Garden was named), and Patras Bukhari (who served as Principal of GC, after whom Bukhari Auditorium was named) are venerated alumni of the university who later went on to become either politicians or bureaucrats; the first was an important politician and a founding member of Punjab's Unionist Party during the British Raj, the second served as Principal Secretary to three heads of states[*] and the third represented Pakistan in the UN. It catered to military personalities like Major Shabbir Sharif, Nishaan-e- Haider recipient, and his younger brother Raheel Sharif, former COAS and notable Chief Justices Javed Iqbal, Saqib Nisar and Naseem Hassan Shah.

As it stands, English acts as the dividing line between the elite bureaucracy of the nation from the everyday layman. It is the barrier to entry that determines who you know and what you do.

Given the state of today's world, I would be hard-pressed to look down upon those with disgust who choose to give a preference to English as a means of trying to carve out a better life for themselves and their loved ones. It is not a personal and moral failing to choose to discard one's native tongues and shed one's culture to survive; rather the failing of the system and those bent on upholding it for their benefit to create such an environment where people feel compelled to do so in the first place.

[*] "Shahabnama, its creator and critics". Dawn (newspaper). 20 July 2009.

"Certain books that are most necessary for all men to know"

By Sukhan Saghir

The role of translation in teaching literature is very significant. One personality who would wholeheartedly endorse this statement would've been Alfred the Great of England, that is, if he was alive. King Alfred has been dead for over a thousand years but his legacy lives on in every person endeavoring to translate a literary text from one language to another in order to make it accessible to people unfamiliar with the former language. According to Aristotle, the purpose of literature was to teach human beings to become more virtuous. He believed that the teaching of literature best accomplished this aim rather than the teaching of other subjects because literature shows rather than tells what virtue is. When Alfred the Great became King of England in 871 A.D., he found his country and countrymen in a dismal state of deterioration. The Danish raids beginning two decades prior to his becoming king had specifically attacked monasteries. The Vikings burnt manuscripts and eliminated men of education resulting in a shortage of those who could understand Greek and Latin. It was with the goal of revival and rejuvenation that King Alfred launched an effort to translate from Latin into English "certain books that are most necessary for all men to know."

King Alfred and his team of scholars translated books like Gregory the Great's *The Pastoral Care*, *The Consolation of Philosophy* by Boethius, *Universal History and Geography* by Orosius and others that he believed contained such invaluable knowledge as should be acquired by all his countrymen. His campaign did not only help to disseminate the wisdom such works contained but it also raised the status of the English Language such that it gradually became the most important language in the world. Most of the "certain books that are necessary for all men to know" in the 21st century are not written in Latin but in English Language. Be it the revolutionary texts of literary thinkers such as Thomas Hobbes, David Hume and Francis Bacon or the captivating novels of Joseph Conrad, D.H. Lawrence and George Orwell, it is safe to say that the world's knowledge is enshrined in the English language. Therefore, not only for moralizing but for the nurturing, civilizing, and enlightenment of our youth, the translation of works of English literature to regional languages is most important.

The extraordinary ability of literature to shape our perceptions, enrich our experience of being a human being, acquaint us with different modes of thought, introduce us to alien times, cultures and peoples is beyond definition. In the words of C.S. Lewis, "Literature adds to reality, it does not simply describe it. It enriches the necessary competencies that daily life requires and provides; and in this respect, it irrigates the deserts that our lives have become." Literature teaches as well as entertains. One of the very first specimens of the English Novel, *The History of the Adventures of Joseph Andrews*

by Henry Fielding, teaches us the importance of honesty, modesty and charity yet not a single page passes without the reader finding something to laugh about. Such is the beauty of literature and such beauty should not be kept reserved for only those who were fortunate enough to be born in a land that speaks the language of the respected author.

Translation of a literary text is an art which is almost as challenging as the creation of a literary text. It is said that a translator has to read as well as a critic and write as well as a writer. It is also said by many that translations can never completely do justice to the original works and that much is 'lost in translation.' However, there is more to a literary text than language, figures of speech and literary devices. It is the universal discussion of the human experience that at its deepest level transcends all sociocultural barriers and unites all human beings. Unregulated ambition in Shakespeare's Macbeth, love and revenge in Emily Bronte's *Wuthering Heights*, debates on creation, identity and the consequences of scientific discovery in Mary Shelley's *Frankenstein*, racial prejudice and social justice in Harper Lee's *To Kill a Mockingbird* are themes that are not dependent on the constraints of a language. They are themes that are prevalent in the lives of all humans and therefore are important to be studied and understood by us all. The importance of translating works of English Literature is not only that it would help those who are completely unfamiliar to the language but even those who know English but not as a first language.

This is not at all to argue the supremacy of English Literature over literature in other languages like French Literature, Russian Literature, Urdu Literature, Portuguese Literature etc. The works of Tolstoy, Gustave Flaubert and Maupassant are said by many to be far better than any produced in the English Language. Avid readers of Urdu literature would rank Saadat Hassan Manto, Qurat ul Ain Haider and Mukhtar Masood above any English writer. However, it cannot be denied that English language is prevailing in the modern globalized world and the fact remains that the English Language has the largest body of literature. Even many writers who don't have English as their first language prefer to produce literature in English. Just like the medieval English people learnt from literature written in other languages and with that knowledge raised the status of their language to its present esteem, it is the need of the hour to translate works of English Literature into various regional languages to better study and learn from them.

Art's Unyielding Influence: A Philosophical Critique of Societal Constraints

By Zeeshan Haider

To commence with the lofty words of Friedrich Nietzsche, as he says, "Art raises its head where creeds relax." Art, in radical societies, is unduly censored and repudiated as it extinguishes the fire of antipathy among the masses and promotes tolerance, peace, mercy, pity, and love – directly conflicting with the objectives of such societies.

Art, however, has been shackled in various epochs by contemporary monarchs, fascists, religious priests, and clerics; Puritans, the Catholic faith, Orthodox beliefs, Nazism, and Ziaism have all prompted the culture of book-burning – banning books and confiscating paintings that were deemed immoral and unholy. Although art is independent and must be so, it cannot be shackled, for it always aspires to dance in the streets and bring joy to children, youth, old men, and women. Art never harms; instead, it brings a smile to the anguished girl whose friend recently abandoned her in a tyrannical autumn and to the widow whose husband was lynched to death by a fanatical mob due to false allegations. As Vincent van Gogh says, "Art is to console those who are broken by life."

Art, in any form, whether its poetry, music, painting, etc., tames the innate animalistic nature of human beings and humanizes them. However, an individual lacking aesthetic and romantic sensibilities is a monster – romantically crippled. A person with the ability to appreciate art never grows old. It keeps a person's mind and soul youthful, enabling them to endure almost anything, regardless of circumstances.

Poetry, in a state of melancholy, on a conspicuous starry night, might carry a person on its view-less wings from the pathetic world into phantasmagoria. Music, on the other hand, is one of the most intensely sublime and effective remedies for loneliness when one is so tense that it harmonizes one's entire soul and alleviates one's anguish – psychologically or emotionally. Paintings serve as vessels for suppressed emotions, especially in deprived people living in radical and extremist societies where artists are often deemed obscene, and art is considered forbidden and thus abandoned. In a nutshell, any society that abandons art forsakes beauty, love, nature, peace, mercy, and pity and consequently becomes sick – an ailment that is indeed incurable. I unequivocally claim, without any compunction, that art is not merely a mirror held up to society but a chisel through which to shape it. History tells us that people have transitioned from the Dark Ages into the Age of Enlightenment, and this enlightenment has been achieved through what? Through art. So, art can never be shackled and concealed; it is unshunnable. The more you shun it, the more it shall raise its head and proudly walk the streets.

Concluding it again with the lofty words of Friedrich Nietzsche, he says, “There is one thing one has to have either a soul that is cheerful by nature or a soul that is made cheerful by work, love, art, and knowledge.”

Lahore

by Zeest

Love is a strange emotion for me. An otherworldly sensation that is supposed to set tangled knots into places. Those who do describe it as the sweetest sensation. For me, sweet, when loaded, turns sour. The sweet love for my mother grew into a tangy, protective one. The safest love of my father that, over time, proved the hardest. Love for the chair that I sit in. Love the girl I hate the most. The love of hating her. The love over whispers, the love of gifts. Love by olive, love by the date. They all speak their existence and seep into my bones with all their warmth. Then, the love that puzzles me the most, the love that shushes me... the love for cities.

Moss climbs tall figurines, and mud houses freefall onto cement paved side streets. Sulphonated greens mourn, and I plug my ears at night. Sharp notes pierce my skin, leaving oily marks and hyperpigmentation. “Your water is dirty,” I hear, and before I can ponder over the statement, a metal figure zooms into sight, mounted over a bridge one could only consider jumping from. Another flight leaves the city, and the havoc it wreaks is louder than the voice of a wrinkled brown grandfather who sings ‘here’ in trembling rhythms.

My city is an inn; travellers, seekers, addicts, lovers… it’s a home for all. When the sun refuses to go down and, birds snuggle back into their nest and its red bricks stand tall and lonely, I go out for a stroll. Waiting for my bus, kicking stones, I think about how my city serves as a temporary abode, how people who left for a season will swarm back in, and how someday, I, too, will leave. How, at 1 am, I will sit on the cold airport tiles of a foreign land and wait for a flight that calls home. How streets will stay the same, how metal will infest my haven. I wonder if Nasir's ‘udaasi’ would abandon it and find a new wall to sleep on. If ‘Insha Ji’ would ever return, anyone would ever narrate the horrors of commuting to and from ‘Samanabad’ ever again in literature (they have already stopped doing that).

But I am sure whatever goes on, ever-broke students will always head to the overpriced Pak Tea House, and in some gilded nostalgia, and they would end up believing they’ve somehow saved some money. Someone will always shut their eyes and run through pigeons on the upper Mall and have their moment of the day (pigeons can’t leave, they will stay). I might become Earth soon, but through the eyes of a sari-clad middle-aged lady, I would stop to look at a girl who laughs so much she sits down on the sidewalk of the university road. Structures change, but the air of my city is always heavy with secrets, bearing decades of murky history. It has seen changing faces, altering voices, enchanting dreams, and exhilarating ideas…one thing it knows is that the pattern stays the same! I think of everything and yet understand nothing.

The salty-sweet hateful love for this place I was born in. Love with skeptical eyes and flushed cheeks. The love for crescent gaze and a polluted skyline. A breath of stinky sewage and a choke of the fragrant Charaghan. Careful passes across weakened walls and the photographed beauty of olden streets. I love the parts that don't fit the aesthetics of flashes and glitter. I relish the highways; they are so dodgy, they ache. Same old ways, same dusty demeanor. I love the passion of my dislike for it. My grit and will. My pluck, and my despise. I hate the way I can't stop loving it. It's nothing when I am not attentive enough, but then I end up hating myself for loving it so much that I become it.

However toxic, I think with all its flaws and odors and slovenly slurs, I am in love... with Lahore.

Musings on Bilingualism: Navigating the Urdu-English Tightrope

By Aleezah Ahmed Malik

The relationship between a language and its speaker is an incredibly weighty and personal experience. Language is intrinsically linked with heritage, identity, customs, and values passed down from generation to generation. Words are, in essence, all we have to convey a crude expression of the vast depths of our emotions, thoughts, and feelings in an attempt to form a connection. I often find myself pondering over some variation of the question, "Why does the sound of all words sound heavier in my native tongue?" "Why did I seek refuge in a foreign language instead of training my tongue to bear the heaviness of my own?" "Will there ever exist full acceptance for my existence beyond the realm of my immediate family?" To say in short, my relationship and my thoughts about the English language are complicated.

This essay-type memoir is a collection of musings I've had over the last nineteen years of my life in which I attempt to vocalize, trace the origins of, and examine the impact English has had on my life (to varying success). I am aware that a lot of this will come across as unrelatable and a touch privileged to the average reader and maybe it is, but it is my life and the things I've gone through. What better time to talk about English than in time for the 150th anniversary of the Department of English Language and Literature of Government College University where I study? This will not be an essay full of entertaining and witty self- deprecation; it was never my strong suit. The only thing I am good at is sincerity so this is an honest-to-God look at what I feel.

As a person, I try to be expressive but the truth of the matter is that I am simply not a person whose strong suit is language. My Urdu is barely passable, my Punjabi even less so, English is the only thing I am good at (hence why I am doing this degree and no other) and it's not even because of anything I did directly. My parents lack the fluency in English that my siblings and I possess and often times struggle to understand us when we try to express ourselves. My middle siblings especially are more oriented towards English and find it even harder than I do to talk in Urdu because they lack the vocabulary and never really showed an interest in learning it because we live in a world where knowing English is more beneficial to you than knowing your native tongue.

They say a person's personality shifts based on the language they speak, and that there are subtle variations in their attitude and approach to different subjects. Applied to myself, I find truth in that assertion. In my mind, my personality is fragmented into two parts; an outer person that exists for 'other people' in Urdu and an inner person that exists for 'myself' in English. Urdu Aleezah is more outgoing, self-sacrificial, and focused on serving the needs of others before her own. English Aleezah is more inward-focused; there is a greater emphasis on the self. I often feel like most of my interests

and hobbies only exist in English and not in Urdu. However, there is a mildly amusing fact that I only read full-length novels in English, refusing to touch short stories in English and only read short stories in Urdu, refusing to touch full-length works.

In Urdu, I am a shallow imitation of the person I am inside. I cannot get myself to talk about the things that hold weight or significance to me; maybe I lack the words to do so or maybe talking about those things in a way more people will understand is a kind of vulnerability, I am not ready to express. Things feel heavier when said in your mother tongue; the phrase 'I love you,' which I say to my loved ones and friends at least ten times a day, seems awkward and clunkier to say in Urdu than in English. As an exercise once, I tried figuring out how I would say it in Urdu and in every which way I could come up with in my limited vocabulary, it never quite seemed to fit; "Mujhy tum say piyar hay" is the most literal translation I thought of but it didn't seem quite right, so I turned to other words, 'ishq, ulfat, muhabat,' the closest I came to translating what I meant was 'shafqat' but nothing still seemed 'just right' as goldilocks put it.

To talk in English feels freeing in a way that is not achievable in Urdu. Urdu Aleezah is grounded in reality while English Aleezah is more of an abstraction. It feels easier to talk about hard topics and heavy emotions in English because there is a kind of curtain that prevents me from fully owning my feelings and comfort that the person receiving the admission will not fully understand.

Moreover, since I'm more proficient in English than Urdu, I find myself thinking in English and then translating the thought out loud into Urdu which produces some awkward, slightly offensive, and occasionally funny "lost in translation" moments every so often that I keep a list of every iconic funny moment resulting from such occasions my siblings and I have. There is also the fact that I frequently don't know what Urdu words mean but that doesn't stop me from using them anyway, often in the wrong context, which does raise some eyebrows when I say something in a public setting that I often hear repeated at home only to find out "Ah, that was definitely not used in the context I originally thought it was." The most vivid illustration of this, in recent memory, is that while addressing my roommate, I said, "Mere mun ko pakhaane lage howe hein" (because I often hear it said and thought it had something to do with not being able to shut up about a thing) only to have her burst out in hysterical laughter and inform me that the meaning of the word 'pakhaane' is very much not in line with what I was intending for it to mean.

Other displays of the linguistic gap include the fact that I usually start counting in Urdu usually till 25 (40 on a good day) and then get stuck and switch over to English because I wasn't taught to count in Urdu beyond that. I struggle to discern the lyrics of Hindi/Urdu songs because it takes a lot of active effort to pick out the individual words and then figure out their meanings plus, because of

the lack of content accessibility, lyrics are harder to find and I have not yet attempted to learn the Hindi script, Devnagari. There are certain words in both languages for which I do not know the equivalent of in the other; I know the names of most spices and certain vegetables in Urdu only and I did not know the English word for ‘chachundar’ (shrew) until surprisingly later in life. There exists no direct translation for the word ‘ghairat’ in English and my father jokes, “It’s because white people don’t have any to begin with.”

For the sake of a greater perspective, you must understand the framework of my upbringing. In raising my siblings and I, my father was faced with the dilemma of whether he should steer his children towards Hindi media or English media (as there is tragically, a lack of Urdu-centred kids’ media) and in the long run he decided that English would be more beneficial as proficiency in it would afford us better opportunities in life rather than Hindi.

He was right of course; a childhood filled with British and American media allowed my siblings and I to learn to speak English and understand it with the fluency and accent of a native. This concoction of factors led to my performance in English exceeding that of Urdu to the degree that if the average person witnesses my sibling and/or I talking to each other, they assume we came to Pakistan after having lived a while abroad. It gets extremely awkward to explain that my siblings and I have never been outside a 200 km radius of the small town we were born and grew up in, much less lived abroad. This exact situation has happened too many times to count and I’ve accepted that it’ll happen just about every time in every new environment I crop up in. It's my own running gag/inside joke with myself at this point.

Given the narrow specificity of my childhood and the isolated sphere we grew up in, my siblings and I always struggled to relate to our peers. I struggled a lot in making friends at school. It is exacerbated by the fact that when you grow up in a small town, you stick out all the more, as a sore thumb. Kids love to bully and otherize anyone perceived as even slightly different from the pack. I remember my childhood as a long wish to be elsewhere, somewhere I didn’t feel like I was the problem. I spent twelve years of my school life biding my time, promising myself that things would get better for me when I got to go to university in a big city. Faced with a bigger pool of people, surely, I would find someone like me.

My household was not reflective of the typical desi household. The beliefs my parents instilled in us and the values I’ve come to hold because of them in the long run have served me well but I wish I could describe to you how lonely it felt as a child. Like you had two horns growing out of your head for which you were ostracized. Having to hear things like ‘Angrez chale gaye, inhe chorgaye,’ ‘kale

angrez' and 'angrez ki aulaad' is very weird as a kid (there is a special layer of irony given that technically I am a dual national, "Hello I'm a British-Asian actor and I live here and there as well").

There existed a certain detachedness I felt towards the people outside of my household. Picture yourself a kid that nobody wants to play with, sit with, or talk to during your free time while the world goes on; every other kid finds 'their' circle of friends and you have an accurate picture of me from grades 3-12. There is a persistent feeling that because of the language barrier, I missed out on key experiences the rest of my mutuals got to have; like I somehow missed the memo on the basics of socialization because I could never relate to the things other kids talked about. My parents never let me indulge in Bollywood or Pakistani dramas and movies growing up because they were very strict about what they deemed "kid-friendly." This has led to me being severely unaware of my own rich culture and heritage regarding its media and popular figures. There's also the fact that the Urdu curriculum taught in schools is needlessly archaic and only acts as a burden on students instead of inspiring a fondness for their tongue and cultural legacy. I cannot blame anyone if the Urdu curriculum taught from grades 1-12 only inspires resentment and hatred for the language. What practical use does it serve for students to know that Ghalib loves mangoes?

I confess to having been a grave snob in the past regarding my fluency in English in the past. I was something of a 'Grammar Nazi' and looked scornfully down upon those who didn't possess the skill I did. Some of that I attribute to the side effects of going to a private school where a strict 'English only' policy was enforced. Switching to public school unquestionably brought me down from my high horse and in time, with bumps along the road, I've grown past that mentality and accepted that knowing English isn't a sign of someone's intelligence. I've grown more accepting of people's grammatical mistakes because they are positively more fluent in at least two languages (the combination varies by person) at the bare minimum and that's a lot more fluency and knowledge than I possess in any language I know so I need to humble myself. I look towards people who possess fluency and mastery of their language with some degree of awe and seek opportunities to learn something from them when I can.

My university friends find it an endearing quirk that I am not good at Urdu but I admit that I feel very alienated from my own cultural identity. It's like I've so thoroughly colonized myself that I feel like a part of the diaspora without ever having exactly lived the diaspora life. My entire existence is the product of colonialism. I wonder who I would be without it.

Moving to Lahore for university has truly been a blessing. I've met so many wonderful people and found the acceptance that I craved all my life despite my initial apprehensions about my degree; if I would fit in, if I would even like what we had to study, whether in making my passion (books and

literature) my field of study I would grow resentment towards it (hasn't happened yet). The environment and academia I've found at Government College and University, Lahore has only furthered my interest and passion for English literature and pushed me to explore areas of literature beyond my comfort zone. It has encouraged me to examine things in a light I had not previously thought of and given me the courage to seek out experiences I otherwise wouldn't have. The newly introduced World Short Stories course compelled me to dip my toes into the realm of short stories, something I refused to read in English, and exposed me to a variety of cultural approaches to emotions and the art of storytelling. The current course, Research Methodology is challenging me to critically evaluate where my interests lie for a potential thesis and how to do the research that will go on to be vital to my professional life.

I came to the Department of English Literature and Literature only to find it filled with – ironically – people oriented towards Urdu literature. The people I've befriended don't make me feel bad for not knowing, rather they are more than willing to help me learn and grow to love my native language. They sit down and patiently explain the words difficult for me when they recite excerpts from their favourite works of prose and poetry. They go with me to watch plays in Punjabi and sit there and explain the portions of dialogue and plot that I don't understand. I've grown a lot in the last year, my reading and writing need work but I've gained a lot of fluency and vocabulary that I never expected to. I'm grateful to have people who love the arts as much as I do, if not more. For the first time in my life, I've started to view Urdu not as a burden but as a thing of beauty. I find myself wanting to read Urdu books, stories, and poetry, something I never thought would be possible in my school life. I know I came here because of my passion for English literature but I hope to walk out at the end of my degree with a love for Urdu and its literature.

I know that the institute I attend has lost much of its former glory but I am forever grateful to it for giving me a place among its halls. It has accepted my English self and given space for me to explore my Urdu self without shame. If that isn't winning in life, I don't know what is.

What is the Name of Mr. Chips' Doctor?

By Sofia S. Mirza

If you are a student of intermediate or have been a student of intermediate at any time in the last 55 years, you are sure to remember this question, and most of you might even remember the answer. English and Urdu literature, i.e., short stories, poems, dramas, novels, and novellas in English and Urdu language, are a compulsory part of the student syllabi in schools and colleges all across Pakistan. While the distinction between English and Urdu medium schools definitely stands, at any rate, to pass your matriculation and intermediate or equivalent examinations in Pakistan, it is compulsory to study and score well in English and Urdu literature exams. In the case of English medium schools, it is safe to say that by the time a student is ready for admission in an undergraduate degree, he/she has been a student of literature for 12 years. In Pakistan, this 12 years of literary education is directed towards accomplishing a most confounding end: the knowledge of the name of Mr. Chips' doctor, the intelligence of knowing what the favorite fruit of Mirza Ghalib was, and the intimation of Winston Churchill's performance in his Latin paper. Once students become acquainted with such knowledge and consequently utilize it to score well in their intermediate examinations, most of them say goodbye to the world of literature and start their academic journeys in various disciplines. Some choose STEM, while others choose humanities or liberal arts disciplines. Surely, they think, investing one's time in studying medicine, mathematics, sociology, law, or journalism is better than memorizing facts from some fictional character's life or learning the birthdays of writers and poets long dead. If the purpose of teaching literature is to sharpen the students' memories, surely it can be scrapped from the syllabus because isn't memorizing involved in other subjects as well?

It is said that literature gives one a better understanding of human nature and the complexity of the human condition. It explores the internal world of human thought and feelings and thus makes readers less judgmental and more empathetic. Reading literature from around the world helps one learn about different cultures and traditions, and this increases one's tolerance. The strictly academic benefits of literature are that it helps one to think clearly, write clearly, and speak clearly. It increases the critical thinking ability, analytical proficiency, and communication skills of the students. The biggest benefit of all seems to be the fact that reading literature is a joyful, liberating, and educating experience all in one. This is not so in Pakistan. Most students do not prefer to indulge in literature beyond compulsory academic requirements in school or college. Even this, they do quite begrudgingly. The very few of us who are actually inclined towards literature and have chosen to pursue it for our undergrad or postgrad studies know that our love for literature did not arise from reading our school and college syllabi. We were lucky enough to have parents, siblings, or other well-wishers who

showed us the magical power that literature holds of transporting us to another time, another world, another civilization. One look at the English or Urdu board exam paper is enough to tell us that literature is not being taught properly in Pakistan and, therefore, students are not at all benefitting from its study. There are many reasons for this.

In his book *The Pedagogy of the Oppressed*, Paulo Freire explains the 'banking model of education.' Such a method of teaching/learning dehumanizes both the teacher and the student by reducing the former to the role of a depositor and the latter to the role of a passive receptor. Teachers narrate information to the students, who store it in their brains and pour it out at the time of examinations in return for grades. Such a process of education does not involve engagement in any meaningful dialogue or methods of critical thinking. When literature is taught in such a way (and it is apparent from the type of questions in board exams that it is taught in this way), it becomes worthless and futile. Students are not at all exposed to the discourse about the socio-cultural aspects of society, taught about the remarkable way in which the use of language and words can conjure up a whole new world or even an appreciation for what it means to be human and to be alive. After 12 years of education, students do not emerge as empathetic, tolerant, and free-thinking individuals with a command over language and analytical abilities but rather as individuals who consider literature a mere waste of time.

In our Pakistani society, asking a lot of questions and deviating from the established norms is not generally encouraged. This also materializes in our teaching and the subsequent learning methods practiced in our country. Literature cannot be benefitted from, and its nurturing objectives cannot be realized with this conservative approach. Unlike science subjects, which deal with objective facts, the study of literature requires one to look at the same thing from many different perspectives. Thus, it is the duty of the teachers of literature to motivate the students to think outside the box and understand meanings beyond the apparent and surface meaning of the text. Creative writing rather than rote learning should be made the norm, at least in literature subjects. Pakistani students are also discouraged from spending more time in the study of literature because they are told it is not as important as the counter disciplines of science and technology. It is very important to teach them about the true importance of literature and its role in shaping generations after generations of human beings; from the time when poetry used to be oral to the birth of the modern novel and drama, literature has stood the test of time and has played its part in shaping the personalities of many great men and women. It is not at all to be taken lightly and looked down upon if we want the youth of our country to do great things as well.

In the 21st century, at a time when literature not only has to wrestle with the misunderstanding of it but also with the growing popularity of social media, movies, and TV shows, we need to restructure our entire methodology of teaching it. It is more important than ever in this age of constant change to teach our students to find anchor and stability in literature. A Gulf News article says, “In an era of modern media, such as televisions and movies, people are misled into thinking that every question or problem has its quick corrections or solutions. However, the literature confirms the real complexity of human conflict.” Unless we teach it the correct way, the case is similar to not teaching it at all, so it is high time the educators of Pakistan realize the scope of the problem and work towards appropriate pedagogical reforms.

POETRY

ARTWORK BY SUKHAN SAGHIR



Flaking Smoked Fish

By Ilona Yusuf

after grief

i culinary? no, not...

just pleasure
ii

slipcover skin glistening
smoke grey stippled silver peels easy
from flesh segmented firm sweet-salt

and the arc of bone

as it lifts from that peach flesh something so perfect
here curved white scimitar there hair-fine cartilaginous

iii

that

the mind

the mind in stasis

-at last

-moves

I Often Forgive You

By Jasir Shahbaz

I often forgive you.
Not because you deserve it
I know it only encourages
you to disappoint more.

I often forgive you.
Not to make peace with myself
I know regret will keep pinching
till I become bitter.

I often forgive you.
Not as an equalising act.
Each mistake has its own remedy.
Guilt can’t give birth to forgiveness

I often forgive you.
Thinking of times when He forgives.
Infinitely, Unilaterally, Certainly.
I borrow some kindness from Al Rahim.
To lend it tonight to you.

Hagiography

By Abhiram Kuchibhotla

read the vedas, sena gave me pedas
on mine mined mind dawns, I'm a yay god of pawns

cursor clicked with cheering, be that hindoo slit a moslem
if round rock is divine and so is plastic cud-chewing bovine
then almighty not only i, but all that sees my eye

well we err and kill, well we human still
omni are cells and bods, so can gods cut gods?
knowing dadajis abound, with words they us bound –
all potentially lords, wholly nirvana lost

left, knowledge out of sight
ideals corrupted, right?

left right left right left right

Untitled

By Amna Naeem

It is okay to not grieve over people who have left a hole deep enough to be your grave,
where, if you leave flowers for company,
their scent would be snatched away
and they would be eaten away in haste

It is okay to force
yourself to live,
distant from apocalyptic heartbreaks,
unhoused homes and
incense

It is okay to breathe healthy
away from the cold blood of love
and refuse the colour of black and mud
When they ask you to play dead with them

You are the day's honeymoon
what are you doing
in this dark?
Your heart is a hut hidden
deep on an island
that no one can touch
It belongs to you

So it is okay, if you're afraid
to be alone with your thoughts
but you better grab your own hand
and politely say no
to favours undeserving
Tell your mind

you do not pick on
loose change, empty apologies
and tricks anymore

You’re the kind of mess
that comes with a broom
Don’t worry, you have you
So it is okay if you hit
the last few nails in the coffin
and protect yourself
from the death
of your own
sanity

To What Do We Owe [after Kamli by Sarmad Khoosat]

By Mustafa Bilal

miserable fruits do not rot –
their skins peel off before they do
from the sorrow in their eyes
and a paintbrush will not help in easing
the pain of a leaving desire.

what happened to the woman
who chose rain over the sound of a radio,
who chose eyes over the blindness of the word,
who chose fire over water and water over fire
after it had turned her down?

to what do we owe this flesh
that is one with the memory of soil?
to what do we owe this pain of longing
that the rivers carry to the sea,
that the Earth swallows along the way?

scraping the earth, stone, leaves
amidst a sea of green
[the yellow comes later]
water will touch you and make you mad,
the white peacock and the white rabbit
might end up in your belly,
fire will quench your thirst
for love has already left
and you can only create whiteness
in its absence.

[white rabbit with red eyes

do not take you to Wonderlands
white rabbit with red eyes
lead you to the aching body (of longing)
like amaltas flowers falling down]

petal by petal:

[each petal for a word
each word for a petal
each for your presence
each for your absence]

I am forgetting you like memory:
the way water seeps down
the way ceilings fall over people's heads
the way you do not name me yours
the way I crave you for now and then
the way the present will always make me
forget the future
yet arrest me all the more for
this skin, this wall, this mound of flesh and bone –

[it is tough and it wants to break apart]

only water can make you full enough
only water can fill up the hunger inside you
only water can make the body bloat enough [to die]
so you are no longer hungry.

Too Brown; too Foreign

By Khushbakht Imran

When I look in the mirror
I feel too brown to be
Talking in this language.
I stick my tongue out and scrub it hard
To cleanse it of the language
My forefathers were inflicted with
An infection that reigned over us a few moons ago
I scrub my tongue hard enough to make it bleed
In hopes for it to bleed out
The rubies of Urdu and Punjabi
But all it bleeds out is a few bland words
Of a language so foreign
That it never feels like home.
I'm caged in a body that knows no language fully,
Trying to survive with half-words
Never being able to convey myself
I'm left feeling so partial; so incomplete
Like a body made of puzzle pieces that don't connect.

Limestone

By Ilona Yusuf

not the hard compacted fists
of rock formed of fire
high-shined in water
but permeable grain
I’m still not sure why I like it
like it? am fascinated by it
perhaps because it’s formed from life
slow-flattened beneath
the weight of water
mille feuilles that carry
the stamp of bone
liquid congealed
the soft whispers
of life's exhalations
then slices thrown up
sharp-slammed
folds criss-crossing
splitting
in shaley flat fragments
or conglomerations
stones pressed together
honeycombed with nodules
fissures elongations
where water's melted
rock to take its
flowing shape
then settled in hidden
pools channels
and something else too
luminosity beneath light

as if rock's embedded
memory of life 's
lit from within

Baseless Habits

By Huzaifa Zeeshan

I toss my doubts into old dustbins
And I wait till spiders cover them with sad cobwebs
I am born from a grave rather than a woman
I don't fear silence at night, or at funerals
I have no face, no glittering eyes,
I only speak the language of dead leaves

Like rocks on mountains,
I sit silently in darkness
Thinking what tree marriages look like in spring
I form shapes in the mud and
I crush dying butterflies

In autumn, I hide in the flowers
Etched on my bedsheets.
I wrestle with old fears
And I settle disputes in villages where old couples live

In winters, I talk with furniture and old teacups
And I mail depressing quotes to sad widows in Anarkali
While no birds chirp in my chest for days
I draw smiles on quiet pebbles
And I teach musicians how deaf men sing in the rain

Though I hate birds, streetlights, newspapers
Interior monologues,
Children and utensils
I often wander in graveyards,
Across unmarked graves,
And old towns, to find refuge,

Running from my own questions.
Composing my own symphonies
In harmony, with ecstasy.

Quantum Physics

By Noor Khalid

garbed into fabric that reaches his heels
azure flames reflected in mirrors, in window panes, in a dagger's glint,
held by a prince torn down,
strands of long hair from an old life-
snips - snapped, cut down, abandoned.

i was never your only daughter, i was your fifth son.
i am not your son anymore

you run your fingers dripping blue over a brazen white:
they think in a dead man's words, some storyteller of men and their mice
speaks of a boy: unsheathing a sword from stone,
becoming king- reborn through the ages
in legends, in fables, in paint on bedroom walls.

knuckles pry at skin, follicle length away, to pull all apart
and see the beauty, skin-deep, akin to bone

a brute comes out, is put down.
the cord cut discreetly.
not pulling tonight, wears down the noose
tomorrow, who knows? husks and shells drop by,
you ask glass if mothers can be forgiven
glass answers in meticulous keys.

droning in on the poorly covered flesh and bones-
a mess to wrap up these sleeves, these hems- dried
leaves on white, pressed roses between pages torn-
a shirt managed on, blood orange.

scratches against the pine box

the brute, buried alive, still lives.

I am my Mother's First Born

By Ayesha Saqib

In a dream, I find her again.
she's sitting in her library
with a stack of books of poetry
in her lap, lost in a world of her own

I remember a picture I saw
years ago, of her sitting
in her library with her firstborn in her lap
staring blankly at a book in front of her

I sit and stare for
what feels like an eternity.
when she laughs,
I realize I don't recognize that laughter –
how do I not recognize my mother's laughter?
it sounds like hers but louder, brighter
…happier?

She turns the pages of her book
highlighting and writing in the margins
I remember a memory from years ago
when I found an old book in her room
highlighted, with scribbles in the margins

It was still covered, but
in dust, in years, and in dreams
that are doomed to remain in those margins

I muster up the courage to
finally walk up to her.

with my trembling hands, I
reach out to touch her face.
the moment that I do,
I wake up, her sleeping
in a bed next to me

I realize then that
the woman in my dream
and I cannot coexist,
not in the same universe
for I am the reason that she isn't.

Solitude

By Ahmad Tajy

The poetess taught me to say,
“No coward soul is mine.”
The novelist taught me to pray,
“God's will be done;” and resign
My hopes in His design.

Now wherefore stopp'st thou me,
O solitude, with thy glitt'ring eye;
O ancient enemy whom I flee
As if thou wert a luciferin malady
Of whom God made no remedy?

O solitude – haunter of my soul!
I fear as thou shalt soon claim
That thou’rt its part and whole;
That be ye one and the same;
And thou the substance, and it the name.

Rogue Dreams

By Huzaifa Zeeshan

The night sky turns and twists in like an old cloth
And white syllables move out through half open windows

And as the night wind moves through rooftops
Of broken homes,
I hear dreams stepping out of the shadows
Moving through corridors
Over cracking leaves,
In deathly silence

I see them slipping through their chains,
These familiar ghosts,
With stealth and subtleness
Murmuring forgotten things in my ear.

They’re in my mind
Picking through old locks,
Tearing down old walls,
Making room for themselves.
I see them
Climbing rooftops to catch wild doves
Trapping them into locked cages,
Singing their lonely children to sleep.

I see them
Gathering ripe fruits off of trees.
Dropping them to the ground
So that parrots can’t eat them.

They sit on branches

Shooting down wandering owls
With unheard curses.
These un-hungry predators.

With
The night sky passing swiftly before me
I aim my bow for these rogue misfits.
Firing at them with the arrows
I sew in abyss

But as dawn approaches
These dreams and specters begin to fade away,
And I’m left with infant memories
To whom I sing unfinished lullabies.

Forgotten forget-me-nots

By Aima Arif

Forgotten forget-me-nots
In your blue vintage jeans

A memory, a lifetime;
Or so it seems.

Our hearts were full
And our gazes always seemed to linger.
Eye contacts ignored, made, then broken.
We were having the time of our lives.

Now we're back again,
Back to where we once started.
I wonder how if none of us had ever moved
We never would've crossed paths,
I wouldn't have been here today.

Would we have met in a distant land?
Where we no longer recognised our own selves
but were eager to make new friends?
Where the shadows of everyone we ever loved
Lingered like the faint scent of the flowers I used to put in your hair
I wonder if you would've smiled at me the same
If I would've been able to know, that in another lifetime/reality/universe we were kindred spirits.

We lived our lives; you and I,
no matter how small, they weren't insignificant.
But now I sit with these withered flowers that made me a promise.

A promise of remembrance,

in exchange of love, care
and a safe abode.

Dear flower, I have not forgotten you,
And all these moments I previously talked about?
I have yet to live them.

The Cold Wilder of Nights

By Zunnoorain Fatima

In the cold wilder of night, when the dark fell
As the silver gleamed over and casted its spell
Long I stood by the shoreline among the riches of shell
Till an apparition carved out from the darkest of dark, wherein that dwell

Whitest of the white draped over him and with a thud he spoke
Came forward, asked my soul, asked me, and drew on my face a stroke
Silence ranged out, as crisp as ice brittle timbre leaves fell to the ground
Quietest of the dark therein, I stood amidst my thumps and pounds

It was him again, another chance for me to beg and speak
Have you ever met yourself? He asked in a loud squeak
Met myself? Met me? O Lord, nay, not me again
Not me to the heaven and hell again, I don’t wanna die in pain

A penknife in his pocket that he held taut in his hands
With a violent grip, he gripped my bod, and slit my throat in a single band
Having breathed my last, in pool of blood and my eyes so wide
Assured the white figure of light, “You’ll meet yourself there, you silly pride!”

Losing Ligament

By Sajjar Shabbir

I miss the summers we spent at your shabby little warehouse;
metallic jibes, telepathic symphonies, insufficient food,
yet a hand to hold, and a friend to gloat.
I remember the lack of spray-paints for our underdone graffiti, but
we could always misuse charcoal or your rough color pencils –
half broken from the middle, half eaten at edges (by me)
art meant everything and we seldom had time to feel anguish at
deprivations of the world.
you wore the black socks that had holes,
enough to invoke trypophobia,
we hid in dirty laundry baskets that smelled like oil mixed with
sweat and aftertaste of base notes of perfume;
musk of mellowed vanillas and frozen blood.
nights were always overbearing with empty, gurgling stomachs
and eyes too moist to see
but at least I had a heart to trust,
now albums of our laughter are covered in dust.
I miss the childhood in your eyes that has crawled away from us,
and you are still waiting to embrace it at the threshold of all the
integrity you have lost,
but the waiting is turning you into a monster.

flowers have withered in your heart,
leaves are floating in your guts,
you are so eerily silent and hurting me;
the roots of our intertwined branches are contorted with sprays of
cyanide
our understanding has skidded away by the friction of pulleys,
carrying the weight of your guilt and regrets.

the clefts in the walls hold echoes of our salty adolescence,
adulthood
and running away from innocence.
the tiny breaks at edges, the smoothed surfaces at curves;
display our affection that has been rendered by aversion.
I see frustration leaking from the pores
and aggression smoothing over the doors,
whispers of hatred mask every nook with a dilute layer and my
heart is so very poor,
to include your absent warmth
and forlorn, desperate tears.

you are becoming all the dark shades of green,
the treachery, the deceit, the betrayal, all laced in your steps;
steps that you are taking away from me
heart that is beating astray,
mislaid love that is frolicking at bay,
the evenings are soaked with poverty of your presence
blood running through my veins has turned gray.
winters now come and leave unwelcomed, unattended
you are calling them yours
i am loathing and falling, waiting for you on my kitchen floor
i am growing old, i am turning one-eighty degrees around to meet
the change,
yet every snow fall takes me back to summers at your home;
dirty, tin-cased yet our to unfold
but you have burnt the warehouse and painted the ruins with
colors of your growth, and I am still,
seeking the ashes of my childhood in those halls

Nature on the Cross

By Ahmad Tajy

The firmament above infused
With God's unfaltering glory
Is the only proof left (if confused)
That Earth be the locus of my story.

I live not in fear of Poseidon's rage,
Nor in the giants' barbaric age –
I live instead in a Greek utopia,
And am thus victim to mania –

For subject not to Godly nature
But to modern man's architecture –
I am bound by systems of man's making
To never see the beauty of God's making.

I am slave to man and toil for Adam's child
Whose mighty despotism must I bear;
And survive his concrete forest wild,
And pray for my soul to God so dear.
Now upon this whited sepulchre dusk is nigh
As marked only by the darkening sky.
As for God's Nature and the rest,
Consummatum est.

Untitled

By Aima Arif

Poets always seem to leave a bitter aftertaste in your mouth,
and poems – to your heart.
one after the other;
there's blood on your hands every time.

Your shadow refuses to give you up
and you're always reluctant to gaze upon it, you fail.

The mild sun burns away your skin and your heart begs you to let go
but there you stand;
bleeding again, yet holding on.

Holding on to the shreds of their love
they had no other place to put.

You let them taint every moment that you live, and every color that you breathe.
They give you grays and you turn them into the mildest of blues, and incandescent light;
you burn yourself to give out that last ray.

They'll never admit they asked for it. you'll never admit they needed to.
And you'll burn and burn and burn and nobody would stop a moment to collect your ashes.

And ashes? They fall slowly,
they don't make a sound,
they're gone before you know it,
but they linger till the edge of dawn
where the twilight enchants you
to a land you dreamt of once,
only to forget.

Guess it's one on one again,
my burnt ashes infront of your fragile little flame,
which one of us will go out first from our crestfallen reveries?
I wonder.

Beauty of Art

By Hira Mehar

He said,
Let yourself bask in guilt and regret,
They are bound to touch your heart
with a tinge of humbleness.
A father is a mountain,
He knows the echo of your sorrows.
A mother is a sea, she drowns in herself
to keep you afloat.
I haven't known this forever,
I learnt love in my grandmother's tears
when departure sat between our ties.
A sister's love is a winter's kiss,
It is like the arrival of spring
It is summer's sadness,
An autumnal fall to other bonds –
Rest have since paled in comparison.
Resilience is another name to spring and patience
I love how it sings songs of hope,
Says move through the blues,
Says, keep going in face of adversity.
And pray, have you heard a poem on life?
How, when poetry is life itself?
And scribble – a few words blackening the paper,
A painting – few colorful strokes on a canvas,
Have you not heard? They too sound of joy,
They sing of life.
Art is life, as are words, as are you and I.

On Palestine – The Dream of a Better Tomorrow

By Shamama Madni

The piercing shackles of submission,
The unrestrained claws of subjugation,
Are slowly rusting away,
The gleam of a new dawn,
The aroma of a fresh breeze,
Is making its way
Into the Holy Land,
The land where courageous souls dwell,
The land where mystifying beauty swells,
None other than Palestine,
Where olives thrive and freedom fighters dine,
Where walls and alleys bear witness,
To the long-lost dreams and hopes endless,
The words of Darwish and Al-Qasim,
Are mightier than bullets and fires
The pain, the suffering, the insurmountable struggle,
The blood gushing in the veins of Palestinians,
The blood so mercilessly spilt,
Will never go in vain, For this liberation
Is not for mere recognition,
It is to live, to breathe, to dream
To live as humans are entitled to live!
To breathe fresh air, not corrupted smoke,
To dream ordinary dreams and not war-torn nightmares.

A Banyan Tree

By Salman Tahir

Thou hath seen evident justice denied
At the break of usual days, certain times
Noble men, carrying their hues of pride
Broken peasants, padlocked hands, and mimes
Eloped lovers, under my shadow, tied
Gruesome, my prop roots due to crimes
Yet, an abject ebb to this disastrous tide
Twilight hath fallen, oblique murk rimes

SHORT STORIES

ARTWORK BY ZAINAB HAROON



The Journey

By Qaisra Shahraz

New Delhi and Kot Badal Khan, India; Lahore, Pakistan, August 1967.

Poor Raju was having the same dream again. In it, he was once more the boy he had been, aged seven years old.

"Water, water!" he demanded in his child's piping voice, tugging at the man's arm. A hand clamped hard over his mouth, blocking his cries. Desperate for air, his small hands clawed uselessly at the adult fingers. The man tightened his hold, staring ahead in the dark.

Raju sat up in bed, his heart pounding. Drenched with sweat, his muslin nightshirt clung to his body. The last time he had had the same nightmare was three months ago. This time, it would prove an apt beginning to what lay in store for him that day.

When he returned from taking a shower, Raju's eyes fell on the crisply-pressed shirt laid out for him on his bed. Love for his mother welling up, he went looking for her in the kitchen where she was making his favourite breakfast of potato parathas.

"Namaste, Mata ji," Raju greeted her, giving her a hug from behind.

"Namaste, my son," Kumari Patel replied, lathering his paratha with extra ghee.

As Raju waited in the dining room, he read the note his father had placed on the table before leaving the house early to open up his chinaware shop.

Dear Raju,

If you have today decided to do what you've long set your mind on doing, Bhagwan will help you. I wish you luck, my dear son. Just remember that we love you very much. We will always love you, my dear son, no matter what happens.

Your loving Pita ji.

His mother entered and placed two hot parathas and dal before him. Normally they sat together to eat. Not today. Too distraught, she hastened back to the kitchen to hide her wet cheeks and leaking eyes.

Kumari Patel stood sobbing over a simmering pot of milky tea. She had tried so hard to be fair about this, reminding herself many times that she should have faith in her son… but the jealousy for an unknown woman continued to torment her.

Nervous energy building up in his stomach, Raju dipped chunks of his paratha into the dal bowl. After he had finished eating, he called out to his mother.

Hurriedly dabbing her eyes with the corner of her sari fold before entering the dining room. Kumari paled at the sight of his suitcase. Despite having packed it herself, it symbolised her loss. She kissed Raju hard on his forehead. He, in turn, bent down to respectfully touch her feet. He couldn't leave without uttering the poignant words.

"I love you, Mata ji."

"I love you too, my son. May Bhagwan take care of you and help you succeed in your mission. Have you got the address?" she fussed before hugging him.

"Yes. It's here in my diary." Raju pointed to the hidden pocket in his coat.

Kumari wanted to say more, but stopped herself. Picking up his suitcase, the young man turned once more and said, "Goodbye, Mother. I will return."

"Goodbye, my Raju," she said quietly. Time would tell if he returned, but she had no right to keep him. She watched from the front doorway, until she lost sight of the taxi. Once inside, she cried as if her heart would break.

At Attari station, Raju took the Samjhauta Express, showing his first-class ticket to Lahore in Pakistan, and settled into his compartment. On the platform, vendors carrying savoury snacks in overflowing baskets stacked on their shoulders hastened to the train windows, chanting, "Garm samosas, garm pakoras." The satsuma and banana sellers energetically vied for the passengers' attention too. Raju waved them away from his window. Five minutes later, the train shrilled into action, speedily puffing its way towards the Wagah border, separating India from Pakistan.

Raju sat thinking of what was ahead of him and about the people he was likely to meet. What would they be like? What would *He* be like? Raju quickly switched his thoughts to *Her*. Would they resemble the blurred shadows in his mind? And how would they react to his arrival on their doorstep?

He then dozed off and was woken by the train coming to a halt at the Wagah border, where customs and immigration clearances took place.

When the train entered Lahore station in Pakistan late in the afternoon, Raju sat up, a tingle of excitement coursing through him. Yet, peering out of the window, he noted that it was a replica of any other Indian station: the same style of buildings, the same bustling atmosphere and ambiance, with vendors keen to sell their goods. People were everywhere, of the same colour as Indians.

In the taxi, Raju gazed out of the window, letting the scenes of mid-day Lahore city life roll before his eyes. The taxi rode past the imposing Victorian red-brick buildings of the Lahore Museum and the old University of Punjab campus. The driver skilfully manoeuvred his taxi through the traffic jam of motorcycles, rickshaws, trucks, minibuses and cars, to reach the neater lanes of Mall Road heading towards the airport and the army cantonment area, popularly known as 'Kent' by the Lahoris.

The taxi finally came to a halt in a large street lined with modern shopping plazas and villas. Raju, who had been chatting with the driver about cricket, stopped abruptly, his heart thumping. The driver pointed to an elegant two-storey villa with a white and peach tiled facade, and a wrought-iron balcony circling the upper floor.

Raju paid the driver with the Pakistani rupees he had exchanged in Delhi. The taxi disappeared in the midst of late afternoon traffic with schoolchildren returning home. Unable to slow the rapid beating of his heart, Raju stood with his suitcase by the side of the house, not quite ready to ring the bell beside the imposing gate and meet its inhabitants.

On the other side of the road was a cafe. Raju walked across and ordered a couple of samosas and a cup of tea. Remembering his mother, he had opted for vegetable samosas. As an orthodox Hindu, she forbade the eating of meat in her household. However, she turned a blind eye to the fact that her son and husband often treated themselves to roast chicken in restaurants.

Raju sat near the window, eyes resting on the house. The muezzin's call to prayers from a local mosque startled him. Some men in the cafe left for their prayers, heading in the direction of the minarets towering behind a row of plazas. Raju's cup of tea remained poised in mid-air, for the gate of the villa had opened and a man of average height had stepped out. Dressed in a traditional white shalwar kameez suit, and with a prayer hat on his head, the man set off in the direction of the mosque. Raju's eyes followed the man until he disappeared around a corner.

Unaware of the interest he had aroused in the young man sitting in the café across the street, Sarwar Hussein walked briskly to get into step with his friend, who was keen to sit in the front row of the prayer congregation.

The mosque was full with men sitting in neat rows. Sarwar Hussein took his usual place at the rear end of the prayer congregation. A few minutes later, the prayers ended. Most men departed, to get back to their work, home or business. A few stayed behind, sitting on seats or on the plush carpet, offering their personal du'ah to be heard by their Almighty Allah.

Sarwar Hussein was one of these men, his hands raised in front of him with tears pouring down his weathered brown cheeks. People had stopped asking him why he always ended his prayers with tears. Too reticent and sensible to pry, they left him alone with his sorrow.

Always the first words of Sarwar's personal prayers were, "Forgive me, my Almighty Allah, for I have sinned… and in such a way that no man can carry a heavier burden on his shoulders than the one I've been carrying for the last twenty years."

In the mosque, memories of the past tortured him. There was one scene in particular which he could never get out of his mind – when he had accidentally choked his beloved young son to death!

This was the tragic secret which had eaten away at his soul for the past two decades and made his wife a nervous wreck. Their eldest daughter had been too young to remember. They had fled India with other Muslim refugees in 1947 when India was divided into two parts and Pakistan was founded as a state for Muslims. They had never shared their painful story with their new neighbours and friends in Pakistan.

They now had three children: one daughter from India, and a son and daughter born in Pakistan. Neither parent ever forgot their eldest son, whose body they had left behind in India, without even burying him. His wife, Zarine, never forgave her husband for what happened that night.

With his eyes closed, Sarwar Hussein suppressed a moan as he let the memories from that fatal night haunt him again. Reliving those memories was a daily ritual and a welcomed form of punishment.

August 1947.

In Kot Badal Khan near the district of Nakodar in India, Zarine sat huddled with her two small children in the rear storeroom of their house. Numb with terror of being attacked by Sikhs or Hindus, she had switched off all the lights and was feverishly chanting Sura Yasin verses under her breath.

It was as if the whole world had gone mad. With the famous 'Mountbatten plan' in place and the 'Radcliffe line' drawn on the map, India had been carved into two parts, with Pakistan in the north for the Muslims. Neighbour had turned against neighbour; friend against friend. All in the name of religion. No one was to be trusted. With increasing communal riots, fear and mayhem reigned. A few months earlier, it was an inconceivable thought that something like this could happen in a civilised state. Overnight, millions had been made refugees.

What neither the Indian nor the British decision-makers had anticipated was the fragility of humankind and its easy slide into hatred.

Anger raged. Whole districts – the local mahalas where Hindus, Sikhs and Muslims had lived side by side with shared walls, balconies, animal compounds, courtyards, communal cooking and washing areas – had become no-go areas. Houses and shops were ransacked, looted and set on fire. Muslims and Sikhs in particular were at loggerheads. The Sikhs' animosity towards the Muslims was inflamed by the Khalistan issue. The Muslims had gained Pakistan. What about the Sikhs? They too deserved a state of their own – their Khalistan.

News of people slaughtered on trains coming from and going to Pakistan, terrified those fleeing from their homes with their belongings in oxcarts, with the old people carried on makeshift palanquins to the safety of the Delhi Red Fort, the Purana Qila camps.

Anxious friends and local leaders of different religious groups urged their dear ones to save themselves, to forget about their houses, farming land, cotton crops, animals and jobs. There was only

one option: to flee to the part designated for them. Muslims to head north to the new state of Pakistan, with Lahore, the old Mughal capital of India, on its side. Hindus from the north, the tribal mountainous Swat region, and from the city of Peshawar, and Sikh Pathans from Punjab, fled south to the Hindu state of India, Hindustan.

The province of Sindh in Pakistan, with its large port of Karachi, became a popular destination for the refugees, the Muhajirs. It was the home city of Mohammed Ali Jinnah, who with a group of people had founded the state of Pakistan.

For all those who had fled to Pakistan, an equal number of Muslims remained in India: they headed for Kerala, Lucknow and Hyderabad. This was when the madness of home exchange schemes came into action, with Muslims taking up the abandoned houses of the Hindus, whilst the Hindus were given the vacant Muslim homes. The messy minor details of reciprocity would be dealt with later. If one family's home was bigger than the one they had left behind, they had to make arrangements to pay the difference and vice versa.

When the famous 'Radcliffe line' was drawn on the map, dividing rivers, towns and cities, people were in a state of utter disbelief. They woke up the following day in either India or Pakistan. With so much at stake, people had at first merely waited, biding their time, crowding around their radio boxes, anxiously listening to the news updates by the hour. After all, it was no trivial matter to abandon one's entire way of life and just flee. From having been thriving businessmen, shop owners, wealthy farmers, government employees, civil servants and respectable members of the community, the people became first fugitives and then refugees – that is, if they reached their destination safely. The Muslims who lived in northern cities like Lahore, Montgomery and Lyallpur congratulated themselves on their good fortune in living in that region. Their Sikh and Hindu neighbours, however, within hours and days had fled with their families to the southern part, leaving behind their beloved homes, belongings and friends. There was heartache, anxiety and chaos.

Sarwar Hussein was one of those who had lagged behind, uncertain whether to leave or stay. His two siblings living in Nakodar had already left to join some relatives living in Lahore, an obvious destination for his family. But like thousands of other fellow Indians, he was reluctant to believe that he had to leave his home!

However, his Hindu schoolfriend and neighbour, Lal Mehra, seriously brought home the message to him that he was endangering the lives of his young family by staying in India. Zarine's relatives, living in the nearby town of Phillaur, had already fled to the north in the buses provided.

"You're my dear friend, Sarwar ji, and I love you very much, but I can't stop anything happening to you or your family. The situation here is really very bad with the riots, my brother,

believe me. You must get out of this region! If I help you, the mob will burn my house down. No one is to be trusted now. You do understand me, Sarwar ji, don't you?"

Yes, Sarwar came to understand that situation well when he went to phone his brother from a local post office late in the evening. His brother had advised him to buy tickets from Phillaur to reach Jullundur railway station and said he would meet them there. On the way back, riding on his bicycle, Sarwar passed the small town of Banga, inhabited by Sikh families. He slipped off the main road and hid behind a tree after witnessing the scene of a young Muslim man being ambushed by a gang of Sikh youngsters. Terrified, Sarwar remained crouched on the ground.

In the scuffle, the young Muslim man knocked one of the Sikh boys to the ground; the boy hit his head on a large stone and died on the spot. In a rage, the others savagely turned on him and one stabbed him in the neck. His cries for help as he bled to death deafened Sarwar's ears. Petrified with fear, Sarwar crept away into the sugar cane fields. With nausea churning in his stomach, he remained there for hours. His mouth was parched, but he was afraid to drink the pinkish water from the well near the field, knowing it might be disinfected to stop the spread of cholera.

The incident had taught him that travelling through Banga was not an option for his family now. They couldn't risk being attacked by a mob out for revenge. Heart thudding like a tabla drum, he retrieved his bicycle and rode back home in the darkness of the night, cycling hard and out of breath, constantly peering over his shoulder in case someone was following him.

"Allah Pak," he whispered, "Lal ji was right. If this is the reality of living in India now, then we can't stay another minute. Not that we want to leave. I love this country, my home, the Sutlej River. This is my birthplace. How can I desert my parents in the old cemetery? Abandon my grocery shop, with its stock piled high up to the ceiling? All our savings that I've invested in the goods? But we can't take anything with us, apart from money and gold jewellery. The way things are, we'll be lucky if we manage to leave our area safe and in one piece."

By the time he reached his front veranda porch, he had come to a firm decision. They had 80 kilometers to cover before they reached Lahore, but it would be too dangerous to go there by major roads or by train. Instead, they would travel stealthily through the village fields. Sarwar reckoned this would be the safer route to Jullundur from where his brother had made arrangements to take them by bus. However, he seriously doubted whether they could make it with two young children, and with only one bicycle as the means of transport. There were no taxis, or horse-driven carriages, Tongas or the buffalo carts to hire at night-time. How would they manage to walk for hours on foot?

All the lights were out in the Muslim households in his mhallah; the only lights visible were in Lal Mehra's home and the homes of the three Sikh families. His own dwelling lay in pitch darkness.

Even the courtyard's dim oil lantern was not lit. Pulling off his muffler from around his face, Sarwar softly knocked three times on their front door and waited.

Then he called quietly, "Zarine, it's me."

Immediately the door was pulled open and his wife ushered him in. He sighed with relief. It was so good to be back in the safe haven of his home – but for how long? What if somebody decided to attack them in the middle of this night? Hindu and Sikh neighbours knew which houses belonged to the Muslims; apart from Lal ji, nobody could be trusted any more.

He hastened after his wife into the windowless storeroom at the rear. Zarine switched on the light, and they sat down at each end of the old charpoy, where their two children were sound asleep. There was no need for an anguished debate now; their fearful, silent glances confirmed to both that it was time for action – time to flee. Where Sarwar had witnessed a live killing, Zarine had heard of the carnage on the trains, and fires in the Powadra and Talwan area as well as the shooting of a Muslim family just two streets away. One member of that family had reacted and killed a Sikh man and then fled in the night.

"Did you get the tickets, Sarwar ji?" Zarine anxiously asked, scrutinising her husband's face. There were no more arguments with him to stay put; by now, she was ready to abandon her home and leave empty-handed. Their house, shop and her brother's cotton fields no longer mattered. Only their lives. "No, Zarine, it's too dangerous to travel by train," he told her. "Terrible things are happening out there. We can take the train from Jullundur." He was reluctant to share the details about what he had witnessed in Banga.

"In that case, what are we going to do then?" she demanded, noting her husband's sweat-beaded forehead and the nervous tic in full action in his left cheek.

"We're leaving tonight, travelling on foot and with the children on my bicycle – and taking very little with us." He let the words sink into her mind.

"What? All that walking – are you joking?" She rose to her feet, agitated and angry.

"It's no joking matter, Zarine! There's no other way," Sarwar explained. "It's too dangerous to go as a family by road; we'll be easy targets. If we go by night, it'll be safer so there's no time to lose. Please get your things together and secure your gold jewellery in the large breast pocket of the under-slip that you were showing me last week. Make lots of parathas and take a jar of mango pickle. That should last us for some time. Fill the water bottle and choose some warm clothing for the children, as it will be cold outside. That's all we can take. I will help you, but we must hurry!"

As Zarine set about hastily preparing the dough for the parathas, Sarwar went through the rest of the house, looking for something precious and small enough to carry in his shoulder bag. Common

sense prompted that with two children to carry, as well as the required food, they couldn't take much with them. Unlike other families they had no buffalo cart at hand to transport their goods.

'But *everything* here is precious. This is our home!' Sarwar mourned, a sob rising in his throat as he removed his family's sepia photos out of their frames. He could not leave his memories behind; they had to go with them. His mind refused to dwell on the following day when their neighbours would discover they had fled in the night. For how long could Lal ji be expected to safeguard their home from being looted, stripped of everything and left empty for any Hindu or Sikh refugee family from Pakistan to take up abode? He wondered if there would be a similar sort of house waiting for his family in Pakistan. The government had promised a fair system of exchanging houses and land.

Sarwar wanted to thank his neighbour Lal Mehra in person for his long friendship and love, but he couldn't risk it. Sitting down at his desk where he normally did his business accounts, he dipped his pen in the ink-pot and wrote a long note in Hindi. Stepping outside in the darkness, he slid the note under Lal Mehra's front door. By the time his neighbour got to read the note they would be far away.

In the dim lantern-lit kitchen Zarine was busy with the parathas. In the storeroom, Sarwar hunted for his children's warm jumpers in a cupboard. Riaz whimpered as his father coaxed his limp arms into the sleeves.

Zarine handed her husband a bag containing a bundle of hot parathas, a small jar of mango pickle and a water container, then rushed into the adjoining storeroom. Opening her silver trunk with the key hanging from her waist by a nala string, she drew out the cotton pouch containing all her gold jewellery. Everything else of value she left untouched. There was no time or luxury for nostalgic tears as she shut the heavy lid on all her old wedding outfits and special items of her dowry lying in that steel trunk, and locked it. She left a note with their name and which city they were heading for, dearly hoping that the family who came to live in their house would be honest people who would return their belongings.

Married eight years ago, Zarine was devastated at leaving everything behind. Sobbing bitterly, she changed into her under-slip with her pouch of gold jewellery tucked inside. God knew, the gold would be needed in difficult times. She put on a warm cotton shalwar kameez suit, and on top of that she wore her outdoor burqa.

Sarwar Hussein too had changed his clothing. Sorting out his money into different bundles of notes, he strategically placed them around his body with a few precious items such as his children's photographs in different pockets of his Punjabi suit and coat.

"This is it, Zarine,' he said tenderly. 'Ready to say goodbye to your beloved home?"

As she stared mutely at him, her eyes full of tears, Sarwar Hussein felt duty bound to remind her, 'Never mind, my dearest, we'll make another home in Pakistan – a much better one than this. And now we must let the children sleep for as long as they can. I know it's going to be difficult for them. You can sit on the bicycle with them and I'll lead it."

Like thieves in the night, they crept out. Sarwar fastened the padlock of their house. He cradled their sleeping son, with one hand pushing the bike. Zarine carried their two-year-old daughter, Tahira, on her shoulders.

Looking stealthily over his shoulder, Sarwar Hussein led his family out of their area, carefully looking down for potholes. He avoided the main road where he knew ditches had been dug and then covered up with hay and animal fodder to lure an unwary traveller or enemy vehicle to fall into them.

For a couple of hours, Zarine sat on the cycle too, precariously holding onto both her children. When it became too uncomfortable, she got off. Sarwar then hopped on and began to pedal, holding his children and two bags tightly in front of him.

To Zarine's aching legs, the few miles they had covered seemed like hundreds. The backs of her shoes were digging into her heels, making them sore. She begged her husband to stop and rest, but Sarwar insisted that they persevere for another couple of hours and try to reach the city of Jullundur where hopefully his brother would be waiting for them.

It was past midnight when Riaz whimpered, waking up in his father's arms "Daddy, why are you carrying me on the cycle?" he asked sleepily. He tried to slip out of his father's arm, gazing up at the night stars. Sarwar gently lifted him down to walk beside him, slowing his own pace. His mother and sister took their turn on the cycle, with his father leading it.

They had walked for half a mile when Riaz began saying that he was hungry.

"Zarine, I think it's time for Riaz to rest and eat something. How about if we take a short break over there?" Sarwar pointed to the bushes at the side of the road.

Zarine was only too glad to comply. She limped towards the bush where she gently laid her sleeping daughter on her shawl spread out on the ground. With Riaz sitting beside him, Sarwar Hussein shared out the food. The parathas and mango pickle had never tasted as good as they did in that strange environment, under the stars.

They were halfway through their meal, when the calm silence of the night was interrupted by the sound of male laughter. Zarine and Sarwar froze, the food between their fingers forgotten; fear etched on their faces.

Sarwar peered from a gap between two bushes. To his dismay, it was a group of young turbaned Sikh men, drunk and singing lewd songs. Two of them carried guns. Another two swaggered from side to side, sharing dirty jokes. Cold fear washed over Sarwar's body. The men were drawing nearer.

Unaware of the gravity of the situation, Riaz came up to his father. Tugging at Sarwar's coat sleeve, he demanded in a clear, loud voice: "Water, Daddy, water. I'm thirsty!"

The men heard and turned, cocking their ears in the direction of the bush. Petrified, Sarwar stared down at his son. Riaz was about to repeat the request. Sarwar clamped his hand hard over his son's mouth. Riaz began pulling at his father's arm, but Sarwar remained oblivious to his son's struggle as he watched the men pass right by the bushes where they were hiding.

Sweat was pouring down Sarwar's temples; unaware of his wife's urgent hands clawing at him to pull her son from his vise-like grip. It was only when the men had passed, that he became aware of what he had done. Glancing down in horror, he dropped his hand. Riaz fell to the ground, lifeless.

"Oh, my God, Sarwar ji, what have you done?" Horrified, Zarine knelt beside her son, shaking him and rubbing his cheeks. No sound, no breath came out of Riaz's mouth.

An anguished scream burst through Sarwar's throat, but before it could pierce the night's silence, he strangled it by shoving the end of his woollen muffler into his mouth and biting hard on it. He had killed his son while trying to save their lives, but if his scream was heard by those drunken men, not one, but all four of them would be dead.

Kneeling beside his son, Sarwar wept. Zarine too, was sobbing, rocking her son to and fro in her arms, beseeching him to wake up. Around them were the cottonfields. Their little daughter was now wide awake with the sound of her parents' distress. Shivering, she too began to cry in the night's darkness.

Sarwar didn't know for how long they vented their grief and wondered what to do with their dead son. Should they take him with them, or to leave him behind and hope that some kind person would bury him? Zarine was out of her mind at the thought of abandoning her son. Sarwar begged her to understand their predicament.

"We have to leave… we still have so many miles to travel. How can we carry our son's dead body with us? Please understand, Zarine. Some compassionate soul will find our Riaz and bury him," he appealed to her.

The thought of leaving their son there, however, was too much for Sarwar Hussein. He didn't know where he drew his strength from as he wrapped up his firstborn in Zarine's shawl and placed the limp body on his bicycle.

In the end, he literally had to drag his wife away from the bush area. They stumbled, half-senseless, into the next village. In one home, lights were still on and music was blaring. It could only be the home of a Hindu family, who had no need to fear or flee from their home and were still celebrating. The couple laid Riaz's body outside the door then rang the bell and stepped aside so as not to be seen.

A few minutes later they saw a woman in a silk sari come out and find the child on the doorstep. She removed the shawl from Riaz's face.

"Patel ji, look here! A child… sleeping. He's not dead, is he?" She called to her husband who came running to the door and peered over at Riaz. Lifting the child, he took him inside. Riaz's parents watched their son's body being taken into the house.

"Zarine. We won't have to worry about him now,' Sarwar comforted her. "The copy of Surah Yasin we left with him will tell those people he's a Muslim. They must and should bury him. Let us leave this place now, Zarine."

Inside the house, placing his ear near the child's chest, the woman's husband listened for a heartbeat. Nothing. Pushing the shawl aside, he gently puffed air into the boy's mouth.

Kumari Patel stared in amazement at what her husband was doing. Had he gone crazy? He was now pressing on the child's ribs and puffing air into his mouth. Then, as if their Bhagwan had heard their prayers, her husband detected a slight heartbeat and jumped back in joy.

"Kumari, the boy is alive!" His wife beamed with happiness, holding out her two hands in prayer to her Bhagwan. "Quickly, let's take him to our doctor." As she tenderly cuddled the child in her arms, her husband went to wake up their driver.

In the doctor's surgery, much to the astonishment of those around him, the boy coughed but remained unconscious. Riaz only came fully awake a day later in Kumari Patel's home. His hands were clawing at his mouth, and he kept saying the words, "Water, Papa, water!" His eyes anxiously sought his parents. Where were they?

Kumari, with no children of her own, rejoiced in her newfound happiness. God had blessed her with a child at last, literally delivered it to her door. She wanted to adopt this blessing of a son, believing that his own parents had abandoned him and therefore had no claim over him. Whether they were in Pakistan or in India, she was not interested in tracing their whereabouts.

It was only many years later that Kumari Patel's conscience bullied her into admitting that they needed to find out about her son's biological family.

When the child Riaz was fully conscious and found himself in a new home with a Hindu family, in his child's mind he deliberately blocked out his own mother, his baby sister, their home – and Him, the father who had nearly choked him to death.

'Mama and Papa have left me!' His young mind struggled to come to terms with what had happened. The last scene he remembered was eating with them in the night amongst the bushes somewhere. Where were they all – and why had they left him behind? In anguish, he sought solace in the arms of his Hindu foster mother.

By that time, his natural parents had reached their destination. They had first gone to the city of Jullundur where they could not find Sarwar's brother, but managed to get on a bus to the city of Lyallpur's refugee camp in Pakistan. After a few days, their relatives came for them from Lahore.

Sharing their tales of woe as refugees with their loved ones, Sarwar and Zarine omitted to mention how Riaz had died. Instead, they offered a fabricated tale of their son dying of a fever, just before they left their home. As to the burial of their son, they dared not utter a word. It became their shameful secret. Zarine never spoke about it, but neither did she forgive her husband for that terrible night and the loss of their son. In her eyes, he had killed their beloved Riaz and then abandoned him on the doorstep of total strangers.

They settled down in a home vacated by a Hindu family who had fled south to India. Sarwar started a new business with the gold jewellery they had brought with them. Zarine gave birth to two more children in Pakistan, but she never forgot her beloved Riaz. Life went on, but they were always tortured by the thoughts that would never go away. What had happened to their son? Had the family who took his body inside buried their son?

On his way home from the mosque, Sarwar Hussein was unaware of a pair of dark eyes boring holes into his back as he entered his home.

His heart beating wildly, Raju stood up. The hour of reckoning had come. It was time to meet the ones who had deserted him, leaving him for dead. Raju left his suitcase with the cafe owner, as he did not want to put his host off by his luggage. After all, they didn't know him. And he had no idea whether that man who entered the villa was his father.

Gathering his courage, he pressed the buzzer at the outside gate. A young man led him into the front garden. Was this his brother? Blushing, Raju greeted him, "Assalama-Alaikum. Can I meet Sarwar Hussein, please?"

"Walaikum Salam. Please come in." The young man led Raju through the open porch and into their reception room. Asking the guest to be seated, he then went to call his father.

Raju waited apprehensively. It was all so surreal. His eyes glided over the furnishings of the room, which celebrated the Islamic faith of the family, from the woolen tapestry woven with the Al-Kaaba design and the names of the prophet's design, to the hand-painted glazed plates with verses from the Holy Quran, to the large family portrait in their Ihram clothing taken after they had performed Hajj in Mecca. The high-quality furniture indicated to him that his family had done well for themselves, considering that they had abandoned everything in India and started from scratch.

Just then, he heard a female voice and the sound of approaching footsteps. Raju felt a thrill run down his spine and the hairs on his arms stood up. When a middle-aged woman with greying hair and a silk chador draped over her head entered the room, he gazed at her in wonder, bade her Salam and stood up.

"Walaikum Salam, my son," she innocently returned, a greeting she normally used for all young men entering her home.

At the words, 'my son', something leaped in Raju's chest, and his eyes filled.

"Sarwarji are having their lunch, they'll be with you shortly. Please feel at home." Out of respect for her husband, she always referred to him in the plural.

She was about to leave. Raju stepped forward. This was the moment and he wanted it to be with Her only and not *Him*.

"Mother," he uttered softly behind her back.

Puzzled, Zarine turned, her forehead creased with perplexity at the young man's peculiar use of the word 'Mother'. Raju poured his soul into his eyes.

"Mother," he repeated with emotion. "I am your son, Riaz."

Zarine stared, as the meaning of his words hammered at her brain. Her mind screamed, Is this a hoax? Her Riaz was dead. She began to sway. Raju reached forward to hold her.

"But my Riaz is dead," she whimpered, her eyes huge in her face.

"Yes, Mother, you left me for dead, but I was only unconscious… I was alive." He waited for his words to sink in. When they did, she could not contain her utter joy and excitement.

"Sarwarji, Tahira, Javid, Saira – where are you all? Come here!" Zarine called at the top of her voice from the doorway.

The family came running from different parts of the villa, wondering at the commotion. Her children stared at her in amazement. What had happened to their normally subdued and serene mother?

Pulling Raju into her arms, she hugged and embraced him as if she would never let him go. Her family looked at each other, alarmed at her behaviour. Had she gone out of her mind, to be kissing a total stranger?

Zarine turned to Sarwar Hussein with tears streaming down her cheeks. She sobbed, “Sarwarji, you’ll never have to curse yourself again. Your son is alive! Look!”

As Sarwar Hussein continued to blankly gape at her, Zarine rushed up to him, tapping him on his chest.

“Look, Sarwarji, our Riaz… whom we left behind in India!”

Clutching his chest, Sarwar stumbled out of the room. The doctor had said that shock of any kind was not good for his heart. Seeing this, Tahira, his eldest daughter, rushed to her father. She called for her brother Javid, who ran to her aid. They led their father to a sofa for him to lie down and were about to call the doctor, when Sarwar told them he was fine, just needed a few minutes’ quiet. He sat up, the pain in his chest forgotten, and held out his hands in prayer to his Almighty Allah Pak. Later, he would offer his special thanksgiving Nafl prayers.

Sarwar then laid down and fell into a deep sleep of relief and joy. No more would he be tortured by that terrible memory of killing his son and then leaving his body behind. But he was not ready to face his son or talk to him, just yet.

Over the next hour, Zarine forgot her family, so engrossed did she become in her eldest son – her firstborn child lost to her for so long. Her other children looked on with bemusement. Tahira was cynical about her mother’s reaction. The man who claimed to be their long-lost brother was a complete stranger, and from another world, India, their arch-enemy, the land from which she and her parents had fled twenty years ago in 1947, in order to save their lives.

Zarine, who was in high spirits, asked Tahira to lay the table for dinner. Holding onto his arm as if he would disappear if she let go, she took Raju around their house. Her other children followed silently behind her. They hadn’t quite got used to the idea of acquiring another brother – an older one at that.

In awe, Raju silently moved from room to room. He was struck by the thought that this would have been his home, living with his two sisters and a brother. Oddly, he felt nothing for them. Even Tahira, his baby sister who was born in India, kindled no feeling. They were, quite simply, strangers. He was acutely aware of his siblings’ skepticism, if not outright hostility, regarding his arrival.

At Zarine’s request, the dining room was opened up. The large, marble veneered table was soon covered with various dishes – some hurriedly prepared by their cook and his mother. Fried fish was brought in from a local restaurant. Raju began to eat with the others. Zarine watched each and every movement of his, noting that he did not use a spoon for rice. He ate the way they used to in India, scooping rice with their fingers. She had not had time to quiz him about all those years away from them. Nor was she in a hurry to learn about the people with whom he had spent most of his life.

Later, after dinner, while they were sipping hot cups of tea and munching on warm, sweet jalebis, Zarine decided it was time to confront her son's past and hear about the people who were part of his world now. Raju shared everything his adopted parents had told him – about how they had found him on their doorstep and, after discovering that he was still alive, had taken him into their household. They now lived in New Delhi, where he worked as a manager in a reputable publishing firm.

Zarine was eager to know how he had managed to trace them to their home in Pakistan. Raju told her how, as a child, he had mentioned the names of his real parents and that of their neighbour, Lal Mehra, as well as the name of their town. Within the first few weeks his adopted parents had visited that area and discovered that his parents had left for Pakistan.

Later, when Raju was older and determined to discover the whereabouts of his real parents, his adoptive parents went back to his former house and met the neighbours, asking for information about his parents. Lal Mehra had shown them a letter with a Lahore address that he had received from Sarwar Hussein many years after they had left India. Raju's adoptive parents did not mention anything to Lal Mehra about Raju being Sarwar Hussein's son, but said that an old Indian friend wished to visit Sarwar and his family in Pakistan. Lal Mehra had happily handed over the letter with the address.

"And so with Bhagwan's help I'm here now," Raju ended emotionally.

Zarine's hand froze on the cup she was holding at the mention of the word Bhagwan – the Hindu word for God. Riaz hadn't said Allah but Bhagwan.

Raju caught the uneasy look in her eye. He did not fail to note the change in her demeanour. His steady gaze made her's falter. Surely his mother would accept the fact that he had adopted the religion of his adoptive parents? Did it make that much difference? After all, he was still her son. He had missed out on their lives and they on his. It was a sobering thought. He had embraced the life and faith of his adoptive parents as his own.

He smiled at the thought of his mother, Kumari Patel, waiting for him in Delhi – and missing her all of a sudden, he momentarily forgot the strange woman sitting in front of him, the one who had given birth to him.

Whilst her eldest son tried to get to sleep in the guest bedroom, Zarine stayed awake for a long time thinking about him. The word Bhagwan kept tapping in her head. Bitterly she wept. It was on religious grounds they had fled from her beloved home in India and it was religion now which had crushed her joyous feelings about her son's homecoming.

Zarine was angry with fate, the injustice of it all, and the suffering of her family in having lost Riaz. And all those years her poor Sarwar had tortured himself. Why did those people not try to trace them earlier? Why leave it till his adulthood?

Riaz was not her Riaz, but a stranger. It was the last straw for Zarine to know that her firstborn, for whom her family had excitedly distributed laddoos around in Phillaur on the day of his birth, was now called Raju, and had become a Hindu. Zarine thought of his Hindu mother, wondering what she should feel about her. Was she jealous of her for looking after her son all these years?

Zarine glanced at her husband fast asleep beside her. For once she didn't envy him his sleep. He deserved it. For him nothing else now mattered, only that his Riaz was alive. She prayed for her husband's health and that of her three children. No, not three children but four, she automatically corrected herself.

The next day passed in a flurry of activities for the entire Hussein family. Raju was taken sight-seeing, to view Lahore's historical monuments: the Shalimar Gardens, the Gurdwara and the Badshahi mosque, as well as touring the walled city with its many doors, and the Anarkali bazaar. He met some of his Pakistani relatives, who were totally puzzled by his appearance, but happy nevertheless for his family.

Before arriving in Pakistan Raju hadn't given much thought to how long he was going to stay in Lahore. Perhaps a week, or a month he had thought, depending on how his visit went. By the third day, however, he began to feel homesick and restless and decided that it was time to return home. He promised his mother Zarine that he would return again soon.

Sadly, Zarine reconciled herself to the fact that her Riaz could never be a permanent member of her household. Raju gave them his Indian address and the telephone number in Delhi, and requested them to visit his other family. Sarwar remained in the background. His guilt kept him there. He lovingly watched his son from a distance, realising that they both, father and son, needed time to bridge that gap between them.

At ten o'clock in the morning of the fourth day, Raju left for Delhi. His family hugged him and saw him off at the Wagah border with mixed emotions. Zarine rained kisses on his face, reluctant to part with him. She did not know how to handle this separation. Subdued, his family returned home, knowing that their lives would never be quite the same. Riaz would always be in their thoughts, but never theirs fully. His two sisters and brother were ambivalent about their sibling's intrusion into their lives. They didn't know whether they felt happy or sad when he left.

Raju's immediate thought as he settled comfortably in his seat on the train, was that his life's mission was accomplished. He had discovered his birth family. He still felt no affection for his father, but he had learned from his mother their version of the story, about how petrified they were of the drunken men, and how that had resulted in the tragedy of his being accidentally suffocated.

In Delhi, Kumari Patel was sitting in front of their altar. With her eyes closed, she was praying for her son Raju's well-being. When the outside door creaked, she opened her eyes, surprised. Her husband was supposed to be at a business evening meal.

On catching sight of her son, Kumari flew into his open arms, the folds of her Banarasi sari flying behind her. Raju rested his head on her shoulder, filled with emotion. Finally, he whispered, "I've come home, Mata ji. Bhagwan has returned your son to your arms."

She heard the joy in his voice. He knew where he belonged. Too overwrought, Kumari didn't reply. Instead, she took his face in her hands, showering it with kisses, starting with his forehead and moving down to his chest. When she eventually released him, Raju bent to touch her feet. Joy rippled through Kumari Patel's being. Her dark eyes glowed in her face.

There was a lot to be said, and a lot to be heard, but she would leave it till later. She let go of her son, telling him to bathe and change into his favourite blue kurtha and matching pyjamas. She then returned to the altar and bowed her head for a special prayer, with her hands firmly pressed together in front of her favourite goddess for a long time. She thanked her Bhagwan for her son's return. Four days ago, she had lost hope of holding onto him, mortally afraid that his Pakistani family would keep him with them.

Her Raju called from his room whilst he unpacked the presents from his other family. "Mata ji, you can now call Neeta's parents and tell them to go ahead with our engagement. I now know that I'm ready to marry and start a family of my own, after visiting my other family. And I am going to tell Neeta the truth about where I have been. To Pakistan, not Dubai."

After getting their Indian visa three months later, Sarwar Hussein and Zarine visited Riaz's Indian family. They too arrived by train. He and his parents went to receive them. It was a strange and awkward meeting. But both sides were thankful. Riaz's parents were grateful to his adoptive parents for saving their son's life and for raising him so well, and also for taking the trouble to trace them back to Pakistan. And Raju's adoptive parents were thankful that he had come into their childless life as their beloved son, and delighted that he had not deserted them to join his biological family.

His parents only stayed for two days. Zarine watched her son and his mother from afar, painfully aware that Kumari adored their Riaz and that he was, indeed, their son. She hugged and kissed him as she left, but gracefully accepted the fact that her Riaz belonged to the other woman. She was simply profoundly glad that he was alive. The regular phone calls continued, and the bonds were gradually deepening between the two families.

Six months passed and Sarwar Hussein and his whole family arrived in Delhi for their Riaz's wedding. It was a first-time visit to India for his siblings; the Indian Hindu wedding was a strange and

unique experience for them. Sarwar and Zarine somehow managed to hold onto their composure as they watched their son circle the wedding fire with his bride Neeta, with wedding garlands around their necks. Both of his families were in tears.

However, Kumari Patel and her husband had a surprise for them. They had also invited an Imam to perform the Muslim Nikkah ceremony. After all, their shared son belonged to two faiths. The two mothers stared at one another, delighting in each other's happiness. It was at that moment, watching the tears in the other's eyes, that the two mothers found a deep joy in sharing him.

Riaz for one, Raju for the other.

Insomnia

By Aamer Hussein

When leaves turned yellow and red and began to fall, my friend Murad felt autumn bite. He took his leather jacket off its summer hanger, put on cotton jumpers and socks every morning for a week, and prepared himself for a cooler season. He booked a ticket that would take him to a warmer climate of Delhi in winter, but he had nearly two months to wait before he could leave. Walking down London's grey streets in early October, he felt that something was about to happen: to him, to someone else, to the earth. But sometimes he thought, with a measure of guilt, that his own unease was big enough to keep away the problems of the world.

Friends from abroad came and went. Days of work were followed by evenings of celebration, and time sped. But when he came back late at night or even when he stayed home to work Murad couldn't sleep or read. He'd sit up till dawn in the darkened kitchen or speak on the phone to friends in countries where the sun hadn't yet set or had already risen. And when he did fall asleep his sleep was restless, his dreams crowded with strange journeys and occurrences. He'd shake himself into consciousness, switch on the lamp and fall back into a sluggish half-awake state with the reading light on. Or he'd go to sleep with fully formed stories in his head and on his lips, but when the morning came and he tried to find the words to write them he could no longer remember what language they'd been in, if they'd been in any language at all.

One Saturday morning he dreamed that he was at a window, watching a group of survivors emerging from the debris of an earthquake, some of them carrying their dead on their backs. From somewhere he could hear the sound of an unfamiliar bell. He shook himself awake to find that he was lying on his back, in his shirt and suit trousers, his jacket beside him, on a strange bed. His socks were on and his shoes were off. In the dull light of the lamp beside him a TV screen showed men in white playing some game he didn't recognize. He had been woken by the harsh music of a mobile phone near him that wasn't his; he didn't have a phone near his bed, and would never have gone to bed with a mobile beside him.

"Oh you're awake," his friend Saad said, walking into the room with wet hair and a towel around his shoulders.

Shaking off his sleep, Murad remembered now how, after reading they'd done at the South Bank followed by a slew of questions from the audience about abandoned mother tongues, nostalgia, the exilic and the exotic, they'd been out with some English friends, danced until late and then gone back for a drink to the hotel on Southampton Row where Saad and Ratna, the poet from Bangalore

who'd read with them were staying. Ratna had drunk rather too much white wine, and insisted on coming to Saad's hotel room to raid his mini-bar for a nightcap when the waiter in the hostel lobby refused to serve them more drinks. At some drunken moment earlier in the evening, a pianist was playing dizzy cascades of jazz notes in a very minor key and Saad was fervently defending Michel Houellebecq to a skeptical Murad as the real voice of Europe when Ratna had looked up from a reverie, wagging a forefinger, "Have you realized we're all middle- aged, single or divorced, and childless?"

"You must have fallen asleep when I took her up to her room," Saad told him. "You didn't even wake up when I pulled your shoes off."

Murad had a faint memory of taking off his glasses, rubbing his eyes and resting his head on a strange pillow. He had probably slept then. (He'd had only five hours of sleep the night before; a call from a sleepless friend in New York, who had left Karachi in 2001 and was still anxious about the change of city and career he had made in his late thirties, had wakened him well before sunrise.)

Saad, a Pakistani poet and human rights activist based for a while in Prague, was supposed to leave with Ratna to read that evening at a university in some distant northern town. He said Murad might as well join them for an early breakfast, but Murad excused himself. It was 7. On the way to the tube station, in dull emptiness of Tavistock Square, he stopped to smoke in the abandoned park just across the road from where a bus had recently been blown up and remembered how, more than a decade before, he'd been sitting there talking to someone he'd recently met at a conference. Her name was Sri Kunti. Her small, perfectly crafted poems had beguiled him with their deceptive intimacy. She had brought boxes of rice, fried chicken and curried beef to the park, which they ate, kneeling on the Bloomsbury grass, with their fingers. She was leaving the next morning for Indonesia. The grass had made him sneeze. She'd told him she was allergic to most metals, particularly gold. Their meeting had inspired both of them to write. For seven months after that they'd exchanged letters, soaring into poetry or dipping into prose, before they were able to meet again, when she had him invited to present a paper on Iqbal's philosophical poetry at a conference in Leiden.

Why, he wondered, was he so often drawn to poets? Once – he was much younger – he'd heard them referred to as vagabonds, wasters and wanderers; in his experience, they did have a rather different approach to life, stability and structure. Sitting in the top deck of the bus, he succumbed to a remote regret for an ailing friendship with Ayla, a poet for whom he had once felt a poignant affection; their ambivalent relationship, after drinking for a while between the still pond of friendship and more stormy waters, had recently run aground. All new loves, Murad had told Ayla once, were re-enactments of old passions, revisitings of old pain. In her case, she wasn't able to engage in a new relationship because she hadn't managed to deal with the things left behind by a past one. He'd last

seen her in June in Milan; there, at a performance of *Othello*, he'd said an imaginary goodbye to her, but after feeling there was nothing more he had to give her because there was little left that she wanted from him, he was still aware of an empty place inside him where something else once had been.

"Didn't you examine your feelings for her?" Saad had asked him on the phone, in one of their late-night conversations.

He thought he had, but he hadn't quite known what it would be like to live with yet another empty place. He sought refuge in friendship or solitude just as he had once sought solace in her company from those things, but he'd had a few too many of these evenings that ended too late after drinks in some club, hotel bar or friend's sitting room.

In a faraway town a month or two ago, he'd spent a night in the arms of someone he'd seen for years as a cordial stranger; their almost accidental love-making had remained, by tacit consent, incomplete. They'd parted with a promise to seen each other more often. He'd thought this sudden intimacy might lead to something lasting, but all that came of it was a handful of messages and phone calls, and two awkward meetings over drinks in crowded, impersonal places. Intimacy, perhaps, had precluded a possible friendship. It had occurred to him then how sometimes, even with eyes wide open, you could willfully misread another person's needs, motives and messages. Filling the spaces left empty by passion with friendship always made you aware of how the love of friends came in fragments: it could be confusing, after initial intensity follow the usual sequence of delays, cancellations, eventual neglect.

He reached home. Oh, for one night of sleep. Eight hours, or even seven, uninterrupted by dreams, bells, voices… At nearly 8, it was too late to go to bed. He made some coffee and checked his messages; he switched on the TV in the empty flat and, over flickering pictures of death and the stricken faces of victims, he heard a voice describing an earthquake in his native country. Surely he couldn't have had a premonition of the catastrophe? Then he realized that he'd probably seen an early report on the TV in Saad's room as he drifted into unconsciousness and thought he'd been dreaming; or that the images of the disaster had somehow imposed themselves in his dream.

Watching the world's tumult in miniature, in your sitting room with the cold voice of a distant announcer in your ears, can trivialise tragedy, make it unreal, numb the spectator. He stretched on the sofa to try to sleep but couldn't. And when he finally slept again, he found himself in a half-darkened cell, being interrogated by two blond policemen who force-fed him a truth serum; to what crimes he was supposed to confess he didn't know. Then he was strapped to a very tall ladder; he was struggling to free one hand, the left, to reach into the pocket of his trousers in which he was sure he had a cigarette or two and a box of matches.

The phone woke him. “O God, O God, O God,” a friend who’d recently lost a loved person was sobbing down the line; she hadn’t wept at her bereavement, but shed seen the news of the disaster and was crying now. And it occurred to him, in dark places, the world’s grief and our own, could melt into one another and become the same.

When he’d put down the phone after attempting to console her, his voicemail rang him back with another message: a doctor friend from Karachi was trying to reach him, with a list of places to which he could immediately send financial or practical help. He crouched by the phone, his head in his hands. Then he clenched his fists and drummed, with the sharpness of his knuckles, his forehead and his temples. When his head began to throb, he flattened his fingers and kneaded the places he’d been drumming, and rubbed his itching, swollen eyes as if to demand from them the water they refused to yield.

He’d been invited out to lunch – it was a Saturday – but by 10 he knew he wouldn’t make it. He phoned to cancel, pleading a painful knee and a pile of student papers to mark, both of which were true.

There’d been a message on his machine from Sri Kunti a day or two ago, from Lisbon. She’d accepted an invitation to read in Cambridge and Norwich and would be arriving in England soon. As usual, she wanted to meet him in a new and distant place. But she hadn’t said when she was arriving, and he didn’t know where to find her. Over the last eight years, he’d travelled to many places to meet this darkly enigmatic Javanese poet who many years ago had left behind her native aristocratic milieu for the world of ideas, books and academic seminars. Sri Kunti, the mother of twins like her namesake, was a nomad with a nesting instinct. One of her hidden talents was for architectural design and in the last decade she had made nests in Bali, Amsterdam, Paris and other places, many of which he’d visited.

Their last meeting but one had been in the hills high above Yogyakarta where, in the opulent surroundings of a tea plantation that had been transformed into a holiday resort, he had spent Christmas Eve with Kunti and her friends. On Christmas day they had driven to the sea, to a place called Parangtritis, where the ancient Queen of the Waters, Lara Kidul, was supposed to reign and did not allow people to dress in green, her special colour. Sitting on the patio, in the purple darkness of a late evening, with a huge platter of local fruit on a low table beside them, they’d been talking about happiness, and Murad had said, “Why do we only know we’ve been happy after the moment has gone? Do regret for the past and fear for the future erode every possibility of recognizing the moment?”

Kunti had smiled and responded in one of her cadenced reflective sentences, “Sometimes you’re listening to music, or looking at a landscape, or simply sitting in silence with someone and that feeling – you can call it happiness – overwhelms you. The saddest thing is to find out later that the

other wasn't even aware of what you felt… didn't share in your happiness at all." She was silent for a moment. In the distance, Lara Kidul's dark sea raged and roared, buffeted by winter rain. "Why don't you write a story about all that," she asked in that deep, soft voice for which she was famous, "regrets, fear, loneliness and joy – and set it right here, in Central Java, and in Bali, by our hills and by our sea? And call it, with just a little irony, 'Happiness'?"

The next morning he'd said to her, "I woke up last night with the vague idea that one of my ancestors, a Sufi preacher, was buried near here. I know one did travel to central Java hundreds of years ago. I don't think it was a dream and I don't believe in summons or premonitions, so it must be some unconscious memory. I know it's silly, but could you ask…?"

She wasn't surprised at all. All her queries proved the truth of his intuition. She arranged for Santo, the thoroughly modern but quietly religious young man who'd driven them there, to take him up to the saint's tomb, a local place of pilgrimage less than a mile away from the hotel. She sat in a café at the bottom of the hill with a pot of ginger tea as he walked up the several hundred steps that led to the small, simple white shrine where Santo said his prayers and he, who had never learnt Arabic or memorized more than a few verses of the Koran and only ever prayed without words or even a recognizable language, made a vow at the saint's tomb and asked for the return of light to his mother's eyes which had been dimming.

Exactly a year later, a tidal wave had hit the Indonesian coast, and in the aftermath of that devastation he hadn't seen Kunti again for months, their exchanges limited to telephone conversations when it was midnight where he was and a little after dawn for her. (On Christmas day in Partangtritis she'd given him, as a gift, a watch with twin faces: the hands of one were set at Jakarta time, so day and night he'd always know what hour it was there and what she might be doing.)

Then this summer, they'd met after a separation of eighteen months by the shores of Lake Como, bringing along unfinished manuscripts and untended stories to show each other. She was giving a paper at a conference that commemorated the centenary of the birth of the poet and philosopher Lidia Belluno, who had written, in this very hotel, a work of existentialist philosophy disguised as a series of letters, the book on which, along with a handful of poems collected after her death, her substantial cult reputation was based. Belluno and her friend and mentor Bruno Cavagna would sit side by side on the lake's shore and write. Cavagna was working on his masterpiece *Insomnia*, a tragicomic love story inspired by their friendship, which came out on the eve of World War 2, was promptly banned, and only resurfaced in the fifties. Cavagna was married, Belluno wasn't. Later, reading the poems his muse had written as she sat beside him on a stone bench by the water, he'd realized the desire and hurt she'd been concealing from him. They became lovers. But only for a short

while. She was too volatile for him. He, a Partisan, disappeared during World War 2. But she'd already taken her own life by then, soon after he went back to his wife: friends and biographers both said the transition from friendship to passion and then separation proved too much for her. Haunted by the story of Belluno and Cavagna, Murad started to work on his piece about happiness on the veranda of his hotel. He spent a lot of time looking at the fountain at the piazza and the play of light on the lake and the gulls flying over silver water and ducks afloat. He didn't get very far beyond an allusive opening passage about the dead poets.

One evening Kunti and he had escaped their colleagues; they were eating cuttlefish in its own ink on the lake's other shore, and talking about Lidia Belluno's response to the war – which Kunti described as pacifist, since Belluno, while castigating the Fascists for invading Ethiopia, had really only thought of the cost to Italian mothers of their sons to their sons.

They'd missed the very last ferry and had had to hire a boat to take them across the lake. As they crossed the water, still talking about Belluno and Cavagna, with the sharp wind throwing foam in their faces, Kunti had asked, "And your story, 'Happiness'?"

Kunti had often commented, "My poems are quite prosy; they're actually stories. But you write poems in prose." In fact, Murad had abandoned serious attempts at poetry twenty years ago, but he'd often envied his friends who were poets; even on tour or in transit, they seemed to disappear into hotel rooms and come back with poems written on their overflow or their empty places, while his prose-writing friends locked themselves away for days, months and years on diets of cigarettes and tea, to write those masterpieces they dreamed would take them to pinnacles of acclaim, or they'd grieve over mountains of rejected manuscripts. (A poem, of course, could only be three or four lines long, but stories tended towards length, and though he was experimenting with lineation and layout to give himself more freedom, he had no interest in rhyme or meter: he thought that even if he did turn to verse, he'd write long, ragged poems.) Poetry or prose, it was all, in the end, a matter of working with pain, turning its blood and bones into something beautiful.

He hadn't known what to say to Kunti about 'Happiness', because he'd only gathered together scattered pictures that, on sleepless nights, he'd tint in the colours of happiness. (He's stealing a peach in an Italian orchard at the age of twenty, feeling protected by the gaze of a friend to whose passion he can't respond. He's driving up the winding roads of hills in Bali or Java with the lush green foliage, date and cotton palms, hibiscus and wild roses of the tropics filling his eyes and the music of wind chimes, church bells or the muezzen's calls in his ears. He's sitting in a pavilion in the hills above Jogja with Kunti while the silver notes of the gamelan orchestra, intertwining with the unearthly shimmer of the singers' high-pitched voices, fill the halls with songs from her childhood – and one

melody' 'Bengawan Solo', she's requested them to sing because he remembers it from his. He's looking from his hotel window in Cernobbio at the fountain in the square in which a duck swims and a gull and a white dove perch on successive tiers, forming a three-levelled sculpture. He's walking in the rain to buy cigarettes in spring on his thirty- first birthday when a pear blossom, like a snow flake, turning on the wind, drifts towards him and he cups his hand to catch it before it touches the pavement, wanting to give it to someone but not knowing whom to gift it too.) You can spin stories out of your emptiness, but writing your images away can also leave you drained and empty. ("Where's the writing today with the wide historical sweep?" his friend from New York had asked him. He had no answer, no solution. If history was synecdoche, happiness, perhaps, was a metaphor.) Each time he tried to complete the story, the images that beset him were of unacknowledged mourning, how he hadn't wept for his dead and even those friends and lovers he'd lost through circumstance and mistakes.

He was sitting at his desk by the window, trying to see if he could assemble the fragments of 'Happiness' into a mosaic, experimenting in a desultory way with line breaks, mostly looking out at a mauve sky. (In a fortnight the clocks would go back; a pall of darkness would come down early on the city and on him.) The phone rang: Maryam, making an unexpected call. She had a sheaf of translations someone had made of her work into French. She wondered whether he had an hour or two. They could meet in a café by a bookshop, in which they often sat and smoked and showed each other stories and poems. His eyes felt heavy with sleep, but the anticipation of seeing Maryam lifted his drooping eyelids. (He loved the ability she displayed, in her poetry, to make the cerebral sensuous and the tactile intellectual; she also understood the ellipses, gaps and frustrations that made all emotional entanglements so maddening. In spite of occasional distances and differences, their tender and almost unconditional mutual affection, very like the love of siblings, had kept them close for more than a decade.)

Outside the window the leaves were still dense on the trees, but their colours were turning. It occurred to him then, that in trying to keep out cold he'd been armouring himself too long with the heaviness of leather. He decided to leave his flat in the thin short-sleeved blue linen shirt he'd put on after his shower.

He stepped out. Rain was forming little puddles on the pavement and the air was biting. But the rain was very fine and the cool air on his bare arms calmed him. The sky was purple, distant. *Once the sky touched me. I can't remember where or when that was. But if it touched me once, it might even touch me again*.

Two years ago, he had gone with Maryam to spend some days in a seaside town in Dorset, sharing with her the silence and calm of those who have to learn to live with sadness. (Murad was

mourning for a friend who had been hit by a car as she crossed the road to the park; she had gone, after hovering between life and death for a week, at the age of twenty-seven, leaving many poems and stories unpublished. Maryam, perhaps, thought she said little about her burden, was thinking of her son who'd been ill for two years.) They'd found themselves by a narrow river, flanked on one shore by a street lined with cafes and antique shops and on the other by yellow, blue and pink houses with touches and trimmings of chalky white. At one of the miniscule jetties scattered along its banks they had boarded a fragile boat that ferried them across the water to a point not far from where the river met the sea. They'd walked a while along the esplanade and found a spot where they stopped, leaning their elbows on a convenient iron railing above a sheer drop to the sea. They lit cigarettes and looked at the waves in high tide. On the beach below, bands of children and teenagers, spurred by some local competition, were attempting to build life-sized sculptures of castles, horses and other fantastic shapes, embellished with bits of broken glass, shiny foil and scraps of metal. Then the clouds parted. The greyish sea changed colour and was full of light, as bright as a field of giant yellow sunflowers. The yellow-streaked sky was very close. Happiness and despair partake of each other: are the interplay of leaf and shadow, sun and its reflection in water, rain on earth and rock. He stood there with Maryam, not talking. After a while – not short, not long, – they walked on, in wordless unison.

King Street, Aberdeen

By Shahbano Alvi

King Street is the main northward access to the Aberdeen city centre from the suburbs. Abdul's halal meat shop was on its southern end which was in the city centre and also near the busy shopping street, Union Street.

Abdul was a wiry little man, dark, with well-oiled hair and flashing white teeth as his plain face split into an ingratiating smile every time a customer entered his shop. The front of the little shop was a grocery store and if you wanted meat he would slip inside a small door at the back, with you trailing behind. He would dive into the cold glass case bringing out your desired piece and efficiently start chopping away over a clean little counter. His white apron was always slightly off-white and hid his trousers and T-shirt. Looking at him darting about his small and stuffy shop Rubina always had an impression that underneath the apron he was attired in a Bengali lungi. The combined scents of spices, agar battis and Asian fruits and vegetables transported her from the granite city of Aberdeen to the housing area of Dhanmondi in humid Dhaka. The shop was stuffy yet oddly comforting. She only bought halal meat from Abdul; never anything else. She preferred going to the bigger, open-aisled, impersonal grocery stores which had now started keeping Asian spices and products.

Rubina opened her eyes and looked around. She had slept on the living room sofa last night. Her bones were aching as she sat up and dragged herself towards the kitchen. The bedroom door was closed. She tiptoed past it. The kitchen was a mess and she mechanically picked up the dustscoop and collected the scattered broken glass pieces with a broom and mopped the floor keeping quiet as a mouse; she had rather become a mouse, she thought with a wry smile.

Switching on the kettle she opened the window and leaned out. There was a quiet calm everywhere. The cold air hit her hot forehead; like the soothing cool Chinese balm her mother would massage her forehead with for her excruciating migraines. Everything was covered in white after the snowfall last night, leaving the world outside pristine; like the pictures on the Christmas cards Mrs Carol Murray used to send her, long after she had returned to her home in the US. Mrs Murray was her teacher in grade three when her father was posted in Rangpur, East Pakistan, and now Bangladesh. It all seemed so far away. She tried holding on to the happy days of her childhood…

Her flat was just off the Union street in a quadrangle. She loved her flat but hated living in it now and often took a bus to Broad Street in the city centre and sat and looked for hours at the large granite building of Marischal College, a part of the University of Aberdeen. It was the second largest granite building in the world and had a remarkable facade with fine details cut into the stone. To

Rubina it looked just like a building cut out in fine crystal, especially when the sun played with the various fine planes carved out of the grey stone.

Sometimes she would roam around in the Marischal Museum which had displays including Egyptian and Classical antiquities, Scottish prehistory and the heritage of northeast Scotland. She loved the temporary exhibitions held there often. A large stained-glass window which dominated the Mitchell Hall portrayed the University's history as the surrounding lights rendered it magical. The Mitchell Hall was used for graduation ceremonies till the majority of the building became the new Council headquarters in the early twenty first century. Rubina would get goose bumps when she thought that her daughter threw her cap up in the air here.

The shrill whistle of the kettle announced that the water was ready for the tea-bag and she jumped to switch it off, nervously checking the door of the bedroom. She poured the boiling water into her mug and took a couple of quick scalding sips to warm the coldness inside her. She felt her body was filled with crushed ice; but her head was hot and throbbing. She needed to be out in the open she thought and putting on her boots she grabbed her fleece and went out. As she turned into Union Street a light snow powdered her burning head. The wind was cold and she gulped a mouthful, breathing deeply. How invigorating it was to be away from Kamal.

Kamal opened his eyes and stared at the ceiling. He was nauseous and his head felt as if it would split with the slightest movement. He tried to get up but fell back with a howl as the the room spun around him.

Sprawled on the bed he cautiously turned his head and saw the chair in the corner and the writing table beside it, littered with empty bottles; the ashtray overflowing with cigarette butts. He caught glimpses of last night; his thirst and the yearning for oblivion. Rubina, watching him in her superior way. There was no expression on her face but he knew that she had the money and it was her house; he only had his strength and manhood to combat the feeling of insecurity gnawing away at his insides. All his pain and anger had spilled out in the form of abuses, till he was completely drained; it didn’t ease his pain though. He had thrown the bottle of vodka at Rubina and the noise of shattering glass was like music to his ears. He had a vague recollection of a loud thud as he found himself on the floor and then the swishing of his clothes as he was dragged into his bedroom.

“Ruby”, he called out irritably.

There was no answer. The hag gone out again, he thought to himself and tottered to his feet. She can go out all she wants but I won’t let her leave me. I will give her a dose of a little love for a bit and keep her entangled then pull her confidence down… he thought triumphantly and swore loudly as he his head hit the door.

"The bloody fat cow has turned my life into a mess." He mumbled as he walked unsteadily to the kitchen and filled a glass with water from the tap.

His inner demons had always been imprisoned deep inside him when he was in Lahore living with his parents and were only allowed out away from home when he spent his weekends with a friend. His parents thought he worked on weekends; he spent the weekdays looking after his bedridden father. Everyone had so much respect for him. He smiled as he thought of his days in Lahore.

And then his parents died; money dwindled and he was forced to look around to safeguard his future. He found Rubina, daughter of old family friends – a lonely, middle-aged widow living alone in Aberdeen with her children all settled in their own lives; with more than enough money. He wooed her with flowers and compliments; won her sympathy by appearing lonely and pitious. He was a handsome man and had always charmed his way into women's hearts easily. Rubina couldn't believe her luck in finding him.

But they never lived happily ever after as he had envisaged… she was so fastidious and proper – not like the women he befriended in Lahore. The novelty of living in the lap of luxury had its charms and advantages, but far away from his beloved city and fawning friends, he felt trapped and lonely with this woman – in this strange city of hard granite buildings.

He emptied the glass of water in the sink and carefully poured some whiskey in it. He needed it.

I'll go for a walk on the bank of the river Don today to bring a little cheer, Rubina told herself as she tried to picture the profusion of yellow daffodils along the riverside. Both sides of the river were always covered in seasonal flowers on lush green lawns; she especialy loved the areas where yellow daffodils carpeted the walks alongside the gently flowing river.

She took a bus and looked out as it turned onto King Street. She loved this street as it skirted old Aberdeen and the university; there was peace and quiet and one eventually reached the bridge over the river Don. Quiet and peaceful; nobody to judge her. Why did she feel so dejected all the time? Where had that confident woman – that she once was – hidden herself. But then all her life she had never realised that she was dark and ugly and not slim like the other women…

She stepped out of the bus and walked towards the river bank. "*Salamalekum* Miss."

Rubina looked up blankly at a thin man grinning at him and then she recognized him as Abdul the halal meat shop man.

"*Walekum Assalam* Abdul. I didn't recognize you for a second." She smiled at him. "What are you doing here? It is so cold and windy." He asked her.

"Well, what are YOU doing here?" She smiled at him. She felt oddly comforted by this simple smiling man.

"Oh I love walking! I come to the river when I miss home." He sat down on the bench at a little distance. He felt at ease in her presence. She was always so kind and patient when she came to his shop.

Abdul told Rubina that he loved walking the King Street heading northwards from his shop – indeed he had done it innumerable times. He liked to pass through the university. It gave him a feeling of being surrounded by knowledge and tolerance and acceptance; it soothed his nerves. And walking kept his emotions in check. He had felt like an outcast even after living here for the last twenty years. He didn't understand the White people – or the Blacks – around him. They had a way of looking at him that made him feel a little less; a little more defensive. It made him brazen and rude at times and he didn't like that.

"What to do Miss? I have made a life here… I make a decent amount of money and send it to my family. All the hardwork and frugal living is worthwhile because it is a fair society. You get what you work hard for. I couldn't have made ends meet back in Dhaka, whereas I now own a grocery store here." He looked at her proudly.

"Yes you are right." Rubina replied thoughtfully and thought of her husband. "It is a fair society if one is brave enough…"

"But I feel so lost here." He continued in a singsong voice. "The people around are strange for me. You see these waves of the river Don? They remind me of the waves of the river Podda – Padma – in my country… I am a good swimmer, I could swim in this ice cold water easily, but when I walk on the crowded streets in the city I feel that the waves of people are suffocating me – I am drowning, touching the depths. So I just walk; alone for miles…" He said wistfully.

"We used to live in a colony in Karnaphulli in Bangladesh – it was East Pakistan then – next to the river Karnaphulli. I loved it there." Rubina had a faraway look on her face as she remembered those carefree happy days. "Later we moved back to Dhaka but to a newly developed colony called Gulshan. There was a wide stream at the end of the grounds around the houses in the area and one could see its bank on the other side. I would watch from my terrace, boats sailing between the two banks. Occasionally the breeze would carry the melodious songs of the boatmen to me and, as I thought then, to faraway enchanted places. Our garden had lots of Jackfruit trees. I have never seen Jackfruit trees anywhere else. The huge brown fruits with scaly skins would rest on the trunks."

"You like Jackfruit?" Abdul asked in wonder. "Hardly any non-Bengali is fond of it."

"Yes… yes, they are not!" Ruby nodded in agreement. "Possibly because of its slightly peculiar odour. Though our cook, Nurul, would make delicious Jackfruit seed curry. I loved it. It was dry and spicy and the seeds tasted heavenly. He would boil the seeds and then peel them ever so laboriously; I helped him with it. We would eat it with white boiled rice and fish curry." She smiled a little forlornly. "I am sure I can still make it if I ever find a Jackfruit."

'So the river holds a special place in your heart too!' Abdul's white teeth twinkled against his dark skin as he laughed out loud. 'At least nature is the same everywhere.'

"What about your wife? And children?" Rubina asked him as she joined in his merriment… Two strangers at ease with each other. The feeling of annonymity breaking down the barriers – as the love of a country closed up the social gap.

"My wife and two daughters live with my parents in a village near Dhaka. What to do? I can't bring up my daughters here in this society?" He told her sadly.

The image of his pretty wife floated before his eyes. She was fair and sturdy with a ready smile. He could picture her flitting about busy in housework and carrying out all sorts of chores in her cotton sari and blouse; cooking *bhaat* and fish curry for the family – beads of sweat gleaming on her nose and forehead – looking shyly at him from under her lashes…

"Why do you feel you can't have your daughters brought up in this society? It has given you so much and you yourself say one gets one's hard work recognized. Your daughters could have the benefit of the finest education. And you and your wife can give them their values."

Abdul shook his head sadly. He was scared deep inside. He didn't understand these people, this society. He had to battle his fears first. Maybe one day…

Rubina sat quietly as the fear of her husband surfaced inside her. She needed to conquer her dread of Kamal too. Someday perhaps…

Rubina unlocked the front door and entering quietly, took off her fleece as she walked into the living room.

"Darling! Where were you? I missed you so much." Kamal was sprawled on the settee grinning at her. "Come and sit with me." He patted the cushion next to him.

"You look like a fat rat." He laughed. "I will pet the rat."

"It's raining outside and I need a hot shower." Ruby said hurriedly and turned to rush into her bedroom.

"I will have a bowl of hot soup ready for the drenched rat." He roared with laughter.

Rubina locked herself in the bathroom and slowly crouched on the floor. Kamal's wooing phase had begun again… It was like clock work – a month or two of abuse and then a couple of days

of romance. She felt a wave of nausea engulfing her. How she hated it! But she knew that if she didn't play along he would be violent and abusive – the words he availed himself of and the language he used! She felt naked; covered in sewage filth. *What am I going to do?* She screamed silently and writhed inside herself. *What have I done to myself? I am a mess.... I need to get out... I need to be far, far away from this man*.

"Kya karoon?" (What should I do?)

It took her a long time to come out of the bathroom and as she sat on her bed, Kamal entered with a bowl of soup on a tray.

She looked up and smiled weakly. *I will go to river Don again tomorrow*. She promised herself.

"So your children are all settled in their lives?"

"Yes. My daughter lives in Manchester and my son lives in Glasgow." Rubina and Abdul were sitting on a bench and she was telling him about her children.

"My daughters go to school in our village. I want them to go to college and not hurry with their marriages; to grow up as confident girls like the girls here." Abdul said wistfully. "They are learning to sing and dance very well."

"May be they should be here with you then…"

"What does your husband do?" Abdul asked her ignoring her last suggestion. "He stays at home." Rubina got up to go.

They didn't want to face their trepidations living a life of dread and unease…

But then they often met on the bank of river Don; a short respite from their respective lives. Snatching a little comfort, gaining a little strength from each other. Longing for the day when they would be free of their fears.

Rubina turned her car on King Street and parked it next to Abdul's *halal* meat shop. The display window looked bright and inviting and the little shop seemed bigger. As she stepped inside she saw the clean meat section on one side and the groceries piled neatly in aisles on the opposite side. A fair plump woman in a bright green sari stood behind the grocery section counter. She smiled at her as Rubina stood there uncertainly.

"Hello miss!" Abdul stood up from behind the meat counter flashing his teeth happily. "Meet my wife, Johra. Long time, no see? You went away somewhere? Yes?"

"Yes... yes, I had to go away suddenly." Rubina smiled at him as she moved towards the meat counter. "Please give me two pounds of boneless chicken and two pounds of lamb mince."

Abdul got busy with the order and kept up a steady chatter.

"You see I finally called my family over four years back. My daughters go to school now; it was soon after you stopped coming for your walks. I was worried but I didn't know where you lived…"

Rubina smiled. "Your wife is lovely." Picking up a basket she turned towards the grocery aisles. "I may as well get my groceries while you do the meat."

As she paid at the counter Abdul came from behind the meat counter and stood next to his wife who was efficiently managing the cash register.

"I will help you with your grocery bags." He said picking up her shopping and walking towards the door. He helped her put away the bags and Rubina thanked him as she got into her car. He stood on the pavement and as she turned on the ignition he waved.

"You look happy now." He remarked.

Rubina looked at him and smiled as she drove away, "You too."

The last four and a half years flashed past her eyes. That fateful evening when kamal was drunk and abusive as usual and she just sat there quietly waiting for him to get too drunk and for his tirade to stop.

"You hag, does nothing affect you…?" He lunged at her and spitted on her face as he fell down and lay there unconscious.

She went and sat in her bedroom in a stupor.

"I must keep my self respect… I must leave him… I have to walk out… Get up and go… Get out of here…"

Late that night she packed her suitcase and finally dragged herself out of her house—her hell – and checked into a motel. The next morning she went to her son.

She had filed for a divorce and had finally got rid of Kamal.

"But how can he be given half your property?" Her friend Mary was incredulous. "You are a Muslim. Your religion doesn't allow husbands to take from wives…"

"Our marriage was registered here. So the law of this country applies." She sighed. Perhaps both got what they wanted… at a price.

Zorro

By Noor Khalid

I don't understand why they turned me into a lesson for picture books. I only wanted some grapes. You get hungry, you have to eat, which is what nature intends. On good days, I found mice and rabbits. I used to dream of catching a hen but once I did, I did not like it very much; I lost most of my appetite too. It's a nice hole I'm hiding in, but they might find me soon. Open season brings out quite a number of beasts. You think about who the real animal here is. I'm getting by with bugs but they don't taste very nice. Having someone so helpless for dinner, I don't like it a lot. Humans do it.

The air does not hurt. It feels cool against my coat like the water in the stream a few strides from here, although I cannot wade in it anymore. Still, the air does not suffocate me, unlike the forest I grew up in. Even a bug-eater, mouse-muncher like myself hated it. A fire broke out, so bright I could not tell myself apart from the flames. Twigs and needles gave way under my feet as I tried to find a way out. But the sky wrapped itself in orange; the stars were gone even though I was a long way from the fire. I stubbed my knee against a log in the reddened dark of the night. Whimpering, I longed for the earth to wrap its arms around me.

Instead, a man appeared. He looked as if something had died. I saw myself in his glassy eyes. Tears were streaming down my face; funny how I didn't notice it. I didn't make a sound: I didn't want to frighten him. He didn't say anything either – that is, until he became aware of the shadows that surrounded us, dark entrails that would swallow us whole. Some forests are like that. He ran away and I was alone again – naturally.

I tried to find the stars again. The mossy road grew dusty, then bumpy, then swampy for a few days, until it turned paved against my paws. There I chanced upon a clump of trees that grew into one another; not wild enough to be a forest but green enough to be called home. They overlooked a narrow stream of water – still, beneath a dragonfly-lit air. On the other end, there stood what looked like a sandcastle under a full-moon sky. Stars peeped from behind clouds - clouds that weren't made of smoke – and I found myself breathing again. The daybreak was bringing life to that mysterious place, and the dead seemed flushed with a feeling I couldn't name. I found myself getting sleepy at that thought.

I had barely closed my eyes when I heard a morning cry. It pierced through the fabric of dusk and dusted the remnants of exhaustion off me. Shaken awake, I looked around to see who was calling me. There was no else there. The light was creeping up from behind the sandcastle: it stopped being a sandcastle and turned into a town. The voice came from there. It sounded like a bird. I wondered if he

was caged. I spent another sleepless day over this. A week went by: the morning cry was sounded everyday. I soon realized that most things arose at its call. As days went by and I had heard him enough times to be sure that the caller was free- freer than I could ever be – its song began to lull me to sleep.

More weeks passed by, and I had grown back into my curious self that had found grapes: I began to wander the town's lanes at night to look for them again. The place was almost as dark as the frightful forest, except for a single light that came from a big house with a cross at the top. Beside the light in the window sat a man who talked to Gaud every night without fail. I never saw this Gaud with him. The man cried quietly in between whispers. At the end of it, he always looked relieved. I didn't understand any of it but as I listened to him talk to himself a couple of times, I found that Gaud existed everywhere around us, only that he couldn't be seen. But those who believed in him would inherit a beautiful place with many gardens. Gardens sounded refreshing, whatever they were. I had grown tired of the earth and its forests.

I tried to get close to the Weeping Man – that's what I called him – even though something tells me that I shouldn't get close to people, lest they catch me and skin me. I wanted to make sure what he said was true, and I, too, would get to see these Gardens if I believed in Gaud. But every time I thought I was getting close, he saw me or sensed me and ran away. It was a maddening task, I just wanted to learn about this Gaud that he loved so much and believed in, even when Gaud was not there. He might have been crazy, I couldn't know for sure. But then I thought about the Source of the Morning Cry, and I understood Gaud, and the Weeping Man, a little after all.

One evening, just when the sun was about to set, I saw two children on the outskirts of the town, picking rocks and leaves. I couldn't make out whether they were two boys, or two girls, or a boy and a girl, but they looked very interesting. One of them was calling the other ‘zorrito.’ That, too, was a new word for me. I tried to get close but they sighted me and shouted, “Zorro!” I became frightened and ran away. I avoided that spot afterwards. They looked nice though, and not the skinning foxes kind of people.

It stayed with me, the word ‘zorrito’. It appeared to me in hushed voices whispered from corners of the world I had not seen. Around that time I met some birds who were traveling south. I asked them if they knew what it meant.

The first bird I saw was a shrike. I asked her if she knew what ‘zorrito’ meant. She looked at me for a second and then flew away.

The second bird I saw was a swallow. I asked her if she knew what zorrito meant. She looked at me for a second but before she could fly away, I grabbed her and put her in my mouth. I hid inside the hollow of a tree as her friends looked for her. After they gave up and left, I threw her up and wailed.

As I wept, I heard hooting. I peeked out of my hole and saw an owl sitting at the branch of the tree. I asked him if he was traveling away too.

“Owls are okay with wherever they are, hoot-hoot.”

He looked old, like the toil of time had got lost somewhere in his feathers. I thought he must know what ‘zorrito’ meant.

“Zorrito? That's Spanish, I think. It means fox, hoot-hoot.”

“What's Spanish?”

“It is a type of tongue, hoot-hoot.”

“There is more than one tongue…?”

“There are more tongues than you can count. Both spoken and otherwise, hoot-hoot.”

It was getting late; I asked him if he was going to sleep. He looked at me funny. “Owls don't sleep at night, hoot-hoot.”

“Oh? I don't sleep either. At night, I mean.”

“Of course you don't. You’re a fox: foxes don’t sleep at night. You’re quite silly, fox. What is your name?”

“What's a ‘name’?”

“It's something that your parents give you so others can know what to call you, hoot-hoot.” “I don't have parents nor anyone to call me.”

“You can name yourself too. I call myself Hooty. You know, because I hoot a lot. Hoot-hoot!”

“I think I've been called Zorro once. Is that an okay name?” “It's a wonderful name, Zorro.”

Hooty and I talked all night that night. He told me about his family whom he had lost during an eclipse, how they had been separated, and that he never found his witch mother, his titan brother and his human-witch sister. He said that most of all he missed his witch best friend who wore glasses and knew a great deal of things. I had no idea what he was talking about, but he looked so sad that I did not want to interrupt. In return, I told him about the Forest Man, the Weeping Man, and the Two-Children-Who-Called-Me-Zorro.

“Oh, I haven't talked to anyone in so long I forgot I could talk this much. And now I'm tired. I didn't even know I could get tired. Do you think the rooster's running late today, hoot- hoot?”

“What's a rooster?”

“It is a bird. Opposite of hen. You must know about hens, hoot-hoot?”

“No, not yet. But I think I will know what a hen is once I see it.”

“Well, I'll tell you. A rooster is much more beautiful, with green and red feathers. Not prettier than peacocks but certainly less annoying, and has a great singing voice too. I'm sure you've heard him sing.”

“No, I'm not sure I have.”

“You know! The bird who calls in the morning when the sun rises; that is a rooster.”

I spent the rest of the day in a trance. Hooty went to sleep as soon as the call sounded. I slipped away and followed it for the first time. It came from a brick-red house, almost as red as me, under the shadow of a walnut tree. There was a small hen under it. I knew it was a hen as soon as I saw her, just like I had thought I would. I didn’t want her to run away so I slowly crept towards her.

“Hello, do you know where the Rooster is?”

The hen’s eyes bulged. She didn’t speak.

“I really want to see him. Can you ask him to come outside?” Her eyes teared up. I realized my paw was on her throat.

“Oh, I'm sorry I didn't mean that. Really, I am not here to hurt you. Can you please tell me where the Rooster is?”

She gave out a cry. But I didn't understand what she was saying. Hooty said about there being a lot of languages. It didn't make any sense because I understood Hooty fine; I understood the Rooster without even knowing what he was.

“I promise I'm not wild. I- I even have a name! Its Zorro…Can you please tell the Rooster that? Does he have a name too? Can you tell me what it is?”

It gets blurry after that. All I remember is that I did not see the Rooster. He still sings but now with a note of lament. Or maybe my days or the fear of getting caught is getting to me. It is crampy here: hours morph into each other and you lose focus. Hooty visits sometimes. I like his company, but most days when the earth is warm, I want nothing except for it to cradle me and take me to the Gardens the Weeping Man talked about. I'd like not to end up as someone's fur coat. Please do not turn me into a fur coat. Hooty might join me too, being ancient and all: but I hope he finds his family first. I would like to see my Rooster there too someday and hold his wing in my paw. Perhaps where nature doesn't govern us, we will talk in words we both understand.

Sedimentary Grief

By Eleen Raja

“Can your hand hold a tree?”

“Do you think a cymbal could substitute for a globe?”

“Is your mother akin to a door or a window?”

“Would it help if I offered you a poem?”

A tin-foiled therapist and a mesh of skin sit in a quaint tangerine room. The only furniture is the seats they occupy and a shelf lined with artificial succulents. They share a metaphor; tucked in an elbow, a hand, and a head. The mesh of skin appears distraught, glazed with the tears that seep from its pores. It’s trying to remember. The tin-foil man knows what but he cannot say. There is a scuffle, the mesh grabs a hand on a shelf and whacks it on the tinfoil man's tinfoil head. It leaves in a hurry, disgruntled at the sight of harm. The hand now held a scrap of tinfoil, grasping a metaphor for loss.

The mesh gradually unravels to discover it is not alone. At the core of it, an organ appears engulfed in a blue mist. It never knew of this other within, foreign yet warm. The mesh had homed warmth yet harm was done, what now? It carries it as it has before, deaf to a newfound pulse. The mesh settles beneath a rock to grieve. The rock aged and so did the earth while the days murmured nothing but the usual wisps of hurrying pedestrians. One afternoon, a brown-suited stranger in a Tundra leaves his mark by abandoning a withering old grand parlor a few feet away from the mesh's grieving corner. Passive to the sedimentary grief of its idle companion, the instrument stood quiet for a week. Regardless of its silent decay and a dusty fallboard, a curious teen discovers the relic of someone's past. Hoping to find at least a few keys functional for a single chord, he lifts the board to find a majority of the keys surprisingly intact. Remembering a few abrupt lessons from a deceased paternal, he settles his tips into a C minor. A gentle press and a potential tune later, he plays as if stumbling upon an old friend on a busy street. The mesh listens. After a minor session, the young boy surrenders to his curfew and places the unhinged board back into its previous facade. The mesh watches him return to a home as the organ within throbs to the memory of the tune. This warmth was memory. This memory was human.

Tender Moments

By Muhammad Womik

At noon, the clock struck twelve, and Haidar found himself in the kitchen with his Amma. The gentle tunes of Nayyara Noor played on Amma’s tiny radio, filling the air with the low hum of a soothing melody that seemed to harmonize with the sizzle of spices and the bubbling of pots on the stove. The aromatic symphony created a haven of warmth and comfort in their small kitchen. These moments in the kitchen held a special place in Haidar's heart.

Amma, multitasking as always, prepared dinner earlier than usual. She had taken on additional responsibilities, recently tutoring the neighbouring children, in addition to her usual chores. Her days brimmed with activity, as she tried to compensate for the household's ever dwindling funds.

Haidar's father had been successfully unemployed for two long years. The only other success he displayed was one which pertained to finding excuses to blame Haidar's Amma for the misfortune that seemed to trail his shadow since their marriage.

Haidar clutched his *I can be a Chef* Barbie doll, a prized possession he'd convinced his Amma to get for him by likening it to her. To accommodate his father's disapproval of his son playing with dolls, Amma had encouraged Haidar to call it an “action figure.” Haider delighted in watching his Amma cook often mimicking his "action figure" as if it were his Amma herself. He eagerly assisted by fetching ingredients and utensils in addition to tasting the food to ensure it matched his father's discerning palate. The warmth of his Amma's love enveloped the kitchen, banishing the cold from the floor where Haidar sat.

In the absence of Haidar's father, a delicate tranquillity settled over their home. The air seemed lighter, as if it had shed the burden of tension that hung heavily in his presence. The kitchen, once a battleground, transformed into a haven where Haidar and his Amma shared tender moments, their laughter and warmth filling the space like sunlight filtering through curtains.

Suddenly, the front door creaked open, an eerie and unusual sound, for Haidar's father rarely returned home this early. Haidar's Amma turned off the soothing music playing on her little phone. Startled, Haidar quickly hid his ‘action figure’ behind his back and darted into his room without greeting his father. In his young mind, he believed he had gone unnoticed, but his father had glimpsed the golden locks of the ‘action figure’ Haidar had concealed.

Haidar locked his room and sought refuge in his closet. As he crouched within, his small frame became shadowed by the suffocating darkness, clinging to the space like a shroud, only a sliver of feeble light creeping in through the door's narrow gap. The air was heavy with the musty scent of old

fabric and long-abandoned dreams while the floor beneath him seemed to exhale a chilling draft. His Amma-like doll sat beside him, its plastic eyes and lifeless smile seemingly filled with the warmth and understanding he had found in his Amma's presence in the kitchen. He placed his hands over his ears, hoping to block out the escalating sounds of his father's anger. As his father's yelling grew louder and more tumultuous, Haidar began to count, a coping mechanism he had perfected over time. He was a bright child, capable of counting well beyond a hundred at this point. Yet, with each number, he yearned for the day when counting would no longer be necessary, when the shadows of turmoil would finally recede, and his home would truly become the safe haven he so desperately desired.

Abysmal Impasse

By Eza Qamar

Out of sight, Out of mind

Forgetfulness proved to be their plight

Unaware, Unending,

They never realized why they cried

Heaving breaths. Hushed sobs. A crumbling form lay in the corner. Knees up to the chest. Face hidden in the crook in-between. Trembling limbs, an aching heart and a decaying soul.

The only light seeping into the naturally darkened room was from the slit under the locked door. The windowless room seemed to glow dimly from the miniscule light it could receive. The light was blinding, unbearable to the human eye. But unlike the light that is usually warm, this light held a coldness to it, releasing an unfriendly frostiness accompanied by a chilling hostility. There was a humming that clung to the light slipping into the room like a vanquishing mist.

"Ignorance is bliss" someone said, they believed

Never acknowledge the problem and it'll vanish, they believed

Living in their own bubble, the reality never touched them

They came crashing down, belief broken and shattered on the ragged pavement floor

The room was small, barely the size of a walk-in closet, suffocating in its compression. Absolutely bare. A run-of-the-mill prison.

The individual shivered, raising their head slowly, hot tears searing the skin of their cheeks. The door and the light was opposite to them. The longer they stared, transfixed by the light creeping in, the more they heard the vague whispers. The voices were calling to them. Encouraging them to step into the light.

Let go.

The individual cried harder. Pain. That was all they could feel. They were trapped and torn. Feeling their soul, their consciousness, and their humanity being split.

Let go.

The voices were welcoming. Promising relief. Relief from the harshness of the individual's reality. A reality encumbered by misery and exhaustion. A never-ending struggle of survival.

Let go.

The individual wanted to, desperately. Their heart longed to walk out into the light and accept the bliss that was being promised to them. But soon as that thought entered their mind, shadowy arms

snaked around their frame, the individual whimpered due to their rigidness, they yelped in pain when they tightened their hold, keeping them rooted to their place.

To the place that was filled with excruciating agony, intolerable misery and sharp, piercing screams of their self-inflicted torture aided by the cruelty of others. The shadows were a subject of immense confusion for the individual. At moments, where their embrace kept the individual grounded and allowed them moments of reprieve from the coldness of the light, in other instances it was that same embrace that choked them to the torture that never resulted in the death that the individual so frantically craved.

Hearing the rumble of their father's chest, thunder crackles in their ears
His anger at everything, results in their anxiety and fear
Yells from him tumble down on their mother, from her to her child continuing in a circle
A vicious cycle with no end, who will finally fix this detriment?

The shadows lurking around the individual belonged to the people in their life that were present but never when they were needed. The people that offered sugarcoated words of validation while breaking down the entire sense of self belonging to the individual with their actions. Wolves wearing the clothes of sheep, the individual thought feeling helpless in front of them. Hating them and loving them in the same breath.

"Raising my hand was never my intention" He pleaded
"You just made me impatient", She reasoned
The excuses were endless, the justifications boundless,
No one ever wanted to acknowledge the presence of their inherent lackness

The individual was lost in the land of the unknown, no longer aware of how long they had spent trapped, how they had ended up in that stifling prison or how to get out of it. The light seemed so appealing compared to their current desolation and despair. The easiest way to rid themselves of their anguish.

They wonder about the childhood they lost;
The early innocence that was stolen, the purity that was deformed
They try to bring it back but they vividly remember
the scraped knees brutally turned to unhealing scars
After all, coloring out of lines with broken crayons, could never really get rid of the flaws

Unbeknown to the individual, the voices were no friends, either, the light was not as pleasing as it seemed. Their offerings of peace and harmony were nothing but sweet lies of the dead.

For a moment, the individual imagined gaining enough strength to rid itself of the hold of the shadows, getting away from the freezing light and the dimly lit room. They fantasized of finding the true happiness and peace, which they had heard about in the tales told by the rare few.

Let go.

And the fantasy shattered. They were back in the room with the blinding light and the persistent shadows. Torn between the two worlds, trapped in their own torment, hopelessness engulfing them and the struggle to break free continuing forevermore.

The ink bleeds out through their fingers and pores

Crucifixion of their heart and body, occurs in echoing screams evermore

They channel the pain into something with a heart-wrenching core

Give them a pen and paper, their words will burden your soul

Title Yet to be Decided

By Ayesha Saqib

Kaise kahoon mai alvida.

It's happening, she thinks to herself. It's really happening. Death might actually be the biggest, harshest reality of life. Yet it all seems unreal to her in this moment. The words keep echoing in her head, getting louder and louder – *he died, he died, he died*. Nope, even the deafening noise in her head couldn't make it seem real. "He died", she repeats to herself. Nope, didn't work. Maybe if she got out of bed, it'd turn out to be a dream and then it would make sense why it seemed so unreal to her. She gets out of bed, washes her face, looks in the mirror longer than usual. Am I awake yet? Nope. Still happening. The noise gets louder, becoming incomprehensible. *He died*. Nope. She walks out of her room and into the living room. It's empty. From the other room, she can hear her mother sobbing. That's weird, she thinks. Amma never cries. *He died*. Oh. Is this really happening? She stands at the door to her mother's room for a few minutes that feel like an eternity, but she cannot gather the courage to walk in. She goes to her brother's room instead. He's not crying, that is a good sign. "Why aren't you packing?" he asks her. Packing for what, she thinks. Where are we going? Oh. *He died*. Death, like every other aspect of life, takes its time to settle in. We must, however, allow it to settle in. We must open the door for it. She opens the door to her mother's room quietly, as if making a sound would make everything seem too real for her to be able to handle. Amma is sitting on the sofa, with her face in her hands. She can hear her sobbing quietly. He died.

Kaise tumhe juda karoon.

She sits behind her mother in the car. She thinks no one will find out that she's only sitting there to avoid seeing Amma cry. It's a long journey, even when your grandfather hasn't died. It's longer than a lifetime if he has. The noise in her head has drowned out, or perhaps gotten too loud for her to be able to hear it anymore. The memories come rushing in, to ensure that there is no empty space in her mind, no place to hide. Ironically, the first memory is from her grandmother's funeral. Not even a year earlier. She's walking outside the family home, searching for him but trying not to make it too obvious. Then she remembers the place where the two of them would usually sit and have tea in the evenings. An old bench near the park. She walks up to the bench and finds him staring off in a daze. She sits beside him for what seems like a few minutes, a few years. Maybe he hasn't noticed her, because he's still staring in the same direction. A few minutes later, he puts his hand over hers. Neither of them says a word. In the car, she appears to be staring off in a daze. The second memory creeps into her mind slowly. A summer evening, a few months after her grandmother died. She sits on

a charpoy in the porch. “Beti, could you play *Jab Tere Sheher Se Guzarta Hoon* by Sharafat Ali Khan on your mobile phone?” There’s silence for a while, she can’t decide if it’s a good idea. *Kesi aandhi chali hai tere baad, din guzaara hai kis tarah mainey, raat kaise kati hai tere baad*… she looks up at him. He's sitting with his face in his hands, sobbing quietly. The memory fades away into a distance. Another one takes its place. Then another. Then another. The hours go by as she relives a lifetime in her mind. It seems so real, the world in her mind. The car comes to a stop. She looks outside the window and sees a crowd of people outside the family house. *He died*.

Aane ka waada tum karo.

She’s sitting in his room now. It’s 12am. The funeral is over, and it’s a bit of a blur still. She tries to remember it but can’t. The silence in the room is deafening, even worse than the noise in her head. The last time she left this room, all she could think about was coming back here, to the room that had always felt like home to her. But now that she’s back here, it doesn’t even feel like the same room. The furniture is all in the same place that it has always been. The date on the calendar says November 4. His medicines sit on top of his side table. The radio is by the pillow. His mobile phone under the pillows as it always was. The books on the shelves are arranged by color, as they always have been. Every single thing in this room is exactly the same as it has always been. Yet, somehow, the room feels completely strange to her. Nothing in the room feels ever remotely familiar. She starts to make the bed, then stops and falls down to the floor. She sits there for a long time, with her face in her hands…sobbing quietly. After a while, she hears someone open the door. It’s Amma, who looks at her with an expression that would stay in her mind for all her lifetimes. She gets up and hugs her, scared that if she lets go, Amma would break into pieces. Eventually, Amma is the one who breaks away. “He died”, she whispers.

Milne ki mai dua karoon.

7:07 pm, three days later. She’s sitting on the bench by the park, with a book of poetry in her hand. The first poem she ever memorized was so that she could recite it for him. For as long as she could remember, he had recited poetry to her. Faraz, Mir, Faiz. Almost all of the poetry she knew was because of him. For a while, she stared at the book in her hands. Even on the bench, the memories found her. It was the summer break of 2013, and she was sitting in her grandfather’s room with her aunt and a young cousin. Her grandfather was watching television, when all of a sudden, he turned it off and started reciting a poem by Mir Taqi Mir. *Yunh uthey uss gali se ham, jaise koi jahaan se uthta hai*. It was the first time he had ever done that, so the memory had stayed with her extremely vividly. Another one. Two months before November 4. Everyone is standing by the gate, saying goodbye to her as her break comes to an end. Her grandfather, taken away in bits by cancer, used up all his strength

to get out of bed and see her off to the car. She hugged her aunt, then her uncle, until there was no option left but for her to hug him. She held on to him carefully, like holding onto a fragile vase on the verge of breaking. He held on to her longer than usual, perhaps wishing she'd stay a little longer. "Mai aapko chand ashaar suna sakta hoon beti?" "Jee, jee zuroor." *Kaise kahoon mai alvida, kaise tumhe juda karoon. Aane ka waada tum karo, milne ki mai dua karoon*. The last of the memories. The last of life as she knew it. It's over. He died.

Cassette Dreams

By Burhan Zahoor

It was a weird dream. Thought that my head would burst open due to the immense pain, I opened the side drawer, took out a few pills, shoved them in my mouth, and took a sip from the glass that had been there since the previous night. I removed the blanket, sat on the bedside, and pondered over the dream I had just woken up from. Freud said that dreams are the disguised fulfilment of our repressed desires. Human beings are simple creatures, but they try to make things complex just to romanticize the suffering, all to find meaning in life.

I have had a habit of writing my dreams since my father died because that was when all my dreams were filled with nostalgia, regrets for the unfinished sins, and an air of melancholy. I shook my head so that all the thoughts might go away. But they did not. Tired from all this, I began to write the dream I just had.

There was silence all around. I started moving forward without noticing the uproar of autumn-struck leaves beneath my feet. It was a strange graveyard. There was a single path with graves on one side with their inscriptions facing you and a flowing river on the other. The moonlight, fighting its way through the tree branches, illuminated the path. I looked at the river where water moved like time: slow, steady, and continuous. The reflection of the moon was jolting as a fettered prisoner in an attempt to flee. The moon seems tired of the daily routine and wants to run off, sliding over the water current. Awestruck and afraid of the conundrum of nature, I briskly started to march forward. My footsteps echoed, and the whole universe knew I was there. I felt exposed as if someone had removed my clothes and felt a million eyes were on me, the hair on my neck erected. I crossed my arms around my chest as if this would protect me against all the evils.

There were graves as far as my eyes could see. There was tall grass behind the graves, tossing their head around, and between them, there was space where time stood still. A sense of relief lingered through my body. All the regrets, problems, and sufferings that make a life restless are buried here. I sauntered now as I was reading the names from the inscriptions. I saw my father's name written on one of the inscriptions, and I stopped. A small flower was growing from his grave, indicating the continuous conflict between life and death.

The inscription had a jagged break along its edge, sending a sharp pang of agony through my heart. The man who would always replace our worn-out toys with brand new ones whenever they broke. Now, I am standing helplessly at the side of his broken inscription, unable to repair it. It was too much to bear.

I moved forward and noticed that numerous inscriptions needed to be fixed. On one inscription, the dust of time had removed the name on it. A thought struck me like thunder so what will be the testimony to their existence? Who are these people? Does a man need a concrete slate for recognition? Who will remember them?

I felt sorry for them. I looked around. There was the darkness of anonymity all around, ready to devour everything. It was terrifying. I couldn't breathe, gasping for air; I ran towards the river, which now was still, and started drinking from it.

After, I sat at the bank and put my back against the tree. I rubbed the tree's rough trunk in the hope that it might start answering my questions, a genie there might be. The silence was louder than ever.

I woke up.

It was a weird dream. But, as Freud said, “Dreams are the disguised fulfilment of our repressed desires’’, so I want to be great. I want to leave a legacy behind. I want to become immortal. But, whenever I stand at the wall of the present and glance over the past, there is nothing but an abandoned terrain. No tree to protect me from the scorching heat of dismay and hopelessness. There is melancholy that I have romanticized too much. And whenever I look toward the future, uncertainty is waiting to destroy me. I do not want to climb down the wall, but the drudge of time is determined to make the wall crumble.

The noise of the hammer hitting the wall.

It is the rumble that terrifies me.

It was a weird dream, but it showed what I wanted.

Maybe Freud was right, after all.

A Bag of Coins

By Musab Idrees

Allah Yar was slowly dragging himself after a grueling day of work. He sold sugarcane juice in the corner of a busy roundabout. The sky had turned midnight blue and the city had wrapped itself in a restless stupor. The faint murmur of drug addicts and hoodlums could be heard in the dark corners of the streets. His legs felt heavy and he could not wait to crash on his bed. The bed that his wife brought as her dowry eighteen years ago.

The yellow street light illuminated patches of the street at various intervals. The street looked like a rotten mango, dark and decaying in the filthy corners and bright yellow where the townhouse stood like an indestructible monument. He could see a young woman in the distance walking briskly. “What is a young woman doing wandering the streets at this hour?” he thought. He did not let his thoughts bother him much and continued his journey home. The woman’s body was tense and alert like she was afraid of something even though there was no one on the street. ‘Women are always afraid of something.’ he muttered under his breath.

The woman was going the same way he was going. She left his line of slight. “Why do women have to be afraid of everything?” That day he did good business. It had been a hot, sweltering day and he was able to sell all of his sugarcane juice in one day. The bag of coins clanked in his pocket. He had put the sweat-damped wad of cash in the pocket of his shalwar for extra safety. He was a mile away from home when he heard heavy footsteps and shouting ahead of him. He was not going to lose his hard-earned money to a bunch of mongrels. He ran towards a large statue and hid behind it. The statue was of a woman carved in a cloak of grey stone. She held a sword in her right hand and a pair of weight scales on the other. Her face was expressionless like someone had sewn her mouth shut.

The footsteps transformed into three dark men running towards the woman as if they were running on a surface of water. The woman let out a loud shriek but the silence of the street engulfed her cries. She resisted the force of the three men but her resolve dissolved into a fit of helpless pleading. Allah Yar had one hand on his bag of coins and the other hand on the foot of the statue. He was not looking at the woman or the three men. He was just staring across them into nothingness. The men carried the woman by grabbing her from each limb except her right arm. The woman’s right hand clawed at the men helplessly. The men carried her away and her shrieks grew distant. The street fell dead again.

Allah Yar’s pace was quicker this time as if his heels were on fire. When he finally entered his house, he did not say hello to his wife or speak to his daughter about her day. He ate his dinner in

silence and went to bed. For a long time, he stared at the ceiling pointlessly. A seed of self- disgust was sprouting from his heart. He could not comprehend the events that happened in the street. That was when it struck him. That was when he understood why women were afraid of everything. That is when he knew he belonged to the rotten part of the mango.

Paws

By Rawhawn Ali

I hear the familiar, yet painful rumble of sounds, and open my eyes. It is never easy to leave my resting spot – but sleep does not fill up a stomach.

The day is clear, and the mists are not here.

Thud, thud, thud.

I hear the thuds all about me. Footsteps, belonging to humans. Some are good, and some are bad. But they are all loud.

As I stretch, I wonder how these two legged creatures, humans, go about their days when all they must hear are the loud footsteps, and the rumble of many voices, drowning each other out.

From the great roar, my ears pick up the tinkle of her laughter and I hasten my steps. They are soft and light upon the ground. I see her from a distance, and I scent food upon the air.

Good.

She is sitting on the stairs, a strange smell about her as usual. It is not a bad smell; there is warmth and food mixed in it too. She sees me and smiles.

"Bella," she says softly, and reaches out to touch me.

Bella. It is a strange sound that she makes when she says that. I think she calls it a name. Humans often make these different sounds when they see each other.

I purr and let her touch me a little. It is a strange thing that she does, but I think it makes her happy. I know that she will feed me once she is done, and I can leave once there is food in my belly.

And her touch does not feel unpleasant.

The voices are not here today.

They go away sometimes, when the mists are thick and it is hard to see or even hunt. It is not a good day, and the air smells wrong.

I have little hope of food, and roam around the cold floors desperately. Just when I am about to give up, I hear some voices, deeper than hers, and feel hope. I quicken my steps and trail them.

The voices have food with them. My belly rumbles as the smell wafts to my nose.

My paws hit the ground softly. As I near them, I see three humans, and mew for help.

They turn and look at me. One of them lets out a guttural voice, and tries to chase me away. But I cannot give up now; no food means death.

One of them stands up, and starts thudding towards me. I walk to him, sniffing for food, driven by hunger.

I fail to see his leg rise in the air.

I must run.

I limp around, hobbling on three feet, and try to clean my eye out. It is futile. And, there is nothing- only the cold, hunger, and pain.

It is cold. My body is trembling.

I must hide.

My ears prick up as I hear sounds – a light footed tread. I quietly hobble away, leaving wet, painful marks on the floor, and try to hide my shaking body into a dark nook.

Perhaps it is one of *them*.

My nose perks up as the musty smell of a nest wafts to it. Good, there may be food tonight after all. My belly rumbles, uncaring of the pain it has brought me. There is no warmth inside my body; only outside of it, as my stubbornly warm blood seeps out. I wonder why it does not go cold like the rest of my body. It oozes out, a drop at a time, painting my paw red, and leaving trail marks everywhere.

Marks for *them* to follow.

There is a light tread, once again. I try to stop shivering, and push myself further into an impossibly small hole. But I feel a spot still hanging out.

I hear a creak. The light footed tread is here.

“Bella,” a female voice calls softly.

“Bella.”

She is here. She knows my name, but she is a human too.

Must not go out. Must not.

I have to wait until the mists are gone.

Until they are gone.

“It's alright.” The soft voice croons.

My body shakes even more. They are bad. They hit me. My paw throbs.

Maybe she will hit me too. Kill me. Hurt me.

I squeeze my eyes shut.

Hours pass. By now I doze off, an ear still open. My starving body cannot keep me asleep, not fully.

Then I feel the cool rush of air on my back.

And a soft voice calls.

“Bella, come.” She says.

My voice dies in my throat. I shake.

She kneels down, and reaches out. I have no strength to fight as she holds me to her chest. She is warm.

“It's going to be alright.” She says.

I think I taste saltiness on her breath.

Somehow, the words comfort me. I sink into her warm embrace.

And I smell food.

She smiles.

Perhaps it will be alright.

The new room is cold, and the shiny floor is too. There is light above me – too much of it. Someone with strange white hands prods me.

“The cat's going to be okay,” says the white handed man, taking his fur off, revealing brown paws underneath. He beams at her.

“That was very kind of you,” he says.

The place is quiet and smells different. There are no more thuds, or voices.

It is warm.

There is food in my belly.

I can see with both eyes again.

As I doze, I hear the light footed tread.

“Bella,” she calls.

This time, I do not try to hide.

A Tale of Sweet Fragrances

By Salman Tahir

Many years later, as Makhmoor was to remember the time he spent in GCU, he couldn't help but recall the sweet memories of the Golden Shower, Arjun Tree, Sukh chain, and Palm trees in Shahab Garden and the Amphitheatre. A handful of solace in the melancholic evenings of October and November that came directly from the sweet fragrance of Arjuna fruits blossomed under the shade of Scholar Garden, it had the power to heal a heart-ailed with provisions of a precarious future. Makhmoor came to Government College, a few decades ago, with such provisions.

The mystery of his name was in some way related to the unfolding of his life events.He had asked his mother about his name several times, she referred him to his grandmother for a deeper inquiry. Initially, with shaking hands, her grandmother refused to tell the little boy of twelve years old about that mystery. He told his grandmother; that his fellows make fun of him by calling him drunk. On hearing such words, his grandmother said in a shrieking voice, "Ghazab Khuda ka, how come they know the meaning?" Makhmoor said, "Their parents make fun of his name by saying Kamal has given such a non-religious name to his son." Grandma narrated, 'Long ago when you were born, the son of your grandfather's friend, who was a teacher in Lahore came here. Your grandfather asked him to give this cub his name, and he said "Makhmoor" and that's how you got your name.' This narrative did not satisfy him. Yet, he had to live with it.

He was born in the small city of Dipalpur and lived almost two decades of his life in that city. During the last few years of his stay, he found a bookshop where the owner, Razzaq, who in his youth worked as a shopkeeper in a bookshop near Anarkali. After his marriage he settled in Dipalpur and soon he adopted a serious intent to open a shop for books to guide the future generations. Makhmoor during his high school touched upon a few abridged novels by Charles Dickens and Jane Austen. Razzaq Chacha was happy with his progress, as he later on allowed him to borrow the books. However, he was always telling Makhmoor that life demands an individual to dwell in the deeper realm of religious studies, as it should be the meaning of one's life.

Pursuing his interests, he got admitted to GCU's English department. In the beginning, it all felt so charming. For Makhmoor, mornings without the sniff of heavily perfumed flower beds along the edges of a limitless Shahab were no mornings. The rustic pastel red of the groovy building brightened up the elation of his heart. He was intoxicated, that is until the wild and tenacious love was an ephemeral truth in the end. He could no longer contend himself with aesthetics. Time demanded something bigger than mere words that were just complimenting his incessant void. Lahore felt like a strange city with a swift stride, fit for only native citizens.

One day, he was sitting in the Scholar's Garden. Rays of light were coming from an unnatural angle bending slightly along the oblong square attic above the newel vestibule of the Vice Chancellor's office. He brooded over a line from Hassan Mairaj's *Rail ki Seti*: "It takes a generation to cross this Ravi of stalling and hesitation until you get the confidence of a native Lahori." His stride had started yet he was nowhere near the goal. During first year of his stay, he would jumble up the whole lecture with curious inquiries and inquisitive philosophical questions. GCU was his first introduction with words like culture, traditions, and discourse. Before that, he had always been creating analogies in his mind, connecting dots and tangling the philosophical aspects of his ideas. He had a lot of questions in his mind. I met him during his first year, Makhmoor was a busy person. Not because he had a lot of friends but because his mind was catching many streams all at once. He was indeed intoxicated but with literary renditions.

Until Makhmoor reached his second year, he became all quiet. One evening he asked me, "What does nothingness have to offer?"

I replied, "I don't know, maybe, something that is actually nothing."

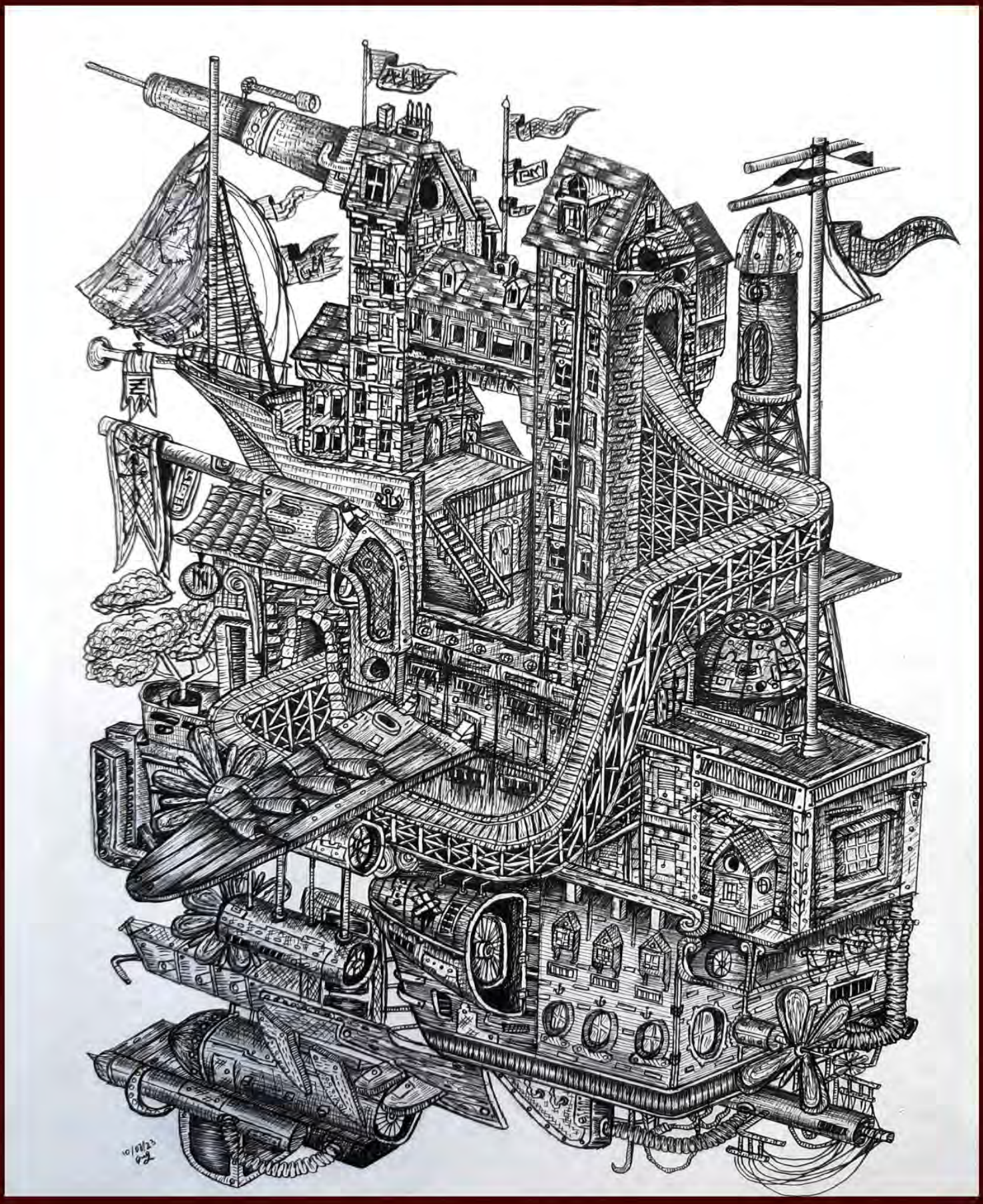
He said, "Have you ever noticed that right before you start writing or stand in front of a canvas to paint something, a sea of possibilities is available to you? Those infinite possibilities together are nothingness. Limitless possibilities without any substantial existence. Here, the magic happens and that magic is before writing or painting you put a limit to those infinite ideas. You select the finest possible chunk out of your imagination, craft it, and embellish every bit of it. In the end, you are left with something that has a concrete existence."

Makhmoor learned it the hard way, vexed by the insignificance of the past and a precarious future. However, his persuasions could not make him acquainted with Lahore. He published his first novel in Lahore and wrote several after leaving Pakistan. After staying in Lahore, for a decade, he went abroad. I met him after two decades in Ohama, Nebraska. He is still teaching at the University of Nebraska. He told me he misses GCU and Thandi Sarak.

Whenever I ruminate over the memories of GCU, I remember him very much. The acme of this place actually belongs to people just like him. Well-versed in poetry, dwelling upon the aesthetics of cinema. In university life, time often passes like a slow cow moving along a pasture of tedious monotony. Students at one point or another try to give it a semblance of meaning. Some find ecclesiastic delight in poetry, others in politics, theory, or an appreciation of aesthetics. However, a wallop of nothingness is definite. Makmoor in his intoxicated state of mind solved that riddle for me. This beauty belongs only to GCU, under its shadow; he found a fine-tuned connection between his past and present in a harmonizing symphony.

COMIC SECTION

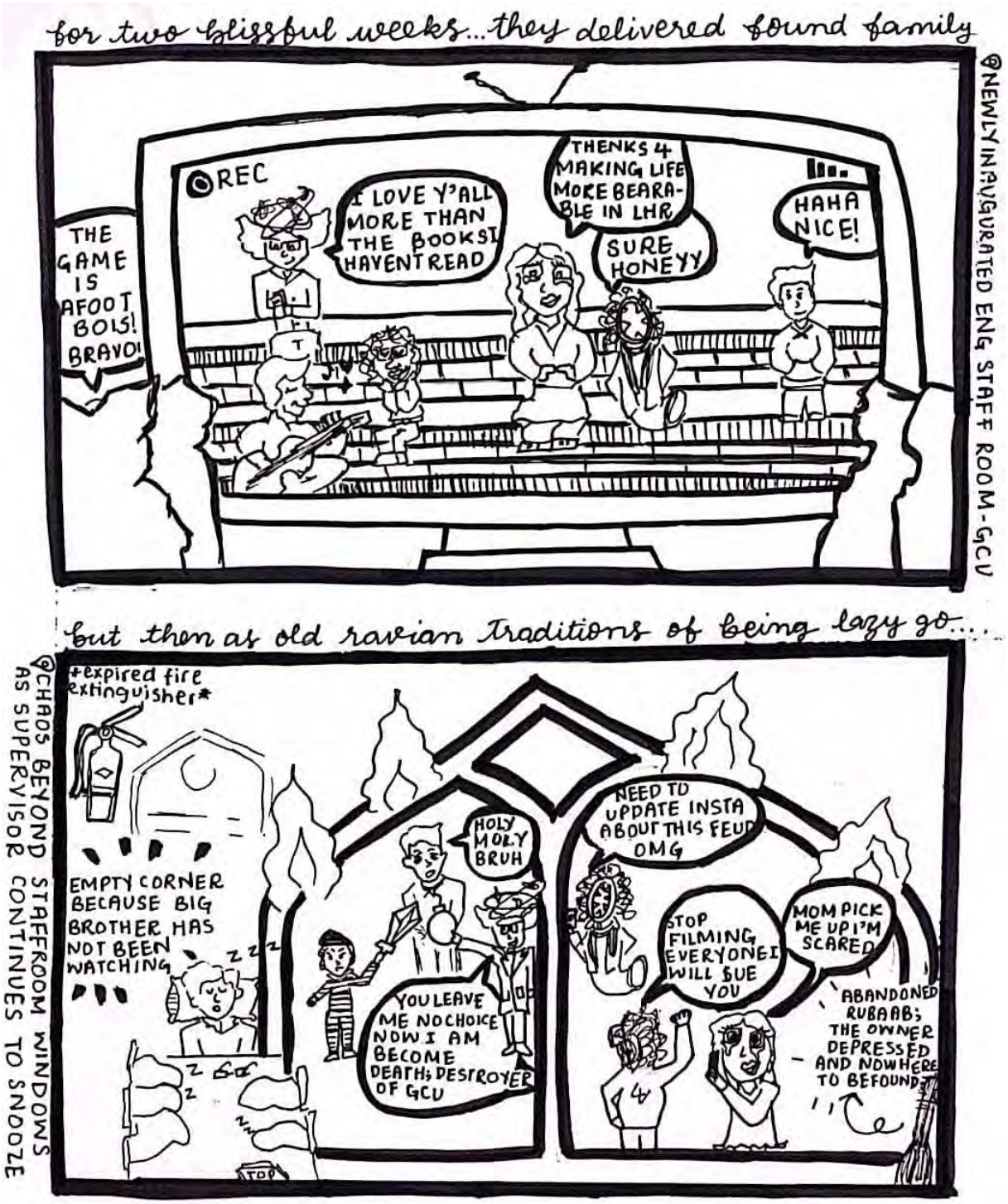
ARTWORK BY HUMNA NAVEED

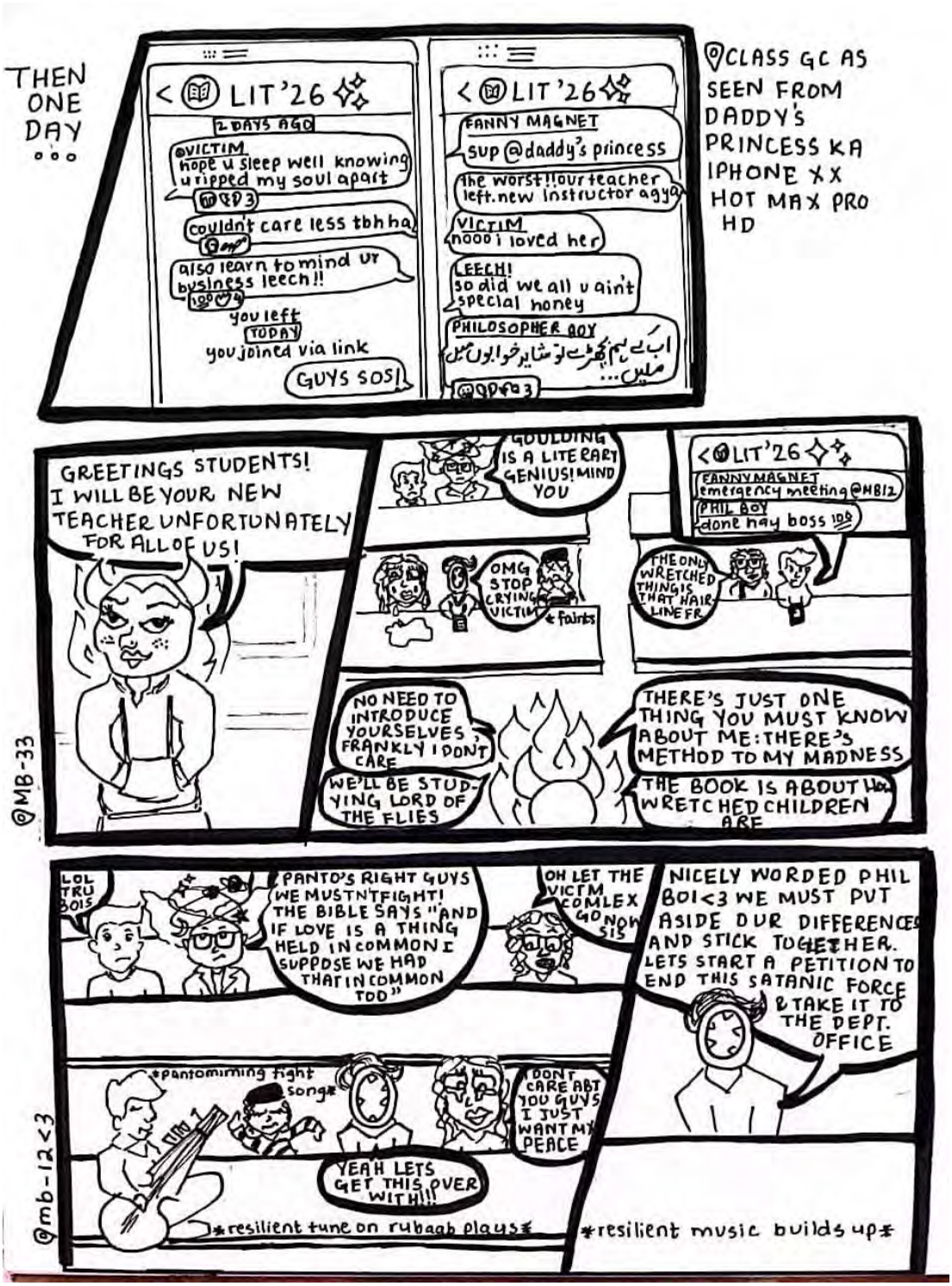


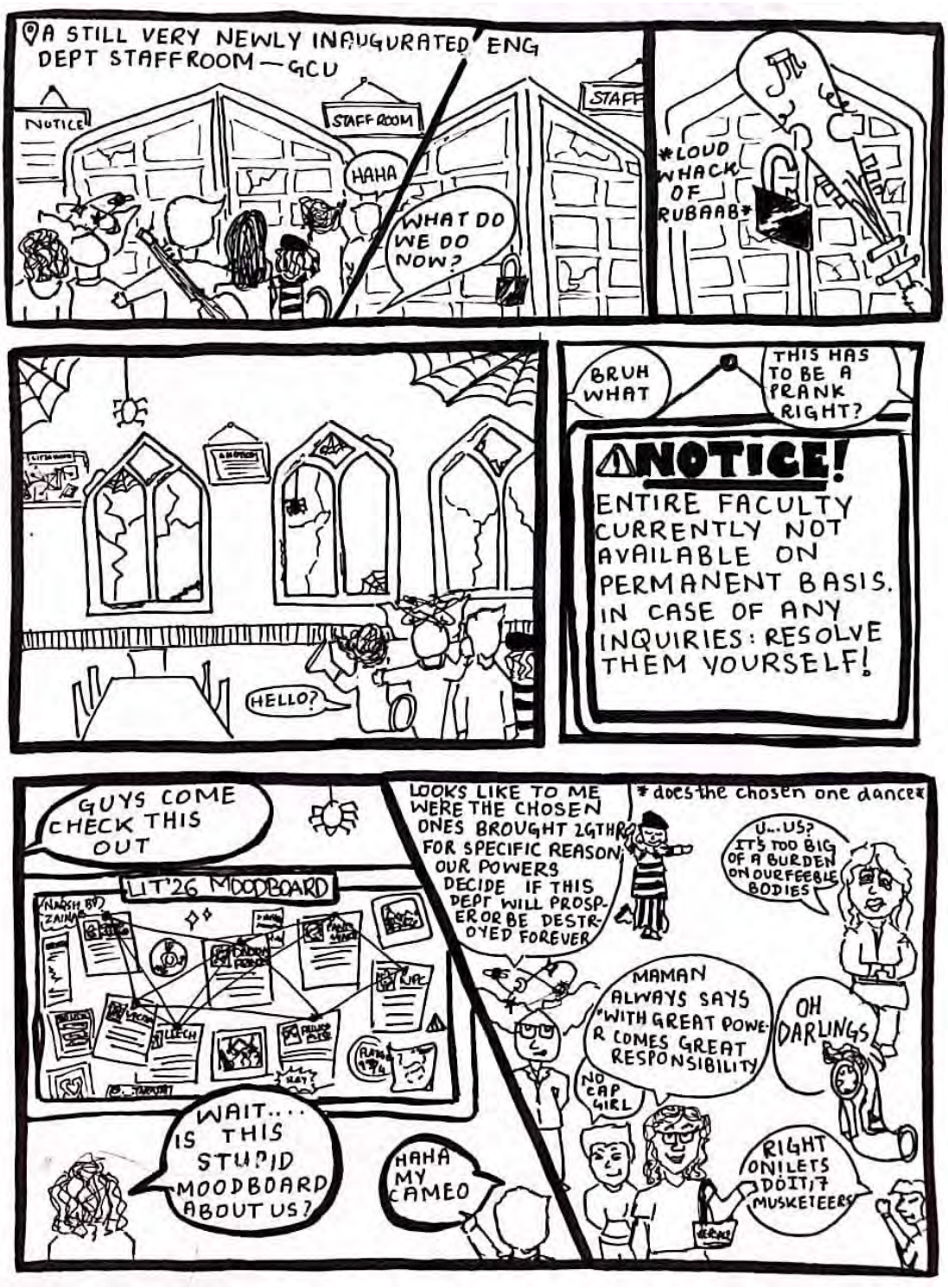

AREEBA KHAKWANI
HUDA HAMID SAHI
The Social Experiment
YOU DON'T GET TO BE A RAVIAN WITHOUT MAKING A MILLION ENEMIES
disclaimer: all persons and events are rooted in reality are purely intentional. it comes from a place of love and is totally unapologized for
@A VERY NEWLY INAUGURATED ENG DEPT STAFF ROOM — GCU
GENTLEMEN! WE'RE GATHERED HERE TO RESOLVE THE IMMINENT PANDEMIC DISMANTLING OUR ESTEEMED DEPARTMENT
COVID ?
THAT'S SO 2020 PLS
IT'S THOSE DARNED STUDENTS! THOSE STICKY CREATURES WHOSE PRESENCE FEELS LIKE BEING SLAPPED BY A SWARM OF MARSHMALLOW BATS: A SENSORY OVERLOAD OF IRRITATION AND OBNOXIOUS SWEETNESS!!!
OH! I DON'T BELIEVE IT'S THAT BAD
LET US NOT FORGET!!

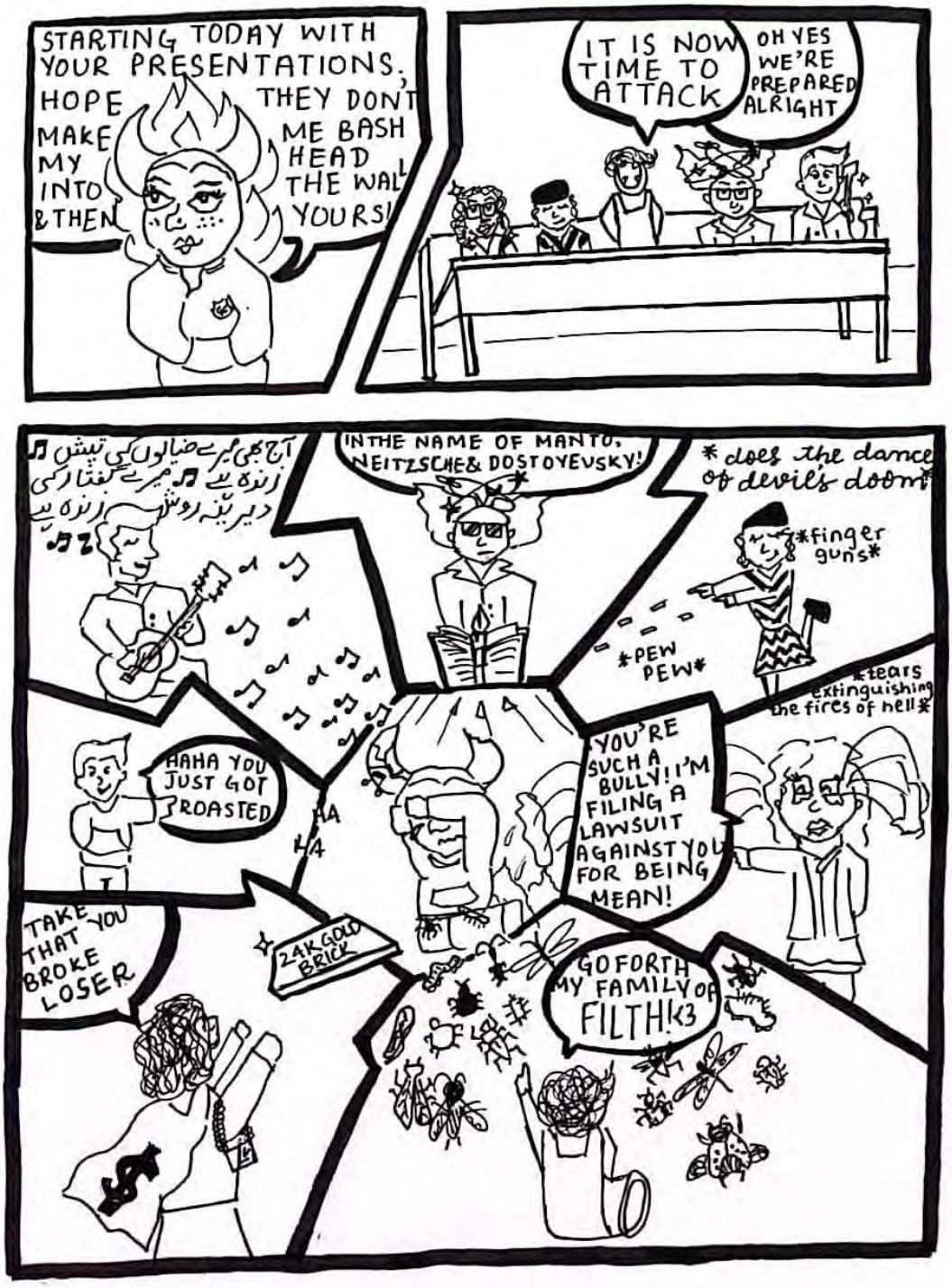

FLASHBACK
@OVAL GROUND - GCU
I LOVE MY JUNIORZ
@INTERCAFÉ - GCU
Juice Bar
AYE AYE MON CAPITON
UWU M'LORD :)<3 >< =~•
(HOT)
@AMPHITHEATRE - GCU
A VERY SRS BOOK - DOS TO BESTIE
@NDC - GCU
Speak Now
GIRLS JUST WANNA HAVE FUNDAMENTAL RIGHTS
♫ GO AHEAD AND CRY LITTLE GIRL NOBODY DOES IT LIKE ♫YOU DO
OPEN MIC '22
THE SITUATION SEEMS TO CALL FOR URGENT AND DIRE MEASURES. FOR THIS, WE MUST CONSULT B.I.G BROTHER
السلام عليكم!
BONJOUR! नमस्ते!
こんにちは! HOOT!!
I HAVE BEEN WATCHING


THIS FILE CONTAINS MY SUPREME PLAN. IT HOLDS THE NECESSARY INGREDIENTS FOR THE CULMINATION OF A BATCH SUPERVISED TO ENHANCE AESTHETICS OF THIS DEPT.
TOP SECRET
LADS & LASSES! NOW THAT YOUVE SIGNED YOUR NDAS, I BID THEE WELCOME TO 'THE SOCIAL EXPERIMENT' WE HAVE SELECTED THESE STUDENTS ON THE BASIS OF THEIR UNIQUE CAPABILITIES
THE FANNY MAGNET
-rizzful musician
-a good old fashioned lover boy™
-oozes charm & lively music
THE VICTIM
-debby ryan & bella swan's child
-zero personality
-adds to the aesthetics (cause pyaari)
DADDY'S PRINCESS
-rich $$$
-rich £££
-rich ¥¥¥
-icon (rich)
THEE PHILOSOPHER
-radiates
-knows the ultimate truth
-Fav Quote: "I am so clever, sometimes I dont understand a word of what im saying."
THE PANTOMIMER
-theatre kid™
-does not speak
-expresses themself through interpretive dance
SOCIAL LEECH
-parasite™
-main character syndrome
-also every other made up syndrome
NON-PLAYER CHARACTER
-"sinf k aitbar sy meri zindagi krazy hai"
-he just stands there tbh
-haha
IN PLAIN WORDS.. THE RECRUITEMENT IS BASED ON "controversial quota")
♫ memories -maroon5 ♫
BATCH '26


for two blissful weeks... they delivered sound family
REC
THE GAME IS AFOOT BOIS! BRAVO!
I LOVE Y'ALL MORE THAN THE BOOKS I HAVENT READ
THENKS 4 MAKING LIFE MORE BEARABLE IN LHR
SURE HONEYY
HAHA NICE!
@NEWLY INAUGURATED ENG STAFF ROOM-GCU
but then as old ravian traditions of being lazy go....
@CHAOS BEYOND STAFFROOM WINDOWS AS SUPERVISOR CONTINUES TO SNOOZE
expired fire extinguisher
EMPTY CORNER BECAUSE BIG BROTHER HAS NOT BEEN WATCHING
HOLY MOLY BRUH
YOU LEAVE ME NO CHOICE NOW I AM BECOME DEATH; DESTROYER OF GCU
NEED TO UPDATE INSTA ABOUT THIS FEUD OMG
STOP FILMING EVERYONE I WILL SUE YOU
MOM PICK ME UP I'M SCARED
ABANDONED RUBAAB; THE OWNER DEPRESSED AND NOWHERE TO BE FOUND


THEN ONE DAY ...
LIT '26
2 DAYS AGO
@VICTIM hope u sleep well knowing u ripped my soul apart
couldn't care less tbh ha
also learn to mind ur business leech!!
you left TODAY
you joined via link
GUYS SOS!
FANNY MAGNET sup @daddy's princess
the worst!! our teacher left. new instructor agya
VICTIM nooo i loved her
LEECH! so did we all u ain't special honey
PHILOSOPHER BOY اب ہے ہم بچھڑے تو شاید خوابوں میں ملیں...
@CLASS GC AS SEEN FROM DADDY'S PRINCESS KA IPHONE XX HOT MAX PRO HD
GREETINGS STUDENTS! I WILL BE YOUR NEW TEACHER UNFORTUNATELY FOR ALL OF US!
@MB-33
GOULDING IS A LITERART GENIUS! MIND YOU
OMG STOP CRYING VICTIM
faints
FANNY MAGNET emergency meeting @HB12
PHIL BOY done hay boss 10$
THE ONLY WRETCHED THING IS THAT HAIR LINE FR
NO NEED TO INTRODUCE YOURSELVES, FRANKLY I DONT CARE
WE'LL BE STUDYING LORD OF THE FLIES
THERE'S JUST ONE THING YOU MUST KNOW ABOUT ME: THERE'S METHOD TO MY MADNESS
THE BOOK IS ABOUT HOW WRETCHED CHILDREN ARE
LOL TRU BOIS
PANTO'S RIGHT GUYS WE MUSTN'T FIGHT! THE BIBLE SAYS "AND IF LOVE IS A THING HELD IN COMMON I SUPPOSE WE HAD THAT IN COMMON TOO"
OH LET THE VICTIM COMLEX GO NOW SIS
NICELY WORDED PHIL BOI <3 WE MUST PUT ASIDE OUR DIFFERENCES AND STICK TOGETHER. LETS START A PETITION TO END THIS SATANIC FORCE & TAKE IT TO THE DEPT. OFFICE
pantomiming fight song
DONT CARE ABT YOU GUYS I JUST WANT MY PEACE
YEAH LETS GET THIS OVER WITH!!!
resilient tune on rubaab plays
resilient music builds up
@mb-12<3


A STILL VERY NEWLY INAUGURATED ENG DEPT STAFFROOM — GCU
NOTICE
STAFF ROOM
STAFF
HAHA
WHAT DO WE DO NOW?
LOUD WHACK OF RUBAAB
HELLO?
BRUH WHAT
THIS HAS TO BE A PRANK RIGHT?
NOTICE!
ENTIRE FACULTY CURRENTLY NOT AVAILABLE ON PERMANENT BASIS. IN CASE OF ANY INQUIRIES: RESOLVE THEM YOURSELF!
GUYS COME CHECK THIS OUT
LIT'26 MOODBOARD
WAIT.... IS THIS STUPID MOODBOARD ABOUT US?
HAHA MY CAMEO
LOOKS LIKE TO ME WERE THE CHOSEN ONES BROUGHT 2GTHR FOR SPECIFIC REASON. OUR POWERS DECIDE IF THIS DEPT WILL PROSPER OR BE DESTROYED FOREVER
*does the chosen one dancer
U...US? IT'S TOO BIG OF A BURDEN ON OUR FEEBLE BODIES
MAMAN ALWAYS SAYS "WITH GREAT POWER COMES GREAT RESPONSIBILITY
OH DARLINGS
NO CAP GIRL
RIGHT ONI LETS DOIT!? MUSKETEERS


STARTING TODAY WITH YOUR PRESENTATIONS, I HOPE THEY DON'T MAKE ME BASH MY HEAD INTO THE WALL & THEN YOURS!
IT IS NOW TIME TO ATTACK
OH YES WE'RE PREPARED ALRIGHT
INTHE NAME OF MANTO, NEITZSCHE& DOSTOYEVSKY!
* does the dance of devil's doom*
finger guns
PEW PEW
tears extinguishing the fires of hell
HAHA YOU JUST GOT ROASTED
HA HA
YOU'RE SUCH A BULLY! I'M FILING A LAWSUIT AGAINST YOU FOR BEING MEAN!
TAKE THAT YOU BROKE LOSER
24K GOLD BRICK
GO FORTH MY FAMILY OF FILTH!<3


CHAMPIONS<3
VICTORY SELFIE!
♫ immortals – fall out boy


That's all Folks!

FLASH FICTION

IMAGE PROVIDED BY ELEEN RAJA



Tomorrow will Come Anyways

By Jasir Shahbaz

I was talking to a friend, sitting on one of the benches where I had sat numerous times as a student. She pointed out that it's been ten years since we joined this place as students and now, we are teaching here. Following up, she asked if I wish to go back in time. Without thinking much, I said, "No, I feel with age, you grow more comfortable in your skin, more confident in your vision of life, the invisible pressure to conform eases out". Later at night, in a conversation my friend mentioned a joke from one of our undergraduate classes, and in that moment all I wished was to go back in time. When after reaching campus, my first text would be asking him where is he? I think as you grow old things become clearer but also more complex. There were things in the past you miss today, but you also have things now, you could only imagine back then. Even though this preference for yesterday or today is not more than a conversation for chai, because no matter how you feel, you can only live in the present. I think nostalgia also comes from regret of not valuing things enough when we had them and being in a constant rush for time to progress. It's like we wanted tomorrow to arrive sooner, because we thought it would fix everything. I wish I knew back then that tomorrow will come on its time anyways, we should spend today cherishing whatever we can lose tomorrow.

She Made Me Pray the Worst for Myself

By Ayesha Khalid

"It's terminal," he says.

A calm settles over her thinking of all the times she prayed for this. When she was a 5 year old and she cried to God to make her sicker than her brother, who got the time of her mother's day. Maybe, next she would have a troubled, unhappy married life too, because her mother always fawns over her sister when she returns from her abusive in-laws. Mothers always love that child the most who is the weakest. She walks out of the doctor's room, a happy, satisfied 21 year-old who is now at her weakest.

Dead Prodigy

By Timsal Fatima

You are glinting silverware, tucked in a red velvet cloth. I am a jilted pot with shabby apertures. My bedroom windows leak while yours are bandaged by their wounds. I watch the dead crows in my derelict garden and think about the Hyacinths that bless your dawns with avian melodies. You left me to the inevitabilities of the Seventh Age. I want you to see my flower- crowned purple wounds and the marks that my dried tears have left on my quivering old lips. But you have slept like a baby, in an old photo album, to never wake up again.

An Orphan

By Ashaad Karim

The sound of a howling clock, giving company to the night that's continuously whining about the occurrence of the death of a star, a star that was annihilated in the result of a supernova. Though its luminance scattered throughout a vast realm of dreams and gave a fine value of vibrantly decorated colours but it changed completely into nothing and that is what the night mourns for. Giving all its essence to space and to a child who just turned nine, who is unable to celebrate his day as he observes his peers do so. He went to the rooftop of his orphanage shelter and began looking for his parents in what he assumed to be some faraway star. But the fact that this star he'd been talking to, each day after not succeeding in knowing who he is, was already gone and added more to the crumbling fortune of this child of God. He never knew where to begin when he sat underneath the wide sky, stuffed with seemingly tiny dots, his clairvoyance wouldn't allow him to sleep without wondering what it would be like if this man from three hundred and fifty years back hadn't been cognizant of what makes an apple drop. And that is when he wants the sound of this ticking clock to end.

Whispers of Hope in the Dying Woods

By Umamah Farooq

Overhead the looming menace of the chainsaw, two trees, Oak and Maple, murmured their silent farewells.

Oak's voice quivered like leaves in the wind. “The world darkens, friend.”

Maple's branches were bowed from the weight of shared sorrows. “Our secrets, our whispered stories, all silenced.”

“Yet, perhaps our destroyed legacy will echo in their conscience, urging change. There might still be hope for humanity left.”

“From our fall, may they learn to nurture life wherever it takes root.”

Bound by time's unbreakable bond, Oak and Maple shared one final embrace, leaving their echoes in the heart of the dying forest.

The Newspaper Boats

By Ali Rasheed

"The dark is no longer frightening, it is the light that scares," little Fatima thought, surrounded by the engulfing darkness. When someone slid a chapati wrapped in a newspaper through the hole under the door, she took the newspaper and crafted a boat out of it. This act stirred mournful memories through her thoughts. Suddenly, the door opened and she was taken to a well- lit furnished bedroom, where she was put to her final sleep. Soon she woke up only to find herself in her boat, this time much more colourful, with many more children in it, sailing through a rainbow.

Sham

By Monochrome

She reaches forward but it dies, quickly shedding pretty pink petals. She reads the sign below, “Do Not Touch! *Mimosa pudica* – known as touch-me-not, sensitive plant and shame plant.” She moves forward, touching another, another and another. The pinnate petals, folding in and drooping. Oh, the power! It is exhilarating. Hysterical laughter bubbles out of her, while people give her odd looks. She feels the rush, understands what it means to be the usurper and not the usurped. Everyone is staring at the mad woman, but no one notices the little girl in the pink frock. Observing, taking in, another mad woman in the making.

The Storm of his Memory

By Struggling Grey

He breaks her heart as he stares off in the distance. She turn his face towards herself. Neither his eyes light up nor does he say, "*Oo, mera put aaya hai*." She tries to control the rising sob, praying that it is just a nightmare. He puts a hand to his bandaged head, racking his brain for some memory, an echo from the past, and simply says, "*Kuch… Kuch samajh nahi*" She walks out of the hospital, her ears are ringing with, "*Dil todhne wale tujhe dil dhoond raha hai… awaaz de tou kaun si nagri mein chupa hai*" recalling how he used to stand in front of the television remembering his wife, laughing while crying, listening to his favourite song again and again. She keeps on walking knowing that he will never pat her head, follow her while reciting prayers or, very simply, recognize her as his own.

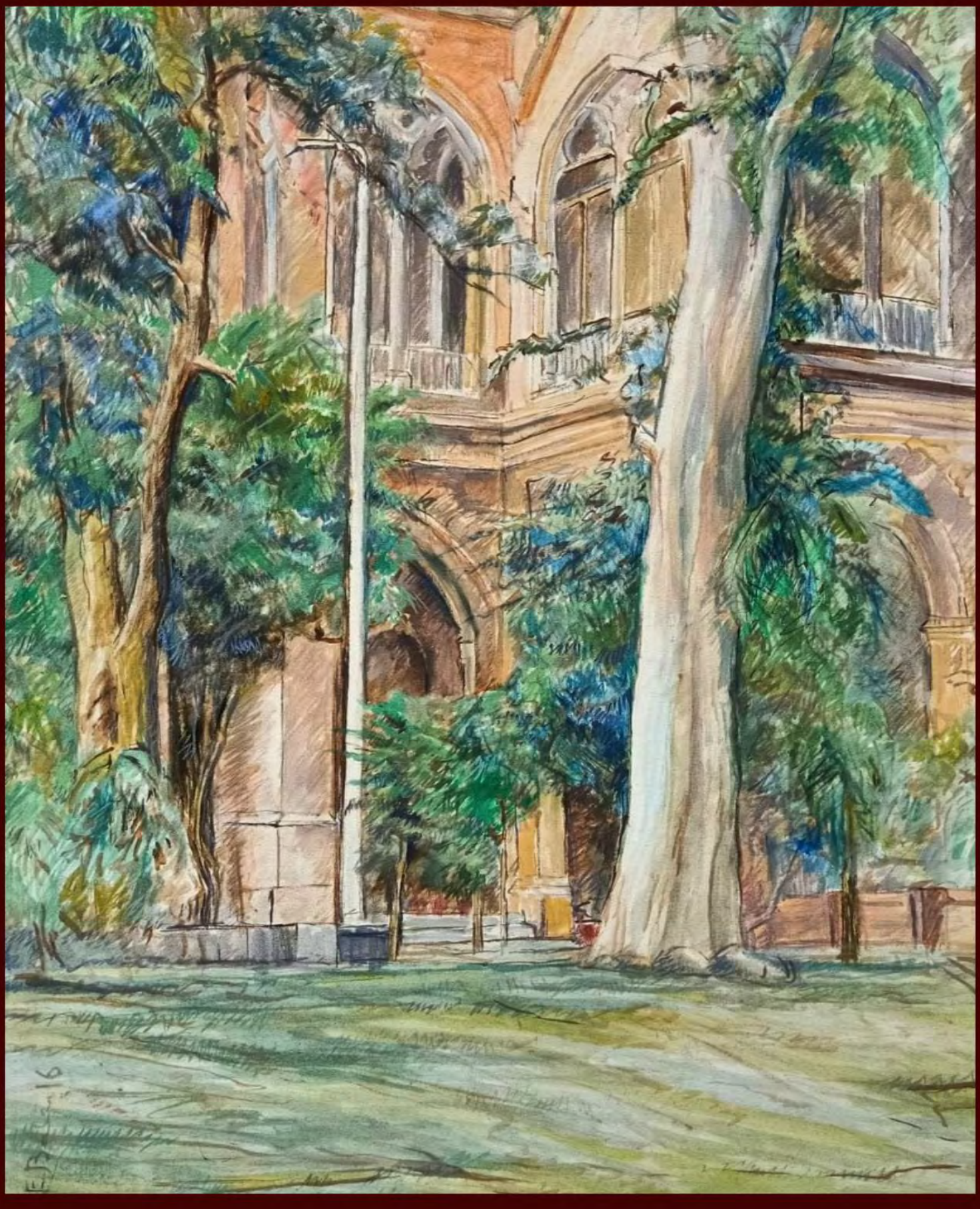
An A-4 Size Poster

By Ashaad Karim

A beach whose picture has been printed out and hung behind the yellow door of that young little boy, whose mother just had a breakdown for not being loved enough by the one for whom she'd left everything behind. She's now withered to the core like a flower that was once rich of bright colours and odour. The neighbours who always fight for those mosaic tiles that have been dipped in silver but have been fading fast. The beach sand that blows over the whole area like people coming across each other yet being mere acquaintances. And that old mother who lives alone in her single bed home: too old for the gaiety to persist, too miserable for death to lurk upon, not so significant to acquire the acknowledgement. She; ignorant of the society, never had the nerve to engulf herself in the waves of social merriment. She'd rather prefer having a glimpse of the sea out of her burly wood painted window, upon which you could see the cracks: a provision of its antiquity and endurance. A man who resembles Benjamin Button, one could look through his eyes and obverse a deep-rooted melancholy, he's been whining about his dead chicks and counts the steps that these neighbours take each day, for no reason. They all observe one another and pity their conditions, having but one thing in common; a sense of anguish drawn out of purposelessness.

ANECDOTES

ARTWORK BY ERFAN ULLAH BABAR



Navid Shahzad

"Having taught literature and media studies to young adults for the major part of one's adult life, one has learned, albeit with some trepidation, to welcome the fork in the road on life's journey. Though the 'road not taken' has remained a constant echo in one's heart, there have been occasions when one has chosen to walk the well-trodden path only to regret it later. Be that as it may, one of the decisions that one has never regretted is to have opted for an English Literature major at the alma mater of my father (late) Chief Justice S. A. Rahman's and Rhodes Scholar and brother (late) Shahid Rahman, who in addition to being distinguished Ravians were also Exeter men.

In my own person, I am deeply honoured to have been asked to write for the one hundred and fiftieth anniversary of the Department of English Literature at Government College University, Lahore where I read for an M.A. degree under the chairmanship of the late Dr. Imdad Hussain supported by a group of scholars and men of letters such as Gillani Kamran, Siddiq Kalim and Rauf Anjum.

That I became the first Muslim woman after Independence to be awarded a First Class First as well as the Diamond Jubilee Purse with my name inscribed forever in the GC Honours list for academics and drama is in large part due to the mentoring at the Department as well as the training I received from Prof. Shoaib Hashmi and Abdul Qayyum 'JoJo' at GCDC for which I owe an enormous debt to those 'masters of the arts' who taught, advised and helped the young woman I was to find my own place in the sun."

Moneeza Hashmi

“Although I have never studied at Government College, it has been a part of my growing up. As I was walking in, I looked at the Oval and I remembered the sports day as I could see my mother running around the Oval on that very day. Then as I grew up at Kinnaird College I was the debate president, so there were competitions and there was always a chance of defeating Government College which I happily did many times. And then of course I married a Ravian and then after that, I had two boys who are Ravians so the connection with Government College is forever, something that gives me goosebumps as I speak of it.

Of course, the minute I walk in it’s Faiz who steps in, and it's Faiz that makes the difference to me and I feel I have tears in my eyes the minute I walk in because this college is such a big part of the history of Lahore. So, when I got this invitation to come today; I woke up this morning with so many things to do but I said Government College calls so I have to be there. I hope that, although my grandsons are not here as model town is a bit too far from here, I hope that one of them at least becomes a Ravian.

This place is like home to me, like PTV is home to me and that’s all there is to say. It's just such a wonderful place as soon as you come in you are graced by these wonderful faces. Bokhari Sahab is someone who I remember and who I used to write letters to. And I hope Government College keeps up the tradition of remembering them like Safdar Mir. Even now, I can see him, standing right there, laughing loudly his eyes popping out, so warm and lovely.”

Qaisra Shahraz

"Many congratulations to all of you Ravians and lovers of literature on the very special 150th Anniversary of the Department of English Language and Literature at Government College University; regarded as one of the most prestigious educational institutions in Pakistan. Described in the words of your 30th Vice Chancellor as 'the leading educational institution in the Indo-Pak sub-continent.' As an educationist, I can truly appreciate and take pride in the achievement and reputation of your university.

I have such fond memories of my two visits to your Department, meeting wonderful students and staff alike, and talking about books, literature, and social issues. It is my father's former college too. The first time I was hosted by the British Council in 2002 to launch my first novel *The Holy Woman in Pakistan*, I recall the thrill I felt whilst walking down the old Victorian building, saying to myself, "My father once walked down this corridor." Your university is a very special place, a famous and highly prestigious educational landmark. Ravians, indeed have a lot to be proud of. I am delighted to share that pride with you all and join you in your special celebrations. Enjoy the anniversary!

Books, Books, Books – how I love them – they literally changed my life from a reader to an author, there were so many stories and novels read, and devoured from the age of 14. I reveled in escaping to & discovering other lands; and learning about other people, societies, and cultures; my imagination was set afire, and my world totally enriched.

For students of literature, let me remind you that literature is a feast for the soul and our senses – no doubt about it – both a luxury and a must. It's not like watching TV; it's a shared experience with thousands of other people. Open a book and you alone inhabit that world. You are the king or queen presiding over that land in your imagination. The pleasure we gain from inhabiting the world of books and the emotions we invest in them is unique to each one of us. Why did, for example, British Victorian authors like Charles Dickens write such long novels, published in short instalments – keeping the readers waiting, like the episodes of modern-day drama serials- simply to keep us hooked, make our emotions and imagination run riot in anticipation.

As a reader and an author – I have tasted both the pleasures of reading and writing for others – I hope my work brings joy to my readers. The story chosen for your magazine by the editor is taken from my latest book, a collection of stories, *The Concubine & The Slave Catchers: Stories from Around the World*. They are written over a period of twenty-five years, with a social consciousness and a particular passion for momentous historical events. Ten stories set in 10 countries. You journey with me from Peru to Poland to Pakistan, for example. There are many themes; "The Slave Catcher" is about black slavery in the USA, set in 18th century Boston: "Train to Krakow" about the holocaust

(the genocide of the Jews by Germans), based on my visit to the concentration camps of Auschwitz-Birkenau Poland: “The Concubine” about the invasion of the Incas by the Spaniards in 16th century Peru, South America – started whilst sitting on the historic monument Macchu Picchu, “The Angel,” the migrant's experience in the Middle East and UK.

My story, “The Journey,” is about the partition of India and Pakistan in 1947. As an author, I was driven to write this – to pay homage to the millions of people affected by the partition- the lives devastated and millions traumatized. It was a time when friends of different faiths became enemies and demonized each other. It left memories of my young aunt crying for her childhood Hindu friend who had to suddenly flee with her family to India. My Khallah Jan, as a child had cried for days, “Gopi, Gopi where are you?” Unfortunately, that animosity has lasted for decades. The two nations continue to demonize each other, creating divisions and hatred in people. As authors, we try in our own small ways to be peacemakers; connecting people and reminding us of our common humanity. Raju is one such character in my story, lost between two nations.”

Manzar Sehbai

"When I came to Government College, I didn't know who I was. I didn't have the slightest knowledge of what was in me or what would become of me so whatever capabilities I have now are because of this institution. This means that if you ask me this question, what I would say is that my identity, my reference is this place. In 1968, in the Amphitheatre, I gave a speech when I was running for the student union and I don't know if this will make you upset but I unfortunately won!"

Shahid Nadeem

"For students who want to pursue literature or journalism or the performing arts, I think Government College is an excellent place to breathe the air which many eminent artists and scholars have breathed in. The atmosphere, the ambience, the Logia, the mosque, the Bukhari auditorium, they're all excellent venues for creativity and the legacy and history of Government College is such that anyone would like to be creative and do something new. So, I suggest that don't just stick to the classroom when you enter the premises of Government College University."

Sarmad Khoosat

"Government College with its traditions and among so many of them I think drama and literature definitely stand out as the most shining stars of the legacy that GC has. I think I was quite fortunate back in 1997 when I joined as a student. I meant legends like Dr. Suriyya Shafi Mir and Sir Siddiqui were still around and you know, just seeing their love for the language and its literature, it was so palpable that one would feel grateful, like Sir Shoaib Hashmi was here, that was sort of his last year with the dramatic club, but you know just seeing these legends I think is such a treasure that I keep very very safe and it's very precious for me."

Student Anecdotes:

Aiman Laeeq

There are many things one can experience in Government College University that officially brand you as a part of it. As a student of the English Department at GC I have often ventured to find a solitary corner in which to cry right before a two-hour lecture, often been minding my own business only to be shat on by a bird (as an act of malice, I'm sure) and once or twice, had my shoe fall apart that took a group effort to put together again. In GC you don't just learn how to cope with all these things, or pull together a haphazard study group hours before your final. You also learn to identify social boundaries, make friendships that get you through all of it and write research papers that take your tears and produce something you want to keep as a souvenir forever.

5th semester at GC has brought on new lectures and new professors. In Dr. Arooj's class, you will learn what it means to have literature so embedded into your soul that what you say during your lectures often sounds poetic. You will learn that your utterance is a performance that you are responsible for, and that when language becomes corrupt, the world you are living in is no longer familiar. You will learn that art for the sake of art and theatre for the sake of intervention is a concept that fascinates you (You will also learn that your professor could write a 900 page guide to theatre and you'd still read it). You will always receive praise in Dr. Saira's class for coming up with an impromptu example, mid presentation, and you will spend 2 weeks on a short story and have the concept of 'nada' instilled into your brain forever. You will learn the beauty of feminist literature and do your recommended readings with a want rivalling your will to live. You will also want to live under Dr. Saira's desk at one point of your degree, or another and I'm somewhat convinced she will willingly take you in. In Sir Umer's class you will learn that everything is serious, but not too serious. You will learn that poetry can often come alive and stare into your face in the shape of your professor, and that humour can be found even in places most hostile to it.

You will learn what it means to not want to miss a class.

The amount of societies in GC seems to be infinite, but the stories associated with those societies are somehow even larger in number. I have been involved in a few of these societies briefly. The biggest role I have played in a society, however, has been in the Safdar Mir English Literary Circle. The cabinet of 2022-2023 has given me some of my most cherished memories of this institution, despite me not being a part of said cabinet. Whether roads were blocked outside of the gates of GC on the evening of an open mic, or it was 1 in the morning on annual dinner night, we stuck together and made the most of every situation. I have made so many bookmarks by hand that I have lost count, but

I would never have it any other way. There have been feverish days spent in classrooms, charts sprawled over flat surfaces and hysteria in every corner of the room, there have been calls for “Kon kon chai peeyega?” about 5 times a day and there have been days the President took a look at everyone’s faces and decided to order a pizza. From entire itineraries mapped out on a whiteboard to crying hugs and “Kis ne kuch kaha hai tumhein?” it has been a wonderful year with the cabinet indeed.

I cannot talk about being a student in the Department of English, and leave out the experience that is Shahab Garden. Sir Umer walks into our class one day and tells us that “Things weren’t like this back in the day, no one was allowed into Shahab”, and it makes you think about what a privilege the entity of Shahab actually is. A senior posts a story of a laughing girl sitting underneath a tree in Shahab with the caption: “Shahab aur uss ki raunak”. You watch the kids from dramatics assemble under a tree in Shahab and hug each other in greeting. You attend a study circle and get to hear your professor say “Koi nai mere sath ye har roz hota hai” when a bird dropping falls on your friend on a bench in Shahab. You watch two people reconcile within the bounds of Shahab, and others gush over their favourite music with their best friends. You experience each joy and sorrow as you do when you read a book, and one day you are sitting on a bench in an empty Shahab Garden and you realise that the ground beneath you has a pulse. Shahab is a separate entity, she stores your memories and your laughter and every emotion under the lining of your skin. Shahab is a separate entity and she grieves and celebrates with you.

Soofia Fatima

A thriving community of young minds, where every corridor holds the promise of knowledge and every lecture room echoes with possibility and yet beneath the surface of this academic wonderland lies a world of deadlines, exams, and the ceaseless hum of assignments. Yes, we are talking about university.

In this microcosm of existence, we confront not only the relentless onslaught of assignments and exams but also the tender embrace of friendship and the searing heartbreak of love. We find solace in whispered confidences, discover therapy in late-night conversations, and witness our dreams unfold in the midst of scholarly chaos. It is a symphony of emotions and experiences, where the minutes stretch into eternities, and every moment is etched with the indelible ink of growth and self-discovery. A turbulent, enthralling, and life-altering journey that is university. My time at Government College University Lahore (GCUL) has been absolutely amazing! The English department is like a second home to me.

GCUL's vibrant atmosphere is truly something special. The university is alive with a mix of tradition and modernity. It's not just about classes and textbooks; there's a real sense of community here. But amidst the rigours of academia, friendships blossom. I'm not talking about people you endure by putting on a fake smile and some different personality. I'm talking about friends who force you into staying late, take you on late-night strolls in Anarkali, and make you visit some random tomb impulsively and especially the ones who nudge you gently towards writing for their societies just before the clock strikes the deadline. It's in these moments that we realize, this is life – messy, demanding, yet strangely beautiful. It's in these shared trials that we find our own unique ways of navigating through learning, and enduring.

The teachers, the ones I got to experience were truly amazing. The professors exude a profound passion for their subjects, igniting a curiosity within me that I never knew existed. I don't take history but I sit in Sir Adeel's classes because of his knowledge, realistic remarks on society and dedication to educating his students. Also love the way Sir Azhar teaches and how you don't have to use big words but the grammatical structure has to be perfect. His guidance was invaluable in shaping my academic pursuits. I've yet to experience many more qualified and interesting professors in the years to come.

The only problem I think there is with the English department is the admissions. If you want to secure an admission you don't need extraordinary grades, an intellectual mindset or anything like that, all you need to do is convince the interviewer that you're the perfect amount of an unhinged and

mentally unstable individual and boom you're in. This is the exact reason my French sir wants to be on the panel so he can get his hands on some stable human beings with common sense.

GCUL, with its rich tapestry of societies, offered an array of functions that enriched my university experience. There is always some kind of function happening especially around the winter season because I remember taking psychology while the amphitheatre was blasting with music for an award ceremony. But through these societies and the functions arranged by them, we always get to experience new things that'll definitely help a person in the future.

One highlight for me was running a poster stall with my friends. It was such a unique experience, and we had a blast! It's moments like these that make university life unforgettable. It has shaped me in ways I never imagined and made me experience different people. It's a chapter of my life that I'll always hold close to my heart.

And let me tell you about the literary festival! It was the first of its kind at GCUL, and it was incredible. The festival brought together some of the brightest minds in literature. I got to attend panel discussions that were so engaging and inspiring. Plus, I had the chance to meet some truly amazing people like Sarmad Khoosat, Manzar Sabahi and Samina Ahmed. It was a great experience because imagine getting up for a normal day and you're suddenly receiving Sarmad Sahib for an event while doing volunteer work.

Government College University, Lahore and the English Department, have indelibly shaped my educational experience. Government College University, Lahore, with its diverse array of societies and transformative events, has been the crucible in which my passions and aspirations have flourished. In just one year, I've learned so much, and I'm eagerly looking forward to discovering even more in the next three. Despite everything, I firmly believe that Government College University, Lahore remains the best thing that has ever happened to me.

What my Father talks about when he talks about GC

By Aleezah A. Malik

Getting to go to Government College Lahore, was one of my father, C. Malik's proudest and most cherished moments in his academic life. He often talks of it fondly which became a huge proponent behind my own admission here, the only difference being that he studied in the Science Block (Bangla, with affectionate hatred) and I study in the Main Building. When asked to relate some stories of his time there, he often returns to two stories. They are as follows.

The Best Room Conspiracy

We lived in the New Hostel. Ahead of the annual dinner, several competitions were held whose results were announced on stage. One such competition for the best room in which a class fellow of ours was incredibly invested and went to great lengths for it, even borrowing a beautiful rug from his uncle. This spectacle caused a great stir in the hostel, leading people to joke that he decorated his room as women do.

As it so happened, another one of our classmates was to be on the judging panel and they along with the rest of the panel were amused in a very sinister manner. They didn't want him to win on the premise of being an overachiever so what happened was that when the jury went around inspecting rooms; they looked at the state of the bed, cupboard and writing table along with the general cleanliness of the room, they ended up declaring me the winner and presenting me the shield on the Annual Dinner!

Here I inform you, reader, that this struck me odd as there was in fact, nothing particularly notable about my room, it was simple but elegant. I had no chance of winning the competition, nor anyone else for that particular matter. I scratched my head but didn't think too much of it in the long run. Nearly three decades later, at a reunion lunch of our batch, our class fellow who was a member of the jury disclosed to us that I was not the actual winner but since the jury didn't like his room decorations being so girlish, it was more of a matter of beating him than me winning. So, it seems that was not my victory but rather his downfall.

The Class Representative Election Collusion

We lay our scene during my final year when society elections were announced. The secretary of the society was to be elected from my class. When the Professor asked for nominations, nobody showed any interest except for a day scholar. Seeing that he was running uncontested, all of a sudden, a hostelite boy sitting next to me stood up and said he would also like to contest. Astonished, I asked him what came to his mind, to which he responded that these were elections and that they, like all

elections should be a competition. It wouldn't be interesting and principled if someone were to be elected unopposed.

Initially, nobody took him or his campaign seriously. But one day, the day-scholar visited the hostel and boasted to the hostelites that he was confident about his victory to an obnoxious length. This attacked the egos of the hostelites who decided that if this was to be done, it was to be done fair and square. They reached out to their contacts both in the boy's as well as girl's hostel and colluded that when the vote was announced, they would do everything not to let the day- scholar win. The competition was between day-scholar and hostelites.

Blind sighted by his ego, when the election result was announced, the day scholar lost and was found in the evening sitting in a garden singing Rafi's sad songs.

Muhammad Womik

Although I've only been a student in the BS English Literature department at GCU for a year, it feels like its spirit has always been intertwined with my own.

The warm-toned architecture embraces us, with the high and mighty eye of the Gothic Lady Tower bestowing its gaze upon the Oval Ground where my friends and I often find ourselves lounging on the green grass idly fidgeting with it, while we unwind over tea and a shared plate of fries from the Inter Cafe. The Oval Ground has been the backdrop for some of my most unexpected friendships, whether they emerged from shared moments of trauma bonding or impromptu study sessions. However, these moments were often shared during the chilly days and evenings of winter. As the scorching sun returned with its relentless glare, our gatherings at the Oval Ground gradually waned. My heart continues to yearn for winter's frosty embrace, despite the risk of my seasonal allergies I'll gladly take an itchy throat if it means reclining on that beloved Oval Ground once again, pretending to be characters in our own literary drama. I long for the dewy grass under our feet, as we spend our time conversing about everything and nothing all at once and simply reveling in the moment, feeling infinite.

Dur-e-Zahra

Coming to Government College was never my dream. Since I was a sixth grader or perhaps even earlier, my visions of grandeur and 'khidmat-e-kalq' manifested in the form of becoming a doctor to the dismay of my paternal guardian who wanted me to do CSS. Fate seemed to conspire with him and the state of affairs came together to weave a tapestry such that for some reason or another I didn't clear the MDCAT even though my overall merit was decently good.

In the midst of my MDCAT preparation, Government College University announced admissions for the newly inducted Department of International Relations. It didn't strike my fancy but my dad still encouraged me to apply and take the test which I did for his sake. I wasn't particularly hopeful about clearing the test let alone the interview but destiny had other plans, plans that didn't align with mine, and I managed to impress the admission board enough that my name ended up on the merit list. This came as a shock given my status as a student of the COVID-19 batch who hadn't studied Pakistan studies and my attempt of the test was based on a series of guesswork.

These are the circumstances amongst which I unwillingly entered the gates of this institute. GCU has this knack for holding events every week or so, there's always something afoot; seminars, musical events, plays, mina bazaars, so the university is always buzzing with activity. My outlook was most impacted by some of the seminars I attended in my first year that rewired a good portion of what I wanted in life. They inspired me and gave me valuable knowledge on a variety of topics and provided grooming on how to approach situations as well as how to accept and deal with criticism.

In my first week, I had the fortune of attending a seminar held by the GCU Welfare Society on CSS preparation led by Sir Umer Rasool, The DG of the Civil Services Academy. He had the cameras turned off and the ensuing session proved to be an insightful and fruitful conversation between him and the students about how he ended up in his situation. The story goes that he was in the process of becoming a doctor and only took up the mantle of CSS preparation to help a friend with their preparation. His only previous qualification was that he had done a simple B.A. but he ended up taking the exam and ranked second overall. That was a resonant moment in my experience here because it showed me that doing MBBS wasn't the only route I could take if I wanted to serve the people of my country.

If I had done MBBS, I would have spent a lifetime with my nose stuck in my books only. Coming to GC improved my self-confidence when once I was so shy and gave me the space to increase my scope of awareness about so many things. It has taught me how to be assertive without being overbearing and how to think about the world I'm faced with and for that I am grateful.

THE RAVI

English Advisor

Dr. Sameer Ahmed

Urdu Advisor

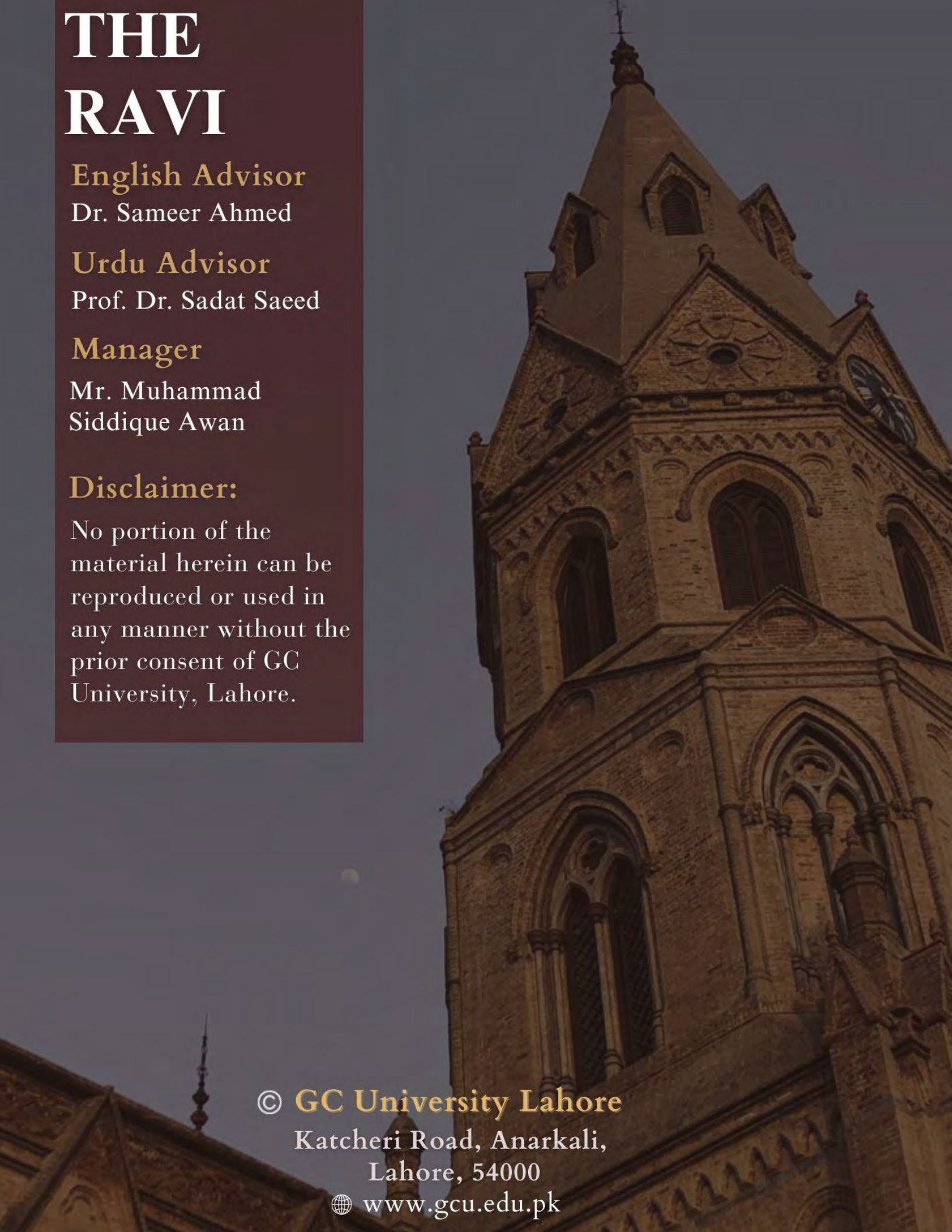
Prof. Dr. Sadat Saeed

Manager

Mr. Muhammad Siddique Awan

Disclaimer:

No portion of the material herein can be reproduced or used in any manner without the prior consent of GC University, Lahore.



© GC University Lahore

Katcheri Road, Anarkali,
Lahore, 54000

www.gcu.edu.pk